اردو میں بچوں کا ادب

ڈاکٹر خوشحال زیدی

اردو میں بچوں کا ادب

اس مقالے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے
ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی گئی۔

پہلی بار:۔ مارچ ۱۹۸۹ء

تعداد اشاعت:۔ چھ سو ۶۰۰

قیمت:۔ دو سو روپے ۲۰۰/-

ناشر:۔ مصنف

مطبوعہ کلر پرنٹنگ پریس دہلی

کتب خانہ انجمن ترقی اردو
اردو بازار جامع مسجد دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار جامع مسجد دہلی

ایجوکیشنل بک ہاؤس
شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

نصرت پبلشرز
امین آباد، لکھنؤ

ادارۂ بزم خضر راہ
۱۲/۵۴۷، گوال ٹولی، کانپور

URDU MEIN BACHHON KA ADAB
DR KHUSHHAL ZAIDI
80 GHAFFAR MANZIL EXTENTION
JAMIA NAGAR
NEW DELHI 110 025
INDIA

انتساب

ڈاکٹر مظفر حنفی کے نام

"کہ جس کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن"

ترتیب

حصہ اوّل: نظریات و مسائل

تیسرا باب:۔ بچوں کا ادب اور اس کے بنیادی عناصر

آٹھواں باب:۔ اردو ادبِ اطفال کا دورِ سوم ۲۲۹
(۱۹۴۷ء تا حال)

حصہ سوم: اردو ادب اطفال کی تخلیقی اصناف کا تجزیاتی مطالعہ

دسواں باب:۔ کہانی

گیارھواں باب: ڈراما

بارھواں باب:- ناول

کتابیات:- ۵۵۱

بیس سال قبل مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی نظموں اور درسی کتب سے ہوتا ہے پھر تقریباً پچاس سال بعد اس کے ارتقائی سفر کا ایک اہم سنگ میل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں بچوں کے لیے ادب کو فروغ دینے کی شعوری کوشش میں نظر آتا ہے۔ جبکہ معیاری درسی کتب کی تیاری کا بیڑا اٹھایا گیا اور بچوں کے لیے علمی ادبی اور نفسیاتی طور پر صالح ادب تخلیق کرنے کے لیے ایک تحریک سی شروع کی گئی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ بچوں کے لیے رسائل جاری ہونا شروع ہوئے اور بڑوں کے اخبارات میں بھی ان کے لیے گوشے قائم ہونے لگے۔ اس طرح بچوں کا ادب' ایک باضابطہ صنف کی سی حیثیت اختیار کر گیا۔ ایک طرف مستند ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات سے اُسے وقار بخشنے لگے اور دوسری طرف ایسے اہل قلم بھی ابھر کر سامنے آنا شروع ہوئے جنھوں نے کلیتاً اپنے آپ کو بچوں کے لیے وقف کر دیا۔ پریس کی سہولتوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب کی ترویج و اشاعت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ کہانی، ناول، ڈراما، معلوماتی اور علمی نثر، تفریحی اور مزاحیہ نثر، گیت، نظم، حکائی نظم غرضیکہ ادب کی مختلف اصناف میں بچوں کے لیے خوب تخلیق ہونے لگی۔ مزید براں بڑوں کے ادب کی طرح ان اصناف میں بھی موضوعاتی تنوع آیا اور بچوں کا ادب واضح طور پر ایک 'تشخص' کا مالک ہو گیا۔ اس کی آبیاری کرنے والوں میں اس صدی کے آغاز سے لے کر آج تک مستند ادیبوں اور شاعروں کی کوئی کمی نہیں رہی ہے۔ مثال کے طور پر ڈپٹی نذیر احمد، حالی، شبلی، اقبال، پریم چند، محروم، خواجہ حسن نظامی، حفیظ جالندھری، امتیاز علی تاج، رشید احمد صدیقی، ذاکر حسین، محمد مجیب، شوکت تھانوی سے لے کر عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر تک ایسے مزید اسمائے گرامی شمار کیے جا سکتے ہیں جن کا نام اُردو ادب میں مسلّم ہو چکا ہے تاہم آج تک کتب تاریخ ادب اُردو اور ادبی تذکرے بچوں کے ادب کے ذکر سے بالعموم خالی ہی نظر آتے ہیں اور ہمارے نقاد اور مبصرین نے بھی اُسے بہت کم در خورِ اعتنا سمجھا ہے۔ ابھی ملک کی دانش گاہوں میں بھی اُسے تحقیقی مقالات کا موضوع شاذ ہی گردانا گیا ہے۔

اس تناظر میں خوشحال زیدی کی تصنیف "اُردو میں بچوں کا ادب" ایک مجتہدانہ کام کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے "بچوں کے ادب" کو پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے

مگر یہاں کی اہمیت سے وہ غافل نہیں رہے ہیں۔

غرضیکہ خوشحال زیدی صاحب نے بچوں کے ادب پر بھرپور نظر ڈالی ہے اور محققانہ طور پر ڈالی ہے۔ انھوں نے اس میدان میں کام کرنے میں اپنی وسیع النظری کا ثبوت فراہم کیا ہے نیز اتنی بڑی تعداد میں ادیبوں اور شاعروں کی کلیات کی نشان دہی کا اہتمام بجائے خود بھی اُن کی ژرف بینی اور مستعدی پر دلالت کرتا ہے۔ انھوں نے اس تحقیقی کارنامے کو انجام دینے میں جو پیش قدمی دکھائی ہے اور جس جاں فشانی سے اُسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا ہے، مجھے یقین ہے کہ اہلِ نظر اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اُن کی کاوش بچوں کے ادب سے متعلق کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ اور زادِ راہ دونوں ثابت ہوگی۔

عبداللہ ولی بخش قادری

۴۴-۱۰۳ اے۔ اوکھلا
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۱۱ر فروری ۱۹۸۹ء

حرفِ آغاز

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ بچے ہماری قومی امانت ہیں اور اس امانت کا تحفظ قوم کے ہر فرد پر واجب ہے لیکن بچوں کا تحفظ اور پرورش و پرداخت کا فریضہ انھیں محض اچھی غذا، عمدہ لباس اور قیمتی کھلونے فراہم کر دینے سے ادا نہیں ہو جاتا۔ ان کی جسمانی نشوونما کے لیے مناسب سہولیات مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ نونہالوں کی ذہنی و فکری تربیت کا بندوبست بھی ضروری ہے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب ہم بچے کو ابتدا سے ہی اس کی نفسیات اور ضروریات کے پیش نظر ادبی مواد فراہم کریں جو تفریح کے علاوہ ان کی معلومات میں بھی اضافہ کرے اور ان کے کردار کو جلا بخش کر مستقبل کا اچھا انسان بننے کی راہ ہموار کرے۔
مقام افسوس ہے کہ ہمارے سماج میں بچے کی اہمیت اور شخصیت کا خاطر خواہ احساس عام نہیں ہے اور اس کی انفرادی حیثیت کو عموماً نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ بچوں کے بڑے انھیں جیسا بنانا چاہتے ہیں اور جس قسم کی تربیت ان کے لیے مناسب تصور کرتے ہیں، بچوں کو مجبوراً ان پر کاربند ہونا پڑتا ہے۔ بالعموم ہندوستانی بچے اپنی پسند اور ناپسند کے مختار نہیں بلکہ انھیں دوسروں کی مرضی کا تابع رہنا پڑتا ہے۔ بچوں سے بے اعتنائی کی یہ روش اس حد تک بڑھی کہ اردو کا ادب اطفال بھی اس کی لپیٹ میں آگیا اور ہمارے ادبی سرمائے کے اس پہلو سے بے اعتنائی برتنے کا رویہ عام ہو گیا۔

اردو ادب اطفال کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس موضوع پر جس سنجیدگی سے

فکر اور کشادہ نظر سے کام کرنے کی ضرورت تھی۔ اسے جتنی اہمیت ملنی چاہئے تھی اس سے
پہلو تہی کی جاتی رہی ہے۔ ہمارے ناقدین اور محققین نے ادب اطفال کو بچکانہ سمجھ کر
اکثر و بیشتر نظر انداز کرنے کی روش اختیار کی۔ بچوں کے ہاتھوں تک صرف نصابی کتب
پہنچتی ہیں۔ لیکن ان درسی کتابوں میں شامل مواد میں بھی اکثر بچوں کی نفسیاتی ضروریات اور
دلچسپیوں کو نظر انداز کر کے پند و نصیحت کے دفتر کھولے جاتے رہے ہیں یا انھیں زبان بیان
سکھانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ مجھے بچپن ہی سے بچوں کے ادب سے شغف رہا ہے اور بچپن میں
میری کچھ کہانیاں مختلف رسائل میں شائع بھی ہوئیں۔ آگے چل کر نگاہ میں کچھ وسعت آئی تو
احساس ہوا کہ اردو ادب اطفال سے ناقدین کی عام بے اعتنائی کا ازالہ ہونا چاہیے۔ میری
خوش بختی سمجھئے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے میرے تحقیقی مقالے کا موضوع "اردو میں بچوں
کا ادب" منظور کیا۔ ۱۹۷۴ء میں مجھے اس موضوع پر باقاعدہ کام کرنے کی اجازت دی گئی اور ڈاکٹر
مظفر حنفی کو میرا نگراں مقرر کیا گیا۔

تاحال بچوں کے ادب پر میری نگاہ ساحل سے طوفان کا نظارہ کرنے والے کی مانند تھی۔
اب جو اس بحرِ زخّار میں غوطہ لگایا تو معلوم ہوا کہ امیر خسرو تا حال باستثنائے چند اردو کا کوئی
بھی عظیم یا اوسط درجہ کا ادیب و شاعر ایسا نہیں ہے جس نے کسی نہ کسی نہج سے ادب اطفال
میں اضافہ نہ کیا ہو۔ ایسے لکھنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں۔ لائبریریوں میں اردو کی تنقیدی اور
تحقیقی کتابیں نیز بالغوں کے لیے تخلیقی ادب پر مشتمل تصنیفات تو عام طور پر محفوظ رکھی گئی ہیں۔
اور ان کے کیٹلاگ بھی مرتب کر لیے گئے ہیں۔ لیکن بچوں کی کتابوں کو محفوظ رکھنا لاحاصل سمجھا
گیا۔ اگر کہیں ایسی کتابیں دستیاب بھی ہیں تو ان کے کیٹلاگ تیار نہیں کیے گئے۔ اردو ادب
اطفال پر تحقیقی کام کرنا اس لیے اور بھی دشوار ثابت ہوا کہ تقسیم ہند کے بعد اس کا بڑا ذخیرہ
سرحد کے اس پار رہ گیا اور جو کچھ ہندوستان کے حصے میں آیا وہ بھی یہاں اردو سے عام
بے اعتنائی کی نذر ہوتا رہا۔ چنانچہ اس بکھرے ہوئے ذخیرے کو کھنگالنے اور اس سے اپنے کام
کا مواد حاصل کرنے میں کئی برس صرف ہو گئے۔ نگراں کی ہدایت تھی اور خود میرا بھی یہ منشا
تھا کہ موضوع کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں (۱) کا مضامین کے علاوہ

[illegible] ادب اطفال پر [illegible] [illegible]
[illegible] کے نظریات سے [illegible]
[illegible] خاصا وقت صرف ہوا بہرحال جس
کی اس تلاش کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

سہولت کی غرض سے اس مقالے کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے تاکہ مباحث گڈمڈ نہ ہونے پائیں۔ پہلے حصے کا عنوان ہے "بچوں کا ادب۔ خصوصیات و مسائل"۔ یہ حصہ چار ابواب پر مشتمل ہے جن میں بچوں کے ادب کی ماہیت اور تعریف، بچوں کی نفسیات اور ادب اطفال کا تعلق، ادب اطفال کے بنیادی عناصر، اس کی ضروریات اور مسائل سے سیر حاصل بحثیں کی گئی ہیں۔

مقالے کا دوسرا حصہ اُردو ادب اطفال کے ارتقائی جائزے پر مشتمل ہے۔ اس جائزے کو تین ادوار میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں امیر خسرو سے ۱۸۵۷ء تک کے اُردو ادب اطفال کا تاریخی سفر بیان کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان تخلیق کیے جانے والے بچوں کے ادب پر نگاہ ڈالی گئی ہے۔ الغرض مقالے کے حصہ دوم میں ایسے کم و بیش تمام تخلیق کاروں کی ادبی کاوشوں اور خدمات کا مجموعی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جنھوں نے اُردو میں بچوں کے لیے تخلیقی کام کیا ہے۔

تکمیلِ ضابطہ کے نقطۂ نظر سے مقالہ مندرجہ بالا دو حصوں میں ہی مکمل کیا جا سکتا تھا لیکن میری اور میرے نگران کی اس کام سے سیری نہیں ہوئی۔ کیوں کہ اس حد تک ادب اطفال کے لکھنے والے اور قابلِ ذکر اہلِ قلم کار تو روشنی میں آ گئے لیکن علیحدہ علیحدہ مختلف تخلیقی اصنافِ ادب کے بارے میں کوئی واضح خاکہ نہیں اُبھرتا تھا چنانچہ مقالے میں ایک اور حصے کی ضرورت محسوس کی گئی جس کا عنوان ہے "اُردو ادب اطفال کی تخلیقی اصناف کا تجزیاتی مطالعہ"۔ مقالے کا تیسرا حصہ چار ابواب پر پھیلایا گیا ہے اور ان کے تحت بالترتیب بچوں کی شاعری، کہانی، ناول اور ڈراما جیسی اصناف کا الگ الگ جائزہ لیا گیا ہے نیز نمائندہ تخلیقات کے تجزیے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے مقالہ کی تیاری کے لیے مجھے سیکڑوں

چھوٹی بڑی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا ہے ظاہر ہے کہ ان میں متعدد تخلیق کاروں کی کتابوں کے ساتھ
تخلیق کردہ چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی شامل ہیں۔ کتابیات کے تحت ایسی تمام کتابوں کی فہرست
صنف وار مقرر کر دی گئی ہے۔ تاکہ موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب بوقت ضرورت
اصل ماخذ تک آسانی سے رسائی حاصل کر سکیں۔

میری خوش قسمتی کہ اس مقالے کی تکمیل میں مجھے اپنے شفیق استاد ڈاکٹر مظفر حنفی
کی رہنمائی ہر گام پر حاصل رہی۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے بچوں کے لیے جو تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی
کام کیا ہے، محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے اپنی ذاتی لائبریری میرے لیے ہمیشہ کھلی رکھی اور
اس میں موجود وسیع ذخیرہ کتب و رسائل سے میں نے خوب خوب استفادہ کیا۔ بہت
سا ایسا مواد جس تک میری رسائی قطعی ناممکن تھی مجھے ہند و پاک کے مختلف علاقوں سے ان
ہی کے وسیلے سے حاصل ہو سکا۔ اس موضوع کے خاکے کی تشکیل سے مقالے کی تکمیل تک
انھوں نے ہر مرحلے پر میری علمی اور عملی رہنمائی بالکل اس بچے کی طرح کی جس کو انگلی پکڑ کر چلنا
سکھایا جاتا ہے۔ ان کے شایان شان شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ
نہیں ہیں لیکن ان کے تئیں تشکر کا احساس میرے دل میں تا زیست برقرار رہے گا۔

میرا خوشگوار فرض ہے کہ اس موقع پر بچوں کے مشہور ماہنامہ "پیام تعلیم" نئی دہلی
کے مدیر اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں صاحب کا بھی شکریہ ادا کروں جنھوں
نے مذکورہ پرچے کی فائلوں سے استفادہ کرنے کا موقع دیا۔ بلکہ کئی کمیاب کتابوں کے نسخے بھی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے ریکارڈ سے تلاش کر کے مجھے عنایت فرمائے۔ جناب الیاس دہلوی صاحب
(مدیر کھلونا نئی دہلی) نے بھی اپنے رسالے کی بہت سی کمیاب فائلوں سے مواد کی فراہمی
کا راستہ میرے لیے ہموار کیا۔ مشہور اشاعتی ادارے نسیم بک ڈپو (لکھنؤ) کے مالک جناب
نسیم انہونوی صاحب نے ماہنامہ کلیاں، بچوں کا باغ (لاہور) اور بچوں کا اخبار (لاہور)
کے بہت سے شمارے مجھے عنایت فرمائے۔ میں تہہ دل سے ان حضرات کا شکریہ ادا کرتا
ہوں۔ اسی طرح جناب ذوالفقار تابش نے مظفر حنفی کی فرمائش پر لاہور سے ماہنامہ
کتاب کے کچھ شمارے میرے لیے فی الفور ارسال کیے۔ میرا فرض ہے کہ ان کا بھی شکریہ

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، دہلی پبلک لائبریری دہلی، میونسپل لائبریری دہلی، چودھری بک ٹرسٹ علی گڑھ، امیرالدولہ پبلک لائبریری (لکھنؤ)، پٹنہ، پی پی این ڈگری کالج لائبریری کانپور، حلیم ڈگری کالج لائبریری (کانپور)، اقبال لائبریری بھوپال، رضا لائبریری رامپور، مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ)، کتب خانہ انجمن ترقی اُردو (نئی دہلی) کے منتظمین اور اراکین نے کتب اور رسائل کی فراہمی میں میرا ساتھ دیا، میں ان کا شکر گزار ہوں۔

سراج انور صاحب، شکیل زیدی صاحب، ابراہیم فکری صاحب، غلام حیدر صاحب اور رئیس الاسلام صاحب کا بھی بہت بہت شکریہ کہ ان حضرات نے بھی کئی کتابیں اور کمیاب رسالے مہیا کیے جس سے مقالے کی تکمیل میں بڑی سہولت ہوئی۔

میری رفیقۂ حیات شہناز اقبال زیدی نے نو برس کی اس طویل مدت میں ہر طرح میرا ساتھ دیا۔ گھر میں پرسکون ماحول قائم رکھا کہ میں یکسوئی کے ساتھ اپنا تحقیقی کام جاری رکھوں اور آخری منزل پر ٹائپ شدہ مواد کی تصحیح میں میری بہت مدد کی۔ اس رفاقت اور خدمت کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔ آخر میں میں جناب شریف الحسن نقوی سیکریٹری اُردو اکیڈمی دہلی کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جن کی خصوصی توجہ اور تعاون کے سبب یہ تحقیقی مقالہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

خوشحال زیدی

۲۳ جنوری ۱۹۸۹ء
انتظار لاج، مختار منزل ایکسٹینشن
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

حصہ اوّل ضرورت اور مسائل

پہلا باب

بچوں کا ادب*

بچہ۔ جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی حیثیت ایک جاندار گوشت کے لوتھڑے کی سی ہوتی ہے۔ جس کے انسانی اعضا ہوتے ہیں۔ وہ صرف روتا ہے۔ ماں کا دودھ پیتا ہے۔ ماں کے بدن کی گرمی اور وقت کا چکر آہستہ آہستہ اس جاندار لوتھڑے کو باشعور بناتا ہے۔ بچہ اپنی ماں کو دیکھتا ہے۔ اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھتا ہے۔ ایک سال سے تین سال کی عمر تک وہ آس پاس کی چیزوں کو پہچاننے لگتا ہے، بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ تین سال سے چھ سال کی عمر کے درمیان وہ پڑھنا لکھنا سیکھنے لگتا ہے اور چھ برس سے دس برس کی عمر میں بچہ دنیا کی ہر شے میں دلچسپی لینے لگتا ہے، وہ ہر چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنے آس پاس اور اپنے ماحول میں نظر آنے والی چیزوں کے ساتھ وہ اپنے متعلق اور دنیا کی تمام چیزوں کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین اور بے قرار رہتا ہے۔ اس کی قوتِ متخیلہ ذہن اور جسم نشوونما پاتے ہیں۔ اس پیر سینڈ ایلیفو کا کہنا ہے کہ بچہ اس عمر میں اپنے گھر سے باہر کی دنیا میں پوری دلچسپی لیتا ہے۔

---

*The child becomes interested in the outer world and wants to hear of other people and other lands. He wishes to get behind the thing he sees and handles. His own-self and his own plans, no longer satisfy him; he is curious to hear of the lives of others-their fears, hopes, discoveries and

secrets. He has become eager to find (everything) he can. 'Lay his hands on' will be great in this [illegible] dry ponderous tomes will be religiously read if the others are available.'[1]

سپیڈ فورڈ کے خیال میں بچہ جب باہر کی دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ جو چیز وہاں دیکھتا ہے استعمال کرتا ہے۔ اور سب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کو بے چین رہتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بچے اپنے بڑوں کی زندگی، تجربات، خوف، حیرت، امیدیں، انکشافات اور غموں کو جاننے کے لیے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اپنے آس پاس کی چیزوں اور [illegible] وغیرہ کے بارے میں جاننے کی یہ خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ اسکولی کتب بچوں کی خاطر خواہ معلومات جیسی [illegible] کتابیں تعلیمی نقطۂ نظر سے تیار کی جاتی ہیں اور ان میں فراہم کردہ معلومات کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ وہ بچوں کو تفریح، ذہنی سکون مہیا کرنے اور ان کی حیرت اور استعجاب کو آسودہ کرنے میں ناکام ہیں۔ اس لیے بچوں کے لیے ایسی کتب کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو انھیں تفریح، ذہنی سکون اور زبان کی پختگی عطا کریں اور ہر چیز کے بارے میں ایسے انداز میں معلومات فراہم کریں کہ بچے کی دلچسپی برقرار رہے نیز ان کی صلاحیتیں بیدار ہو کر فروغ پا سکیں۔ چنانچہ ایسی ہی کتب بچوں کا ادب کہلانے کی مستحق سمجھی جاتی ہیں جو ان کی نشو و نما میں معاون ثابت ہوں۔

رابندر ناتھ ٹیگور کا کہنا ہے کہ ٹھیک سے دیکھنے پر بچے جیسا پرانا اور کچھ نہیں ہے۔[2] ہمارا زمانہ تعلیم، رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور نفسیات کے اعتبار سے انسان ایک بے پناہ تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ لیکن بچہ ہزاروں سال پہلے جیسا تھا آج بھی ویسا ہی ہے۔ وہی لگاتار ہمارے زمانے سے چلے آنے والے طور طریقے پر انسان کے گھر میں 'بچہ' کی شکل لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ جب سے دنیا بنی ہے تب ہی سے یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے، مگر پھر بھی

---

1. Peter Sandiford, "Mental & Physical Growth of children." Page.[illegible].

۲۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے مضمون، ساہتیہ اکادمی دہلی ص ۲۴۲ (ترجمہ)

بچہ ہر زمانے سے جتنا خوبصورت، بھولا بھالا اور پیارا تھا آج بھی ویسا ہی ہے۔ شک کی وجہ یہ ہے کہ بچہ، خدائی دین ہے اور اس کی فطرت میں کوئی کھوٹ شامل نہیں ہے۔ جبکہ ادب کئی اعتبار سے معاشرے اور انسان کے ہاتھ کی تخلیق سمجھا جاتا ہے۔ بچوں کو بہلانے کے لیے جو لوریاں اور لوک گیت وجود میں آئے وہ بچوں کا ادب ہیں۔ دراصل بچوں کے ادب کا آغاز ماؤں کی ان لوریوں سے ہوتا ہے جنھیں بچہ اس وقت سے سننے لگتا ہے جب وہ پہلی بار اس دنیا میں آکر ماں کی گود میں آنکھ کھولتا ہے۔ یہ لوریاں اور گیت صدیوں سے رائج چلے آرہے ہیں۔ لیکن بچوں کے ادب میں جن کتابوں کو شامل کیا جاتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ دو سو سال قدیم ہیں حالانکہ بچے صدیوں سے اپنے بڑے بوڑھوں کی زبانی لوریاں اور قصے سنتے چلے آئے ہیں۔

برٹینکا جونیر انسائیکلوپیڈیا میں بچوں کی کتب کے بارے میں لکھا ہے۔

"It is at all surprising that books suitable for boys and girls began to appear only about 200 years ago, yet stories which children enjoyed, were told by words of mouth for countless generation."[1].

عہدِ قدیم میں انسان زندگی سے متعلق حادثات، تجربات اور واقعات، کہانی اور قصوں کی شکل میں ایک دوسرے کو سناتا پھرتا تھا۔ ایسی کہانیاں بہادری، جوش اور قوم کی برتری کی کہانیاں ہوتی تھیں۔ بالغ اور بچے دونوں ہی عشق و محبت، جنگ و جدل کی کہانیاں سننے میں دلچسپی لیتے تھے۔ خاندان کے بزرگ اپنے چھوٹوں کو ایسی کہانیاں سناتے چلے آئے ہیں جو زندگی اور دنیا کے عجائبات (یعنی ان کی معلومات اور تجربہ تمام) واقعات اور حادثات اور ان کے خاندان سے متعلق ہوتی ہیں۔ جاڑے کی لمبی سیاہ راتیں، جنگل اور جنگلی جانوروں اور مافوق الفطرت واقعات سے متعلق کہانیوں کو سن کر گزار دی جاتی۔ مگر بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ اس غیر مہذب، غیر متمدن اور غیر ترقی یافتہ دور میں بھی دنیا کے مختلف حصوں میں جو زبانی کہانیاں سنائی جاتی ہیں، ان میں خاصی مماثلت پائی جاتی

1- Britannica Junior Encyclopaedia Vol.II-C, 1960, Page 447.

[illegible] ان میں کچھ اہمیت تھی۔ یہ تحریر قدیم [illegible]
پسند کرتا تھا جو سیر و سیاحت / جدید [illegible] عشق اور بہادری کے کارناموں پر مشتمل ہوتی تھیں۔
سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ فن تحریر و طباعت کی سہولتوں سے [illegible]

طباعت کی ایجاد سے قبل بہت کم کتب بچوں کے لیے ہاتھ سے لکھی ہوتی تھی۔ [illegible] کی لکھی کتب بہت کم بچے پڑھ پاتے تھے سوائے امیر زادوں کے جو گرجا گھر یا کسی کتب میں جا سکتے تھے۔ ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ کتابیں بیشتر لاطینی زبان میں تھیں کیونکہ روم کے زوال کے بعد گرجا گھروں میں بھی رومن (ROMAN) زبان مستعمل نہیں تھی۔[1]

تاریخ میں بشپ ایلڈہم (BISHOPALDHEHM) کو بچوں کے ادب میں سب سے پہلا مصنف مانا گیا ہے۔ یہ انگلینڈ کا باشندہ تھا جس نے بچوں کے لیے اپنے خیالات کا اظہار سوال و جواب کی شکل میں لاطینی (LATIN) زبان میں کیا۔ اس کے بعد وینریبل بیڈ (VENERABLEBED) نے لڑکوں کے لیے مشقی اسباق پر مشتمل کتاب لکھی۔ الفریڈ دی گریٹ (CANTERBURY) نے دیگر زبانوں سے انگریزی میں بچوں کے لیے کتابیں ترجمہ کرائیں۔ سینٹ اینسلم آرک بشپ آف کنٹربری (SAINTANSLEM) (ARCHBISHOP) نے بچوں کے لیے سب سے پہلے انسائیکلوپیڈیا تیار کی جو بچوں کی عام معلومات میں رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔

بچوں کے عالمی ادب میں ہندوستانی کہانیوں نے سب سے پہلے اولین حیثیت حاصل کی سنسکرت کی مشہور تصنیف "پنچ تنتر" کی عالمی مقبولیت اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے "پنچ تنتر" کی کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ صدیوں سے ان کہانیوں نے بچوں کی ہی نہیں بلکہ بڑوں کے لیے بھی تفریح اور دلچسپی کا سامان فراہم کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کہانیوں کو عالمی مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ کہانیاں فارسی ترجمے کے ذریعہ پہلے ایران اور

---

1. Britannica Junior Encyclopaedia, Vol. 4, C 1988, Page 2508.

پہ عمل بچوں کے ادب کی تعریف متعین کی گئی ہیں۔ لہ

اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اس مسئلہ پر غور کرنا ضروری ہے کہ [illegible]
لکھ سکتے ہیں؟ بچوں اور بالغوں کے ادب میں کیا فرق ہے؟ کیا بچوں کے لیے لکھی ہوئی [illegible]
کتب ادب اطفال میں شامل کی جا سکتی ہیں؟ نیز بچے کس قسم کی کتب پسند کرتے ہیں؟
اس ضمن میں شفیع الدین نیر کہتے ہیں۔

"بچوں کے ادب سے مراد نظم و نثر کا وہ ذخیرہ ہے جو خاص طور پر بچوں کے لیے لکھا گیا ہو یا اپنی معنویت اور افادیت کے اعتبار سے بچوں کے لیے مخصوص ہو یا یوں سمجھئے کہ جو ادب چار یا پانچ سال کی عمر سے تیرہ چودہ برس تک کے بچوں کے لیے مخصوص ہو اسے ہم بچوں کے ادب سے تعبیر کرتے ہیں۔ بلاشبہ بچوں کے ادب کو بھی ان اقدار اور خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے جو کسی بھی زبان کی نظم و نثر کو ادب کا درجہ بخشتی ہیں۔ ان تحریروں میں خیال کی رفعت، جذبہ کی صداقت، زبان کی لطافت اور بیان کا حسن شامل ہیں۔" ٹہ

برٹینیکا جونیر انسائیکلو پیڈیا (لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے) میں ادب اطفال کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"By children literature, is meant three kinds of writing, important in the lives of young people as they grow up. In the first place the term includes all of the different kinds of stories, written especially, for boys and girls..... secondly, it refers to traditional or folk literature, the collection of fairly tales. Finally, it includes the books written for adults which children have claimed as their own."[2].

لہ میکا کرشن، مریا سرے "بچوں کا عالمی ادب" ماہنامہ آجکل جنوری ۱۹۷۹ء ص ۲۲ اردو [illegible] شہباز حسین

ٹہ نیر محمد شفیع الدین "اردو زبان میں بچوں کا ادب" سیمینار اردو میں بچوں کا ادب جامعہ ملیہ اسلامیہ

2. Britannica Junior Encyclopaedia (For Girls & Boys) Vol. IV. C 1951. Page. 249

انسائیکلوپیڈیا کے اعتبار سے بچوں کے ادب میں وہ تمام کتب شامل ہیں جو خاص طور سے بچوں اور نوجوانوں کے پڑھنے کے لیے خاص طور پر لکھی گئی ہیں۔ جن میں کہانیاں، نظمیں اور وہ کتب بھی شامل ہیں جو بڑوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ مگر بچوں نے ان کو اپنا لیا ہے۔

"بچوں کے ادب" کے بارے میں ایک سمپوزیم اور تقسیم انعامات کے موقع پر پریا کپور نے کہا ہے:

"The Basic consideration for children's literature is that it should have well constructed plot, worthwhile contents, signified theme, convincing characterisation, appropriate style and attractive formats. For more important to this is the children book to be richer in interest, true far a abundant in every quality that responds to childhoods."[1].

---

1. Priya Kapoor, "Child psychology & children literature," a paper read in the symposium and prize competition for children's literature from 28th January to 30 January 1980, at N.I.E. campus by N.C.E.R.T., New Delhi.

پریم چند نے بچوں کے ادب میں بڑا اہم موضوع اور مرکزی خیال [illegible] پر زور دیا ہے۔ ساتھ ہی ان کا کہنا ہے کہ بچے کے لیے جو کتب لکھی جائیں وہ بچے کی دلچسپی اور بچے کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی جائیں۔ ہری کرشن دیوسرے بچوں کے ادب کے بنیادی عناصر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"बाल साहित्य की रचना के मूलाधार के ही तत्व तथा मनोवैज्ञानिक नियम है जो बच्चों को स्वस्थ मानसिक विकास द्वारा सफल व्यक्ति बनाने के लिये आवश्यक है। बाल साहित्य उन अंकुरों की पुष्टि करता है जो बड़े होकर उन्हें जीवन के सत्य को पहचानने में सहायता करें।" [1].

دیوسرے کے خیال میں بچوں کے ادب کے بنیادی عناصر وہی نفسیاتی اصول ہیں جو بچوں کے ذہن کو صحت مند بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ بچوں کا ادب بچوں کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جو بڑے ہو کر زندگی کی سچائی کو پہچاننے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر ہنری اسٹیل مشہور کتاب A CRITICAL HISTORY OF CHILDREN Lit میں بچوں کے ادب کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"What, after all do we mean by the term? Is it the literature written especially for the young the fairy and wonder tales, the nursery rhyms and songs, the dull books of etiquette and ademinition and moral persuations, the story of school or playing field or of far-flung adventure? It is all of this, to sure, but it is far more. It is the whole vast body of literature, that children have adopted commonly to share

---

1. डॉ हरि कृष्ण देवसरे, बाल-साहित्य - एक अध्ययन" आत्माराम एण्ड सन्स दिल्ली 6, पेज 11

with their elders, but some times to monopolise. It is quite literally their literature. For it is, in the end, not the parents, the teachers, the preachers not even the authors, but the childrenthemselves who determine what their literature is to be."[1].

بچوں کے ادب میں پریوں اور جادو کی کہانیاں، نظمیں اور گیت، اخلاقی مضامین، اسکول اور کھیل کا میدان اور سیر و سیاحت کی کہانیاں سب ہی کچھ ملتا ہے۔ اور اسی کو بچوں کا ادب مانا گیا ہے۔ مگر اس بات کا قطعی فیصلہ نہ تو اساتذہ و نہ ہی والدین، نہ ادیب اور نہ شاعر ہی کر پائے ہیں کہ کیا بچوں کا ادب ہے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ اس بات کا فیصلہ تو خود بچے ہی کر سکتے ہیں کہ ان کا ادب کیا ہو اور کیسا ہو ـــــ ؟ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ بچے کس قسم کی کتب پسند کرتے ہیں؟ بچوں کا ادب کیسا ہونا چاہیے؟

بچوں کے ادب پر متعلقہ ملک کے ماحول، سماجی رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کا پورا اثر پڑتا ہے۔ جو کتاب سندھی بچوں کے لیے لکھی گئی ہے ضروری نہیں کہ وہی کتاب امریکہ کے بچوں کو بھی پسند آئے۔ بچوں کے لیے لکھنا بہت مشکل کام ہے اور نہ ہی ان کے لیے لکھی ہوئی سندھی کتابوں میں بچوں کے ادب میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اکثر بچوں کے لیے لکھی جانے والی کتابوں اور ادبِ اطفال کے بارے میں مرقوم طراز ہے۔

"All books written for children are not necessarily literature, does the adul[illegible] conception of what constitutes a children's

---

1. Henery Steel from 'Introduction of the, 'A critical History of children's literature." MEIGS, Page XII.

book coincide always with that of the child. There are those who think of a child's, book as just a simpler treatment of an adult theme. This point of view considers children, only as dominating adults and arises from misunderstanding of child-hood itself., For children are a race, whose experience of life is different from that of adults Theirs' is a different world-a child's world in which values are expressed in children's terms, and not in those which belong to adult experience."[1]

للن اسمتھ کے خیال میں بھی بچوں کے لیے لکھی گئی ساری ہی کتابیں بچوں کے ادب میں شمار نہیں کی جاسکتیں زیادہ تر یہ ہوا ہے کہ بڑوں کی باتوں کو آسان اسلوب اور زبان میں بچوں کے لیے پیش کر کے اس کو بچوں کا ادب مان لیا گیا ہے۔ لیکن یہ خیال بچوں کو بڑوں کی ایک اکائی ثابت کرتا ہے جب کہ بچے کی اپنی ایک الگ حیثیت ہے۔ بچوں کی دنیا بڑوں کی دنیا سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔

بڑوں کے مقابلے میں بچوں کے مسائل بہت سیدھے سادے اور آسان ہوتے ہیں۔ دوسری طرف بچے بہت حساس ہوتے ہیں۔ وہ سچ اور جھوٹ، اچھے اور برے، سکھ اور دکھ، یا انصاف و ناانصافی کے فرق کو سمجھتے ہیں۔ بچوں کے یہ جذبے [illegible] نہیں ہوتے جو بڑے اس فرق کو واضح کرنے کے لیے بچوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہ [illegible]

---

1. Lillian Smith, "A critical approach to Children's literature" Page - 15.

کی شخصیت کی تعمیر بچپن میں ہی ہوتی ہے۔ بچوں میں تخیل کے ساتھ ساتھ اخذ کرنے، نقل کرنے اور اس سے متاثر ہونے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ پال ہازرڈ بچوں کی کتابوں کے بارے میں لکھتا ہے۔

"Books that remain faithful to the very essence of art those that after to children in intutive and direct way of knowledge a simple beauty capable of being perceived, immediately arousing in their soul a vileration, which will endure all their lives That givs them respect for universal life, that respect the valor and eminent dignity of play "[1]

پال ہازوڈ کا کہنا ہے کہ بچوں کے لیے وہ کتابیں اچھی کتابیں ہیں جو بچوں کی روحوں میں ایسے جذبات اور تاثرات پیدا کر سکیں۔ جو ان کی زندگی میں مستقل تاثرات چھوڑ جائیں، جو ان کے کھیلوں اور مہماتی کارناموں میں بچوں کی ہمت افزائی کر سکیں۔ پال ہازوڈ آگے کہتا ہے۔

"That Children's books contain a profound morality that they set in certain traits worthy of lasting fore ever, that maintain in their own behalf faith in truth and justice To write for children in this way demands a great deal from the writer, a sense of the importance of universal moral and spiritual values creating and imaginating powers and strength of expression of language [2]

1, Paul Hazar "Books Children & Men" Page 427

2, —Do—

بچوں کی کتابوں میں سنجیدہ اور اخلاقی باتیں ہوتی ہیں جو بچوں میں سچائی اور انصاف کا جذبہ جگاتی ہیں۔ بچے کے لیے کتابیں لکھنا بہت نازک کام ہے۔ بچوں کے ادب اور بچوں کی کتب کے بارے میں عموماً زبان اور اسلوب، اور بچوں کی مختلف عمروں کے اعتبار سے کتابوں کا تعین اور تقسیم کی جاتی ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ بڑوں کے موضوعات کو آسان زبان میں پیش کر کے بچوں کے لیے کتاب تیار کر دی گئی ہے۔ بالفاظِ دیگر بچے اور بالغ کے ادب میں بہت کم امتیاز رکھا گیا ہے۔ جو نظمیں، کہانیاں، مضامین اور قصے ہم لوگ بچپن سے پڑھتے آئے ہیں ان میں سے بیشتر سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد پڑھنے کو ملتے ہیں۔ بچوں کے ادب میں دراصل وہ تمام مضامین، منظومات اور کتب شامل ہیں۔ جو:۔

الف :۔ خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں اور ـــــ

ب :۔ جن کو موضوع زبان اور آسان اسلوب کے اعتبار سے بچوں کے اسکولی نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔

بچوں کا ادب اور درسی کتب :۔

اگرچہ درسی کتب یا نصابی کتب کا تعلق ادب سے براہ راست نہیں ہے، ان میں موضوعات اور بچوں کی عمر کے مختلف مدارج کی پابندی کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بچوں کی دلچسپی اور نفسیات کا درسی کتب میں عام طور پر لحاظ نہیں کیا جاتا۔ دراصل بچوں کا ادب درسی کتب سے آزادانہ حیثیت رکھتا ہے۔ ماہر بننا بے بنیاد ہے، کیونکہ صرف بچوں کے قریب ہونے اور بچوں کو تعلیم دینے سے ہی بچوں کے ادب میں مداخلت کرنے کا حق نہیں مل جاتا۔

ہر چند کہ "بچوں کے ادب" کا اسکول کی درسی کتب سے تعلق نہیں ہے لیکن درسی کتب کا، بچوں کے ادب سے براہِ راست تعلق ضرور ہے۔ درسی کتب اور بچوں کے ادب میں بہت بڑا فرق ہے اور یہ فرق ہے دونوں قسم کی کتب کے موضوعات، زبان اور اسلوب

نگارش کے امتیازات۔ اسکول کی کتب جہاں بچوں کو ایک ایک سیڑھی چڑھنا سکھاتی ہیں۔ ان کو انگلی پکڑ کر ایک خاص منزل تک لے جاتی ہیں وہاں بچوں کا ادب۔ علم کا لامحدود خزانہ بچوں کے لیے پیش کرتا ہے اس میں بچوں کی نفسیات اور ضروریات کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ بچے اس میں سے اپنی ضرورتِ خواہش اور ذہنی بساط کے مطابق اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ ہری کرشن دیوسرے نے اسکولی کتب اور بچوں کے ادب کے فرق کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

"एक मनोवैज्ञानिक पहलू है जो बाल साहित्य और स्कूली साहित्य में मौलिक भेद करता है, वह है दोनो प्रकार की पुस्तकों के वर्ण्य-विषय, भाषा तथा शैली। स्कूली पुस्तकों का साहित्य जहां बच्चों को एक-एक सीढ़ी चढ़ना सिखाता है, उनकी उंगली पकड़कर आगे ले चलता है वहीं बाल-साहित्य ज्ञान के असीम भण्डार को बच्चों के सामने प्रस्तुत करता है। बच्चे उसमें से अपनी इच्छानुसार अपनी जिज्ञासाओं तथा ज्ञान की तुष्टी के लिये ग्रहण कर लेते है। [1]

بچوں کے ادب کی اپنی الگ اہمیت ہے۔ اسے پڑھنے والے بچے بھی بڑوں کی طرح پسند اور ناپسند کرنے کی آزادی رکھتے ہیں۔ بچوں کے ادب کے لیے نہ تو عمر ہی کی کوئی قید ہے اور نہ ہی علم کی کوئی قید ہے۔ آج دنیا کے ہر ملک میں بچوں کے ادب کی اہمیت دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ بیسویں صدی تو بچوں کے ادب کا سنہرا دور ہے جس میں بچوں کی کتابوں کو باضابطہ طور پر ادبی حیثیت حاصل ہوئی۔ بیسویں صدی میں عالمی پیمانے پر یہ مان لیا گیا ہے کہ بچوں کی ایک الگ اور آزاد دنیا ہے۔ ان کی اپنی ایک شخصیت ہے وہ محض بڑوں کی ایک اکائی یا مثنیٰ نہیں ہیں۔

بچوں کے ادب پر مزید گفتگو کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ہم دیکھ لیں کہ ادب کیسے

---

1 डा० देवसरे हरि कृष्ण, "हिन्दी बाल साहित्य - एक अध्ययन आत्माराम एण्ड सन्स, दिल्ली [1969] पेज 3

کہتے ہیں؟ اور ادب کا زندگی سے کیا تعلق ہے نیز ادب کے کیا مقاصد ہیں۔؟

ادب اور اس کا مقصد:۔

ادب کو اظہار و بیان کا سب سے اعلیٰ ذریعہ تسلیم کیا گیا ہے یعنی جتنے بھی عمدہ اور پُر اثر انداز میں ہم اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں اس اظہار کا نام 'ادب' ہے۔ ادب اپنے زمانے کا عکس ہوتا ہے جو جذبات اور خیالات لوگوں کے دلوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں وہی زندگی پر اپنا عکس ڈالتے ہیں۔ ادب ــــ ایک فنکار کے روحانی توازن کی ظاہری شکل ہے اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے۔

ادب کو زندگی کا آئینہ اور سماج کا عکس تسلیم کیا جاتا ہے جس سماج اور قوم کا کوئی ادب نہیں وہ قوم مردہ تصوّر کی جاتی ہے۔ کسی قوم کے مذہبی خیالات، سماجی اور اخلاقی تنظیم اس کے تاریخی واقعات اور سیاسی حالات کا صحیح آئینہ۔ اس کا ادب ہے۔ ادب اور سماج میں گہرا تعلق ہے دونوں ہی ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ ادب ــــ سماج کو متاثر کرتا ہے، سماج کو بناتا ہے، مذہب حکومت، سیاست کو متاثر کرتا ہے۔ انسان کی شخصیت کی تعمیر میں معاون ہوتا ہے، اس میں قوت اور حرکت پیدا کرتا ہے، حقیقت سے آگاہ کرتا ہے، انسان میں عزم محکم اور مشکلات کو عبور کرنے کے لیے سچّا استقلال پیدا کرتا ہے۔

ادب کا سب سے بڑا مقصد قوم میں انسانیت، آزادی کا جذبہ، خود اعتمادی، بیداری اور اتحاد پیدا کرنا ہے۔ ادب ظلم کی مخالفت کرتا ہے۔ جہالت غفلت اور خود پرستی کو دور کرتا ہے توہم پرستی کو دور کر کے انسانوں میں قوت عمل پیدا کرتا ہے۔ ادب کا کام ماضی کو پیش کر کے، حال کو درس دینا اور مستقبل کا عکس دکھانا ہے۔

اطہر پرویز نے ادب کی خوبی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ادب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے بہترین خیالات کو بہترین لفظوں میں، بہترین ترتیب کے ساتھ محفوظ کر لیتا ہے۔ اس میں سچ پوچھیے تو اپنے زمانے کے نہ صرف بہترین خیالات، الفاظ اور ترتیب کے ہے بلکہ اس میں اپنے زمانے کی سچّی روح ہوتی ہے"[۱]

---

[۱] اطہر پرویز: ادب کسے کہتے ہیں۔ ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء ص ۱۲،۱۳

ادب اور اس کے مقصد کے بعد ایک اور سوال اٹھتا ہے کیا بچے اور بالغ کا ادب ایک ہے یا بچے اور بالغ کے ادب میں کیا نمایاں فرق ہے۔؟

بچوں اور بالغ کے ادب میں فرق:۔

'بچہ' اور 'بالغ' دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ بچہ عمر کے ۱۳/۱۴ سال تک بڑی تیزی سے نشو و نما کے مختلف مدارج طے کرتا ہے بڑی بڑی تبدیلیوں اور ترقیوں کی منزلوں سے گزرتا ہے ہر لحظہ اس کی زندگی میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور آہستہ آہستہ سنِ بلوغ تک پہنچنے پر ان تبدیلیوں کی رفتار سست ہوتی جاتی ہے اس کا ذہن پختہ ہو جاتا ہے اور ایک طرح سے اس کے جسم کی تعمیر مکمل ہو جاتی ہے۔ اس بات کے پیشِ نظر بچوں کا ادب ذہنی، لسانی اور عمر کے اعتبار سے بڑوں کے ادب سے مختلف ہونا چاہیے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مستقبل میں جس ادب سے بچّے کو سابقہ پڑے گا اس کا عکس یا اس کی کڑی ادبِ اطفال سے ضرور ملنی چاہیے۔ بچوں کے ادب میں اسلوب نگارش کا امتیاز رکھنا ضروری ہے۔ طرزِ بیان کا انتخاب موضوع کی مناسبت سے ہونا چاہیے۔ جس طرح بالغوں کا ادب زندگی سے عبارت ہے اسی طرح بچوں کا ادب بھی روزمرّہ زندگی سے قریب تر ہونا چاہیے۔ بچوں کے ادب اور بڑوں کے ادب میں فرق اتنا ہے کہ بچوں کے ادب میں تصوّراتی مواد اور تخیلی موضوعات زیادہ اہم ہیں کیونکہ بچے کی قوّتِ متخیلہ کی نشو و نما بچپن ہی میں ہوتی ہے۔

بچّے میں ادبی شعور کب پیدا ہوتا ہے:۔

'زبان' اور 'ادب' دونوں میں بڑا فرق ہے۔ کسی زبان کا بولنا یا جاننا اور بات ہے اور ادب ایک الگ چیز ہے۔ بچہ ماں کی گود میں پرورش پاتا ہے۔ اس بے زبان سے 'ماں' تنہائی میں مخاطب ہو کر باتیں کرتی ہے۔ وہ اغوں اغوں کرتا رہتا ہے۔ بچّے کے بہن بھائی، اقربا اور والدین بچے سے باتیں کرتے ہیں جبکہ بچہ اس گفتگو کو سمجھتا تک نہیں۔ البتہ جو الفاظ "بچّے" کے کان سے بار بار ٹکراتے ہیں ان کو وہ دوہرانے کی سعی کرتا ہے، اس کوشش میں سب سے پہلے وہ ایسے الفاظ بولتا ہے جن سے صرف ہونٹوں کا تعلق ہوتا ہے، کیونکہ ایسے الفاظ وہ بآسانی ادا کر لیتا ہے۔ بچہ 'پانی' کو پانی نہیں 'مم' کہتا ہے۔ ماں باپ دونوں ہی بچّے کے پاس

رہتے ہیں، دونوں اس سے محبت کرتے ہیں، مگر بچہ سب سے پہلے 'ماں' کہتا ہے یعنی پہلے وہ ایسے الفاظ اور حروف ادا کرتا ہے جن کا تعلق تالو سے نہیں ہوتا۔ پھر بچہ آہستہ آہستہ مصوتوں سے مصمتوں (CONSONENTS) کی طرف آتا ہے۔

ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین نے "بچوں کا ادب" ایک [illegible] تحریر کیا ہے۔

"چھ سال کی عمر تک وہ صاف تلفظ کے ساتھ زبان بولنے لگتا ہے۔ چھ برس کی عمر سے بچوں کو اپنی مادری زبان پر عبور حاصل ہونے لگتا ہے۔ اس کے بعد اسی منزل پر بچے میں ادبی شعور جاگتا ہے۔ اس کے بعد فرہنگ، اظہارِ بیان، اصطلاحات علمیہ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ چیزیں ادبی نشو ونما میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ صوتیات اور جملے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اس عمر میں بچے کو وزن اور عروض کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس لیے وہ منظوم ادب میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی آسان نظمیں گاتا اور گنگناتا ہے۔ چونکہ منظوم ادب پرکشش بھی ہوتا ہے اور دلچسپ بھی۔ بچے میں تک بندی کا شوق بھی اجاگر ہو جاتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچے تک بندی خوب کرتے ہیں۔ جبکہ انھیں اوزان کا قطعی احساس نہیں ہوتا۔ بچے کی ذہنی صلاحیت اس عمر میں ہی واضح ہوتی ہے، اس کی قوتِ متخیلہ میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے، اس کا ذہن تیزی سے خیالی دنیا میں پرواز کرتا ہے۔ اسی سبب نظم کے بعد بچہ اگر کسی چیز میں دلچسپی لیتا ہے تو وہ خیالی کہانیاں ہیں۔"[1]

رفتہ رفتہ بچہ جب ۱۰-۱۲ سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس میں بتدریج سماجی احساس پیدا ہوتا ہے وہ دنیائے حقیقی دنیا میں آنا پسند کرتا ہے۔ دنیا سے اس کو گہری وابستگی ہو جاتی ہے۔ بچے کو ایسے کردار پسند آتے ہیں جو گھریلو اور روزمرّہ زندگی کے زیادہ قریب ہوں یا جن تک اس کے تخیل کی رسائی بآسانی ہو جائے۔ نانی، دادی، ابا، بھائی، بہن وغیرہ کے کردار، بچے کی زندگی کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اس لیے بچہ ایسے کرداروں میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتا ہے وہ

---

[1] پروفیسر مسعود حسین "بچوں کا ادب" بموقعہ سیمینار لٹریچر میں بچوں کا ادب، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، ۲۵ فروری ۱۹۷۶ء ص ۲ (قلمی مضمون مملوکہ عبداللہ ولی بخش قادری)

اپنے بڑوں کی نقل اتارتا ہے اور ان کے حرکات و سکنات کو ڈرامائی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اسی منزل پر بچے میں احساسِ مزاح پیدا ہونے لگتا ہے۔ چونکہ بچہ عمر کا یہ حصّہ اپنے گھریلو ماحول میں خصوصاً اپنی ماں کے پاس گزارتا ہے۔ اس لیے اس کی مادری زبان ذہنی نشوونما میں بہت معاون ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین کے خیال میں بچے کی ادبی حس کی نشوونما مادری زبان میں ہونا چاہیے کسی دوسری زبان میں نہیں۔

۱۳ ر ۱۴ برس تک کی عمر میں بچے میں ادبی شعور آجاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بچوں کا ادب کیسا اور کیسا ہونا چاہیے؟ بچوں سے متعلق جو کتب آج ہمارے سامنے ہیں ان کی تین قسمیں ہیں ادبی، معلوماتی اور مشقی۔ ثانوی منزل پر ادب میں نمایاں تبدیلی جنس موضوع اور عمر کے فرق کے ساتھ آتی ہے، عمر کے مختلف مدارج کے اعتبار سے بچوں کے ادب کے بھی مختلف مدارج اور مقیادات ہیں۔

۷۔۸ برس تک کے بچّوں کا ادب :۔

۷/۸ برس تک کے بچّوں کے لیے ایسی کتابیں ہونی چاہئیں جو زبان، کے اعتبار سے آسان ہوں ان میں تصاویر پرکشش، واضح اور دیدہ زیب ہوں۔ بچے تصاویر میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ موضوعات نفسیاتی ہوں۔ اس عمر میں بچے کے ذہن میں کیوں؟ کب؟ کیا؟ اور کیسے جیسے سوالات ابھرتے ہیں۔ بچہ متجسس رہتا ہے۔ تخیلی کہانیاں اس کے لیے زیادہ پرتاثیر ہوتی ہیں۔ مگر ان تخیلی کہانیوں کا تعلق کسی نہ کسی شکل میں روزمرّہ زندگی سے ضرور ہونا چاہیے۔ اس عمر میں بچّے دادی، دادا، یا نانا نانی سے کہانیاں سننا پسند کرتے ہیں اکثر وہ کہانی سنے بغیر سو نہیں سکتے۔ اس عمر میں بچّے کو زیادہ تر روایتی کہانیاں سنائی جاتی رہی ہیں۔ جو بچّے کے بزرگوں نے خود اپنے بزرگوں سے بچپن میں سنی تھیں۔ اس عمر میں بچّے کو لوک گیت اور چھوٹی بحر کی نظمیں زیادہ پسند آتی ہیں خاص طور پر ایسی نظمیں جن میں موسیقیت اور غنائیت ہوتی ہے۔

۹ سے ۱۱ برس تک کے بچّوں کا ادب :۔

اس عمر کے بچوں کا ادب پہلی منزل سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ پہلی منزل میں تخیلی کہانیوں اور تصاویر پر مشتمل کہانیوں کی بہت اہمیت ہے اب بچّے کو تخیل سے زیادہ فطرت میں دلچسپی

ہونے لگتی ہے۔ جن کہانیوں کا تعلق زندگی اور روزمرّہ کے تجربات و حادثات سے ہوتا ہے بچہ ان میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اس عمر میں بچے کی نشو و نما فطرتاً بہت تیزی سے ہوتی ہے۔ وہ اشخاص میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ لوگ کیسے رہتے ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ کیا کہتے ہیں؟ کیا کھاتے ہیں؟ ان کے آداب و اطوار، کردار، اور افعال میں بچہ بہت دلچسپی لیتا ہے۔ اکثر بڑوں کی نقل بعینہٖ اتار لیتا ہے، اس منزل پر بچے کے ادب میں منجملہ اصناف کے ڈرامے کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس منزل پر بچے میں رومانی اور جمالیاتی عنصر بھی کارفرما ہوتا ہے۔ بچّوں کو حقیقت سے روشناس کرانے کے لیے قدرے مبالغے اور رنگ آمیزی سے کام لینا عیب نہیں ہے۔ اس دور میں بچوں کو اجنبی مقامات، بزرگوں، پرانے زمانے کے لوگوں سے واقفیت اور حال کی روشنی میں ماضی سے روشناس کرایا جاسکتا ہے جس سے بچہ اپنے ذہن میں مستقبل کا ایک خاکہ ترتیب دینے لگتا ہے۔

۱۲ سے ۱۴ برس تک کے بچّوں کا ادب:-

اس عمر کے بچّوں کا ادب پہلی اور دوسری منزل کے ادب سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ اگرچہ ان دونوں منازل کے ادب سے اس کا پوری طرح واسطہ اور رابطہ ہوتا ہے۔ اس منزل پر بچہ پوری طرح ہوشمند ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا سماج، ماحول، خاندان اور اپنے قرب و جوار سے پوری طرح واقف ہو جاتا ہے۔ اس کو اچھے برے کی تمیز آ جاتی ہے۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ تخیّل میں رفعت، تجربات میں وسعت اور اعتماد میں پختگی آ جاتی ہے۔ اب بچہ آزادی اور خود مختاری کو پسند کرتا ہے اپنی پسند اور ناپسند پر اس کو اصرار ہوتا ہے جو کچھ بھی اس کو اپنے ماحول تعلیم اور ادب سے ملتا ہے اس سے وہ پوری طرح متاثر ہوتا ہے۔ دراصل اس عمر میں بچے کی شخصیت مزاج، عادت و اطوار اور کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس عمر کے بچوں کے ادب میں مشاہیر کے کارنامے، تاریخی ناول، جوشیلی نظمیں، اخلاقی و ادبی موضوعات پر مشتمل کتب اور مضامین کو شامل کرنا چاہیے۔

۱۴ سال کی عمر تک بچے کی شخصیت اور اس کے کردار کی نشو و نما میں اس ادب کا پورا ہاتھ رہتا ہے، جو بچہ پڑھتا ہے عام طور پر ایسی نظموں اور قصے کہانیوں یا مضامین کو لوگ زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ جن میں پند و نصیحت ہو۔ عموماً خیال یہ ہے کہ وہ اخلاقی قدریں جو کسی قوم، فرقے، یا طبقے میں رائج اور داخل ہوتی ہیں، ان کو اس طرح پیش کیا جائے کہ بچے

انھیں درس کی طرح پڑھیں۔ ان سے فائدہ اٹھائیں۔ ایسے مضامین یا نظمیں اچھی ضرور ہوتی ہیں لیکن براہِ راست بچوں کے لیے ناصحانہ انداز اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس خشک پیرایے سے بچے پر زیادہ اثر نہیں ہوگا اور وہ ایسے مضامین یا منظومات کو ناپسند کرنے لگے گا، چنانچہ لازمی ہے کہ مقصد کو ایسے ادبی پیرایے میں لپیٹ کر پیش کیا جائے جیسے کڑوی دواؤں پر شکر کا غلاف چڑھا دیا جاتا ہے۔

بچوں کے ادب کی خصوصیات:۔

(۱) بچوں کی ادب کی سب سے بڑی خوبی حیرت اور استعجاب ہے جو کہ بچے کے ذہن میں کیا، کیوں، کیسے .... جیسے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہ ہر چیز کو حیرت واستعجاب سے دیکھتا ہے۔ نیز اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تجسس بچے کی فطرت میں شامل ہے۔ اس لیے ادبِ اطفال میں بچوں کی فطرت کے مطابق موضوع اور طرزِ تحریر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ بقول عابد سہیل :۔

"وہ لوریاں ہوں یا کہانیاں، نظمیں ہوں یا گیت، معلوماتی کتابیں ہوں یا چٹکلے، یہ حیرت واستعجاب ان میں کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود رہتا ہے۔ کہیں یہ جانوروں کی شکل اختیار کرتا ہے کہیں دیو اور بھوت کی، کہیں جنوں کی، کہیں پریوں، کی، کہیں بادشاہ کے بے پناہ خوبصورت دربار کی، جہاں بادشاہ کی تالی بجاتے ہی، جو چیز وہ چاہتا ہے حاضر ہو جاتی ہے۔ کہیں 'پنچ تنتر' کی کہانی 'چالاک خرگوش' کی جس میں وہ ایک خونخوار شیر کو غصہ دلا کر اسے کنویں میں چھلانگ لگانے پر مجبور کر دیتا ہے، سچ پوچھیے تو بچوں کے ادب میں حیرت کا عنصر ہی بچوں کو اس سے جوڑتا ہے۔" [۱]

(۲) بچوں کے ادب کی بنیاد علم اور اخلاق پر ہو اور اس کے مقاصد اچھی تعلیم اور تربیت پر

---

[۱] عابد سہیل: "اردو میں بچوں کا ادب" ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء ص ۹۳ (مدیر) خورشید احمد صدیقی۔

مبنی ہوں۔ جو بچوں کے ادب میں بچوں کی فطری صلاحیتوں کو ابھار سکیں۔ اس لیے براہِ راست ناصحانہ انداز مناسب نہیں سمجھا جاتا۔

(۳) بچوں کی قوت متخیلہ بڑی زبردست ہوتی ہے خصوصاً عمر کی پہلی اور دوسری منزل میں یہ ان خوشیوں کا موجب ہوتی ہے۔ اس لیے ایسی منظومات یا مضامین جو بچوں کی اس قوت (قوتِ متخیلہ) کے اظہار کا موقعہ دے سکیں، کامیاب تصور کیے جاتے ہیں۔

۴۔ شفیع الدین نیر کہتے ہیں ا۔

"بچوں کے لیے ایسے عنوانات پر مشتمل نظمیں، کہانیاں یا مضامین مناسب ہوتے ہیں جن میں صحت، صفائی، تفریح، ورزش اور محنت و مشقت کی طرف انھیں توجہ دلائی جائے۔ مختلف کھیلوں کا تذکرہ بھی ہونا چاہیے۔" [1]

۵۔ بچوں کے ادب کی زبان نہایت آسان ہونی چاہیے۔ بچے کی اپنی زبان میں، بچے کی روزمرہ زندگی میں مستعمل الفاظ ہوں۔ عمر کے مختلف منازل کی مناسبت سے زبان، سہل اور دشوار ہو۔ طرزِ ادا اور اسلوب بیان ایسا ہو کہ بچے بخوشی ان مضامین کو پڑھیں ان میں دل چسپی لیں۔ ان کو پڑھ کر مسرت محسوس کریں۔ کہانیوں میں مختلف دلچسپ واقعات اور ذہنی واقعات کی شمولیت سے بچوں کی دلچسپی کو بڑھایا جاسکتا ہے۔

۶۔ انسان اور خصوصاً بچوں کی سیرت میں مذہبی عقائد بہت اہمیت رکھتے ہیں، اس لیے ان کے عقائد کے اعتبار سے خدا کے وجود اور اس کے جمال و جلال اور دوسری صفات کا نقش بچپن ہی میں بچوں کے ذہن پر مرتسم کرنا بھی ادب اطفال کا فریضہ ہے جس کے تحت اس کے کردار میں بنیادی خوبیاں خود بخود پیدا ہو جائیں گی۔

۷۔ بچوں کے لیے جو کہانیاں، قصے یا نظمیں لکھی جائیں ان میں کسی حد تک مبالغہ آرائی و رنگ آمیزی سے اس کی دلچسپی کو دوبالا کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح بچے کے ذہن اور تخیل کی پرواز بلند سے بلند تر ہو سکتی ہے۔

۸۔ بچوں کے ادب میں حب الوطنی، باہمی اتحاد اور قومی یکجہتی کا عکس پایا جانا بھی اس کی ایک بڑی خوبی ہے۔ اخلاقی مضامین اس طرح کے ہوں کہ شروع ہی سے اپنے اقربا، اعزا،

دوست، شناسا، ہمسائے اور ہم وطنوں سے وابستہ رہے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے دوسرے لوگوں کی عافیت اور جائز آزادیٔ خیال وعمل سے تصادم کا خطرہ لاحق ہو، بچوں میں باہمی نفرت عداوت، تعصب اور تنگ دلی کو دور کرنا بھی اچھے ادب کا فرض ہے۔ ایسے خیالات کو موضوع بنانا چاہیے جو بچوں کے ذہن میں انسانی وحدت اور محبت کی فضا قائم کرنے میں معاون ثابت ہوں۔

۹۔ "ادب اطفال" بچے کے ذہن کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرے اور اس کے مطالعے سے بچے کو بھی خوشی اور ذہنی تسکین ہو۔

۱۰۔ بچوں کے ادب کی ایک اور نمایاں خوبی 'تنوّع' ہے۔ بچّہ ایک ہی نوع کی چیز ایک ہی انداز میں بار بار پڑھنا پسند نہیں کرتا لہٰذا بچوں کے ادب میں موضوعات کی رنگا رنگی ہونا چاہیے ان موضوعات کی پیشکش نئے نئے اسالیب اور انوکھی ٹکنیک سے ہونا چاہیے۔

بچّوں کے ادب کے موضوعات:۔

بچوں کے ادب کی متذکرہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ بچے کس قسم کی کتابیں پسند کرتے ہیں۔ عمر کے مختلف مدارج کے اعتبار سے جو چیزیں ان کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ بچّہ اس منزل پر ان کو پسند بھی کرتا ہے یا نہیں؟ بچّوں کی دلچسپی اور ضروریات کے پیشِ نظر ادبِ اطفال کے موضوعات کیا ہونا چاہئیں۔

یہ ایک اہم اور مشکل سوال ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ بچّوں کو جو کچھ مل جائے اس کو پڑھ لیتے ہیں۔ اپنی پسندیدہ کتابوں میں وہ کیا چاہتے ہیں، یہ وہ خود تو نہیں بتا سکتے، لیکن ان کا نہ ختم ہونے والا تجسس، ان کی کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی جبلّت، اپنے ماحول اور قرب وجوار کے متعلق جاننے کی خواہش اور انجان چیزوں کے بارے میں اس کے تصوّرات، ان باتوں کا تجزیہ کرتے ہیں کہ بچے کی پسند اور ناپسند کیا ہے؟ اپنے تجسس اور خواہش کو بچہ کتاب ہی سے پورا کرتا ہے۔ بچّہ زیادہ تر ایسی ہی کہانیوں کے پڑھنے میں دلچسپی لیتا ہے۔ جن میں مافوق الفطرت واقعات اور کردار ہوں جیسے جن، پری، دیو وغیرہ وہ ایسی کہانیوں کا دلدادہ ہوتا ہے۔ جن میں جنگل اور پہاڑوں کا تذکرہ ہو، ایسے بہادروں اور سچے انسانوں کا ذکر ہو

جو مصائب اور پریشانیوں کو بہادری سے برداشت کرتے ہوں، ہولناک اور خونخوار جانوروں کا مقابلہ کر کے ان کو شکست دیتے ہوں، مہمات سر کرتے ہوں اور انسانوں کو برائی اور ظلم سے نجات دلاتے ہوں۔

بچے کی زندگی کا بیشتر تجربہ اس کے گھر، پڑوس اور اسکول کے ماحول تک محدود ہوتا ہے یہی ماحول اس کے نظریات اور خیالات کی تعمیر پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ادب اطفال کے وسیلے سے اس ماحول سے باہر کی دنیا کے متعلق معلومات حاصل کرتا ہے۔ بچہ کیا پڑھنا زیادہ پسند کرتا ہے؟ کن موضوعات کو پسند کرتا ہے؟ دراصل اس بات کا انحصار کسی حد تک بڑوں پر ہے وہ بچے کی عادات، اطوار، اس کی ذاتی دلچسپی، اس کی صلاحیت، نفسیات اور ضروریات سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں، اگر بچے کی نفسیات، صلاحیت اور اس کے ماحول کے پیشِ نظر ان کو مناسب کتابیں پڑھنے کو دی جائیں گی تو بچہ دلچسپی سے ان کا مطالعہ کرے گا۔ لیکن اگر بڑوں کو ہی بچوں کی نفسیات اور ادب سے متعلق صحیح واقفیت نہیں ہے، ان کی دلچسپیوں کا صحیح اندازہ نہیں ہے تو وہ غیر مناسب انتخاب کے ذریعے بچے کے شوق اور کتاب سے اس کی دلچسپی کو ختم کر دیں گے اور پھر آہستہ آہستہ بچے کا یہ شوق ماند پڑ جائے گا۔ اس طرح بچوں کو کتابیں فراہم کرتے وقت ان کی نفسیات، ان کے ماحول، اور ان کی داخلی صلاحیتوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

بچوں کی پسند کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی پسند عجیب ہوتی ہے، ان کو سب ہی کتابیں پسند نہیں آتیں۔ چند اچھی کتابوں میں سے بھی بہت کم ایسی کتب ہوتی ہیں جن کو بچے پسند کرتے ہیں۔ مشیر فاطمہ ڈاکٹر ڈیلامیر کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

> "بہترین اور اچھی چیزوں میں سے بہت کم یاب چیزیں بچے پسند کرتے ہیں۔ بچوں کو ایسی کتب زیادہ پسند آتی ہیں جن میں سچائی، دیانت داری، ایثار، قربانی، حق کی فتح، اور بصیرت ہوتی ہے۔" [۱]

یہ چیزیں بچوں کی نشو و نما میں، ان کی شخصیت کی تعمیر میں بڑا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ ادب اطفال کی خصوصیت میں تخیل اور تجسس پر کافی زور دیا گیا ہے۔ اگر کسی کتاب سے بچوں کے تخیل میں وسعت پیدا نہ ہو، کتاب بچوں کے ذہن کو آگے نہ بڑھا سکے۔ اس کے پڑھنے سے

---

[۱] مشیر فاطمہ، بچوں کے ادب کی خصوصیات، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء ص ۷۷

نہ پڑھنا نہ صرف وقت ضائع ہوگا بلکہ بچے کی ذہنی نشوونما میں ایک قسم کی رکاوٹ آجائے گی اس لیے جو کتاب بچوں کی نشوونما میں معاون ہو، اس کو بے تامل بچوں کے ادب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

بچوں کے ادب میں ایسی کہانیوں کی بہت اہمیت رہی ہے، جن میں مافوق الفطرت واقعات اور کردار پیش کیے گئے ہوں ایسی کہانیوں کے وسیلے سے بچے بادشاہوں کے دربار، شہزادوں کی صحبت، اور چاند تاروں کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ پریوں کی کہانیوں سے بچے کی قوتِ متخیلہ کی نشوونما ہوتی ہے اور اسے جلا ملتی رہتی ہے۔ اصل بادشاہوں، صوفیوں اور قومی رہنماؤں کی کہانیاں، قصے، واقعات اور حادثات وغیرہ بچے کی تاریخی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ بزرگانِ دین کی زندگی کے واقعات اور کردار بچے کی سیرت پر مثبت اثر ڈالتے ہیں۔ آج کا دور سائنس کا دور ہے۔ نئے نئے انکشافات پر مبنی کہانیاں بچوں کی ذہنی نشوونما میں معاون ہوتی ہیں اور معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کرتی ہیں۔

بعض لوگوں نے بڑوں کے موضوعات کو آسان زبان میں لکھ کر بچوں کے لیے پیش کیا ہے۔ جو مناسب نہیں۔ بچے خود ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر قوم کا ادب دوسری قوم کے ادب سے مختلف ہوتا ہے۔ یہی بچے بڑے ہو کر بالغوں کی قوم میں شامل ہو جاتے ہیں۔ بڑوں کے تجربات بچوں سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ دونوں کے مسائل میں بڑا فرق ہے۔ بچوں کے لیے تو چھوٹے چھوٹے مسائل بھی بہت اہم ہیں۔ بچے سچ اور جھوٹ، اچھے اور برے، خوشی غم، انصاف اور ناانصافی، ایمانداری اور بے ایمانی کے خیالی فرق کو تو سمجھ لیتے ہیں لیکن کیا وہ اس کے عملی پہلو کو بھی سمجھ پاتے ہیں؟ بچے کا ذہن اتنا پختہ نہیں ہوتا کہ بڑوں کی طرح ان تمام باتوں کے عملی پہلوؤں کو سمجھ سکے۔ جو بڑوں کے لیے اہم ہیں۔

بچوں کو اچھی کتابوں میں یہ باتیں بڑے واضح اور سیدھے سادے طریقے سے بتائی جاتی ہیں۔ یہ تمام خوبیاں اچھے مصنفین کی تحریروں میں مضمر ہوتی ہیں۔ ایسی کتابوں سے ہی بچے کو یہ پتا چلتا ہے کہ سچی اور بے غرض محبت کا صلہ آخر کار اچھا ہوتا ہے۔ بچوں کی اچھی کتاب میں زندگی کے حقائق ہوتے ہیں۔ یہ کتاب محض نصیحت کی خاطر نہیں لکھی جاتی بلکہ ان حقائق کے ذریعہ بچے کو آگے بڑھاتی ہیں۔

یہ امر مسلّم ہے کہ بچپن میں ہی انسان کی شخصیت کی تعمیر ہو جاتی ہے یہ ان کی زندگی کے بننے اور سنورنے کا زمانہ ہوتا ہے جو واقعات، حادثات، اسی زمانے میں بچے کے

ذہن پہ نقش ہو جاتے ہیں ان کی یاد تازیست قائم رہتی ہے۔ مستقبل کے ذوق و شوق اور طبعی رجحان کی تعمیر اسی منزل پر ہوتی ہے۔ لیکن ہم لوگ بچوں کے اس قیمتی دور کی اہمیت کو نظر انداز کر کے اس کی نفسیات اور فطرت کے مطابق تربیت پر زیادہ توجہ نہیں دیتے، جن بچوں کو اچھی کتب پڑھنے کی عادت ہو جاتی ہے وہ بڑے ہو کر اچھے ادیب، شاعر اور فنکار بن سکتے ہیں اور خود اچھا ادب اور اچھا فن تخلیق کر سکتے ہیں، اپنی زندگی کا کوئی صحت مند مقصد اور نصب العین متعین کر سکتے ہیں اور اسی طرح اپنی زندگی کو سنوارنے کے ساتھ معاشرے کو بھی بہتر بنا سکتے ہیں۔

اردو کے بیشتر ادیبوں اور شاعروں نے بچوں کے لیے لکھا ہے لیکن ابھی تک بچوں کے لیے معیاری ادب بہت کم تخلیق ہوا ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ادب اطفال کا کوئی معیار مقرر نہیں ہو سکا۔ ہمارے یہاں زیادہ تر ادیبوں نے منتخب موضوعات پر لکھا ہے یا پھر زبان اور بیان کے اعتبار سے بڑوں کے ادب سے انتخابات تیار کر لیے گئے ہیں۔ بچوں کے ادب کی تخلیق کو اعلیٰ درجے کا فن نہیں سمجھا گیا۔ محض ناصحانہ اور سبق آموز مضامین کو بچوں کے ادب میں کیونکر شامل کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کے لیے تو ایسی تخلیقات پیش کرنی چاہییں جن کے ذریعے اس کی ذہنی اور جسمانی نشو و نما میں مدد مل سکے اور بچوں میں اعلیٰ انسانی قدروں کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ بچہ خود جو سمجھے اور کہنا چاہے اس کا اچھے پیرایہ میں اظہار کر سکے۔

بچوں کے ادب میں تنقید:۔

کسی کتاب یا ادب کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے میں نقّاد کے مزاج اور اس کی پسند و ناپسند کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ مختلف لوگوں کے نظریات بھی مختلف ہوتے ہیں وہ اپنے نظریات اور ذہنی تحفظات کے پیشِ نظر ہی کسی تخلیق پر تنقید کرتے ہیں ادب کی کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو کئی ناقدین کے ہاتھوں سے گزرتی ہے۔ سب سے پہلا ناقد خود اس تخلیق کا مصنف ہوتا ہے، موضوع کا انتخاب وہ پہلے ہی کر چکا ہے، اسلوب نگارش کا اس کو علم ہے، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اپنے مقصد یا موضوع کے اظہار بیان میں وہ کہاں تک کامیاب ہے۔ اس کے بعد مصنف اس کتاب کی ظاہری شکل، اس کے گیٹ اپ، طباعت اور کاغذ سے متاثر ہوتا ہے، جتنی دیدہ زیبی اور خوش سلیقگی سے وہ کتاب شائع ہوتی ہے اتنا ہی اس

کا مصنف زیادہ خوش ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ جاننے کا متمنی ہوتا ہے کہ اس کے ساتھیوں، ہمعصر ادیبوں اور ہم عصر ناقدین کا اس تخلیق کے بارے میں کیا خیال ہے۔

کسی کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں بحیثیت ناشر تجارتی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ کتاب عوام یا خواص میں کتنی مقبول ہوگی، اسے اس کی اشاعت سے کتنا مالی فائدہ ہوگا۔ ناقد اس کتاب میں دیکھے گا کہ کن لوگوں کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اس کا ادبی معیار کیا ہے؟ مصنف نے کس موضوع کا انتخاب کیا ہے؟ اس موضوع کی کیا اہمیت ہے۔ وہ اپنی طرزِ نگارش سے کسی حد تک اپنے مقصد کی وضاحت کر سکا ہے؟

عام طور پر بچوں کے لیے جو کتب، مضامین اور منظومات شائع ہوتی ہیں ان کے پس پشت مالی منفعت حاصل کرنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ ان کی کتابوں میں بچوں کی ضروریات اور نفسیات کا خیال بہت کم رکھا گیا ہے جبکہ بیسویں صدی میں ادب اطفال کو بیحد اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے۔ اس صدی میں بچوں کا ادب ضروری تو ہے ہی ساتھ ہی کئی ممالک میں اس نے فیشن کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بچوں کے لیے کھلونے اور دیگر چیزیں خریدنے کے ساتھ ساتھ خوبصورت کتابیں خریدنا ضرورت بھی ہے اور فیشن کے دائرے میں بھی شامل ہے۔ بچوں کی ضرورت اور مانگ کے سبب اس صنعت کا کاروباری ہو جانا ایک فطری امر ہے مگر اس کا یہ مضر نتیجہ بھی سامنے آتا ہے کہ کئی بار اچھی کتابوں کو وہ اہمیت نہیں مل پاتی جس کی وہ مستحق ہوتی ہیں۔ بڑھتے ہوئے کاروباری طوفان کے نتائج کے بارے میں میگ کورنیلیا رقم طراز ہے:۔

"Commercialism a.d were production have at times readed such proportions as to overshadow the scares of five books. The trend to write to meet a specific need has some times discouraged the author's writing out of his real affinity. But looking back over the period, the unworthy books have dropped out of sight and problem of knowing which of the many good books to accent in our discussion has been a difficult one indeed."[1].

---

1. MEIGS, CORNELIA, "A critical History of Children's Literature " Page 432

میگ کورنیلیا کے خیال میں بچوں کی کتب کی بڑھتی ہوئی اشاعت اور اس کی کاروباری شکل نے بچوں کی اچھی کتابوں پر برا اثر ڈالا ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ وہی کتابیں اچھی ہوں گی جن کی تعداد اشاعت زیادہ سے زیادہ ہو، بار بار چھپتی ہوں، اور زیادہ سے زیادہ منافع دے سکیں۔ لیکن کسی کتاب کا بہت زیادہ چھپنا اس کے اچھی کتاب ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اردو میں بچوں کے لیے بہت اچھی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن وہ زیادہ تعداد میں نہ چھپنے کے سبب زیادہ سے زیادہ قارئین تک نہیں پہنچ پائیں۔ اردو کے تقریباً ہر بڑے ادیب نے بچوں کے لیے لکھا ہے۔ ان سے یہ مضامین یا کتابیں بچوں کے لیے رسائل کے مدیران یا ناشرانِ کتب نے لکھوائی ہیں۔ بچوں کے مشہور رسائل کے خاص نمبروں میں ہم کو اچھے اچھے ادبا اور شعراء کے مضامین اور منظومات مل جاتی ہیں۔ مگر کیا ان تخلیقات میں بچوں کے ادب کی جملہ خصوصیات موجود ہیں، کیا ان تمام تخلیقات کو بچوں کے ادب میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بہت سی خامیاں ہیں۔ کسی کا اسلوب بیان اور زبان مشکل اور غیر موزوں ہے تو اکثر ادیبوں نے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو بڑوں کے لیے مناسب تھے یا جن میں بچوں کے مسائل ضروریات، نفسیات، اور ان کی ذہنی نشوونما کا قطعی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

بچوں کے لیے منظومات، مضامین اور کتابیں برابر لکھی جاتی رہی ہیں، چھپتی رہی ہیں اور کافی تعداد میں شائع ہوئی ہیں۔ مگر ان میں بیشتر عام کتابیں ہیں اچھی کتابوں کی قلت ہے۔ بچوں کے ادب میں ثانوی درجات تک کی درسی کتب کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جن میں قدماء کے مضامین بھی شامل ہیں۔ مگر جب ہم ان مضامین پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر مضامین بچوں کے لیے لکھے ہی نہیں گئے ہیں۔ بلکہ موضوعات، اسلوب نگارش اور سہل و عام فہم زبان کے سبب ان مضامین کو بچوں کی درسی کتب میں شامل کر لیا گیا ہے یا بہت سے مضامین اخلاقی درس کے لیے مؤلفین نے خود قلم بند کر دیے ہیں، قدیم شعراء کے کلام سے سہل منظومات یا ان کے اقتباسات نصاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ مثلاً نظیر اکبر آبادی کی میلوں ٹھیلوں یا

ہوتے ہیں۔ مثلاً نظمیں بچوں کے نصاب میں شامل ہیں جو مخصوص عمر کے بچوں کی ذہنی سطح کے سبب
منتخب کی گئی ہیں۔ مثلاً بچوں کے لیے جتنی بھی کہانیاں ہیں۔ نظیر اکبرآبادی، محمد حسین آزاد ابتدائی
درجات کے نصاب میں شامل پاس سے پہلے شامل کیا گیا ہے کہ اس میں بکثرت الفاظ کے ساتھ ساتھ
موسیقیت ہے۔ اس طرح بچوں کی درسی کتب میں ہوائی کے نقصانات، مختلف اقتباسات
دلچسپ بیان، صبح کا منظر، تہوار کی رات وغیرہ کے تحت شامل کر دیے گئے ہیں جبکہ بچہ یا بچے
کی ذہنی نشوونما اور نفسیات سے ایسے اقتباسات کا دور تک کوئی واسطہ نہیں۔

محمد حسین آزاد، حالی، اقبال، اور خصوصاً اسماعیل میرٹھی جیسے شعرا نے بچوں کے لیے خاص طور پر لکھا ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جنہیں ہم بچوں کے ادب میں شمار کر سکتے ہیں کیونکہ ان میں بچوں کے ادب کی جملہ خصوصیات موجود ہیں، لیکن نثری ادب کے تحت درسی کتب میں شامل تخلیقات اکثر اس معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ مجموعی طور پر اگر ہم درسی کتب کے مضامین اور منظومات کا جائزہ لیں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صحیح معنوں میں بچوں کا ادب اردو میں کم تخلیق کیا گیا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ہر دور کی اچھی کتب کی تعداد محدود ہے ورنہ بیشتر کتب کی افادیت اپنے زمانے کے ساتھ ختم ہو گئی۔ مختلف ادوار میں مختلف نظریات و خیالات بچوں کے ادب کا موضوع بنتے رہے ہیں اور پھر ان نظریات اور خیالات کے ساتھ ساتھ وہ کتب، منظومات اور مضامین بھی اپنی اہمیت کھوتے رہے، وجہ یہ ہے کہ بچوں کے ادب کو یا بچوں کی کتابوں کو مناسب ادبی حیثیت اور اہمیت نہیں دی گئی۔ ہمارے ناقدین اور مفکرین نے ادب اطفال کو نظرانداز کیا اس کے لیے کبھی تنقیدی نظریات و معیارات قائم نہیں کیے گئے اور ان مضامین اور کتب کو مروجہ تنقید کے عام پیمانے پر پرکھ کر اس کی اہمیت کو کم سمجھا گیا۔

بچوں کے ادب پر تنقید بالکل جداگانہ فن ہے محض موضوعات، زبان اور اسلوب کے اعتبار سے ہم ادب اطفال پر تنقید نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے سائنٹفک دور میں بھی بچوں کے ادب کا کوئی جداگانہ معیار مقرر نہیں کیا گیا۔ ادب اطفال پر تنقید کے سلسلے میں ڈاکٹر ہری کرشن دیوسرے لکھتے ہیں۔

"[illegible] रचना, शिल्प, पाठक [illegible]"[1].

بچوں کے ادب پر تنقید کرنے کے لیے بچے کی نفسیات اور دلچسپیوں کو مدِ نظر رکھنا ہوگا حقیقت یہ ہے کہ بڑوں اور بچوں کے مقاصد، اسلوب نگارش، موضوعات اور تلازمے الگ الگ ہیں بچوں کے ادب پر تنقید کرتے وقت اس فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے مناسب تنقید کی مدد سے ادب اطفال کے معیارات قائم کیے جا سکتے ہیں۔ میگ کورنیلیا نے اس نکتہ میں لکھا ہے۔

"------That criticism can establish the distinction between the merely average and genuinely great, that it can stimulate creative writing and creative illustrations. There is still need for more penetrating and knowledgeble criticism, which estimates the quality of a book in relation to what it is, rather than what it is not."[2]

"بچوں کے ادب پر تنقید کر کے معیاری اور علمی کتابوں کے فرق کو نمایاں کیا جا سکتا ہے تنقید اچھے لکھنے والوں کے لیے ایک معیار مقرر کر سکتی ہے تنقید کے ذریعہ کتاب کا ہر پہلو ہمارے سامنے آ سکتا ہے۔ عموماً جب بڑے بچوں کے لیے کسی کتاب کا انتخاب کرتے ہیں۔ تو اس نگاہ سے نہیں کہ کتاب میں پیش کردہ نظریات کیا ہیں؟ یا اس کتاب کا کیا موضوع ہے؟ اسلوب کیسا ہے؟ بلکہ وہ کتاب اس لیے منتخب کی جاتی ہے کہ اس کتاب کا موضوع

1- डा० [illegible], "हिन्दी बाल साहित्य - एक अध्ययन"
आत्माराम एण्ड संस दिल्ली, पेज 29

2- Meigs, Cornelia "A critical History of children's Literature." Page 423.

[illegible]

بچوں کے مطالعہ [illegible]

[illegible] ہے کہ [illegible] کتاب میں تمام [illegible] موضوع کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اگر اس کا
طرزِ بیان دلچسپ نہیں ہے، تو بچہ اس مضمون سے کوئی تاثر قبول نہیں کر سکے گا۔ اکثر دیکھا گیا ہے
کہ لکھنے والے کا ذہن نیا ہے، وہ اچھے اچھے موضوعات اور عمدہ مرکزی خیال رکھتے ہیں لیکن ان کا
اسلوبِ بیان اچھا نہیں ہوتا۔ ان کی زبان میں توانائی اور سلاست نہیں رہتا، جو کچھ وہ چاہتے ہیں
کہہ نہیں پاتے۔ اس کے برعکس اچھا ادیب طرزِ تحریر سے معمولی سے معمولی موضوعات کو پُر اثر
بنا سکتے ہیں۔

یہاں ایک نیا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھی تحریر کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ بچوں کے ادب
کے لیے اچھی اور افادی تحریر ہم کس کو کہہ سکتے ہیں۔ کسی کتاب پر تنقید کرنے سے پہلے ناقد کے
ذہن میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مصنف کا کیا مقصد ہے؟ اس میں اس کو کس حد
تک کامیابی ملی۔ اس کے کیا اسباب ہیں؟ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کے نتیجے میں
اچھی تنقید وجود میں آتی ہے۔ اس طریقۂ کار کو آزمانے سے ناقد سائنٹفک انداز میں اچھے بُرے
کی تمیز کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ ناقد کا فرض ہے کہ وہ اس کتاب کو غائر نظر اور انہماک
سے پڑھے۔ کتاب کا غور و خوض سے مطالعہ کرنے پر ہی غیر جانبدارانہ رائے کا اظہار کیا جا سکتا
ہے۔ ادبِ اطفال کی بڑی خوبی تو ترسیل ہے [illegible] موضوع 'پریوں' کی کہانی ہو، جانوروں کے متعلق
کتاب ہو، یا کسی ہیرو کی سوانح حیات ہو، ان سب میں اچھی تحریر کی خوبیاں ضرور ہونا چاہیے۔
محض موضوع کے پیشِ نظر ہم ادبِ اطفال پر تنقید نہیں کر سکتے۔ ہمیں یہ بھی کہنے کا کوئی
حق نہیں ہے کہ ہیرو HERO کی کہانی پریوں کی کہانی کے مقابلے زیادہ دلچسپ ہوتی
ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ معلومات کی کتابیں بچوں کے لیے زیادہ مفید ہوتی ہیں، تو
دوسروں کے نزدیک ایسی کتابیں جن کا موضوع تخیلی ہو، اچھے ادب سے زیادہ قریب
ہوتی ہیں، کیونکہ بچوں کی ذہنی نشوونما میں تخیل کی بہت اہمیت ہے۔ نقاد کو ایسی کتابوں
کے خاکے، نظریات، موضوعات اور اسلوبِ بیان کا جائزہ لینا چاہیے۔

اصلاحی یا پند و نصیحت پر مبنی کہانیوں اور مضامین سے بچوں کی اصلاح یا [illegible]

کی دلچسپی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ جبکہ بعض ادیبوں نے [illegible]
اجاگر کیے ہیں جس کے سبب ایسی کہانیوں میں بچے فطرتاً دلچسپی لیتے ہیں [illegible]
ادب اطفال کے تاریخی ارتقاء پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی کہانیاں یا [illegible]
کے کارناموں پر مبنی ہوتی تھیں یا ان میں محض اخلاقیات کا عکس ہوتا تھا۔ ایسی کتابوں میں
سیاسی، سماجی، اور اخلاقی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی، مگر ایسی کتب اور ایسے
ادیب زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتے کیونکہ ان کے خیالات وقتی اور مسائل عارضی
اہمیت کے حامل تھے۔

مشیر فاطمہ کا کہنا ہے:-

"وہی کتاب اچھی ہے جو فن کا حق ادا کرتی ہے، جو بچے میں امنگ پیدا کرتی
ہے اور علم کا راستہ بتاتی ہے، جو پہلی نظر میں ہی اپنا اثر ڈالتی ہے خوبصورت
معلوم ہوتی ہے جو بچوں کی روح کو متحرک کرتی ہے، جو آئندہ زندگی میں ہمیشہ
کام آتی ہے" [1]

اچھی کتاب وہ ہے جو بچے میں عالمگیر انسانیت اور محبت کا جذبہ ابھارے، جو کھیل کھیل
میں شجاعت اور وقار کی خواہش بیدار کرے، جو بچے کے دل میں یہ احساس پیدا کر سکے
کہ ذہن اور سوجھ بوجھ کی تربیت کامیاب زندگی کے لیے ضروری ہے: اچھی کتاب کا صرف
یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ مفید اور قابل عمل ہو۔ پال ہازرڈ معلوماتی کتب کو بھی مفید اور کارآمد
سمجھتا ہے خصوصاً وہ کتابیں جن کو پڑھ کر بچے میں انسان کے دلی جذبات کی قدر کا مادہ
پیدا ہو۔

کتاب کے موضوع کا ارتقاء فطری انداز اور ہمواری کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس کتاب
کے واقعات دلچسپی کے ساتھ ایک دوسرے سے اس طرح منسلک ہوتے جائیں کہ بچے کی
دلچسپی اور تجسس بڑھتا جائے۔ بچوں کی کہانی میں دلچسپی واقعات سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر
کہانی کا پلاٹ اچھا نہیں ہے۔ اس میں پلاٹ میں ربط، تسلسل اور دلچسپی نہیں ہے تو
کہانی کتنے ہی اچھے اور دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی ہو، بچے کی دلچسپی اس میں زیادہ دیر [illegible]

[1] مشیر فاطمہ، بچوں کا ادب کی خصوصیات، انجمن ترقی اردو ہند [illegible]

دوسرا باب

بچے کی نفسیات اور ادبِ اطفال

"بچہ سادہ لوح ہوتا ہے۔ اس کی زندگی بالکل کورے سفید کاغذ کی مانند ہوتی ہے اس کے بزرگ، اس کا ماحول اور اس کے آس پاس کی سماجی اور سیاسی فضا بچے کی شخصیت پر جو چھاپ ڈالتی ہیں، وہ نقوش زندگی بھر اس کے ذہن و دل پر مرتسم رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "بچہ "لا" سے اثبات پیدا کرتا ہے اور تخیل کی ایک دنیا آباد کرتا ہے الگ الگ چیزوں کو نئی شخصیت دے کر نئے نام سے پکارتا ہے۔ ٹانگوں میں لکڑی لے کر گھر بھر میں اسے گھوڑا بنائے دوڑائے پھرتا ہے۔ گڑیا کو سامنے بٹھا کر اس سے باتیں کی جاتی ہیں۔ تکیہ کو ماں سمجھ کر سینے سے لگایا جاتا ہے۔ انھیں حقیقی سمجھتا ہے اور دنیا انھیں کیا سمجھتی ہے۔ اس کی اسے پروا نہیں ہوتی۔ یہ بچہ ہے۔ نارمل بچہ! بھلا آپ کا بچہ!"[1]

بچے کی پیدائش سے لے کر اس کی مکمل نشوونما تک علم نفسیات بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ بچوں کی نفسیات ہی بچوں کے ادب کو جنم دیتی ہے۔ بچوں کے پڑھنے کی عادت اور بڑھتی ہوئی دلچسپی ہی نے بچوں کے لیے ایک الگ ادب کو جنم دیا، جس کو آج بچوں کا ادب کہا جاتا ہے۔ چونکہ بچوں کے ادب کی بنیاد ان لوریوں سے شروع ہو جاتی ہے جو

---

[1] ڈاکٹر سلیم اختر: "بچہ اور کتاب نفسیات کی روشنی میں" ماہنامہ ماہِ نو، لاہور، نومبر ۱۹۸۹ء [illegible]

معصوم بچے کو سلانے کے لیے، ماں، گنگناتی ہے۔ اس [illegible]
کے ساتھ ساتھ گامزن رہا ہے اور بالآخر اس نے ادبی شکل اختیار کرلی۔ [illegible]
اور بچے کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے نظم، لوری، گیت، کہانی، تصویر، خطے
ڈرامے، مضمون اور اس قسم کی مختلف اصناف بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں تاکہ بچے میں
مطالعہ کی عادت بڑھے۔ اس کے ساتھ ہی جیسے جیسے تہذیب و تمدن میں تبدیلیاں
آئیں، بچوں کی نفسیات بھی متاثر ہوتی رہی۔ اگر ہم صرف دو سو سال قبل کی بات کریں
تو آج کے اور اس وقت کے ماحول سماجی اور سیاسی حالات نیز اخلاقی قدروں میں ہمیں
میں زمین و آسمان کا فرق بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ آج دنیا ترقی کی طرف گامزن ہے
جدید سائنسی آلات، ایجادات، انکشافات اور جدید ٹکنالوجی نے بچوں اور بڑوں کی زندگی
میں ایک انقلاب برپا کردیا ہے۔ آج کے بچے بھی اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ بچے
حال میں مست ہیں اور ذہنی اعتبار سے بہت سمجھدار ہیں۔ ان کی قوت متخیلہ بھی
بہت تیز ہے۔ ان سب باتوں کے پیچھے نفسیات کا بڑا اہم ہاتھ ہے۔ مختلف ماہرین نفسیات
نے بچوں کی زندگی ان کی عادات و اطوار اور مزاج کے بارے میں عملی طور پر بہت سی
تحقیقات و تجربات کیے ہیں۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ آج جو بچہ ذہنی طور پر صحت مند ہے
وہ زندگی کے ہر میدان میں آگے نظر آئے گا۔ جو بچہ عقلمند، تیز اور سمجھدار ہوتا ہے
اس کے خیالات بلند ارادے پختہ اور شخصیت پرکشش ہوتی ہے۔ اس بچے میں ہر کام
کو خود کرنے کی جستجو اور اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی سوجھ بوجھ ہوتی ہے۔
اگر ایسا ہے تو بچہ زندگی میں بہت کامیاب انسان رہے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے
کہ بچے کی نشوونما مناسب ماحول میں ہو۔ نارمل بچے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس
کے لیے سب کچھ اس کے بڑے ہی کریں یا اس کا ہر کام ہر الجھن بڑے ہی دور کریں
بچہ تو خود اپنا کام کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ خود کام کرکے خوشی محسوس کرتا
ہے۔ وہ ایسا آزاد ماحول چاہتا ہے جو اس کے خیالات اور تصورات کو عملی جامہ
پہنانے میں مدد کرے۔

بچے کی زندگی بڑے کی زندگی سے بہت مختلف [illegible]

[illegible]
جانب سے عمد نہیں کیا جاتا [illegible] ہوتا ہے [illegible]
اپنے بچوں کے مزاج اور ان کی خواہشات اور نظریات کے سبب [illegible]
چلنے کی اپنی ضد برقرار رکھتا اور زیادتیوں کے سبب بچوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ یہ غلطی نہیں
سمجھنا چاہیے کہ بچے بالکل ویسا ہی بن جاتے ہیں جیسا بڑے چاہتے ہیں۔

بچے بہت ذہین اور حساس ہوتے ہیں لیکن اکثر اوقات بچوں کی ذہنیت اپنے
بڑوں کی غیر دانشمندانہ رویوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ بچوں کی
نفسیات کا خیال نہ رکھتے ہوئے ان پر بیجا دباؤ ڈال کر ان کی اپنی مرضی کے مطابق بنانے
کی کوشش کرتے ہیں وہ بچے بعد میں فیصلے خود پسند نوجوان کہلاتے ہیں۔ آج کے
دور میں یہ بہت بڑا مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ کیونکہ بڑے ایک طرف تو بچے کو پیار دیتے
ہیں اور دوسری طرف اپنے نظریات اور فلسفے کو میٹھی زہریلی گولیوں کی شکل میں ان کے
حلق میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ روش بچے کی شخصیت کو ابھرنے نہیں
دیتی۔

بچوں کے خیالات کو اندھیرے میں بھٹکانے کی اس روش سے زیادہ نقصان دہ
بچوں کے لیے دوسری چیز نہیں۔ بچے پر بیجا دباؤ نہیں پڑنا چاہیے۔ بچہ ہر چیز کے
بارے میں ایک خیال رکھتا ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنی نگاہ سے دیکھ کر سمجھنے کی کوشش
کرتا ہے۔ یہ اس سوجھ بوجھ کا نتیجہ ہے جو پیدائش سے بچے میں ہوتی ہے اور
بہت تیزی سے بڑھتی ہے اگر اس سے ہٹ کر کوئی چیز اس کے سامنے رکھی جاتی ہے
تو وہ قطعی پسند نہیں کرتا۔ بچوں کی ہر بات کے لیے ان کی اپنی رائے ہوتی ہے چاہے
کوئی کتاب ہو یا کھلونا وہ اسے اپنے طور پر پرکھتے ہیں۔ بچے کو ہر کتاب یا ہر کھلونا
پسند نہیں آتا۔ ہر بچے کی پسند جداگانہ ہوتی ہے اس لیے اگر ہم کو ان کے ساتھ انصاف
کرنا ہے تو ان کے خیالات، ان خیالات کا اظہار اور ان کے کل پہلوؤں کو اہمیت دینا
ہوگا۔ بچے کی نفسیات کو وسیلہ بنا کر اپنی بات ان کے ذہنوں میں منتقل کی جا سکتی ہے لیکن
خیالات کو [illegible] بچوں کو پورا حق ہے۔ [illegible] منظور کیا یا نامنظور [illegible]
[illegible]

ہاتھ ہوتا ہے جس میں وہ رہتے ہیں۔ بڑوں سے کوئی بات زبردستی منوانا مشکل ہے۔ اپنی مرضی کے خلاف بچے بھلے ہی مان لیں لیکن موقع ملتے پر وہ باغی ہو جائیں گے۔ بچہ کسی بات کو اس وقت تک منظور نہیں کرے گا جب تک وہ اس کو پسند نہ کرے۔

بچے تو اپنے اس مستقبل کی طرف دیکھتے ہیں جس طرف ان کے قدم خود بخود اٹھتے ہیں اگر اس میں کوئی رکاوٹ آتی ہے یا ان کی پسند کے خلاف کوئی بات ہوتی ہے تو بچے اس کو رد کر دیتے ہیں۔ بچے کا مستقبل بہت روشن ہوتا ہے اس میں بہت سے رنگین خواب، سکھ چین، آرام اور زندگی کی رنگینیاں ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جدوجہد کی کالی گھٹائیں بھی ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ جن کو دیکھ کر وہ ہمت سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور زندگی میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اس مستقبل کے بارے میں بچے خود کچھ نہیں جانتے اور نہ ان کے بڑے ان کے مستقبل کے بارے میں مطمئن ہوتے ہیں لیکن اس مستقبل کے لیے چونکہ ان بچوں کو ہی جدوجہد کرنا ہے لہٰذا شروع سے ہی ان کی خواہشات اور ہر چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی عادت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ بچے زندگی کے ہر حادثے، کتاب کی ہر کہانی اور زندگی کی ہر سچائی کا اپنے پیمانہ پر تجزیہ کریں گے۔ جس چیز میں ان کو دلچسپی ہوتی ہے، جس چیز کی طرف ان کا دل کھنچتا ہے بچے وہی کرتے ہیں۔ آپ اس سلسلے میں بچوں کو مجبور نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں للین اسمتھ رقمطراز ہے؛

"NO FORCE IN THE WORLD CAN COMPEL CHILDREN TO READ, FOR LONG, WHAT THEY DO NOT WANT" [1]

بچے خود کو مستقبل کے لیے تیار کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے ہم ان کی مدد کریں جو گزر گیا اس کی طرف کیا دیکھنا لکیر کا فقیر ہونے کا زمانہ نہیں رہا۔ جان اینڈرسن نے لکھا ہے:

"The child is engaged in an on going process of development"

---

1. Lilian Smith, "A critical approach to children's literature" Page 12

that is not reversible, because of the inter-relation that occrue neither relations within the child, these within the context, nor their inter-action can be reproduced a second time in their exact original forms."[1]

زندگی ہمیشہ "حال" میں ہوتی ہے اور مستقبل کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ بچوں کو کتابیں بھی ایسی ہی پسند آتی ہیں جو ان کے مستقبل کو جاننے میں معاون ثابت ہوں۔ ایسی کتابیں نہیں جو "حال" کا آئینہ نہیں ہیں۔ اور جو بچوں کے تصورات کے اڑن کھٹولے کو ان کے مستقبل تک نہ لے جاسکیں۔ اسی وجہ سے مافوق الفطرت کردار اور واقعات سب اپنی دلچسپی کھوتے جا رہے ہیں۔ بچے ایسی کہانی سن کر پری سے ملنا چاہتے ہیں۔ "جن" کو دور سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ دیو کو سزا دینا چاہتے ہیں۔ جب ان بچوں کو حقیقی دنیا کا پتہ چلتا ہے تو محض مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اب بچے ہوائی جہاز، راکٹ اور آسمان سے راکیش شرما کو لے جانے والے مصنوعی سیارے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ چاند ستاروں اور آسمان کا تصوّر کرتے ہیں۔ ان کی دلچسپی انٹارٹیکا کے برفیلے علاقوں میں ہے جائنٹ رابرٹ اور اسٹار ٹریک جیسے پروگراموں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ بچے میں زبردست نفسیاتی تبدیلی خود بخود آرہی ہے۔

مناسب جسمانی اور ذہنی نشوونما کے لیے بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ بچوں کی نفسیات کوئی ایسا مشکل موضوع بھی نہیں ہے جس کو عام والدین نہ سمجھ سکتے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ بچے کی حرکتوں، عادات و اطوار، مزاج اور اس کے رجحانات کا صحیح پتہ لگانا اور مستقبل کے لیے ان کی صحیح راہ نمائی کرنا ہی بچوں کی نفسیات ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچہ جب اچھی اچھی حرکتیں کرتا ہے، عقلمندانہ کام کرتا ہے، اپنی محدود معلومات کے دائرے میں آپ کے پوچھے ہوئے سوالوں کے جوابات دیتا ہے تو آپ بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اگر وہ توڑ پھوڑ کر نقصان کرتا ہے۔

---

1. John E Anderson; Methods of child psychology" From the book, 'Manual of child psychology.' (Edited by) L Car-Michael Page 3

تو آپ غصہ ہو کر اس کی سرزنش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں افعال کے پیچھے بچے کے دل میں اچھے برے کا کوئی احساس کارفرما نہیں ہوتا۔ وہ تو معصوم ہے، اچھے برے کا فیصلہ تو ہم نے کیا ہے۔ یہ افعال تو بچے کے دل کے احساسات اور جوشش کو مطمئن کرنے والے ہیں۔

بچوں کی نفسیات کا مطالعہ متعدد ماہرین نفسیات کا خاص موضوع رہا ہے۔ فرائڈ ہومرلین، جان اینڈرسن جیسے ماہرین نفسیات نے بچوں کی نفسیات کو اہمیت دی اور بڑوں کی نفسیات سے جداگانہ موضوع قرار دیا۔ ان ماہرین نفسیات کے تجربات اور تجزیات کی تلخیص حسب ذیل ہے۔

(۱) بچہ ایک ایسی مخلوق ہوتی ہے جو بتدریج بڑھتا رہتا ہے اور آہستہ آہستہ سن بلوغ کو پہنچتا ہے۔

(۲) بچہ ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ان تمام حالات کا مقابلہ کرتا ہے جو اس کے سامنے آتے ہیں۔ اس کے برتاؤ کی یہ منزل خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ بچے کی یادداشت اس کے مطالعہ کی دلچسپی، اس کے جذبات سبھی کو الگ الگ دیکھنا ضروری ہے۔

(۳) "بچہ" ایک ایسے ماحول میں رہتا ہے جو اس کے مزاج، برتاؤ، اور اس کی بڑھتی ہوئی ترقی کو برابر متاثر کرتا ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کا جذبہ اسی ماحول سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسی ماحول سے اپنے مستقبل کے لیے راہیں منتخب کرتا ہے۔" [1]

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ بچوں میں سارے کام کرنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن وہ بڑے کے بتانے اور سکھانے سے ہی ابھر کر سامنے آتی ہے، بچوں کی نفسیات کے ماہرین لال جی رام شکل نے اپنی مشہور کتاب "بال منوگیان" میں لکھا ہے:

"मनुष्य के बच्चे जन्म से असहाय होते हैं। और जीवन के उपयोगी कार्य सीखने में बहुत समय लगाते हैं, या यूं कहा जाये कि मनुष्य जन्म भर सीखता ही रहता

[illegible] ۔[1]

بڑوں کی تربیت اور انکا ماحول بچوں کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں پوری طرح معاون ہوتے ہیں۔ شکل جی نے اس سلسلے میں ایک مثال یہ دی ہے کہ نپولین نے ایک بار انسانی نفسیات کو جاننے کے لیے بیس بچوں کو، جن کی عمر چند ماہ کی تھی اکیلے رکھا۔ ان بچوں سے بات کرنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی، بچوں کو کھلایا پلایا جاتا لیکن ان سے بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ دو سال تک بچوں کو اسی طرح رکھا گیا۔ تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے زیادہ تر گونگے ہو گئے۔ اور کچھ بچوں کا یہ گونگا پن واضح ہو گیا۔ اگر ہم بچوں کو کوشش کر کے زبان نہ سکھائیں تو وہ بولنا بھی نہ سیکھیں۔ اس کی سب سے اچھی مثال ہماری زبان ہے بچہ وہی زبان سیکھ جاتا ہے۔ سماج کے سب ہی خیالات، افکار، عادات اور اطوار جن سے وہ اپنی زندگی کی گاڑی چلاتا ہے، سیکھنے سے آتے ہیں۔

انسان میں سیکھنے کی فطرت سب سے زیادہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ بچپن سے ہی اس کے تمام فطری رجحانات آہستہ آہستہ پروان چڑھتے ہیں۔ مگر یہ فطرت اور رجحانات فطری طور پر تبدیل بھی ہوتے جاتے ہیں۔ ان تبدیلیوں پر نظر رکھنے کی سخت ضرورت ہے ورنہ بچے گمراہ ہو سکتے ہیں۔ ان کی فطری صلاحیتوں کو اس طرح ابھرنے دینا چاہیے بچے کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما میں کوئی رکاوٹ نہ آسکے۔ بچے کی نشو و نما کے دوران اس کی فطری صلاحیتوں اور رجحانات پر نظر رکھنا بڑوں کا کام ہے۔

۱۔ خواہش اضطراب:۔

اس دنیا کے لیے جس طرح بچے نئے ہوتے ہیں اسی طرح یہ دنیا بھی بچوں کے لیے نئی اور عجوبہ ہوتی ہے۔ وہ بڑا ہو کر بھی دنیا کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور پھر بھی پوری طرح سمجھ نہیں پاتا۔ اس عجائباتی دنیا کی ہر شے کو جاننے اور سمجھنے کی خواہش کو الٹ

---

۱۰ [illegible]

ہوں۔ بچہ کو وقت پر نہلایا جاتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس کی تمام ضروریات کی طرف دھیان دیا جا رہا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی کام وقت پر نہ ہو تو بچہ ناراض ہو جاتا ہے، وہ روتا ہے، چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ اگر برابر اس کے ساتھ ایسا ہوتا ہے تو بڑا ہونے پر وہ بچہ باغی ہو جاتا ہے۔ بڑوں کا کہنا نہیں مانتا۔ بات بات پر الجھنے لگتا ہے اور آخر میں تذبذب کا شکار ہو کر کسی بھی معاملے میں کوئی یقینی فیصلہ نہیں کر پاتا۔

بچہ کسی کے بھی مقابلے میں خود کو کمزور نہیں تصور کرتا اور نہ ہی کسی دوسرے بچے سے کسی بات میں خود کو چھوٹا یا کمزور سمجھتا ہے۔ یہ فطرت بڑا ہونے پر بچے کو باہمت اور بہادر بناتی ہے اور بعد میں یہ عادت بچے کی اخلاقی خوبیوں میں سے ایک خوبی بن جاتی ہے۔ کھیل کود اور جہاتی سیاحت وغیرہ میں یہ عادت بڑے کام انجام دیتی ہے۔ اس فطرت کی صحیح نشو ونما ہونا ضروری ہے۔ ورنہ بچہ باغی اور سر پھرا ہو جائے گا۔ بزرگوں کا یہ کہنا بھی صحیح ہے "بچہ بادشاہ ہوتا ہے، وہ صرف حکم چلانا جانتا ہے۔ وہ کس وقت کیا کرنا چاہتا ہے کسی کو معلوم نہیں۔ اسے حسب مرضی کام کرتے رہنے دینا چاہیے۔ قدم قدم پر اس کے جذبات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

خود نمائی کی عادت بچوں خصوصاً لڑکیوں میں بہت ہوتی ہے۔ کسی جگہ بڑے بیٹھے ہوں اور بچے کی طرف قطعی توجہ نہ دے رہے ہوں تو بچے خود اپنی اہمیت جتانے کے لیے کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کرتے ہیں کہ بڑے ان کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ کچھ والدین کی عادت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے اپنے بچے کی برائی کرتے ہیں اس طرح بچے کی "انا" کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ اس کی ہمت شکنی ہوتی ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ بچے کے سامنے ہی اس کی بہت زیادہ اور بے جا تعریف کرتے ہیں۔ اس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں یہ بات بھی بچے کے مستقبل کے لیے نامناسب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بچے کی اس فطرت پر بہت احتیاط سے نظر رکھنی چاہیے تاکہ بچہ نہ تو احساس کمتری کا شکار ہو اور نہ ہی احساس برتری میں مبتلا ہو پائے۔

۴۔ اپنی چیزوں کو جمع کرنا، ان کی حفاظت کرنا:۔

بچے جو کچھ دیکھتے ہیں اسے اپنے قبضہ میں کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی دلچسپی اور اپنے استعمال کی چیزوں کو حاصل کرنے اور ان کو جمع کرنے میں بچوں کو خاص دلچسپی ہوتی ہے رنگین کاغذ، چھوٹی چھوٹی پنسلیں، معمولی تصویریں، ٹافیوں کے کاغذ اور اسی قسم کی دوسری چیزیں جمع کرتے ہیں۔ جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے ہیں، ان کی دلچسپی میں تبدیلی آتی رہتی ہے بچوں کی اس فطرت پر بندش عائد نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس سے متاثر ہو کر وہ اپنی ضرورت کی چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر بچوں کی اس فطرت کو دبانے کی کوشش کی گئی تو وہ لاپرواہ اور غیر ذمہ دار ہو جاتے ہیں لیکن یہ عادت حدِّ اعتدال سے بڑھ گئی تو پھر وہ اپنا اپنا ہی سوچیں گے۔ لالچی، کنجوس اور خود غرض ہو جائیں گے اس وجہ سے اس فطری رجحان کی نشو و نما میں بھی توازن ضروری ہے۔

۵۔ احترام اور فرماں برداری:۔

یہ فطری خود نمائی سے قطعی مختلف ہے لیکن اس کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس سے بچے کے دل میں نرمی اور دوسروں کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ماں باپ والدین اور اپنے بڑوں کی عزت، ان کے جذبات کا احساس ان کی فرماں برداری اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کو اس رجحان سے تقویت ملتی ہے۔ اگر بچے میں یہ فطرت نہ ہو تو سماج میں اس کا جینا مشکل ہو جائے، اس لیے اخلاقی اور سماجی دونوں اعتبار سے احترام کرنے کی یہ عادت بچے کے لیے بہت ہی ضروری ہے۔

والدین، اساتذہ، بڑے بھائی بہن اور دوسرے بزرگ جو کچھ کہیں اس کو مان لینا فرماں برداری کہلاتی ہے، فرماں برداری ایک ایسی فطرت ہے جس کو بچے ابتدا ہی سے جانتے ہیں۔ یہ کرو، یہ مت کرو، یہ اچھا ہے، یہ برا ہے یہ تو بچے کے لیے ابتدائی ہدایات ہیں۔ یہ ہدایات بچے کے لیے اس وقت تک مفید ہیں جب بچے میں خود سوچنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہو جاتی۔ اس صلاحیت کے نمودار ہو جانے پر بچہ ہر حکم پر غور اور اس کی افادیت کی چھان بین کرنے لگتا ہے۔ اب وہ صرف اسی

شخص کا حکم مانتا ہے جس سے اسے عقیدت یا محبت ہوتی ہے یا جس سے وہ [illegible]
مرعوب ہوتا ہے۔ بچے کو جو شخص زیادہ متاثر کرتا ہے وہ اس کے احکام کی پابندی زیادہ
کرتا ہے۔ ایسی ہدایات بچے کی بہتر رہنمائی کرتی ہیں اور مستقبل میں اس کو بہت سی الجھنوں
سے نجات دلاتی ہے مگر ان ہدایات اور احکامات کا پرتاثیر انداز میں دیا جانا ضروری ہے
ان کا انداز جارحانہ یا لہجہ حاکمانہ نہیں ہونا چاہیے۔ آج کے بچے براہ راست نصیحت پسند
نہیں کرتے۔ اس لیے اگر بڑوں کی نصیحت کا انداز جارحانہ ہوا تو بچے باغی ہوجائیں گے۔

۶۔ نقل کرنا، تقلید کرنا:۔

بچوں کو "پیارے بندر" کہا جاتا ہے۔ یہ خطاب اس کو محض اس کی شوخیوں اور شرارتوں
کے سبب نہیں ملا بلکہ وہ دوسروں میں جو کچھ دیکھتا ہے بندر کی طرح اس کو نقل کرتا
ہے۔ نقل کرنے کی یہ صلاحیت فطرت انسانی ہے۔ انسان کی جبلّت ہے۔ بچوں میں یہ بہت
تیز ہوتی ہے۔ بچے ہر ایک کی نقل بآسانی کر لیتے ہیں۔ اگرچہ بڑوں کی نقل کرنا بُرا سمجھا جاتا
ہے لیکن یہ بچے کی جسمانی اور ذہنی نشو ونما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اٹھنا، بیٹھنا، چلنا
پھرنا، بولنا، کھانا، پینا، پڑھنا، لکھنا جیسی باتیں محض بڑوں کی دیکھا دیکھی ہی بچوں میں
آتی ہیں۔ اسی فطری رجحان سے بچے کی اداکارانہ صلاحیتیں سامنے آتی ہیں اور بڑے ہونے
پر انھیں کامیاب اداکار بنا سکتی ہیں۔ بچوں میں اچھی اچھی عادتیں اس فطری رجحان کے ذریعہ
شروع سے ہی پیدا کی جاسکتی ہیں۔ بدن کو پاک وصاف رکھنا، اپنی چیزوں کو ٹھیک
سے استعمال کرنا، وقت پر اپنا کام کرنا، صبح سویرے اٹھنا، عبادت کرنا، مطالعہ کرنا،
دوسروں کے ساتھ ہمدردی برتنا۔ یہ سب باتیں بچہ بڑوں کو دیکھ کر سیکھتا ہے۔ اگر
بچے کے آس پڑوس کا ماحول ٹھیک ہے، گھر کی فضا خوشگوار ہے، تو بچہ زندگی کی
بہت سی اچھی باتیں بہت جلد سیکھ جائے گا۔ مہذب کہلائے گا۔ برخلاف اس کے اگر گھریلو
ماحول میں کسی قسم کا انتشار ہے۔ اس کے گردوپیش کا ماحول گندا ہے تو بچہ غیر مہذب
ہو جائے گا، بگڑ جائے گا۔

۷۔ مقابلہ:۔

بچہ میں دوسروں سے اپنا تقابل کرنے کی خوبی ہوتی ہے۔ اسی فطرت کے سبب بچے دوسرے بچوں پر سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ پڑھائی، لکھائی، کھیل کود، رہن سہن اور دوسری اچھی باتیں، ان سب کے سلسلے میں بچوں میں مقابلے کا جذبہ ہوتا ہے۔ مقابلے کے دو پہلو ہیں۔ ایک رشک دوسرا حسد۔ رشک کے تحت بچہ دوسرے بچوں سے آگے بڑھنا چاہتا ہے لیکن وہ کسی دوسرے کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔

حسد میں بچہ دوسرے بچہ سے جلنے لگتا ہے۔ اس کو نقصان پہنچا کر خود آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ مقابلے کا پہلو "رشک" بچے کے لیے بہت فائدہ مند ہے لیکن دوسرا بے حد نقصان دہ ہے۔ پڑھنے لکھنے میں عموماً رشک کا مادہ بچوں میں ہوتا ہے حسد کہ حسد کھیل کود کے سلسلے میں زیادہ ہوتا ہے، بچے کھیل میں ایک دوسرے کو گرا دیتے ہیں، مارتے ہیں اس لیے مقابلے کا جذبہ جب تک یکساں اور صحت مند انداز میں نہ ہو بچّے کی نشو و نما پر برا اثر پڑتا ہے۔ حسد کا جذبہ تو بچے میں پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر بچے میں صحیح طور پر مقابلے کا جذبہ پیدا ہو گیا تو وہ بہت عقلمند، سمجھدار، تیز، بہادر اور باہمت بنے گا۔

۸۔ ہمدردی کا جذبہ:۔

ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے۔ انسان کے علاوہ کسی دوسری مخلوق میں یہ جذبہ نہیں پایا جاتا۔ ہمدردی کا یہ جذبہ بچہ اپنے آس پاس کے ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ یہ جذبہ بہت اہم ہے۔ اس سے بچے کے کردار میں ایک قسم کا میٹھا پن آجاتا ہے۔ اس کی شخصیت پر اثر اور پرکشش ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس جذبہ کو بھی بچے کی فطرت میں صحیح ڈھنگ سے ابھارنے کی ضرورت ہے۔

قوتِ مُتخیلہ:۔

بچوں کے تخیل کی پرواز بہت تیز ہوتی ہے۔ چار پانچ برس کی عمر کے بعد ہی بچے

کا ذہن تیزی سے کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہو کر سامنے کی چیزوں کے بارے میں مختلف سوالات کرتا ہے اور ان ہی سوالات اور جوابات کی مدد سے آہستہ آہستہ اس کے تخیل کی نشوونما ہوتی ہے۔ وہ قدرتی مناظر سے محظوظ ہوتا ہوا، دوڑتا ہوا، کھیلتا ہوا اور دل ہی دل میں لاتعداد غیر ممکن باتوں کو ممکن بنا کر اپنے تخیل کے تانے بانے بنتا رہتا ہے۔ علم نفسیات میں تخیل کو ذہن کا وہ فعل مانا گیا ہے جس کے ذریعے کسی بھی شے کی عدم موجودگی میں اس کا ہو بہو احساس ہوتا ہے۔ ولیم جیمس لکھتا ہے:

"Sensation, once experienced, modify the nervous organism, so that copies of them arise again in the mind after the original outward stimulae is gone No, mental copy, however, can arise in the mind of any kind of sensation which has never been directly excited from without [1]

ولیم جیمس کے اس اقتباس کی روشنی میں تخیل اور پرانی یادوں میں زبردست فرق نظر آتا ہے۔ پرانی یادیں تو کسی بھی چیز کی ہو بہو شکل پیش کرتی ہیں جب کہ تخیل کا کمال یہ ہے کہ ماضی اور حال کے تجربات کی بنا پر نئے خیالات پیدا کرتا ہے کے بارے میں لال جی رام شکل لکھتے ہیں:

"कल्पना वास्तविक जगत की मौलिकता का बढ़ाती है जिस व्यक्ति की जिस प्रकार की कल्पना होती है, उसको उसी प्रकार का संसार दिखाई देता है। हम अपनी कल्पना द्वारा वास्तविक संसार की कष्टों, का सरलता से निवारण कर सकते, दुखो में रहकर सुखों का आनन्द ले सकते है।"[2]

جس انسان کا تخیل جس قسم کا ہوگا اس کو دنیا ویسی ہی نظر آتی ہے۔ تخیل کی مدد سے انسان اپنی زندگی کو رنگین سے رنگین تر بنا سکتا ہے۔ دکھ میں سکھ کا احساس

---

1 William James, "Principles of Psychology" Vol II, Page 44

2 लालजी राम शुक्ल, " बाल मनोविज्ञान" पृष्ट 218

کر سکتا ہے۔ تخیل ابتدا میں اپنے ماحول کے دائرے تک ہی محدود ہوتا ہے۔ بچہ اپنے آس پاس جو کچھ دیکھتا ہے وہ اپنے والدین اور بزرگوں سے جو کچھ سنتا ہے، اس کا تخیل کرتا ہے۔ گھوڑے کی سواری نہ کر پانے پر ایک موٹے ڈنڈے کو ٹانگوں کے بیچ میں دبا کر گھوڑا بنا لیتا ہے منہ سے ٹک ٹک کی آواز نکالنا، بچوں کا ایک دوسرے کے دامن کو پکڑ لینا اور چھک چھک کی آوازیں نکال کر ریل بنا لینا، ڈاکٹر بن کر بیمار گڑیا کو دیکھنا، یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو بچے کے ماحول اور اس کے تجربات کی دین ہیں۔ بچے میں تخیل کی یہ صلاحیت تجربات کے ساتھ اسی منفرد عادت اور فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ کہانی سنتے سنتے بچے کے ذہن میں اچانک ایک منظر ابھر آتا ہے اور جیسے جیسے کہانی بڑھتی ہے بچے کا تخیل بھی بچے کو اس منظر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھاتا ہے۔ اس طرح بہت سی غیر معین اور ان دیکھی چیزوں اور باتوں کی بچے کے ذہن پر ایک تخیلی شکل بن جاتی ہے۔ جانوروں اور پرندوں کی کہانیاں سن کر ان سے ویسی ہی باتیں کرنا اور اپنی تخیلی دنیا کی تصاویر کو حقیقت کی شکل دینا بچے کو بھاتا ہے۔ کہانیوں کے ذریعے اس کی قوت متخیلہ بڑھتی ہے۔ مگر آج کے دور میں خیالی کہانیوں کا تاثر بہت محدود ہو گیا ہے۔ جدید سائنٹفک انکشافات نے ہمارے بہت سے نظریات کو متاثر کیا ہے اور ان کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ آٹھ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے بچہ حقیقی دنیا کو سمجھنے لگتا ہے اور بے بنیاد باتوں کا تخیل اب بچے کو پسند نہیں آتا۔

ہیڈ فیلڈ لکھتا ہے:

"Fairy tales are really symbolic of abstract ideas and the boy or girl of this age is concerned not with the abstract but with practical achievements His imagination is occupied with the wonderful things, he can and will do and so he is not interested in fairy tales "[1]

بچے کے تخیل کی نشو و نما کے سلسلے میں کہانیوں کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی

---

1 J&A, Hadfield, "Childhood and Adolescence " Page 156

افلاطون (PLATO) نے کہا تھا کہ گھر کی عورتوں کو اچھی اچھی کہانیاں یاد کرائی جائیں۔ جو وہ اپنے بچوں کو سنائیں۔ اس کا کہنا ہے کہ بچوں کو ایسی کہانیاں قطعی نہ سنائی جائیں جو ان میں غیر اخلاقی باتوں کو جنم دیں۔ کہانیاں وہی اچھی ہوں گی جو بچوں کو زمانے کے ساتھ آگے بڑھائیں۔

بچوں کی قوت متخیلہ کو بڑھانے میں اداکاری (ACTING) کی بھی اہمیت ہے اداکاری سے بچوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت کو بھی سمجھنے لگتا ہے۔ اداکاری کے ذریعے بچے میں تعمیری تخیل پیدا ہوتا ہے۔ اس کا ایک نظریہ بن جاتا ہے اداکاری کرتے وقت بچہ یہ جانتا ہے کہ وہ جو رول (ROLE) ادا کر رہا ہے، وہ حقیقی نہیں ہے بلکہ تخیلی شکل ہے۔ اداکاری سے بچوں کے خیالات اور افکار میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

الغرض قوت متخیلہ بچوں کی نشوونما اور ترقی میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔

ادب اطفال میں بچوں کی نفسیات :-

"بچوں کے ادب" پر این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کے منعقدہ ایک سیمینار کے ورکشاپ میں پریا کپور نے بچوں کی نفسیات اور ادب اطفال کے رشتے پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :

"Knowing children and knowing good books are two sides of the coin We need the books to fire a child's imagination and take him to a wonderful world of fact and fiction "[1]

---

1. Praya Kapoor, "Child psychology and children literature a paper read in the symposium and prize competition for children's literature from 28 January to 30 January 1980 Organized by N.C.E.R.T., New Delhi.

بچوں کی کتب کے پڑھنے کے سلسلے میں ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ کتاب پڑھنے سے بچے کا ذہن تیزی سے بڑھتا ہے۔ اس لیے بچے میں مطالعہ کی دلچسپی اور عادت کو فروغ دینا بہت ضروری ہے۔ پڑھنا صرف دماغی فعل ہی نہیں اس کے ذریعے احساسات اور جذبات کا بھی ارتفاع ہوتا ہے۔ مطالعہ سے مزاج، دلچسپی، خوشی، ہمت، لگن اور خواہشات میں اضافہ ہوتا ہے بچے کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔

پڑھنے کے سلسلے میں ولیم گرے کا کہنا ہے کہ

"روزمرّہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے رہن سہن اور زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے اپنے ذہنی اور جسمانی نشوونما کے لیے شہریت اور انسانی افکار کی وسعت کے لیے دنیا کو سمجھنے کے لیے مذہبی ضروریات کو بڑھانے اور ان کو پورا کرنے کے لیے مطالعہ بہت ہی ضروری ہے۔ زندگی کو رنگین بنانے میں کتابوں کی بہت اہمیت ہے۔"[1]

اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر رقمطراز ہیں:

"بچہ اپنی عمر اور جسم کی بنا پر تو کمزور اور ناتواں ہوتا ہے لیکن دوسروں کا سلوک اس میں عدم تحفظ کے جن شدید احساسات کی آبیاری کرتا ہے وہ اس میں مزید ناتوانی کا احساس پیدا کرتے ہیں یوں کہ وہ خود کو بالکل بے بس بے کار، اور بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ ایسے میں کتاب اس کی ہمت بندھاتی ہے چنانچہ وہ (بچہ) کہانیوں کے کرداروں کے ساتھ اپنی نفسی تطبیق کر لیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ محض قاری سے بڑھ کر ہیرو بن جاتا ہے۔ ادب کی اثر پذیری میں تطبیق کی اپنی نفسیاتی اہمیت ہے۔"[2]

کتاب کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بچوں کو تو رنگین اور دلکش کتابوں سے شروع سے ہی دلچسپی ہوتی ہے۔ ابتدا میں بچے صرف تصاویر دیکھ کر ہی خوش ہو لیتے ہیں۔

---

[1] ولیم ایس گرے دی ٹیچنگ آف ریڈنگ اینڈ رائٹنگ ص ۲۲۵

[2] ڈاکٹر سلیم اختر "بچہ اور کتاب۔ نفسیات کی روشنی میں" ماہنامہ ماہ نو (لاہور) نومبر سنہ ۱۹۷۹ء ص ۵۵۔ چیف ایڈیٹر کشور ناہید۔

پھر جیسے جیسے ان کی واقفیت زبان اور پڑھنے کی استعداد بڑھتی جاتی ہے۔ کتابوں سے ان کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جب وہ اپنے بڑوں کو کتابیں پڑھتے دیکھتے ہیں، جب بڑے ان کو کتابوں سے کہانیاں سناتے ہیں تو بچے بھی ان کو خود پڑھنے کے لیے بے چین ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی میں بچوں کے ادب کو زبردست اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ قبل ازیں بچوں کے لیے اتنی زیادہ مطبوعہ کتب نہیں تھیں۔ آج بہت کم ایسے گھر ہوں گے جن میں بچوں کے لیے کتابیں نہ ہوں۔ جہاں کوئی نہ کوئی اخبار یا رسالہ نہ آتا ہو۔ آہستہ آہستہ اخبار اور رسائل کے خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ بچوں کے اخبار اور رسائل بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ بچے اچھی کتابیں پڑھ کر نہ صرف خوش ہوتے ہیں بلکہ مطمئن بھی ہوتے ہیں۔ بچوں کے اس ماحول نے خود ان کی نفسیات کو متاثر کیا ہے۔

بچوں کی کتابوں کے سلسلے میں یہ نظریہ واضح طور پر سامنے آیا ہے کہ وہ جن کتابوں کو پسند کرتے ہیں، وہی کتابیں بچوں کے ادب میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ لیکن بچوں کے لیے لکھی ہوئی تمام کتابوں کو بچوں کے ادب میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ مطالعے سے بچے کی رغبت ان کے فطری رجحانات کے تحت بڑھتی ہے، پہلے اسے کتاب کی ظاہری دل کشی متاثر کرتی ہے اور بعد میں اس کا موضوع اور اس کا اسلوب اپنے اثرات مرتسم کرتا ہے۔

بچوں کے لیے لکھنا ہر ادیب کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ایک باقاعدہ اور علاحدہ فن ہے۔ ایک ایسا فن ہے جس میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ذرا سی لغزش سے مصنف کا مقصد فوت ہوسکتا ہے۔ اور وہ تصنیف بے روح ہو جائے گی۔ یہ بہت مشکل اور قیمتی فن ہے۔ اشاعت کا یہ وہ میدان ہے جس میں ناشر، مصنف، آرٹسٹ تینوں مساوی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ اجتماعی کام (TEAMWORK) ہے اور ان تینوں میں سے کسی ایک کے کمزور پڑنے پر بچوں کے لیے اچھی کتب تیار کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

بچوں کے ادب کی خصوصیات میں سادگی اور سادہ اسلوب بیان ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی اچھی کہانیاں، نظمیں اور ڈرامے بچے کی دلچسپی کو ابھارنے میں ناکام رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا انداز بیان، بچوں کی نفسیات کے اعتبار سے غیر دلکش ہوتا ہے یا بچوں کی اپنی زبان میں نہیں ہوتا۔ بچے کے دل میں دنیا اور آس پاس کی چیزوں کے بارے میں جاننے کی جو خواہش ہوتی ہے اسے شروع سے ہی آسودہ کرنا ہوگا اور یہ

کام اچھی طرح بخوبی کر سکتی ہیں۔ بعض کتابوں میں موضوع اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا بچے کچھ بھی نہیں جانتے اور مصنف ہی سب کچھ جانتا ہے۔ وہ ایسے انداز میں بچوں کے لیے یہ کچھ موضوع پیش کرتا ہے کہ وہ پر تاثیر نہیں ہوتا۔ دقیق اور مشکل الفاظ پر مشتمل جملے، بچے کے ذہن کو کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی جگہ گردش میں رکھتے ہیں اور وہ اصل مقصد تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ بچوں کے ادیب کا فرض ہے کہ وہ بچوں کے لیے جو کچھ لکھے وہ آسان اور بچوں کی اپنی زبان میں ہو۔ باعتبار عمر بچوں کی معلومات کا لحاظ رکھنا بھی ادیب کا فرض ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی دنیا کو خود دیکھے اور محسوس کرے۔ ان کی عادات واطوار اور دلچسپیوں کا مطالعہ کرتا رہے۔

بچے بہت حساس اور نرم و نازک دل کے مالک ہوتے ہیں ان کے احساسات اور جذبات کا خیال رکھنا والدین، اساتذہ، مصنفین، مولفین اور شعرا کا اولین فرض ہے۔ عمر کے اعتبار سے تین سال کی عمر تک بچے گھر اور آس پاس کی چیزوں کو پہچاننے لگتے ہیں تین سال سے چھ سال تک کی عمر کے بچے ایسی کہانیاں سننا پسند کرتے ہیں جن میں گھریلو ماحول کی جھلک ہوتی ہے۔ چوہے، بلی، طوطا مینا، کوا کتا، چور سپاہی کی کہانیوں سے بچے کو اس عمر میں بہت دلچسپی ہوتی ہے۔ قوت متخیلہ جیسے جیسے نشو و نما پاتی ہے "بچے" کی ہر چیز کو جاننے کی خواہش بھی اس کے ساتھ ساتھ فروغ پاتی ہے۔ چھ سال کی عمر کے بعد بچہ کا ذہن تیزی سے کام کرتا ہے۔ اس عمر میں گھریلو ماحول سے نکل کر دیکھنے اور باہر کی چیزوں کو جاننے کی خواہش ہوتی ہے۔ عمر کے اس دور میں پریوں کی کہانیاں جنگلی جانوروں کے قصے اس کی دلچسپی کا مرکز ہوتے ہیں۔ "پنچ تنتر" کی کہانیوں کی مقبولیت کا بھی راز ہے۔ یہی وہ منزل ہے جب بچہ بچپن سے لڑکپن کی طرف آتا ہے۔ اس کے ذہن میں جنگلی جانوروں مثلاً شیر، بھیڑیا، ریچھ، چیتا، لومڑی، گیدڑ وغیرہ کے بارے میں طرح طرح کے خیالات ہوتے ہیں۔ وہ ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے مضطرب رہتا ہے۔ بچہ ہر جانور کے بارے میں ایک نظریہ قائم کر لیتا ہے۔ مثلاً شیر جنگل کا راجہ ہے، وہ سب جانوروں پر حکومت کرتا ہے۔ لومڑی بہت خود غرض اور چالاک جانور ہے۔ بندر عقل مند ہوتا ہے۔ ان کے ذہن پر پریوں کا خوبصورت تصور ہوتا ہے۔ بچہ ان کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔ کوہ قاف کی سیر کرنا چاہتا ہے۔

جان پال نے اپنی کتاب "آپ بیتی" میں اسی جذبے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

"ان دنوں میں پڑھ بھی نہیں سکتا تھا پر اس سے کیا ہوا؟ میری بھی ایک کتاب ہو میرے دل میں یہ خواہش اس وقت بھی تھی۔ اس لیے میرے لیے بھی کہانیوں کی کتابیں لائی گئیں۔ میں نے ان میں سے دو کو چن کر سونگھا اور اپنی ماں کے گود میں پھینک دیا۔ ماں نے ان کتابوں کو دیکھ کر پوچھا۔

"تو تم پریوں کی کہانیاں سننا چاہتے ہو؟

میں نے تعجب سے پوچھا۔

"پریاں! کیا ان کتابوں کے اندر پریاں ہیں" کہانی سنی تو، وہی کہانی نکلی جو میری ماں مجھے نہلاتے وقت کئی بار سنا چکی تھیں۔ یہ کہانی سنتے ہوئے میں ایسی دنیا میں پہنچ جاتا تھا جہاں میرے اور پریوں کے علاوہ اور نہیں ہوتا تھا"۔[1]

اپنے بہت سے ناممکن کاموں کو ممکن بنانے کی بات بچے پریوں کے توسل سے ہی کرتے ہیں لیکن جب بچے کا تخیل حقیقی دنیا سے مطابقت پیدا کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ پری کوئی چیز نہیں ہوتی جو کچھ بھی کرنا ہے ہمیں خود کرنا ہے۔ اس احساس سے وہ با عمل ہو جاتے ہیں، مشکلات کو خود عبور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مہاتی کہانیوں سے ان میں ہمت اور بہادری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ عمر کے اس دور میں اخلاقی کہانیاں بھی فائدہ مند ثابت ہوتی ہیں۔ دراصل بچے کی زندگی کا یہ وہ نازک دور ہے جب اس کی شخصیت کی تعمیر شروع ہوتی ہے۔

اپنے والدین، بہنوں، بھائیوں کو بچے جیسا کرتے دیکھتے ہیں خود ویسا ہی کرتے ہیں۔ نقل کرنا ان کی فطرت میں داخل ہے۔ ڈراموں کی اہمیت بھی اسی وجہ سے ہے۔ ڈراموں کے ذریعے بچوں کے سامنے بہت سے واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ڈرامہ دیکھتے وقت "بچے" ان کرداروں میں کھو سے جاتے ہیں۔ ان کرداروں کی شخصیت سے

---

[1] ورڈس: "جان پال کی آپ بیتی" جز داوّل (ہندی)، مترجم ہری موہن شرما، مشمولہ ماہنامہ "کادمنی" جون ۱۹۹۶ء ص ۱۵۴ - ۱۵۵

متاثر ہوتے ہیں۔ ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں اس طرح بچوں کے کھیل اور اس کے تصرف میں ایسے ذرائع بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔

غنائیت اور موسیقیت کی وجہ سے گیتوں اور نظموں کو بچے جلد یاد کر لیتے ہیں چھوٹے چھوٹے معصوم بچے اپنے آس پاس کے کرداروں سے متعلق مختصر گیتوں کو بہت پسند کرتے ہیں اور انھیں آسانی سے یاد کر لیتے ہیں بچوں کو اخلاقی نظمیں بھی پسند آتی ہیں۔ اقبال کی مشہور نظم "دعا" کا نام مثال کے طور پر لیا جاتا ہے۔

حب الوطنی، بنی نوع انسان کی خدمت، کھیل کود وغیرہ سے متعلق نظمیں، اس قسم کے نفسیاتی تصوّرات بچے کی شخصیت پر اثر ڈالتے ہیں۔ "بچوں کے ادب" اور بچوں کی نفسیات دونوں میں گہرا تعلق اور رابطہ ہے۔ بچوں کی نفسیات کا بھر پور مطالعہ کے بغیر کوئی بھی ادیب ان کے لیے اچھی کتابیں نہیں لکھ سکتا۔ ادب اطفال کے لیے خود بچے ایک اچھی کسوٹی ہیں۔ کیوں کہ وہ اپنی دلچسپی اور رجحانات کے اعتبار سے ہی کتابیں پسند کرتے ہیں۔ بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ ہی بچوں کے ادب کی بنیاد ہے۔

بچّوں کا ادب اور عمر کے مختلف مدارج :۔

نفسیات نے بچّوں کی نشو ونما کی کئی منزلیں بتائی ہیں۔

۱۔ شیر خوارگی ——— (۱ تا ۲ سال)

اس عمر میں بچے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ بچّہ بالکل بے بس ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اعضا کو استعمال کرتا ہے اور کبھی کبھی اپنے اغراض کا اظہار بھی کرتا ہے۔ اس عمر میں بچہ بولنا، چلنا، دوڑنا وغیرہ سیکھتا ہے۔ اس کی خواہشات اور احساسات میں بتدریج اضافہ ہوتا ہے۔

۲۔ ابتدائی بچپن :۔ (۳ تا ۶ سال)

اس عمر میں جسمانی چستی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ ہر وقت کھیلنا چاہتا ہے۔ اس کو

یہ کھیل پسند ہوتے ہیں جس میں ایک ہی کام بار بار کیا جائے۔ ایسی کہانیاں یا نظمیں پسند کرتے ہیں جن میں کوئی فقرہ یا جملہ بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اس عمر میں بچے ایسے کھیل کھیلتے ہیں جن میں قدرے تخیل اور سمجھ بوجھ استعمال ہو۔ اس عمر میں بچے کی ہمت بڑھائی جائے تو بچہ اپنے تخیل اور سمجھ کا آزادی سے استعمال اور اظہار کرنے لگتا ہے۔ اس کی جسمانی چستی کو بڑھانے کی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں۔ اسے کسی کام کو کام کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ اس عمر میں بچے کے اندر تجسس اور تحقیق کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ بچے میں تقلید کا مادہ بھی عمر کی اس منزل پر پیدا ہوتا ہے اور بچے کی عادتوں اور اخلاق کی اصلاح و تعمیر کا زمانہ بھی یہی ہوتا ہے۔

۳۔ بچپن :۔ تبدیلی کا زمانہ ۶ تا ۸ سال

یہ بچے میں زبردست تبدیلیوں کی منزل ہے۔ اس منزل میں وہ کسی حد تک اپنے کو خود مختار تصور کرتا ہے۔ وہ اسکول میں داخل ہوتا ہے اور جماعتی احساس کا دور یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنے زیادہ سے زیادہ دوست اور ہمدرد پیدا کرنا چاہتا ہے اور والدین کی بہ نسبت وہ دوستوں کے ساتھ زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ اس عمر میں بچے کا جسم کافی تیزی سے بڑھتا ہے اور بچہ جلدی کام کرنے میں تھکن محسوس کرتا ہے۔

۴۔ بچپن کا آخری دور :۔ ۸ تا ۱۲ سال

یہ بچے کی زندگی کا سنہری دور کہلاتا ہے جس پر ماہرین نفسیات نے بہت غور و خوض کیا ہے۔ اس عمر میں بچہ عجیب قسم کی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کی طبیعت اور مزاج بدلتا رہتا ہے اگر اس منزل پر والدین یا سرپرست صحیح رہنمائی نہ کریں تو اس کا مضر اثر اس پر زندگی بھر رہتا ہے۔ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ اس زمانے میں بچہ اپنی کم سنی کے افعال کو دہراتا ہے۔ اس کا معیار کسی قدر بلند ضرور ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ہر لمحہ نئے نئے جذبات بچے کے دل میں ابھرتے رہتے ہیں۔

عنفوانِ شباب کا دورِ اوّل ۱۲ تا ۱۵ سال

اس دور میں بچے میں کام کرنے کی خواہش اور قوت پختہ ہوتی ہے۔ دماغی اور جسمانی چستی اس دور کی خاص خوبی ہے۔ بچے میں اخلاق اور مذہب سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اس دور میں بچے کی فطری محرکات اور جذبات پر کڑی نگاہ رکھنی پڑتی ہے کیوں کہ اس وقت اسے صحیح رہنمائی کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ اس عمر میں بچے اعلیٰ نصب العین کی طرف بآسانی مائل کیے جا سکتے ہیں۔

عنفوانِ شباب کا دورِ دوم۔ ۱۵ تا ۱۸ سال

عمر کے اس دور میں بچے کے عادات واطوار پختہ ہو جاتے ہیں۔ والدین اور معلّمین کا فرض ہے کہ بچے کے سامنے ایسا نصب العین پیش کریں جس کے ذریعے وہ اپنی آئندہ زندگی کا مطمعِ نظر متعین کر سکے۔ یہ بہت نازک دور ہوتا ہے۔ انسان کی شخصیت کی تشکیل و تکمیل اسی دور میں ہوتی ہے۔ ذرا سی بھی لغزش اس کے لیے زندگی بھر کا رونا بن سکتی ہے۔ اگر بچے پر اس دور میں کڑی نظر نہ رکھی گئی تو وہ بگڑ سکتا ہے اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جنسی خواہشات بیدار ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس طرف بھی نظر رکھنا لازمی ہے اگر وہ جنسی خواہشات کی طوفانی لہروں کا شکار ہو گیا تو اس کی زندگی متاثر ہو سکتی ہے، اس کے بڑھتے ہوئے جنسی جذبات کی رہنمائی ہم اچھے اور نفیس لٹریچر کے ذریعے کر سکتے ہیں۔ جس کا بیشتر حصّہ اخلاقی اور مذہبی تعلیم پر مشتمل ہو۔ اس عمر میں بچہ آزادی پسند اور خود دار ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ نہایت محبت اور شفقت سے پیش آنا چاہیے۔

"ادبِ اطفال" کا تعلق بچے کی دماغی نشوونما سے ہے۔ اس ادب کو بچوں کی عمر کے اعتبار سے دو مدارج میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ جو کہ تین سال سے چودہ سال تک کی عمر کا احاطہ کرتے ہیں۔ لڑکے کا بچپن پانچ سے دس برس تک اور لڑکیوں کا گیارہ سے چودہ برس تک مانا جاتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی جانے والی کتابوں پر ان ہی مدارج کی پابندی خاص طور پر عائد کی جاتی ہے۔ لیکن عمر کے مدارج کی تقسیم بچوں کے ادب،

میں قابل قبول نہیں۔ کیا اس پابندی کے تحت بچوں کا ادب لکھا جاسکتا ہے؟ کیا ادیبوں اور شاعروں کے لیے اس کا پابند ہونا ضروری ہے؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات، بچوں کے لیے کتابیں لکھتے ہوئے مصنف کے سامنے آتے ہیں۔ ان سوالوں پر غور کرنے سے قبل بچوں کی ذہنی نشو و نما سے متعلق مختلف ماہرین نفسیات کے تجربات اور ان کے نتائج پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔

بقول پال گیرلیسن، آج بچے کی ذہنی نشو و نما کے مطالعے کے سلسلے میں تین اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔

(۱) بچّے کی پرورش اور نشو و نما

(۲) ماحول اور حالات

(۳) ماحول کو متاثر کرنے والی نفسیاتی اور سماجی طاقتیں۔ لہ

بچّے کی پرورش اور نشو و نما:۔

دنیا کے ہر ملک کی آب و ہوا اور جغرافیائی حالات مختلف ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی ملک کے مختلف صوبوں کی آب و ہوا میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس آب و ہوا اور جغرافیائی کیفیت نے وہاں کی زندگی، تہذیب و تمدّن اور رسم و رواج کو بھی متاثر کیا ہے۔ ظاہر ہے ان تمام باتوں کا اثر بچوں کی نشو و نما پر پڑتا ہے۔ ایک ملک کے بچے دوسرے ممالک کے بچوں سے جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے مختلف ہوں گے۔ ہندوستانی اور سوویت بچوں کی نشو و نما میں یہ فرق نمایاں نظر آتا ہے۔ دونوں ممالک کے بچوں کی پرورش الگ الگ ڈھنگ سے ہوتی ہے۔ یورپین ممالک کے بچے نفسیاتی اصولوں کے تحت پرورش پاتے ہیں۔ جب کہ ہمارے ملک میں روایتی اور پرانا طور طریق چلا آرہا ہے۔

ماحول اور حالات:۔

ہر ملک کا ماحول اور حالات الگ الگ ہوتے ہیں مثلاً ایک آزاد ملک کے بچوّں

کی نشو و نما اور پرورش میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ غلام ملک کے بچے غلامی کا شکار ہونے کے سبب صحیح طور پر پرورش نہیں پاتے۔ پھر عصر حاضر میں زیادہ تر ملک ایسے ہیں جہاں بچوں کو سیاسی ضرورت کے تحت ایک خاص رنگ میں شروع سے ڈھالا جا رہا ہے۔ چین اور روس اس کی بہترین مثالیں ہیں اور ظاہر ہے کہ بچوں کو جیسا ماحول ملے گا ان کا ذہنی اور دماغی ارتقاء اسی نہج پر ہوگا۔

ماحول کو متاثر کرنے والی نفسیاتی اور سماجی طاقتیں

کسی بھی ملک کے ماحول کو سیاسی، سماجی، نفسیاتی طاقتیں متاثر کرتی رہتی ہیں اپنی تہذیب، اپنے یہاں کے رسم و رواج اور اپنے مذہب سے ہر انسان کو محبت اور لگاؤ ہوتا ہے اور وہ انھیں کے مطابق اپنے بچوں کی پرورش کرتا ہے۔ یہی کیفیت نفسیاتی طاقتوں کی ہے۔ چیکوسلواکیہ میں مائیں جنگ سے نفرت کرتی ہیں وہ اپنے بچوں کو بھی ایسی جنگوں سے نفرت کی تعلیم دیتی ہیں۔ اس کے برخلاف یورپ کے دوسرے ملکوں میں اپنے وطن کے لیے مر مٹنے کا جذبہ بچوں میں شروع سے ابھارا جاتا ہے۔

بچوں کے دل و دماغ اتنے لچکدار ہوتے ہیں کہ ان کو کوئی بھی رخ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وہ ارتقاء کے منازل طے کرتا ہے اس میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ ان تمام قیود کو توڑنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ آج کی دنیا میں یہ [illegible] (AGGRESSIVE) نوجوان انھیں وجوہ کی بنا پر ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔

"بچوں کے ادب" پر عمر کے مختلف مدارج کی پابندی عائد کرنا مناسب نہیں۔ اسمتھ[1] لکھتا ہے۔

".It is true that children go through stages in their reading as stages in their reading as in their physical growth. A child may turn from reading fairly tales to look about the vikings or still later to an Mars.."[1].

---

2. Lilian Smith, "A critical approach to children's Literature." Page, 15.

عمر کے ساتھ ساتھ بچوں کی معلومات، دلچسپی اور عادات واطوار میں تبدیلی آتی رہتی ہے ایسے حالات میں بچوں کے لیے کتابیں لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بچے میں ایک عادت ہوتی ہے۔ ہر نئی چیز کو پسند کرتا ہے جو چیز اسے پسند ہے اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ کوشاں رہتا ہے جو بچے بڑے اور سمجھ دار ہو جاتے ہیں وہ نئی نئی معلومات حاصل کرنے کے لیے مضطرب رہتے ہیں۔ ان کے سوالات اتنے الجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ایک مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ بچے کبھی کبھی ایسے سوالات کرتے ہیں جو ان کی عمر سے زیادہ کے ہوتے ہیں۔ اور ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ بچے کے ذہن میں ایسے سوالات کس طرح آئے آج کا دور سائنس کا دور ہے۔ دنیا بہت تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ یہ ترقی اور دن بدن بدلتا ہوا ماحول سماج اور سیاست کی تبدیلیاں بچے کی نفسیات کو بے حد متاثر کر رہی ہیں۔ بچہ ہر چیز کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آج کے بچے میں خود اعتمادی اور اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ بچوں کو شروع سے ہی کھلی آنکھ سے زندگی کو دیکھنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ بچے خود زندگی اور دنیا کی پہیلیوں کو بوجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سو سال قبل کے بچے کی جو حیثیت تھی وہ اب بدل چکی ہے۔ ان میں اب انسانی جذبہ بھی ابھر رہا ہے۔ ان حالات میں بھی اگر عمر کے مختلف مدارج کے تحت ہم بچوں کے ادب کو محدود کر دیں گے تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ عمر کے یہ مدارج بچوں کی نفسیات کے مطالعے اور بچوں کی ترتیب وار تعلیم کی غرض سے مقرر کیے گئے ہیں۔ بچوں کے ادب سے ان کا اتنا گہرا تعلق نہیں ہے جتنا کہ اس کی تعلیم سے ہے۔ درسی کتب کے سلسلے میں تو یہ پابندی لگا سکتے ہیں لیکن بچوں کی مختلف اصناف ادب پر یہ پابندی عائد نہیں کی جا سکتی اگر ایسا ہوتا تو آج جو کتابیں دنیا کے بچوں میں کلاسیکل مانی گئی ہیں وہ ناپید ہوتیں۔

اس ضمن میں کورنیلیا نے لکھا ہے:

"Most of the books, which regard as classics of children's Literature were written without children in mind and were taken over by them with cheerful disregard of what they could not understand. None of these were aiming at children." .

کلاسیکی کتب اگرچہ بچوں کے لیے نہیں لکھی گئی ہیں مگر بچوں نے ان کو اپنے ادب میں اپنا لیا ہے۔ اور یہ کتب تقریباً ہر عمر کے لوگوں کو مختلف قسم کی تفریح فراہم کرتی ہے۔ عمر کے مختلف مدارج اور بچوں کی نفسیات کا تجزیہ کرنے کے سلسلے میں میں نے اپنے ہی بچوں پر ایک تجربہ کیا۔ میرے تین بچے ہیں۔ صدف (عمر گیارہ سال) میری سب سے بڑی بچی ہے جو دہلی پبلک اسکول میں درجہ ہشتم کی طالبہ ہے۔ اس سے چھوٹا بیٹا عباس نو سال کا ہے جو اسکول ہٰذا کے درجہ چہارم میں ہے اور سب سے چھوٹا بیٹا میثم سات سال درجہ سوم میں ہے۔ ان تینوں کو کومکس (COMICS) اور کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔

صدف، عباس اور میثم کی مختلف عمروں کے اعتبار سے میں نے تین کتابیں خریدیں اور ہر کتاب پر الگ الگ تینوں بچوں کے نام لکھ دیے۔ اپنی دانست میں میں ان کے لیے بہت اچھی اچھی کتابیں لایا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے کہا۔ عباس! یہ کتاب تم پڑھو صدف یہ تمھاری کتاب ہے اور میثم تمھارے لیے تو میں بہت ہی عمدہ کتاب لایا ہوں اس میں بہت سے جانوروں کے بارے میں دلچسپ باتیں ہیں۔

اس طرح میں نے تینوں کی عمر کے مختلف مدارج کے اعتبار سے یہ کتابیں تقسیم کیں تھیں۔ بچوں سے مجھے بہت لگاؤ ہے اور اپنے تحقیقی مقالے کے سلسلے میں مختلف بچوں کی نفسیات اور عادات واطوار کا بغور مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ رات کو جب میں اپنے بچوں کے کمرے میں گیا تو معلوم ہوا کہ عباس میثم کی کتاب چپکے چپکے پڑھ رہا ہے، عباس کی کتاب صدف نے ایک چیونگم دے کر اس سے لے لی ہے اور صدف کی کہانی کی کتاب میثم کے زیر مطالعہ ہے۔ چوں کہ تینوں میں کتابوں کے سلسلے میں آپس میں کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے بھی مداخلت نہیں کی۔ اگر جھگڑا ہو جاتا (جیسا کہ عام طور پر بچوں میں ہوتا ہے) تو شاید مجھے مداخلت کرنا پڑتی لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ گیارہ سال کی صدف کو عباس کی کتاب پڑھنے کی کیا ضرورت تھی اور عباس کو میثم کی کتاب سے کیوں دلچسپی تھی،

ساتھ ہی میثم جو صرف سات سال کا ہے اسے صدف کی کتاب کیوں پسند آئی۔
اس کا جواب میرے خیال میں صرف یہ ہے کہ بچوں کی اپنی دلچسپیاں اور اپنی اپنی پسند
ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہی بات سب سے اہم ہے نہ کہ بچوں کی عمریں۔ آج "ادب اطفال"
میں بچوں کی مختلف عمروں کے مدارج کی طرف خاص طور پر توجہ دی جا رہی ہے۔ اور کہا جاتا
ہے کہ بچوں کے لیے کتابیں لکھتے وقت مصنفین کو ان کی عمروں کا خیال رکھنا چاہیے۔ حد یہ ہے
کہ لائبریری کے لیے کتابوں کے انتخاب میں بھی عمر کے اس فرق کے تحت درجہ بندی کی جاتی
ہے مگر کبھی اس نکتہ پر غور نہیں کیا جاتا کہ بچے عمر کی ان پابندیوں کو مانتے بھی ہیں یا نہیں!
اس سوال کا جواب نفی میں ہی ملتا ہے۔ چنانچہ عمر کے مختلف مدارج کی تعلیم "ادب اطفال"
کے لیے کوئی مناسب اصول نہیں ہے۔

بچوں کا ادب اور اس کے بنیادی عناصر

اکثر لوگوں کے ذہن میں اس غلط خیال نے گھر کر لیا ہے کہ بچہ دنیا کی سب سے زیادہ خوش و خرم اور مطمئن مخلوق ہے۔ جسے روزی کمانے کے لیے کسی قسم کی جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ جو فکرِ فردا اور غمِ دوش سے آزاد ہے جسے سب پیار کرتے ہیں اور جو اپنی ہر خواہش پوری کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

جہاں تک بچے کے غمِ روزگار سے آزاد ہونے کا تعلق ہے تو بالکل درست ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ خوشی کی نفسیات میں روزگار کا غم اگرچہ کچھ کردار ادا کرتا نظر آتا ہے مگر وہ کردار بنیادی نہیں ہوتا۔ بالغوں کی طرح بچوں کی خوشی کا بھی بڑی حد تک جذبات و احساسات پر انحصار ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی محدود دنیا کے مطابق اس کے جذباتی تقاضے اور ان کی تسکین نسبتاً ایک چھوٹے دائرے میں محدود ہوتی ہے۔ بچے کے جذباتی نشوونما میں اس کے والدین اور دیگر افرادِ خانہ کا اس کے بارے میں روا رکھے گئے طرزِ عمل سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔

بچہ جو چاہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے اپنے بزرگوں سے کرا لیتا ہے۔ اس میں حقائق کا اس حد تک دخل نہیں ہوتا جتنا کہ خیال میں ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے بچے اور بڑے دونوں، کھیلنا پسند کرتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ بڑے بہت کم آزاد ہوتے ہیں، وہ اپنے خیالات اور تفکرات کا شکار رہتے ہیں۔ وہ تفریح کا اہتمام اس لیے کرتے ہیں کہ غمِ روزگار کو بھلا سکیں۔

بچوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ صبح سے شام تک بلا تھکے کھیلتے رہتے ہیں، بھاگتے ہیں، ایک دوسرے کو مارتے ہیں، جھگڑتے ہیں، پڑھتے ہیں اور پھر کھا پی کر اتنی گہری نیند سوتے ہیں کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔

یہ سلسلہ صدیوں سے دنیا میں چلا آ رہا ہے۔ اب تک بہت کم لوگوں نے بچوں کی زبان ان کی باتوں، ان کی نفسیات، ان کی دلچسپیوں اور خواہشات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ بچوں کے جذبات اور احساسات، خواہشات کا والدین تک کو احساس و پاس نہیں ہوتا۔ ناچی کے اوراق پلٹنے سے اور بھی مایوسی ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمارے سماج میں بچوں کو شروع سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ البتہ خیالی پریوں اور کچھ کہانیوں کے کرداروں نے ضرور بچوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ سید امیر علی نے ابتدائی کہانیوں کے بارے میں لکھا ہے۔

"اکثر ہر دل عزیز کہانیوں اور لوریوں کی ابتدا زبانی (ORAL) طور پر ہوئی۔ لیکن جب کوئی کہانی، کوئی لوری یا پہیلی بچوں کی ایک نسل سے زیادہ نسل میں ہر دل عزیز اور رائج رہی تو پھر کسی ادیب کو ان زبانی حکایتوں یا پہیلیوں کو قلمبند کرنے کا خیال آیا۔ جیسا کہ ہم سب آج کے بڑے بوڑھے جو گزرے ہوئے کل کے بچے تھے، خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ بچپن کی کتنی ساری کہانیاں اور نظمیں ہم نے کتابوں سے نہیں بلکہ اپنے کسی بزرگ سے سنی تھیں اور بچے تو بچے بڑے بھی اس وقت لکھنے میں طاق نہ تھے۔ اس لیے بچوں کا ادب کتابی شکل سے زیادہ حکایات کی شکل میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا ہے۔"[1]

ایسی (زبانی) کہانیوں میں طرزِ بیان کا انحصار کہانی سنانے والے کی اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں پر زیادہ ہوتا تھا اور جتنا سنانے والا اس فن سے ماہر اور اس زبان پر عبور رکھنے والا ہوتا تھا اتنا ہی اس کو اس کے زمانے کے بچے پسند کرتے تھے۔

جیسے جیسے اقوامِ عالم کے درمیان باہم رسل و رسائل کی فراوانی ہوتی گئی ایک ملک اور قوم کا ادب دوسرے ملکوں اور دوسری اقوام تک سیاحوں، سفیروں اور تاجروں کی وساطت سے

---

[1] سید امیر علی: "بچوں کے لئے کیا لکھنا چاہئے؟" ماہنامہ کتاب (لاہور) جنوری ۱۹۷۰ء ص ۲۱ (مُدیر ذوالفقار احمد تابش)

پنچ تنتر اس سلسلے میں اہم ہے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ایک ملک کے بچوں کی پسندیدہ کہانی کسی نام سے مشہور ہے اور دوسرے ملک میں وہی کہانی اس ملک کی زبان میں کسی اور نام سے معروف ہے۔

قدیم زمانے میں بچوں اور بڑوں کے لیے الگ الگ ادب نہ تھا البتہ بچوں کی دلچسپی اور موضوع کے اعتبار سے بڑوں اور بچوں کے لیے کہانیوں اور گیتوں کو الگ الگ کیا جاتا رہا ہے۔ میگ کارنیلیا رقم طراز ہیں۔

"In that ancient world of primitive ideas and primitive impulses, there was little distinction between what entertained the elders and what entertained the young."[1].

انسانی زندگی میں مختلف اعتقادات، خیالات، رسومات اور تجربات نے جن کہانیوں اور گیتوں کو جنم دیا ہے وہی ہر عمر کے انسانوں کو ان کی عمر، ان کی دلچسپیوں اور ان کی نفسیات کے اعتبار سے تفریح کا سامان اور معلومات فراہم کرتے رہے ہیں۔ یہ خیالات، نظریات، رسومات، عقائد اور تجربات جب بھی بدلے کسی نئی تخلیق نے جنم لیا۔ اس طرح کہانیوں اور گیتوں کا ایک بڑا ذخیرہ اکٹھا ہوتا رہا۔ لوک گیت اور کہانیوں نے مختلف چولے بدلے لیکن لوک گیتوں اور کہانیوں کا میدان ہمیشہ سے وسیع رہا۔ صدیوں سے گاؤں کے لوگ جاڑے کے زمانے میں آگ کے پاس بیٹھ بیٹھ کر کہانیاں سنایا کرتے ہیں۔ دادیاں اور نانیاں بچوں کو سلانے کے لیے لوریاں اور چھوٹی موٹی کہانیوں کا سہارا لیتی رہی ہیں۔ ڈاکٹر کرشن دیو اپادھیائے نے لکھا ہے۔

"जन मन के मनोरंजन के लिये गाँवों में स्वांग नाटक भी खेले जाते हैं। जिन्हें देखने के लिये दूर-दूर से लोग आते हैं। गांव के लोग अपने दैनिक व्यवहार में कहावतें, मुहावरे और [illegible] का प्रयोग करते हैं छोटे-2 बच्चे खेलते समय अनेक प्रकार के [illegible] [illegible] सीख जाते हैं। जब कभी मौज [illegible] [illegible], लोक साहित्य के [illegible] [illegible] है। इस प्रकार लोक-साहित्य मानव के जन्म से लेकर मृत्यु तक है, सब [illegible] स्त्री-पुरुष, बच्चे [illegible] [illegible] [illegible] सभी लोगों की सम्मिलित सम्पत्ति है।"[2].

---

1. Meigs, Cornelia, " A Critical History of Children's Literature." Page.4.

2. डा० कृष्ण देव उपाध्याय, "हिन्दी साहित्य का बृहत इतिहास" [illegible] 16

اس عالمی یا عالمگیر ادب میں جس حصے کے بچے حق دار ہیں وہ معیار اور مقدار کے اعتبار سے کم اہم نہیں ہے۔ چارلیس فرانس نے تمام عوامی ادب کو بچوں سے متعلق تسلیم کیا ہے۔

"Hence, fold-lore is always the delight of childien because it is the poetic wisdom of the childhood of the race. It is also the pleasure of the old who are wise-enough to renew their youtn by rebaptism in the enternal simplicities in completing the circle of life." (Charles Francis Potter, Standard Disctionary of Folk-lore, Mythology & Legal. Page 401)

بچوں کو اپنے تجربات کی دلچسپ کہانیاں سناتے وقت بڑے کئی بار خود میں بچوں جیسی عادات و اطوار، نفسیات نیز بچوں کی طرح دلچسپی محسوس کرتے ہیں اگر ایسا نہ کریں تو وہ کہانی یا قصہ، بچوں پر اثر انداز نہ ہو۔ بچوں کی ضد ماننا، توتلی زبان میں ان سے بات کرنا، بچوں کا ساتھی بننا — یہ تمام باتیں بڑوں کے بچپنے کی علامات ہیں جو لوگ بچوں کے ساتھ ان جذبات اور احساسات کا اظہار نہیں کر پاتے وہ بچوں کے ساتھ نہ تو کسی قسم کا رابطہ قائم کر سکتے ہیں اور نہ بچے ان کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس لیے عالمی ادب کا وہ حصہ جس میں بچے دلچسپی لیتے ہیں بہت ہی نفسیاتی عوامل کا حامل ہے۔ اس کی تخلیق اور نشر و اشاعت نیز ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کے طریقے بھی نفسیاتی ہیں۔ کہانیوں میں دلچسپ اور جوشیلے کارنامے، دل کش مناظر، بچپن کے پسندیدہ جانوروں کے تذکرے، چھوٹے چھوٹے گیتوں میں الفاظ کی تکرار، یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جو نفسیات کے مطالعے کے بغیر غیر دلچسپ رہیں گی۔ کھیل کے گیتوں میں بچوں کے جذبات لوریوں میں ترنم اور بچے کے جذبات میں نشو و نما اور اچھے مستقبل کی خواہش یہ سب عناصر ایسے ہیں جو عوامی ادب کو بچوں کا ادب بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ادب کو ہم ادب اطفال کہہ سکتے ہیں۔ بچوں کے لیے عوامی ادب میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ نہایت آسان اور عام فہم زبان نیز دلکش اسلوب میں پیش کیا گیا ہے بقول سید امیر علی:۔

"دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کرۂ ارض کے بسنے والے بچوں کے لیے اپنے

اچھے زمانے کے مصنفوں نے جو کہانیاں اور گیت یا اسباق لکھے ہیں وہ اس بات کی شاہد ہیں کہ ان سب نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ جو الفاظ، اصطلاحات اور محاورے بچوں کے ادب میں استعمال کیے ہیں ۔ وہ بچوں کے لیے عام فہم، سہل اور روزانہ استعمال میں آنے والے ہوں۔"(۱)
بچوں کے ادب کو ہم مندرجۂ ذیل اصناف میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) افسانوی ادب۔ (الف) کہانی (ب) ناول۔
(۲) ڈراما
(۳) غیر افسانوی ادب، سائنسی ادب۔ معلوماتی ادب۔
(۴) شاعری۔

افسانوی ادب

(الف) کہانیاں

کہانی کہنا اور سننا ایک ایسا عمل ہے جس کا آغاز موسیقی اور رقص کے ساتھ ہی ہو گیا تھا بلکہ ایک نظریہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کہانی موسیقی اور رقص سے بیشتر ظہور پذیر ہوئی۔ محققین اس نظریہ کے حامی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب کرۂ ارض پر انسان نے مل جل کر رہنا شروع کیا تو اس وقت مرد قوت لا یموت کے حصول کی خاطر غاروں سے باہر نکل کر جانوروں کے شکار میں مصروف ہو جاتے تھے اور ان کی عورتیں دل بہلانے کی خاطر اپنے مردوں کے شکار کے واقعات سنایا کرتی تھیں۔ یہ واقعات وہ اپنے انداز سے، اپنے تخیل سے کام لے کر مبالغہ اور آوازوں کے زیر و بم کے ساتھ آنکھوں، ہاتھوں اور ٹانگوں کی حرکات کے ساتھ جوش اور دلچسپی سے بیان کرتی تھیں اس سارے طریقہ کار کو کہانی کی اولین شکل قرار دیا گیا ہے۔

کہانی نسل انسانی کی سب سے قدیم صنف سخن ہے۔ جس کے سبب کہانی سے نسل

انسان کی دلچسپی ایک فطری امر ہے۔ دنیا کا کوئی ایسا معاشرہ، ملک یا خطہ دریافت نہیں ہوا جہاں کہانی کسی نہ کسی شکل میں موجود نہ ہو۔ فرق یہ ہے کہ جو قومیں ترقی کے مدارج اور مراحل سے گزر چکی ہیں ان کی کہانیاں ان کے ادب کا ایک نمایاں حصہ بن گئی ہیں۔ اور ہم ان میں سے اکثر کہانیوں کو اپنی اپنی زبان میں بھی پڑھ سکتے ہیں نیز جو معاشرے نوشت و خواند کی صلاحیتوں سے ابھی تک محروم ہیں ان کی کہانیاں سینہ بہ سینہ سفر کرتی رہتی ہیں اگر یہ کہانیاں ہم تک پہنچی بھی ہیں تو ان لوگوں کی زبانی ہیں جن کا تعلق ان معاشروں سے نہیں ہے بلکہ سیاحوں، تذکرہ نویسوں اور سفرناموں کے توسط سے۔ ان کہانیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کہانیاں سننے سنانے میں ہم سے کس قدر مختلف ہیں اور وہ تہذیبی لوازم جن سے ہماری کہانیاں بہرہ ور ہیں، اس سے ان کہانیوں کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔

ڈاکٹر سیفی پریمی نے دنیا کی چند قدیم کہانیوں کے بارے میں لکھا ہے۔

"دنیا میں کہانی کا رواج قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ مصر و بابل کے افسانے ایسپ کی کہانیاں (حکایات لقمان) کافی مشہور ہیں۔ اپنشد میں ایک تمثیل ملتی ہے کہ کتوں نے جمع ہو کر ایک سردار کو چنا اور کھانا مانگنے کے لیے شور کرنا شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کی پہلی لکھی ہوئی کہانی ہے۔ اس کے علاوہ مہابھارت میں بہت سی کہانیاں درج ہیں۔ اس کے بعد جاتک کہانیاں ملتی ہیں۔ یہ وہ پالی کہانیاں ہیں جو گوتم بدھ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ حیوانی کہانیوں کے لیے جاتک کے بعد سنسکرت کی مشہور کتاب "پنچ تنتر" ملتی ہے۔"(۱)

اصنافِ ادب میں بچوں کو کہانی سب سے زیادہ پسند ہے۔ کہانی میں بچوں کی دلچسپی اور پسند کے بارے میں مشیر فاطمہ رقمطراز ہیں:۔

"بچوں کی دلچسپی کہانی میں اس لیے بھی ہوتی ہے کہ اس میں کوئی واقعہ ہوتا ہے، بچہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ واقعہ کہاں ہوتا ہے، کن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے؟ جگہ اور لوگ اس لیے اہم ہیں کہ وہ اس واقعہ کا جزو ہوتے ہیں

۱۔ ڈاکٹر سیفی پریمی "حیات اسمٰعیل" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی [illegible] ص ۲۲۱

بھی سوچتے ہیں کہ کہانیاں پڑھنے سے بچہ کیا ان سے جو علم نتائج کے واقعات کیوں
اور کیسے ہوتے ہیں؟ لیکن دیکھیے سوال یہ ہے کہ وہ بچے کے ذہن میں یہ سوال
پیدا کرے کہ اب کیا ہوگا؟ اس طرح کہانی میں تجسس اور خواہش کی فضا پیدا ہو جاتی
ہے۔"[1]

کہانی خواہ بڑوں کے لیے ہو یا چھوٹوں کے لیے اس کا گہرا اور بنیادی تعلق اپنے معاشرے اپنے
عہد اور اپنے جغرافیائی کوائف سے ہوتا ہے۔ کردار تو خیر ہر قوم اور ہر ملک کے اپنے ہوتے
ہیں ان کے علاوہ ہر کہانی کا اپنا مقامی رنگ ہوتا ہے۔ کہانی کے توسط سے سنجیدہ، علمی اور
سائنسی مضامین بھی اتنے لطیف اور دلکش بن جاتے ہیں کہ بچے انھیں بآسانی قبول کر لیتے
ہیں۔

اسٹینڈرڈ ڈکشنری آف فاک لور میں کہانی کی خوبیاں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہیں۔

"It will be seen that the characteristic feature of the fold-tale is the fact that it is traditional. It is handed down from one person to another and there is no virtue in originality. This tradition may be purely oral. The tale is heard and is repeated as it is remembered, with or without additions or changes made by the new teller."[2].

اسٹینڈرڈ ڈکشنری آف فاک لور کی تعریف دراصل فاک ٹیل کے بارے میں ہے۔[2]
ہندوستانی زبان میں ہم اسے لوک کہانی کہتے ہیں۔ لوک کہانیاں دنیا بھر میں مشہور ہیں اور
روایتی انداز میں سینہ بہ سینہ چلی آنے والی زبانی کہانیاں ہیں یہ کہانیاں زندگی کے جن حقائق
اور تجربات سے گزر کر بچوں تک آتی ہیں ان سے بچوں کو تفریح اور دلچسپی کے ساتھ مستقبل

۱؎ مشیر فاطمہ، بچوں کا ادب کی خصوصیات، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۶۲ء ص ۶۷

2. Standard Dictionary of Fold-lore, "Mythology & Legend." Page 408-409.

کے لیے رہنمائی بھی ملتی ہے۔

مجموعی طور پر، کہانی، میں درج ذیل خصوصیات ہونی چاہئیں۔

۱۔ کہانی دلچسپ ہونی چاہیے۔ یہ چھوٹے بچوں کے لیے ہو یا بڑوں کے لیے۔ اس میں تجسس و تجربات بہت ضروری ہیں۔ آگے کیا ہوگا؟ یہ سوال بچوں کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔

۲۔ کہانی میں ایسے واقعات بیان کیے جائیں جو بچوں کے ذہنوں پر منفی اثر نہ ڈالیں۔ مثلاً یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کہانی میں دہشت انگیز عنصر کو اس قدر اہمیت دے دی جائے کہ بچہ دہشت زدہ ہو کر رہ جائے۔

۳۔ بچوں کو سچی کہانیوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی ان کو ایسی کہانیاں اچھی لگتی ہیں جن میں حادثات ہوں، مبالغہ ہو لیکن ایسے حادثات اور واقعات سچے بھی ہو سکتے ہیں۔ کہانی میں جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں وہ خیالی ضرور ہوتے ہیں لیکن یہ واقعات ہماری روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں یا آسکتے ہیں۔ اس طرح کہانی کسی حد تک سچی ہوتی ہے اور اس قسم کے واقعات پڑھ کر بچوں کو جو تجربہ حاصل ہوتا ہے وہ خود ان میں دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ ان کے خیالات میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ اور ان کے لیے خیال آرائی کا موقعہ فراہم کرتا ہے۔

۴۔ جب ہم کہتے ہیں کہ بچوں کی کہانی کو اصولاً بچوں کی کہانی ہونا چاہیے تو اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ زبان سلیس اور آسان ہو بلکہ یہ بھی کہ کہانی میں جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ ان بچوں کی ذہنی استعداد سے فطری مطابقت بھی رکھتا ہو جن کے لیے یہ کہانی لکھی گئی ہے۔

۵۔ کوئی کہانی چاہے خواہ وہ بڑوں کے لیے لکھی گئی ہو یا بچوں کے لیے اس کی پرکھ یہ ہے کہ پڑھنے والے کو اس سے کیا تجربات حاصل ہوتے ہیں اس کا انحصار اس بھی ہے۔ کہ ادیب کو اپنے مضمون طرزِ تحریر اور زبان پر کتنی قدرت حاصل ہے۔ کسی کہانی کا موضوع معمولی اور اس کا اسلوب بیان دلچسپ ہوتا ہے۔ کسی کا موضوع دلچسپ ہوتا ہے اور انداز بیان میں وہ دلکشی نہیں ہوتی۔ موضوع، خیال اور اسلوب بیان تینوں میں ربط ہو تو پڑھنے والا اس کی سچائی اور اہمیت کو محسوس کرتا ہے۔

۶۔ کہانی کا تخیلی ہونا بہت اچھی بات ہے۔ لکھنے والے کو اسے اس انداز میں پیش کرنا چاہیے کہ سننے اور پڑھنے والے بچے اسے جھوٹ نہ سمجھیں۔ کہانی میں حقیقت پسندی کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مصنف بالکل سامنے کی بات لکھ دے۔ کہانی کا فن یا فنی کمال یہ ہے کہ وہ پڑھنے والوں یا سننے والوں میں یہ احساس جگا دے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے یا کہہ رہا ہے، وہ سچائی ہے۔

۷۔ ہمارا عہد تسخیر قمر کا عہد ہے۔ تسخیر کائنات کا عہد ہے۔ اس عہد میں بے سروپا اور محض تخیل زدہ کہانیوں کی افادیت نہیں رہ گئی ہے۔ البتہ ایسی کہانیاں ضرور ہوں جو ان کے تخیل کی نشوونما میں اضافہ کر سکیں۔ اس دور میں جو بچے سانس لے رہے ہیں وہ ذہناً پہلی نسلوں کے بچوں سے اگر بہت حد تک نہیں تو کافی حد تک ضرور مختلف ہیں۔ آج کا دور سائنس کا دور ہے پھر بھی تخیلاتی کہانیوں کو سرے سے رد نہیں کیا جا سکتا۔

غلام الثقلین نقوی کا کہنا ہے:

"اس سائنسی دور میں شاید لوگ کہیں کہ جنوں اور پریوں کی طلسماتی گرفت سے بچوں کو آزاد کرانا لازمی ہے تاکہ ان میں سائنسی ذہن پیدا ہو سکے لیکن کیا کیا جائے کہ ابھی انسان کا ذہنی ارتقاء اس نقطے پر نہیں پہنچ سکا جہاں وہ قطعاً معروضی ہو کر رہ جائے اس کا بچپن تو خاص کر بہت ضدی ہے اور تخیل کی اس دنیا سے نہیں نکل سکا ہے جہاں اب بھی اڑن کھٹولوں اور کل کے گھوڑوں پر پرواز کے مواقع ملتے ہیں۔ تخیلاتی دنیا کی یہ فرضی سیر اس کی جبلت کا ایک ایسا جزو لاینفک بن چکی ہے جو ہوائی جہاز اور چاند گاڑی پر اڑنے کے باوجود جوں کا توں قائم ہے۔" [1]

دورِ جدید میں تخیلی کہانیوں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر اطہر پرویز لکھتے ہیں:۔

"اگر انسان ان دیکھے سپنے نہ دیکھتا تو وہ نہ کوئی ہوائی جہاز اڑا سکتا نہ دریاؤں پر

---

[1] غلام الثقلین نقوی "بچوں میں ذوقِ ادب کیسے پیدا کیا جائے" ماہنامہ کتاب [illegible] ص ۱۹ (مدیر ذوالفقار احمد تابش)

چل جاسکتا۔ اگر وہ ایسے قصے کہانیاں نہ سنتا تو اس کے دماغ کو اتنی اچھی طرح سے سوچنے کی عادت بھی نہ پڑتی۔ آخر وہ سوچتے سوچتے خواب دیکھتے دیکھتے ایک ایسی دنیا بنانے میں کامیاب ہوگیا کہ جو اس دنیا سے ملتی جلتی ہو۔"[1]

بچے اس قسم کی کہانیوں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں جس میں ہماری روزمرہ کی زندگی کے واقعات ہوں یا پھر غیر معمولی حادثات ایسی کہانیاں عموماً سیدھی سادی ہوتی ہیں۔ ان کے لکھنے والوں کا مقصد تو صرف اتنا ہوتا ہے کہ سوت سے اچھا کپڑا بن لیا جائے۔ حادثات کے قصے عموماً بحری سفر، قزاقوں کی کھوج وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ مشیر فاطمہ رقمطراز ہیں:۔

"بحری سفر کے قصوں سے بچوں کو بڑی دلچسپی ہوتی ہے کیونکہ سمندر ان کو ایک نامعلوم دنیا میں لے جاتا ہے جس کی بے پناہ طاقت سے وہ مرعوب ہوتے ہیں جس کی اتھاہ گہرائیوں کے متعلق وہ جاننا چاہتا ہے۔ ادیب کے ساتھ خود خیال آرائی کرنے میں ان کو بڑا مزا آتا ہے۔ جہاز کے بھنور میں پھنس جانے کا منظر ان کو ڈرا تو ضرور دیتا ہے لیکن وہ سندباد جہازی کی مستعدی، جرأت اور ہمت کی داد دیئے بغیر نہیں رہتے۔"[2]

بات کو واضح کرنے کے لیے باعتبار موضوع کہانیوں کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ باتصویر کہانیاں

۲۔ داستان یا قصے

(الف) اساطیری داستانیں

(ب) روایتی قصے

۳۔ پریوں کی کہانیاں

۴۔ اخلاقی کہانیاں اور مذہبی کہانیاں۔

---

[1] اطہر پرویز: ادب کیسے کہتے ہیں، ترقی اردو بورڈ نئی دہلی، ۱۹۷۶ء ص ۶

[2] مشیر فاطمہ: بچوں کے ادب کی خصوصیات، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ۱۹۶۲ء ص ۱۱

- تاریخی کہانیاں
۲۰- جدید کہانیاں

باتصویر کہانیاں

بچوں کی دنیا بڑی رنگ برنگی ہوتی ہے۔ اور اس رنگ برنگی دنیا میں بچے خوبصورت رنگین اور رنگین تصاویر میں گم ہو جاتے ہیں۔ بچے معصومیت کے ساتھ ٹیڑھی سیدھی لکیریں کھینچ کر سمجھتے ہیں کہ بہت اچھی تصویر بنائی ہے۔ دراصل بچّے کی پہلی زبان ہی تصویر ہے۔ ڈاکٹر شیلندر ورما کا کہنا ہے کہ تصویروں کے ذریعے زبان کی تعلیم دینے میں بہت مدد ملتی ہے۔

"भाषा ज्ञान में चित्रों का विशेष महत्व है। चित्र के माध्यम से ही वर्ण ज्ञान आकार बोध, फिर
ज्ञान बोध और फिर पठन ज्ञान विकसित होता है। बच्चों का चित्रों से जो वर्ण ज्ञान
परिचय होता है, वह बच्चों के मानस पटल पर सदा के लिये अंकित हो जाता है।"[1]

یہ حقیقت ہے کہ بچے کی سب سے پہلی کتاب تصویر ہوتی ہے۔ وہ تصویروں سے بہت محظوظ ہوتا ہے۔ "بچہ" زبان سے ناواقف ہوتا ہے تو وہ نظم کے ترنم اور کہانی کو سن کر خوش ہوتا ہے۔ اس کے بعد باتصویر کتابوں کو دیکھ کر اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ تصویر میں الفاظ کو ڈھونڈتا ہے۔ کس چیز کی تصویر ہے؟ وہ تصویر کو نام دیتا ہے اور اس کے متعلق جملے بناتا ہے۔ مثلاً بلّی کی تصویر دیکھ کر وہ سوچتا ہے، یہ بلّی ہے، بلّی میاؤں میاؤں کرتی ہے۔ بلّی چوہوں کو پکڑتی ہے بلّی دودھ پی جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ ان سب جملوں کا تصویر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن بچہ تصویر دیکھ کر اس کے متعلق جو کچھ اس نے سنا ہے یا وہ اس کے بارے میں جتنا جانتا ہے، وہ وہی کہنا اور سننا چاہتا ہے۔ تصویر بچے کو کتاب سے مانوس کراتی ہے۔

بچہ کسی بھی عمر کا ہو رنگین اور باتصویر کہانیوں پر بے اختیار لپکتا ہے خواہ اسے ایک لفظ بھی پڑھنا

---

१० डा० शैलेन्द्र वर्मा, "[illegible]"

نہ آتا ہو ۔ تصویریں وہ بڑے تجسس کے ساتھ دیکھتا ہے جو تصویر اس کے سمجھ میں نہیں آتی اس کے بارے میں اپنے بڑوں سے پوچھتا ہے۔ تصویر ایک ایسی زبان ہے جو سینکڑوں الفاظ سے زیادہ پر اثر ہوتی ہے۔ بچہ معصوم ہوتا ہے اس کا دل بہت نرم و نازک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دل پر الفاظ کی زبان کے بجائے تصویروں کی بے زبانی زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔

تصویر کا تعلق براہ راست بچے کے دل اور اس کی نظر سے ہوتا ہے۔ تصویر بچے کی قوت تخیل کو بڑھاتی ہے۔ بچہ تصاویر کے ذریعہ اپنے خیالوں کو وسعت دیتا ہے اور اپنی رنگین دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ تصاویر کی مدد سے مختلف چیزوں، جانوروں، پرندوں، پیڑ پودوں، مختلف ممالک اور اقوام کی تہذیب اور تمدن، وہاں کے رسم و رواج، مافوق الفطرت واقعات اور ان کے خیالی کردار پریوں کی شہزادی، جن، بھوت، دیو اور سائنسی ایجادات اور اس قسم کی بہت سی چیزوں سے تصاویر کے ذریعے بچے کی شناسائی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باتصویر اور رنگین کتب کی مقبولیت بچوں کے ادب میں دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے یہ دور باتصویر رنگین کہانیوں اور کامکس (COMICS) کا دور ہے۔

تصویروں کی مدد سے بچے میں پڑھنے کی عادت ہوتی ہے۔ بچہ تصویر کے نیچے درج الفاظ کو جوڑ توڑ کر پڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوجاتا ہے تصویر کے ذریعے ہم بچے کی دلچسپی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر تصویر میں کوئی کہانی بیان کی گئی ہے تو بچہ خود اس کو نکال لے گا۔ وہ جانتا ہے کہ تصویر خود بولتی ہے اس کے لیے پڑھنا ضروری نہیں۔ کتاب کے ورق الٹتے جائیے کہانی خود بخود واضح ہوتی جائے گی۔

بچے عمر کے ابتدائی دور میں الفاظ سے زیادہ تصویر کی زبان کو جانتے اور پسند کرتے ہیں جیسے جیسے وہ عمر کے مختلف مدارج طے کرتے ہیں، الفاظ اور زبان کو زیادہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اب وہ تصویر سے حرف اور الفاظ کی طرف آتے ہیں۔ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ پہلے "تصویر کی زبان" وجود میں آئی جب انسان جنگلی جانوروں کی طرح رہتا تھا اور نیم قبائلی زندگی گزارتا تھا جب اسے بولنا بھی نہیں آتا تھا۔ اس وقت وہ پتھروں، پیڑوں کے پتوں، چھالوں اور پیڑوں کے تنوں پر تصاویر بنا کر اپنے مقاصد کی وضاحت کرتا تھا اور تصویر کو ترسیل و ابلاغ کا وسیلہ بناتا تھا جب بنی نوع انسان کے ارتقاء میں تصویر کو اتنی اہمیت رہی ہے تو "بچے" کا تصویروں سے لگاؤ فطری ہے۔

بجائے اس کے جو تصاویر کو دیکھتا ہے اگر ابتدا ہی سے بات سمجھ میں آ جائے کہ ذہن پر اس کے دیکھنے سے بھی ہوتی باتیں دیکھنے کے لیے نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ جیسے جیسے عمر ترقی کرتی ہے تصویروں میں دلکشی کی تبدیلی ہے مثلاً اس کے باوجود باتصویر کہانیاں ہر عمر کا بچہ پسند کرتا ہے جیسے جیسے بچے کا ذہن ترقی کرے گا تصویروں سے لگاؤ میں کمی آتی رہے گی۔ اور تصویروں کا سائز بھی چھوٹا ہوگا۔ شروع میں موٹی موٹی لکیروں کے ذریعے رنگین تصاویر زیادہ دلکش لگتی ہیں۔ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ باریک لکیریں اور کبھی شوخ یا دو رنگی تصاویر اچھی لگتی ہیں۔

اکثر بچوں کی پسند اور ناپسندیدگی کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ بچے کالی اور سفید تصاویر کو پسند نہیں کرتے یا وہ بنیادی رنگوں کی تصاویر کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ہم بچے کو ہر باتصویر کتاب کا مطالعہ شوق سے کرتے دیکھتے ہیں۔ دراصل بچے ان تصویروں کو پسند کرتے ہیں جن میں کہانی بیان کی گئی ہو، چاہے وہ کالی اور سفید تصویریں ہوں یا رنگین۔ دورِ جدید میں چاہے ہیروؤں کی کہانیاں ہوں یا کوئی سائنس فکشن، بچے انھیں باتصویر پسند کرتے ہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ ریڈیو کے مقابلے میں بچوں کی کہانیاں اور دیگر پروگرام ٹیلی ویژن پر زیادہ مقبول ہیں۔ خواہ وہ رنگین ٹیلی ویژن ہو یا کالا سفید۔ جائنٹ روبوٹ اور اسٹار ٹریک کی مقبولیت اس کا ثبوت ہے۔ تصاویر بچوں کے شعور ہی کو نہیں۔ اس کے خیالات اور جذبات کو بھی بے حد متاثر کرتی ہیں۔ لیکن کوئی بھی باتصویر کہانی بچے کے لیے اس وقت دلچسپ ہوگی جب اس کے خیالات اور احساسات بچے کے لیے ہوں گے نہ کہ بڑوں کی چیز کو سہل بنا کر پیش کر دیا جائے۔ تصویری کہانی کے تاثر میں مصور کے تخیل کا زبردست ہاتھ ہوتا ہے۔ اچھی باتصویر کہانیوں میں مصور کی یہی صلاحیت کہ کیا چھوڑا ہے، کہانی کو زیادہ بامعنی بنا دیتی ہے جو بغیر تصویر کی کتاب میں ممکن نہیں۔ جب بچے کا تخیل اس چیز کا پتہ لگا لیتا ہے کہ تصویر میں کیا بات چھپی ہے تو وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے اور پوری تصویر کو بھی۔ اگر تصویر اچھی ہے تو وہ غیر شعوری طور پر فنِ مصوری سے لطف اندوز ہوگا۔

باتصویر کہانیوں کے ضمن میں کامکس (comics) کا تذکرہ ناگزیر ہے جس نے ایک مسئلہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کی بے پناہ مقبولیت کے نتیجے میں بچوں کے ذہنوں پر منفی اثرات بھی مرتسم ہو رہے ہیں۔ ان کامکس کی کہانیاں نہ دینی ہیں نہ ہی مافوق الفطرت بلکہ ان میں عموماً سائنس فکشن کے نام پر عجیب و غریب واقعات پیش کیے جاتے ہیں اور بچے ان کہانیوں

اور واقعات کو نہیں پڑھتا بلکہ تصویروں ہی میں کھویا رہتا ہے۔ تھری ڈی (3 D) کامکس، اس سلسلے کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ بچہ ایک مخصوص چشمہ لگا کر ان کامکس کو گھنٹوں دیکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ پڑھنے سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ کامکس میں پوری داستان تصویروں کی شکل میں نہ بیان کی جائے بلکہ درمیان درمیان کچھ خلا دے کر تحریر کے ذریعے کہانی کو بڑھایا جائے اس طرح بچہ پڑھنے پر بھی مجبور ہوگا۔

۲۔ داستان یا قصے

(الف) اساطیری داستانیں

اساطیر (MYTH) کی تعریف اسٹینڈرڈ ڈکشنری آف فاک لور میں ان الفاظ کی کی گئی ہے۔

"Myth is a story presented as having actually occurred in a previous age, explaining the cosmological and supernatural tradition of a people, their supernatural tradition of a people, their Gods, Heroes, cultural trends, religious beliefs etc."[1].

اساطیری داستانوں میں ان قومی سورماؤں کے کارنامے دہرائے جاتے ہیں جو اپنے کردار اور افعال کی وجہ سے اپنی قومی زندگی میں فخر کا باعث ہے اور جن کی زندگی اپنی قوم کے لیے مشعل راہ تھی۔ ان داستانوں سے ہمیں ماضی کے حالات اور واقعات کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ مذکورہ بالا ڈکشنری میں آگے لکھا ہے۔

"The purpose of Myth is to explain as Sir G L Gomme said, Myth explain matter in the science of a pre-scient fic age"[2]

اساطیری یا اسطوری ادب کے ارتقاء میں بڑا حصہ تو نہیں ہے لیکن رزمیہ نظم میں ہم اس روایتی مواد کو ادبی اور فنی شکل دے لیتے ہیں۔ یہ شکل اس اساطیری داستان کی جان ہوتی ہے۔ اسی ادبی اور فنکارانہ حسن نے ان داستانوں کو آج تک زندہ رکھا ہے۔ اساطیری داستانوں

---

1. "Standard Dictionary of Fold-lore, Mythology of Legend." Vol. II Page 778

۲۔ ایضاً

کتب لکھنے سے پہلے مترجم کو سمجھانا ہے کہ اس کے اصل اسلوب، مفہوم اور آہنگ کو باقی رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور منظومہ نظم کی پوری روایت، حسن اور تخیل کی پرواز کو بھی محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(ب) روایتی قصے

"روایتی قصے" پریوں کی کہانیوں کی طرح بچے ہی نہیں بڑے بھی دلچسپی سے پڑھتے اور سنتے ہیں۔ یہ سلسلہ زبانی کہانیوں کی شکل میں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ یہ روایتی قصے کہانیاں آپ بیتی اور جگ بیتی کے ساتھ ساتھ سیاحوں کے جہاتی سفر اور ان کی سوانح عمریوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ بادشاہوں اور نوابوں کے درباروں میں قصہ گوئی کو بہت فروغ ملا تھا۔ قصہ گو قصہ پر قصہ جوڑتے جاتے ہیں اور قصہ ختم نہیں ہوتا تھا۔ ان قصہ گویوں کا انداز زیادہ تر بیانیہ ہوتا تھا۔ ایسے درباروں کے زوال کے بعد دنیا کے مشہور اور مقبول قصے مختلف زبانوں میں قلم بند کر دیے گئے۔ مصنفین نے اپنے انفرادی اسلوب اور منفرد طرز تحریر کی چاشنی سے مختلف کرداروں اور ناموں نیز زماں و مکاں میں تبدیلی کے ساتھ قصوں کے ناموں میں بھی تبدیلیاں کیں۔ ایک ہی قصہ کسی ملک میں اور نام سے ہے۔ اور دوسرے ملک میں کسی دوسرے نام سے۔

روایتی قصوں کا تعلق عام لوگوں سے ہوتا ہے۔ ان کے کرداروں کی بہادری، وفاداری کے کارناموں، ان کی محبت اور نفرت کی داستانیں، نیک انسانوں کی نیک دلی اور برے لوگوں کی بدی کے تذکرے کم و بیش یکساں ہوتے ہیں۔ ان میں وہی لوگ ہوتے ہیں اور وہی باتیں ہوتی ہیں جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں بعض قصوں کی تاریخی اہمیت بھی ہوتی ہے۔ کوئی خاص کردار کچھ مخصوص حالات میں دکھایا جاتا ہے۔ ہیرو اپنی بہادری کے جوہر دکھاتا ہے اور کسی بےکس و مظلوم کو مصیبت سے نجات دلاتا ہے۔ خواہ اس کو خود اپنی جان گنوانا پڑے۔ ان کہانیوں میں بچوں کو ہیرو کی غیر معمولی بہادری سے دلچسپی ہوتی ہے اور ان مخصوص حالات میں وہ ہیرو کے ساتھ خود بھی اپنے کو بہادر اور نڈر تصور کرتے ہیں اور اپنی قوت متخیلہ کو پرواز کا موقعہ دیتے ہیں۔

پریوں کے قصے اور روایتی قصے میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ مگر پریوں کے قصوں میں

ایک تخیل حقیقت ہوتی ہے۔ اگر بچے نے پہلے پریوں کے قصے نہیں سنے یا نہیں پڑھے تو اس کو روایتی قصے کہانیوں میں کم لطف آئے گا۔ کیونکہ قوت متخیلہ کی مدد کے بغیر روایتی قصے بے لطف ہو جاتے ہیں۔ روایتی قصوں میں حقیقت اور تخیل کی آمیزش ہوتی ہے۔

بچے شعوری یا غیر شعوری طور پر جانتے ہیں کہ روایتی کہانیوں کے پڑھنے سے ان کو ایک خاص تجربہ حاصل ہوگا۔ ان کہانیوں میں بہادری، جادو اور رومانس کے علاوہ زندگی کے حقائق اور صداقت بھی ہوتی ہے۔ بہادری کے کارناموں میں ان کو بہادری کے ایسے واقعات ملتے ہیں جنھیں پڑھ کر وہ مبہوت ہو جاتے ہیں۔ لیکن روایتی کہانیوں میں بہادری کے کارناموں کے ساتھ ہیرو کی مصیبت اور جدوجہد کے واقعات بھی سامنے آتے ہیں جن کی وجہ سے بچے کو ہیرو سے ہمدردی اور لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب بچہ ایک بہادر کردار اور اس کی بہادری کے کارناموں اور اس کی مصیبت کے حالات پڑھتا ہے تو اس کی زندگی کی اعلیٰ قدروں سے آگہی ہو جاتی ہے انسان کی زندگی آرام و آسائش اور کامیابی ہی کا نام نہیں ہے بلکہ خندہ پیشانی اور ہمت کے ساتھ مصیبت کا سامنا کرنے کا نام زندگی ہے۔ اس طرح بچے میں صبر و تحمل ہمت اور بہادری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ عملی زندگی کی راہ میں ایک قدم آگے بڑھاتا ہے۔

روایتی کہانیاں بچوں کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ اگر ہم اپنے ادبی اور تہذیبی سرمائے میں سے انتخاب کر کے بچوں کو ایسے قصے فراہم کریں جو ان کے دل و دماغ کو روشن کر دیں۔ جو ان میں اچھے کام کرنے کی لگن پیدا کریں جو ان میں صبر و استقلال کے جذبات کو ابھاریں اور مصیبت میں بہادری اور ایمانداری سے کام کرنے کی طرف مائل کر سکیں۔

۳۔ پریوں کی کہانیاں

پریوں کی کہانیاں بچوں اور بڑوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ اس سائنٹفک دور میں جب انسان چاند پر پہنچ گیا ہے خلا میں کئی کئی دن رہ کر دنیا والوں سے باتیں کر سکتا ہے اور توہمات کی دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے اس وقت بھی پریوں کی کہانیوں کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ چنانچہ ان کہانیوں میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جس نے ان کہانیوں کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ پریوں کی کہانیاں صدیوں سے بچوں کی دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔

بقول کارل بوہلر

"Fairy tales represent the first or one of the forms of artistic stories arising during the childhood of humanity "[1].

پریوں کی کہانیاں میں عام طور پر عجیب وغریب واقعات کردار اور ایک خوابناک فضا ہوتی ہے۔ یہ عجیب وغریب واقعات سیدھی سادی زبان میں بیان کیے جاتے ہیں جس سے بچہ مزاح اور رومانس کی طلسمی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ اس کے تخیل کی پرواز اسے ایسی خوبصورت اور دلچسپ دنیا کی سیر کراتی ہے۔ جہاں پہنچ کر وہ خود کو فراموش کر دیتا ہے اور اپنے آپ کو ایک ایسا نیا کردار تصور کرنے لگتا ہے جو سبز پری اور لال پری کے ساتھ پرستان کی سیر کرتا ہے۔

پریوں کی کہانیوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا اور سنا گیا ہے۔ یہ انسانی تہذیب کی سب سے قدیم یادگار ہیں ۔ یہ کہانیاں اب بھی دور دراز اور پسماندہ علاقوں میں اپنے اصلی روپ میں محفوظ ہیں۔ ان کہانیوں کے ذریعے قدیم زمانے کی لوگوں کے رسم ورواج، رہن سہن اور ان کے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ پریوں کی کہانیاں مافوق الفطرت واقعات اور کرداروں کے باوجود انسانی تہذیب وتمدن کے ابتدائی دور کی عکاس ہیں۔ ان کہانیوں میں اس دور (جس دور میں وہ لکھی گئی ہیں) ماحول، مقامی رنگ اور معاشرے کا نمایاں عکس ہے پریوں کی کہانیاں اپنی خوبیوں اور اپنی فضا سے اس مقام کا پتہ دیتی ہیں جس علاقے سے ان کا تعلق ہے۔ قدرتی ماحول اور نسلی کردار کے اثر کا فرق کسی مقام کے تخیلی ادب سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات مختلف ممالک کی کہانیوں کے مطالعے سے بخوبی واضح ہوسکتی ہے۔

پریوں کی کہانیاں، روایتی کہانیوں سے قدرے مختلف ہیں۔ روایتی کہانیوں میں تخیل اور حقیقت دونوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ جب کہ پریوں کی کہانیاں تخیلی ہوتی ہیں۔ آج سائنس کا زمانہ ہے، حقیقت پسندی کا دور ہے۔ اس وجہ سے تخلیقی کہانیوں کی افادیت میں کچھ شبہ کیا جانے لگا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہماری روزمرہ کی گفتگو، ماحول، رسم ورواج اور تمثیلوں میں ان پریوں کی کہانی کا تذکرہ آتا ہے۔ چاند پر پہنچنا اور آسمانوں کی سیر کرنے کا

---

1. Karl BuHler, "The Mental Development of the child. Page 74.

عملی تصور پریوں کی کہانی ہی کی دین ہے۔ ہوائی جہاز، راکٹ اور مصنوعی سیارہ وغیرہ پریوں جنوں دیوؤں کی تہلکہ خیز کہانیوں کا ہی عملی نتیجہ ہیں۔ اطہر پرویز کے درج ذیل اقتباس سے بھی اس نظریے کی تائید ہوتی ہے۔

"جس زمانے میں ایسی کہانیاں لکھی جاتی تھیں، یہ وہ زمانہ تھا جب نہ تو آج کے ہوائی جہاز تھے اور نہ لوگوں کو زمین کے اندر کی کانوں کا کوئی علم تھا اور نہ ابھی انسانوں نے دریاؤں پر پل بنائے تھے لیکن وہ اپنے خیالات کی دنیا میں ہوا میں اُڑنے کے خواب دیکھتا رہتا، زمین کے چھپے ہوئے سونے چاندی کے خزانوں کو دیکھ کر خوش ہوتا، دریاؤں کو پار کرنے کے تصور میں مگن رہتا۔"[1]

پریوں کے قصے گمنام ہیں لیکن جو قصے کسی ایسے علاقے سے وابستہ ہیں جہاں کی ادبی خصوصیات مشہور ہیں۔ ان میں علاقائی رنگ پایا جاتا ہے۔ ہمیں ان خصوصیات کو برقرار رکھنا ہوگا۔ پریوں کے قصے ہماری ادبی میراث ہیں۔ جن کا اپنا ایک طرز، اپنی ایک نئی ٹکنیک ہے۔ کہانی کا طرز جدید یا روایتی جو بھی ہو اس کا ایک مقصد لوک کہانی کی خوبیوں کو بچے تک پہنچانا ہے جس طرح گرم برادرز (GRIM BROTHERS) نے پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کہانیاں جن میں زندگی خوب صورتی اور تخیل ہے انھیں بھائیوں کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہیں۔ پریوں کے قصوں میں طرح طرح کی طرز تحریر، ہیئت، موضوع اور اظہار خیال کے اسالیب ملتے ہیں۔ یہاں ان کا کوئی عام معیار مقرر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پریوں کے تمام قصوں میں ایک جیسے حکایتی طرزِ بیان کا مطالبہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

۴۔ اخلاقی اور مذہبی کہانیاں

اخلاقی اور مذہبی کہانیوں کا خاص مقصد بچے کی سیرت کی تعمیر اور اخلاقی اقدار کی تلقین ہے۔ بچوں کے ادب میں "پنچ تنتر" کی کہانیاں اخلاقی تعلیمی نقطہ نظر سے ہی تخلیق کی گئی ہیں۔ یہی حال "گلستاں" اور "بوستاں" کی حکایات کا ہے۔ دونوں کتابوں کے ہر قصے کا مقصد کسی نہ کسی قسم کی پند و نصیحت کرنا ہے۔ بچوں کی سیرت اور اس کی شخصیت کی تعمیر میں اخلاقی

---

[1] اطہر پرویز: ادب کے لیے ترقی اردو بورڈ نئی دہلی [illegible]

کہانیوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ مشیر فاطمہ، پال ہازرڈ کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"بچوں کی کتابوں میں کچھ اخلاقی باتیں دی جاتی ہیں اور کچھ سچی باتیں بتائی جاتی ہیں تاکہ بچے سچائی اور ایمانداری میں اعتقاد رکھیں۔"[1]

بچوں کے لیے اخلاقی کہانیاں لکھنا خاصا مشکل کام ہے۔ اس کے ذریعے ادیب اخلاقی قدروں کی ترغیب دیتا ہے۔ اس میں تخلیقی جواہر اور تخلیقی صلاحیت ہونا چاہیے۔ معمولی لکھنے والے اخلاقی کہانیوں کو پیچیدہ اور خشک بنا دیتے ہیں۔

بچے کو نیک سیرت بنانے اور اعلیٰ کردار کی تعمیر میں اخلاقی کہانیوں کے ساتھ مذہبی کہانیوں کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ مذہبی کہانیوں میں مذہبی واقعات، مذہب کی بنیادی باتیں اور مذہبی بزرگوں کی زندگی کے حادثات اور ان کے کرداروں پر مبنی کہانیاں، بچوں کی عام فہم زبان میں پیش کی جاتی ہیں۔ جن کا مقصد بچوں کے کردار، اعلیٰ اوصاف کی بنیاد رکھنے کے ساتھ ساتھ مذہب کی بنیادی تعلیم بھی دینا ہے۔ عموماً بچوں کی دلچسپی ایسی کہانیوں میں کم ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایسی کہانیوں کو دلچسپ اور پرکشش، مفید بنانے میں مصنف کے اسلوب نگارش اور طرز تحریر کی بڑی اہمیت ہے۔

۵۔ تاریخی کہانیاں

تاریخی کہانیاں، اساطیری داستانوں اور روایتی قصّوں سے مختلف چیز ہیں ان کہانیوں میں تاریخ اور تخیّل کا امتزاج ہوتا ہے۔ ان کا موضوع اور مرکزی خیال تاریخ کے ٹھوس واقعات ہوتے ہیں۔ مصنف اپنے اسلوب نگارش اور تخیل کا خوب صورت رنگ چڑھا کر ان تاریخی واقعات کو خوب صورت اور مؤثر بناتا ہے۔ اکبر اعظم، عدل جہانگیر، رضیہ سلطان، اشوک، مہارانا پرتاپ نوشیرواں عادل، ناصرالدین وغیرہ کی کہانیاں اسی ضمن میں آتی ہیں۔ تاریخی کہانیوں کو بچے بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ کیونکہ ان میں پرانے زمانے کے حالات اور واقعات رسم و رواج رہن سہن، مذہبی عقائد اور سماجی ماحول کے بارے میں عجیب و غریب باتیں سن کر بچوں کو خاص حیرت ہوتی ہے۔ اگر وہ بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے تخیل میں پریوں کی کہانیوں سے

---

[1] مشیر فاطمہ: بچوں کے ادب کی خصوصیات انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۲ء ص ۲۷

بھی زیادہ لذت محسوس کرتے ہیں۔

تاریخی کہانی لکھنا بہت بڑا فن ہے۔ فنکار اپنی کہانی کو کسی خاص عہد سے وابستہ کرتا ہے۔ اس کی خاطر اسے اپنے تصورات کو اس دور میں لے جانا ہوتا ہے۔ تصورات کی دنیا میں اس زمانے کے حالات کو بسا کر ان کو کہانی کا روپ دیتا ہے وہ کہانی کے حسن کو برقرار رکھنے کے ساتھ تاریخی واقعات کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ کہانی کو ایک مخصوص تاریخی پس منظر میں لکھنا ہوتا ہے جس میں اس زمانے کے حالات اور واقعات نیز رسم و رواج کی عکاسی ہوتی ہے۔

تاریخی کہانیوں میں صرف تاریخی واقعات کو جوں کا توں بیان نہیں کیا جاتا بلکہ تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ قاری کو اس دَور کی جھلک بھی دکھائی ہوتی ہے اس کا احساس بھی دلانا ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت کبھی نہیں بدلتی صرف انسان کے تجربات زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مصنف کا فرض ہے کہ مختلف منتخب کرداروں کے ذریعے اس زمانے کے لوگوں کے تجربات بتائے۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے جب فنکار اپنے تخیل کو اس زمانے میں پہنچا دے جس زمانے کی نمائندگی کرتا ہے۔

تاریخی کہانیوں میں اس زمانے کی مخصوص قدروں کو برقرار رکھنا چاہیے۔ مگر شان و شکوہ کی تفصیل کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ انسانی کرداروں پر پس منظر کو حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے تاریخی کہانیوں میں صرف بڑے کارناموں کا ذکر کافی نہیں ہے۔ کہانی میں حرکت بھی ہونا چاہیے اس میں جتنے زیادہ واقعات ہوں گے بچے اس کو اتنا ہی پسند کریں گے۔ تاریخی کہانیوں میں داستان اور تاریخ کی آمیزش شیر و شکر جیسی ہونی چاہیے۔ لکھنے والے کے لیے کہانی مقدم ہے تاریخ مؤخر۔

تاریخی کہانیوں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کی کہانی میں پلاٹ، کردار اور واقعات خود تخلیق کرکے ان کو کسی تاریخی عہد سے وابستہ کرتا ہے۔ دوسرے قسم کی کہانی میں قدیم زمانے کے پلاٹ اور اس کے کرداروں کی بنیاد پر اپنی کہانی کی اساس قائم کرتا ہے۔ بعض لکھنے والے ان دونوں طریقوں کو بیک وقت بھی استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں تاریخی کردار تخلیق کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی تاریخی واقعات کا دامن بھی نہیں چھوڑتے۔ یہ صحیح ہے کہ ادیب کو تاریخ میں ایسے واقعات مل جاتے ہیں جس کے تانے بانے پر وہ اپنی کہانی کا ڈھانچہ کھڑا کرتا ہے۔ واقعات کہانی کے

لحاظ سے مکمل نہیں ہوتے۔ اس لیے تاریخی واقعات میں سے اپنے مطلب کی چیزوں کا انتخاب کرکے ان کو کہانی کے زندہ کرداروں کا روپ دیتا ہے۔ وہ ہیرو کی زندگی کے ذریعہ اس مخصوص تاریخی زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات، عقائد اور ماحول سے متعارف کراتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے ہمیں اس زمانے کی ذہنیت سے روشناس کراتا ہے۔ کسی بھی حکومت کے عروج وزوال میں چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ لوگوں کے باہمی تعلقات، بادشاہوں کے خاندانی حالات، امرا اور وزرا کی طاقت حاصل کرنے کے لیے جھگڑے یہ تمام باتیں اچھی تاریخی کہانی میں مضمر ہوتی ہیں اور بچے کی اس تاریخی عہد سے دلچسپی پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ان کو پڑھنے کے بعد بچے کے لیے تاریخ صرف جنگ، تاج پوشی اور عیش وعشرت کا بیان ہی نہیں رہ جاتی بلکہ اس زمانے کے حالات معلوم کرنے کا ایک بہترین ذریعہ بن جاتی ہے۔

۴۔ جدید کہانیاں

اس زمرے میں تمثیلی کہانیاں، معلوماتی کہانیاں، تفریحی کہانیاں، جانوروں جنگلات سمندروں اور پہاڑوں وغیرہ سے متعلق مہماتی اور سائنسی کہانیاں اور خلا سبھی آتے ہیں۔ بچے پریوں کی کہانیوں کے بعد اگر کسی دوسری کہانی میں دلچسپی لیتے ہیں تو وہ مہماتی اور سائنسی کہانیاں ہیں۔ جدید کہانیوں کے بارے میں میرزا ادیب لکھتے ہیں:۔

> "بچے کا کائنات سے اولین رابطہ کہانیوں ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ پرندوں کی کہانیاں پریوں کی کہانیاں، درختوں کی کہانیاں، پھولوں کی کہانیاں۔ یہ اور اسی قسم کی کہانیاں اسے یقین دلاتی ہیں۔ کہ اس کے گرد کیا کچھ ہے اور یہ سب کچھ کتنا پیارا ہے۔"[1]

رات میں جب بچے کو چندا ماما کی کہانی سنائی جاتی ہے اور اسے نیند آنے لگتی ہے تو وہ خود کو چاند پر محسوس کرتا ہے۔ کہانیوں کے سارے کردار اس کے تخیل میں گھومتے پھرتے

ہیں لیکن اسے ایسی کہانیاں سنائیں جن میں بہادروں کے کارنامے شامل ہوں۔ یہ مقصد سلیقہ مندی اور ہنر مندی کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی تقاضہ کرتا ہے کہ جو شخص کہانیاں لکھے وہ بچے کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے پوری طرح واقف ہو، بچہ کس حال میں کیا قبول کرتا ہے، اس کے تخیل کو کس طرح متحرک کیا جاسکتا ہے اور اس کے اندر بعض چیزیں قبول کرنے اور بعض چیزیں رد کرنے کی صلاحیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ کہانی لکھنے والوں کو ان باتوں کا علم ہونا چاہیے۔

جانوروں کی کہانیاں اور تمثیلی کہانیاں بچوں کو بہت پسند آتی ہیں۔ خصوصاً چھوٹے بچے اپنے آس پاس کے جانوروں اور پرندوں کے بارے میں تمثیلی کہانیاں بڑے شوق اور لگن سے پڑھتے ہیں۔ ایسی کہانیوں سے تفریح کے ساتھ معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ جانوروں اور پرندوں کی کہانیوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

بچوں کو مہماتی اور سائنسی کہانیوں سے بھی دلچسپی ہوتی ہے۔ سندباد جہازی کی کہانی اس کی بہترین مثال ہے۔ مہماتی کہانیوں کے توسط سے بچوں میں بہادری، جرأت اور مہم جوئی کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے مگر یہ حوصلہ محض بہادری کی کہانیاں سنانے سے نہیں پیدا ہو جاتا۔ ایسی کہانی میں سلیقے اور ہنر مندی کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ مصنف کہانی لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ وہ بہادری اور جرأت کے کارناموں کو خوف و دہشت والے مناظر پر اس طرح حاوی کر دے کہ بچہ لاشعوری طور پر اپنے اندر جرأت مندی کی صلاحیت پیدا کرے اور اسے ترقی بھی دیتا رہے۔

دورِ جدید میں سائنس فکشن اور خلا بیسے نے بے پناہ مقبولیت حاصل کرتی ہے جس میں حیرت و استعجاب بھی ہے۔ مہم جوئی بھی اور ہیرو کو بہادری دکھانے کے مواقع بھی موجود ہیں۔ ایسی کہانی لطف کے علاوہ سائنس کے بارے میں مفید معلومات بھی فراہم کرتی ہے مگر ہمارے یہاں جو سائنس فکشن لکھے جا رہے ہیں ان میں سے بیشتر میں جان نظر نہیں آتی اور بچے سائنسی استعداد کی کمی کے سبب اس کے منفی اثرات قبول کر رہے ہیں جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے یہاں سائنسی تجربات تا حال اولین مرحلے میں ہیں۔ ایسا ماحول دستیاب نہیں ہے کہ سائنسی فکشن عمومی دلچسپی کی چیز بن سکے۔ محض مغربی ادب کی نقالی کرنے سے ہمارا مقصد حل نہیں ہوگا۔ اور خصوصی مہارت رکھنے والے مصنفین کو اس پہلو پر زیادہ توجہ دینی ہوگی۔

(ب) ناول :-

بارہ تیرہ سال کی عمر میں بچہ لمبی لمبی کہانیاں پڑھنا چاہتا ہے۔ اس عمر میں ایسی مختصر کہانیاں جو تھوڑے سے وقت میں ختم ہو جائیں ۔ ان کی دلچسپی اور ذہن کی تشنگی نہیں کر پاتیں۔ طویل کہانیوں میں بچے سیر و سیاحت، دلچسپ واقعات اور حیرت و استعجاب پیدا کرنے والی تحریریں پسند کرتے ہیں اس قسم کی کہانیاں انھیں بیشتر ناول ہی میں ملتی ہیں۔

طویل کہانیاں بچے اس وقت بھی پڑھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں جب ان کے والدین بڑی بڑی اور موٹی موٹی کتابیں پڑھنے میں محو نظر آتے ہیں۔ بچے جانتے ہیں کہ وہ ناول پڑھ رہے ہیں۔ ان میں طویل کہانیاں پڑھنے کی خواہش فطری طور پر بیدار ہوتی ہے اگر اس وقت بچوں کو کچھ پڑھنے کو نہیں دیا جاتا تو وہ اپنے بڑوں کی کتابیں (ناول) چوری چوری پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچوں کی اس خواہش کو نہایت سنجیدگی سے دیکھا جائے ۔ اس وقت بچوں کو ہم کوئی کتاب نہیں دیتے یا ان کو پڑھنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کا منفی اثر پڑتا ہے اور بچہ اپنے ذہن کی تشنگی کے لیے جو بھی کتاب ملے گی اس کو پڑھے گا، خواہ وہ فحش لٹریچر ہی کیوں نہ ہو۔

"ادب اطفال" میں ناول زیادہ پرانا نہیں ہے۔ اکثر قدیم طلسماتی اور دیہاتی کہانیوں کو ناول کی شکل میں پیش کر دیا گیا ہے۔ بچوں کے عالمی ادب میں رابنسن کروسو (RABIN SONCRUSO) بچوں کے ادب کا پہلا ناول مانا گیا ہے۔ اس کے بعد اسٹی ون سن کا ٹریژر آئی لینڈ اور لیوس کیرول کا ایلیز ان ونڈر لینڈ وغیرہ کئی ناول بچوں کے لیے شائع ہوئے۔ جنھوں نے بچوں میں بہت مقبولیت حاصل کی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ "گلیورس ٹریولس" اور سند باد جہازی کے سفر نامے وغیرہ بچوں کے مشہور اور مقبول عام ناول ہیں جن کے پلاٹ اور موضوع دونوں تا دیر بچوں کو دوسری دنیا کی سیر کراتے ہیں۔ اردو ادب اطفال میں ابتدائی ایسی ہی تخلیقات ہیں جو تراجم یا ماخوذ شکلوں پر مشتمل ہیں۔ مثلاً عظیم بیگ چغتائی کا "قصر صحرا" جو تین جلدوں میں پھیلا ہوا کارنامہ ہے۔

ناول انگریزی لفظ (NOVELTY) ناولٹی کا مخفف ہے جس کے معنی ہیں "نیا پن" وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ناول کے مطالعہ کے دوران ایک تخلیقی ماحول میں محو ہو کر قاری اپنے ماحول

سے دور چلا جاتا ہے۔ جہاں اس کو ایک نئی دنیا ملتی ہے جس میں وقت گزار کا وہ سکون محسوس کرتا ہے۔ ناول زندگی کا عکس بھی ہے اور ترجمان بھی۔ ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے واقعات خواہ ہماری دنیا کے ہوں یا دوسری دنیا کے یا مافوق الفطرت، وہ ایک دوسرے سے زنجیر کی کڑی کی طرح پیوست رہتے ہیں اور ان کا تعلق براہ راست کہانی کے مرکزی خیال یا موضوع سے ہوتا ہے۔ ناول کے تمام واقعات اور حادثات ہماری زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی کرتے ہیں وہ زندگی کو کسی نہ کسی طرح متاثر ضرور کرتے ہیں۔ اگر بچوں کے ناول کو ہم اس روشنی میں دیکھیں تو بچوں کے ناول بھی زندگی کے واقعات و حادثات سے ہی متعلق ہوتے ہیں۔ یہ حادثات انسانی زندگی سے اخذ کیے گئے ہوں۔ یا جانوروں، پیڑ، پودوں اور پرندوں کو تمثیلی پیرائے میں پیش کیا گیا ہو۔

بچوں کے اچھے ناول کا وصف یہ ہے کہ مسائل کو سلجھانے میں ان کی مدد کر سکیں۔ بچوں میں جوش و خروش، ہمت، استقلال، حق و باطل، ایمانداری اور سمجھداری کا جذبہ ابھار سکیں۔ "رابنسن کروسو" "سند باد جہازی ٹریزر آف لینڈ" اور ڈیوڈ کاپر فیلڈ وغیرہ ایسے ناول ہیں جنھیں بچوں نے اپنے دل اور اپنی ذات کے مسائل کا حل سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ ایسے ناول کو پڑھنے سے بچوں کو نہ صرف تفریح حاصل ہوئی بلکہ ان کے خیالات اور تجربات میں اضافہ بھی ہوا۔ بچوں کی قوتِ متخیلہ بڑھی۔ ان میں تجسس اور حیرت و استعجاب کا مادہ پیدا ہوا۔

ناولوں میں پلاٹ کی بہت اہمیت ہے، بچوں کے ناولوں کے پلاٹ، ان کی کہانیوں کے مقابلے، بڑے کینوس پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں وسعت ہوتی ہے۔ باریک سے باریک بات بھی واضح طور پر اور پھیلا کر بیان کی جاتی ہے۔ ناول کے ذریعے مصنف کھل کر اپنی بات کو بچوں تک پہنچا جا سکتا ہے۔ بچوں کے ناولوں کے پلاٹ ان کی دلچسپی اور ضرورت نیز بچوں کی نفسیات کے اعتبار سے متعین ہو سکتے ہیں۔ بچوں کے ناول کے موضوعات اور پلاٹ دونوں کا انتخاب بہت احتیاط سے کرنا ہوتا ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ بچوں کے ذہن اور ان کی نفسیات کے اعتبار سے ہی موضوع کا انتخاب کیا جائے۔ مثلاً آج کل بچے جاسوسی ناول بہت پسند کرتے ہیں۔ پلاٹ اور موضوع کے ساتھ ساتھ بچوں کے ناولوں میں کردار نگاری کی بڑی اہمیت

ہے۔ بچہ ناول پڑھتے وقت خود کو ناول کے ہیرو کی جگہ یا اس کے ہمراہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ کردار کے انتخاب میں بھی بچوں کی دلچسپی اور ان کی نفسیات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ کردار ایسے ہونے چاہئیں جو بچوں کے جانے پہچانے ہوں۔ بڑوں کے وہ کردار بھی لیے جا سکتے ہیں جو بچے کی شخصیت پر اچھا اثر ڈالتے ہوں، کردار ایسے ہوں کہ بچہ پڑھتے وقت بالکل ویسا ہی محسوس کرے جیسا کہ وہ اپنے ملنے والوں یا دوستوں میں رہ کر محسوس کرتا ہے اور ان سے ہمدردی، محبت یا نفرت کر سکتا ہے۔ اچھا ناول وہ ہے کہ ختم کرنے کے بعد بھی ان کا تصور کر کے بچہ لطف اندوز ہوتا رہے۔ بچوں کے ناولوں میں کرداروں کی کثرت نہیں ہونی چاہیے۔ ناول کے ہر واقعہ اور کردار کا باہمی ارتباط ضروری ہے۔

ناول کی زبان اور اسلوب دونوں ہی کو آسان، عام فہم، اور دلکش ہونا چاہیے۔ ناول کی زبان جتنی آسان اور عام فہم ہوگی، بچے کی دلچسپی اتنی ہی ناول پڑھنے میں برقرار رہے گی۔

پلاٹ اور موضوع کے اعتبار سے بچوں کے ناول کو چھ مختلف اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔

(۱) سیر و سیاحت سے متعلق ناول (۲) مہماتی ناول (۳) تاریخی اور جغرافیائی ناول (۵) جاسوسی ناول (۶) اخلاقی اور سماجی ناول۔

۱۔ سیر و سیاحت سے متعلق ناول

بچوں کے ناول کی شروعات ہی ایسی تخلیقات سے ہوئی ہے جو سیر و سیاحت کے واقعات پر مشتمل ہیں۔ بچے ایسی طویل کہانیاں بہت پسند کرتے ہیں جن میں سیر و تفریح ہو اور ان سے مختلف ممالک کے باشندوں کے سلسلے میں معلومات حاصل ہو سکیں۔ ایسے ناول بچوں میں ہمت جوشِ جستجو اور سیر و سیاحت کا شوق پیدا کرتے ہیں۔ "رابنسن کروسو" "سند باد جہازی" اور "گلیور" وغیرہ کے سفر اور کارنامے ایسے ہی شہرۂ آفاق ناول ہیں جن کے ترجمے تقریباً دنیا کی تمام زبانوں میں ہوئے ہیں۔

۲۔ مہماتی ناول:۔

ایسے ناول بچوں میں ہمت اور بہادری کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ یہ ناول بھی سیر و سیاحت کے ناولوں کی طرح بچوں میں بہت مقبول ہوتے ہیں مہماتی ناول بہادری کی زندگی کے واقعات سے پُر ہوتے ہیں۔ شکاری کہانیاں، سمندری اور پہاڑی سفر، ڈاکوؤں کی کہانیاں، جنگلات کی زندگی وغیرہ مہماتی ناولوں کے خاص موضوعات ہیں۔ بچوں کو آج کل ایسے ناول بہت پسند آتے ہیں جن میں ان کا ہیرو بہت بہادر ہو اور کئی کئی دشمنوں پر بھاری پڑتا ہے۔ مار دھاڑ، خطروں سے دوچار ہونا، سنسنی خیزی، دوڑ بھاگ یہ تمام چیزیں بچوں کو ایسے ناولوں میں بہت پسند آتی ہیں۔

۳۔ تاریخی اور جغرافیائی ناول:۔

تاریخی ناول سے مراد ایسے ناول سے ہے جس کا پلاٹ، کردار اور مرکزی خیال، کسی خاص تاریخی واقعے سے اخذ کیا گیا ہو۔ جن کو پڑھ کر بچے اس زمانے کے ماحول، تہذیب و تمدّن، رہن سہن اور حالات سے واقف ہو سکیں۔ تاریخی ناولوں سے نہ صرف بچے کی تفریح ہوتی ہے بلکہ تاریخ سے بھی اس کی واقفیت بڑھتی ہے۔ تاریخ اور اس دور کی پوری جھلک بچے کے سامنے آجاتی ہے۔

تاریخی ناولوں کی طرح جغرافیائی ناول بھی آج کل بچوں میں بہت مقبول ہیں۔ پاتال سے لے کر آسمان تک ندی سے لے کر پہاڑوں تک کی کہانیاں بچہ سننا یا پڑھنا چاہتا ہے۔ ایسے ناولوں کے ذریعہ بچوں کو جغرافیہ کی پوری تعلیم دی جاسکتی ہے۔ روسی زبان میں یہ تجربات بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ جن میں کانوں، پہاڑوں، ندیوں کی کھوج اور اس کے مطالعے کا ذکر ہے۔ مختلف ممالک مثلاً سائبیریا، میکسیکو، افریقہ کے حالات اور طرز زندگی کو پیش کرنے والے ناول اس زمرے میں آتے ہیں۔

۴۔ سائنسی ناول

آج سائنسی ناولوں کو بچوں میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے یہ ناول سیر و سیاحت

اور مہماتی ناولوں سے بھی زیادہ مقبول ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان ناولوں میں مہمات ، عجیب و غریب اور سیر و سیاحت سب کچھ شامل ہے۔ سائنسی ناول کے لیے موضوعات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ سائنس فکشن (FICTION) نے آج بچوں کے ادب میں ایک زبردست انقلاب برپا کر دیا ہے۔ جائنٹ روبوٹ ، اسٹار ٹریک ، اور اسپائیڈر مین وغیرہ ایسے ہی ناولوں پر مشتمل ہیں جن کے مطالعہ سے بچے میں اس دنیا اور کائنات کے اسرار جاننے کا ذوق ، وجذبہ بیدار ہوتا ہے۔ سائنسی ناولوں کے ساتھ طویل فنطاسیے بھی بچے بے حد پسند کرتے ہیں۔ "فنطاسیہ" ان مہماتی کہانیوں / ناولوں کو کہا جاتا ہے جس میں ایسے واقعات بیان کیے جائیں جو عجیب و غریب واقعات سے مزین ہوں اور بچوں میں تجسس برقرار رہے۔

۵۔ جاسوسی ناول :۔

سائنسی ناولوں کے ساتھ ساتھ بچوں اور بڑوں میں یکساں طور پر جاسوسی ناول کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔ ان جاسوسی ناولوں میں بچوں کے لیے تجسس ، سسپنس ، سوجھ بوجھ ، جرائم اور ان کی سزا سے متعلق خاصا دلچسپ مواد ملتا ہے۔ ایسے ناولوں کے ذریعہ بچوں میں حب الوطنی اور فرض شناسی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے لیکن بچوں کے لیے جاسوسی ناول کی تخلیق کرنا ذمہ داری کا کام ہے کیونکہ اس نہج پر لکھے جانے والے کمزور ناولوں سے ان میں جرائم پسندی کا مادہ بھی پرورش پا سکتا ہے۔

۶۔ اخلاقی اور سماجی ناول :۔

اخلاقی اور سماجی ناولوں کی اہمیت ہمارے یہاں مسلّم ہے۔ ایسے ناولوں کے موضوعات بچوں کی اپنی سماجی زندگی کے حادثات اور واقعات سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ جن سے بچہ پوری طرح متاثر ہو سکتا ہے۔ ایسے ناولوں کے ذریعے اخلاقیات کا درس بھی دیا جاتا ہے۔ براہ راست پند و نصائح کے سبب بچے ایسے ناولوں میں کم دلچسپی لیتے ہیں۔ اخلاقی اور سماجی ناولوں میں بچوں کے اپنے مسائل کا حل بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ طرز تحریر ، واقعات اور پیشکش میں ندرت اور دلکشی پیدا کر دی جائے۔ تو اس طرز کے ناول بے حد مؤثر ثابت ہو سکتے

ہیں۔

۲۔ڈراما:۔

دنیا کی تمام زبانوں کے ادب میں ڈراما قدیم زمانے سے پایا جاتا ہے۔ماہرین کا خیال ہے کہ جب انسان تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھا اور جنگلوں میں قبائلی اور وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا اس زمانے میں وحشی آگ کے گرد جمع ہو کر ناچتے گاتے تھے۔ وہ اپنی زبان میں جسم کی حرکات کے ساتھ ان جذبات اور تجربات کا اظہار کرتے تھے۔ جو شکار کرتے ہوئے جنگلوں میں گھومتے ہوئے یا آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہوئے انھیں پیش آتے تھے۔ تمام دن کے ہونے والے واقعات کی وہ لوگ اشاروں اور حرکات و سکنات کی مدد سے ہو بہو تصویر پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور یہی اظہار ڈرامے کی اولین شکل تھی۔ جیسے جیسے انسان متمدن ہوتا گیا اور عقل میں وسعت اور شائستگی پیدا ہوتی گئی۔ اس کے اظہار کی صورت اور عمل میں بھی تبدیلی آئی۔ ساتھ ساتھ ڈرامے کا فن بھی کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کا اسلوب اور موضوع بدلتا رہا اور بتدریج ڈرامے نے ادبی شکل اختیار کر لی۔

— ڈرامے میں اجزائے ترکیبی مقرر کئے گئے اور حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا مکمّل عکس ڈراموں کے ذریعے ہی ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ بچوں میں نقل اور ایکٹنگ کرنے کا رجحان فطری طور پر بڑوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ بچے نقل سے ہی بڑوں کی طرح چلنا، پھرنا، کھانا سونا، اٹھنا بیٹھنا اور اچھی بری عادتیں سیکھتے ہیں۔ بچوں کے چھوٹے چھوٹے کھیل اس رجحان کا ہی نتیجہ ہیں۔ ٹیلی ویژن، سینما، یا اسٹیج پر کوئی ڈرامہ دیکھ کر وہ اس کے کسی اہم کردار خصوصاً ہیرو کی نقل کرتے ہیں۔ بچے ایسی فلمیں بہت پسند کرتے ہیں جن میں مار دھاڑ ہوتی ہے اور پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کی عملی نقل کرتے نظر آتے ہیں۔ محمّد علی کلے بوکسنگ اور بروس لی کے جوڈو کراٹے اس کی بہترین مثال ہے۔

بچے اگرچہ اپنے زیادہ تر معاملات میں، اپنے بڑوں پر منحصر رہتے ہیں۔ لیکن اس کے

باوجود زیادہ تر وہ بڑوں کی دیکھا دیکھی ہر کام خود کرنا چاہتے ہیں۔ بڑوں کے افعال بچوں کے نقالی کے رجحان کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جذباتی حادثات اور واقعات بچوں پر براہ راست گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بچے اپنے بڑوں کی نقل کرتے ہیں جیسے چشمہ لگا کر بیٹھ جانا، دوسرے بچوں پر بڑوں کی طرح رعب جمانا۔ ریل دیکھ کر دیا سلائی کی مدد سے ریل گاڑی بنانا۔ ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے ہو کر ریل کے ڈبے بن جانا اور چھک چھک کی آواز نکال کر آگے بڑھنا، ان کے نقل کرنے کی مثالیں ہیں۔

بچوں کے ڈرامے کا خاص مقصد موقع محل کے اعتبار سے تہذیب، عادات و اطوار سکھانا ہے اس کے ساتھ ساتھ ڈرامے کا مقصد انسان کی فطرت اور اس کو کردار کا مطالعہ کرنا، جذبات کی عکاسی، صحیح طور پر تلفظ کی ادائیگی اور اداکاری سکھانا ہوتا ہے۔ ڈرامے کا مطمح نظر محض پند و نصائح نہیں ہے۔ ایک تاریخی ڈرامہ کے ذریعے جس میں کسی بادشاہ کا انصاف یا مظالم دکھلائے گئے ہوں۔ بچوں کو اس زمانے کے رہن سہن، بول چال، بادشاہ اور ان کے دربار وغیرہ کو تاریخی پس منظر سے آگاہ کرتے ہیں۔ ڈرامے کا مقصد محض انصاف کا ڈنکا بجانا نہیں اور نہ اس بادشاہ کے لیے بچوں کے دلوں میں ہمدردی یا نفرت کا جذبہ پیدا کرنا مقصود ہے۔ ڈرامے کا بنیادی مقصد بچوں کی تفریح ہے۔ ڈرامے ایسے ہونے چاہیے جن سے بچوں کی نشو و نما ہو سکے اور قوت متخیلہ کو بڑھاوا مل سکے۔ آج دنیا میں بچوں کے لیے اس قسم کے ڈرامے لکھے جا رہے ہیں۔ ایسے ڈرامے کو کامیابی کے ساتھ اسٹیج کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ بچوں کے ڈرامے کے بارے میں ہری کرشن دیوسرے رقمطراز ہیں۔

"नाटक का अर्थ है "कार्य और संघर्ष यह बहुत बड़ी क्या है। जहां कहीं भी जीवन है, वहां यह कभी नहीं रुकती। इसका मानसिक व्यापार से आन्तरिक सम्बन्ध होता है। यह जीवन की कला है। यह तब तक ही कार्य करती है, जब भावात्मक पक्ष वास्तविकता के साथ" अनुकूलरूप में होता है"[1]

ڈرامے کا مقصد عمل اور جد و جہد ہے۔ یہ بہت بڑا عمل ہے جہاں کہیں بھی زندگی ہے

---

[1] डा० हरि कृष्ण देवसरे, "बच्चों के नाटक"

یہ عمل کبھی نہیں رکتا اس کا ذہنی صحت مندی سے باطنی رابطہ ہے۔ بچوں کے ڈرامے دو حصوں میں منقسم کیے جاسکتے ہیں۔

(۱) سادے ڈرامے (یعنی ایسے ڈرامے جن کے لیے کسی اسٹیج کی ضرورت نہیں)

(۲) اسٹیج کے ڈرامے

پہلے درجے میں وہ ڈرامے شامل ہیں جو بالکل سادہ ہوتے ہیں اور جن کی ایکٹنگ کے سلسلے میں کسی ہدایت (DIRECTION) اور اس کو پیش کرنے کے لیے کسی قسم کے اسٹیج کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ایسے ڈرامے کلاس روم، گھر کے برآمدے، پارک اور کھیل کے میدان میں بچے کھیلتے ہیں۔ اکثر بڑے بھی بچوں سے فرمائش کرتے ہیں کہ وہ نقل کرکے بتائیں فلاں شخص کیسے بولتا ہے؟ کیسے چلتا ہے؟ کیسے کھاتا ہے؟ یہ ناٹک ہر گھر میں کھیلے جاتے ہیں۔ بچوں کو ایسے ڈرامے بے حد پسند آتے ہیں۔ جیسے عدالت، پولیس کا کردار، نقلی کلاس روم، ماں باپ بھائی بہن، استاد اور اپنے یہاں آنے والے مہمانوں کی نقلیں اتارنا ایک نوع کے سادے ڈرامے ہیں۔

بچے ایسے ڈراموں میں اپنا پن محسوس کرتے ہیں۔ انھیں اخلاقی اور مذہبی تعلیم دینے کے لیے بھی ایسے ڈرامے بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایسے ڈراموں میں پلاٹ مختصر (کبھی کبھی پلاٹ ہوتا ہی نہیں) چھوٹے چھوٹے مکالمے اور روزمرہ کی آسان زبان استعمال کی جاتی ہے۔

اسکول سے لوٹ کر اپنی کتابیں، کپڑے جوتے، پانی کی بوتل وغیرہ مناسب جگہ پر رکھنا، گندگی نہ پھیلانے کی عادت، صبح سویرے اٹھنا، ہاتھ منہ دھونا اور وقت پر اسکول جانا وغیرہ وغیرہ کچھ ایسے موضوعات ہیں۔ جن پر چھوٹے چھوٹے ڈرامے کرنے کا شوق بچے میں پیدا کیا جاسکتا ہے۔

دوسرے قسم کے وہ ڈرامے ہیں جو بچوں کے اسٹیج پر کھیلے جاسکتے ہیں۔ ان کے لیے اسکول بہت کارگر ثابت ہوا ہے جہاں چھوٹے چھوٹے ڈرامے جن کے موضوعات تاریخی، اخلاقی اور اصلاحی ہوتے ہیں) اساتذہ کی مدد سے ننھے منے بچے تیار کرتے ہیں۔ اینڈرسن کی بہت سی پریوں کی کہانیاں بھی بچوں کے ڈراموں کا موضوع رہی ہیں۔

ڈراموں کی دنیا بچوں کی اپنی دنیا ہے جس میں انھیں اپنی پسند ناپسند کا پورا پورا اختیار ہے۔ ایکٹنگ کرنے اور گانے ناچنے کی ان کو پوری آزادی ملنی چاہیے۔ اس لیے اب زیادہ تر

ایسے چھوٹے چھوٹے ڈرامے تیار کیے جاتے ہیں جن میں کسی قسم کے میک اپ اور ملبوسات کی ضرورت نہ ہو اور نہ ہی پردہ اٹھانے یا گرانے کی نیز لمبے لمبے مکالمے رٹنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آج کے ڈراموں کے پلاٹ در اصل بچوں کی زندگی کے پلاٹ ہوتے ہیں جن میں وہ اپنی زبان اور مکالمے استعمال کرتے ہیں۔

ڈرامے اور ایکٹنگ کے سلسلے میں بچے زیادہ تر اپنے اساتذہ یا بڑوں پر منحصر رہتے ہیں۔ بچوں کے ڈراموں کے سلسلے میں عموماً بڑوں کا یہ کردار رہا ہے کہ بڑوں کے موضوعات اور مضامین کو توڑ موڑ کر بچوں کے لیے لکھ دیا گیا ہے۔ ایسے ڈراموں سے بچے قطعی مطمئن نہیں رہتے۔ بچوں کے ڈراموں، بچوں کی ضرورت، نفسیاتی رجحانات، ان کی دلچسپی اور ان کی صلاحیت کے اعتبار سے کیے جانے چاہئیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بچوں کے ڈرامے بالکل ویسے ہی ہوں جیسے بچے خود چاہتے ہیں اور جیسا کہ عملی طور پر روزمرّہ کی زندگی میں وہ دیکھتے ہیں۔ ایسے ڈراموں میں خاص بات یہ ہوگی کہ کسی بھی معمولی بات کو جب ڈرامے کا موضوع بنایا جائے گا تو بچہ اس میں پوری دلچسپی لے گا اور اس کے دل پر وہ ڈرامہ، اس کا موضوع اور اس کے کردار براہ راست اثر انداز ہوں گے۔ اگر ایسا ہے تو ڈرامے بچوں میں اسکولی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے کردار کی تعمیر میں بھی معاون ثابت ہوں گے۔

بچوں کے ڈراموں کے موضوعات، اسلوب اور زبان سب ہی بڑوں کے ڈراموں سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ بچوں کے ڈراموں کا موضوع بہت سیدھا سادہ ہوتا ہے۔ بچوں کے ڈرامے کردار، مکالمے، پلاٹ، زبان وغیرہ سبھی معاملوں میں بہت حد تک محدود ہوتے ہیں۔

بچوں کے ڈراموں کے اجزائے ترکیبی کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ یہ اجزائے ترکیبی وہی ہیں جو بڑوں کے ڈرامے کے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ بچوں کی زبان، ان کی دلچسپیوں اور ان کے ذہنی رجحانات سے مطابقت رکھتے ہیں۔

۱۔ پلاٹ:۔

بچوں کے ڈرامے کے لیے مناسب موضوع اور پلاٹ کا انتخاب سب سے اہم ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ روزمرّہ زندگی کے واقعات کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنا بچوں کی دلچسپی کا باعث نہیں۔ ان کے خیال میں بچوں کے لیے صرف ایسے موضوعات اور پلاٹ مناسب ہوتے

ہیں جو خیالی دنیا اور طلسماتی واقعات وحادثات پر مبنی ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بچوں کے اپنے مسائل کو عملی طور پر پیش کرنا سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ یہی بات تاریخی واقعات کی پیش کش میں ہو سکتی ہے۔ جن تاریخی واقعات اور کرداروں کے بارے میں بچے سنتے ہیں انھیں اسٹیج پر دیکھنا بھی چاہتے ہیں۔

بچے شوخ اور چلبلے ہوتے ہیں۔ نئی چیز دیکھتے ہی ان کی فطرت کی شوخی بیدار ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ نئی چیز کو دیکھ کر اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں۔ آسمان پر سات رنگ کی دھنک دیکھ کر برسات کے موسم میں گھنگھور کالی گھٹائیں دیکھ کر وہ اچھلنے کودنے لگتے ہیں۔ تتلی دیکھ کر اس کے پیچھے دوڑنے میں انھیں مزا آتا ہے۔ اس لیے ڈرامے کا پلاٹ ایسا ہونا چاہیے جس سے بچے کے تمام نفسیاتی رجحانات کی نشو ونما یکساں طور پر ہو سکے نیز بچے کی دلچسپی بھی برقرار رہ سکے۔ پلاٹ ایسا ہو جو بچوں کے مسائل اور ان مسائل کا حل پیش کر سکے مستقبل میں ان کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے۔ آج ہم کسی گاؤں، شہر یا ملک تک ہی محدود نہیں ہیں۔ اب خلا میں بھی پہنچ چکے ہیں اسلیے بچوں کے ڈرامے کو اپنے تنگ دائرے سے باہر نکلنے کا موقع ملنا چاہیے۔

۲۔ مکالمے :۔

مکالمے بچوں کی اپنی زبان میں ہوں، مختصر اور آسان ہوں۔ بچوں کے لیے لمبے جملے اور ثقیل الفاظ سے بوجھل مکالمے لکھنا بے سود ہے۔ مکالمے ایسے ہونے چاہئیں کہ بچہ خود ان کے مطلب کو سمجھ سکے۔ ایسے مکالموں کی ادائیگی بھی ٹھیک انداز میں ہو سکتی ہے۔ بچے خود بھی ایسے ڈرامے پسند کرتے ہیں جن کے مکالمے بچوں کو زبانی اور بآسانی یاد ہو سکیں۔ اور ان کی ادائیگی صحیح لہجے اور صحیح تلفظ کے ساتھ ہو سکے۔ اگر ان باتوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تو مکالمے اور اداکاری دونوں ہی بے اثر ہو جاتے ہیں۔

۳۔ کردار نگاری :۔

بچوں کے ڈرامے میں کردار کم سے کم اور مختصر وقفے کے لیے ہوں تو اچھا ہے۔ اس طرح ہدایت کار کو بڑی مدد ملتی ہے۔ کردار زیادہ تعداد میں ہونے سے پلاٹ اور مکالمے حفظ کرنے کے ساتھ کرداروں کے باہمی رشتوں کو یاد رکھنا بچوں کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ کرداروں کا

شروع ہی میں تعارف کرانے سے ان کی اداکاری کرنا اور انھیں اچھی طرح پیش کرنا، ہدایت کار کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

۴۔ زبان اور اسلوب:۔

بچوں کے اچھے ڈراموں کے لیے ضروری ہے کہ ان کی زبان بچوں کی اپنی زبان ہو یعنی اسے آسان اور عام فہم ہونا چاہیے۔ آپس کی روزمرہ بول چال میں استعمال کیے جانے والے الفاظ بچوں کے لیے آسان ہوتے ہیں نیز ان کو وہ سمجھنے کے ساتھ ساتھ بآسانی ادا کر سکتے ہیں۔ الفاظ کا تلفظ صاف ستھرا اور صحیح طور پر ادا ہونا چاہیے۔ بچوں کو ہنسانے اور گدگدی پیدا کرنے والے الفاظ، ہنسی مذاق سے بھرے چٹکلے بہت بھاتے ہیں، اسلوب میں ان کی شمولیت سے ڈرامے کی تاثیر اور افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۳) غیر افسانوی، معلوماتی اور سائنسی ادب:۔

"ادب اطفال" میں عموماً کہانی، قصوں، ڈراموں اور داستانوں کو افسانوی ادب اور باقی تمام نثری سرمائے کو غیر افسانوی ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔ افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب میں مصنف کے نقطہ نظر سے بھی بڑا فرق ہے۔ افسانوی ادب کے لیے مصنف کے ذہن میں سب سے پہلے کہانی آتی ہے اور وہ کہانی پوری تصنیف پر چھائی رہتی ہے جب کہ غیر افسانوی اور معلوماتی کتب لکھنے کے لیے مصنف کو یہ احساس رہتا ہے کہ وہ بچوں کو کسی قسم کا مواد فراہم کر رہا ہے اور کسی خاص موضوع یا کسی خاص چیز کے بارے میں بچوں کو تفصیلات بتا رہا ہے۔ کتاب کا واحد مقصد محض بچوں کو تفریح بہم پہنچانا نہیں ہے بلکہ کہانی کے پیرائے میں بھی مناسب معلومات ہی فراہم کی جاتی ہیں۔ معلوماتی کتب میں مصنف درس بھی دیتا ہے۔ اس طرح غیر افسانوی ادب میں ہم ان کتب کو شامل کر سکتے ہیں جو بچوں کو مختلف انداز میں مختلف قسم کی معلومات فراہم کرتی ہیں۔

غیر افسانوی ادب اور معلوماتی کتب کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بچوں کی درسی کتب اور امدادی کتب کے علاوہ ان میں مختلف موضوعات پر مشتمل کتابیں مثلاً سوانح عمریاں، مکاتیب، اصلی سفرنامے اور سائنٹفک کتابیں شامل ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بچوں کے

ادب میں افسانوی اصناف برطری حاوی رہے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں بچوں کے لیے غیر افسانوی کتب اور معلوماتی کتب بہت کم لکھی گئی ہیں۔ بچے کی جب آنکھ کھلتی ہے تو وہ پریوں کی کہانیاں سنتا ہے اور پھر اسی خیالی دنیا میں اس کے ذہن اور جسم دونوں کی نشو ونما ہوتی ہے ۔

غیر ممالک میں افسانوی ادب سے زیادہ معلوماتی کتب کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں زیادہ تر معلوماتی کتب، غیر ممالک کی کتب کے تراجم یا چربے ہیں۔ حالانکہ ہمارے بچوں کو اپنے ہی ملک کے بارے میں معلوماتی کتب اور غیر افسانوی کتابوں کی اشد ضرورت ہے۔ جدید تعلیمی نفسیات اور سائنٹفک ترقیات نے بچوں کے ذہن پر اثر ڈالا ہے۔ اس کے تحت وہ محض پریوں پری قناعت نہیں کر سکتے غیر فطری اور ما فوق الفطرت واقعات اور کرداروں سے ہمیشہ بہلائے نہیں جا سکتے۔ چونکہ بچے میں تجسس کا مادہ بچپن سے ہوتا ہے اور آج کی سائنس کی دنیا نے بچے کے ذہن کو بہت ترقی یافتہ بنا دیا ہے۔ چنانچہ وہ ہر اس چیز کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے جو اس کے سامنے آتی ہیں یا جن کے بارے میں وہ متجسس رہتا ہے۔

یہاں ایک سوال اٹھتا ہے کہ کیا بچوں کی درسی کتب معلوماتی کتب ہیں ؟ درسی کتب اور معلوماتی کتب میں بڑا فرق ہے۔ درسی کتب اور معلوماتی کتب کے فرق کو سورن کھانڈ پور نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے

"A textbook is read with the help of the teacher, while an information book is read by the child himself . All textbooks are information books but not all information books are textbooks though a large number of them are brought by schools ".[1]

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ درسی کتب بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے کافی ہوتی ہیں جبکہ

---

1. Swarn Khandpur, "Non-Fiction for children." Sovenior of XXI National Prize Competition for children's literature, January 1980, Organised by N.C.E.R.T., New Delhi, Page 202.

دورِ جدید کے ماہرینِ تعلیم بچوں کے لیے وسیع مطالعہ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ بقول عطش درانی:

"دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں کتاب کا تصور آہستہ آہستہ ناپید ہوتا جارہا ہے اور مجموعی اور کثیر مطالعہ بچے کو علم کا واضح اور جامع تصور قائم کرنے میں بیحد مفید ثابت ہوتا ہے۔ جدید ماہرینِ تعلیم اس امر پر اس قدر متفق ہیں کہ شاید ہی کسی اور مسئلے پر اتنے متفق ہوئے ہوں"[1]

اب مسئلہ یہ ہے کہ بچوں کے کثیر مطالعہ کے لیے کس قسم کا مواد مہیا کیا جائے اور اسے کس انداز میں پیش کیا جائے یعنی کیا لکھا جائے؟ کیسے لکھا جائے اور کس طرح پیش کیا جائے؟ بچوں کی انسائیکلو پیڈیا اس سلسلے کی سب سے اہم اور مفصل حوالہ جاتی کتاب "ریفرنس بک" ہے جس میں مختلف موضوعات اور مضامین پر مکمل تفصیل مل جاتی ہے، مختلف زبانوں میں بچوں کے لئے انسائیکلو پیڈیا ملتے ہیں اور بیحد کارآمد ہیں لیکن ہماری ہندوستانی زبانوں خصوصاً اردو میں اس قسم کی کتب کی کمی رہی ہے۔

ہمارے ملک میں ادبِ اطفال کے ساتھ سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ اس کو عموماً غیر معیاری بلکہ غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ خصوصاً مصنفین نے غیر افسانوی ادب، معلوماتی ادب اور سائنسی کتب پر بہت کم توجہ دی ہے۔ صرف کہانیوں اور نظموں کو ہی بچوں کا ادب سمجھا گیا ہے۔ بچوں کے لیے غیر افسانوی ادب لکھنے والے ادیبوں کو دراصل ادیب کا وہ مقام نہیں ملتا جو افسانوی ادب کے مصنف کا ہے۔ یہی نہیں بلکہ غیر افسانوی ادب کو تخلیقی ادب میں شمار ہی نہیں کیا جاتا۔

غیر افسانوی ادب اور معلوماتی کتب لکھنا بہت مشکل اور ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ بالکل اسی طرح کا عمل ہے جس طرح کہ کسی بھی نئے مکان کو بنانے میں ایک ایک اینٹ کا استعمال سلسلے وار ہوتا ہے۔ آپ بغیر بنیادی اینٹیں رکھے بیچ میں کسی بھی اینٹ کو نہیں لگا سکتے اور نہ ہی بنیادی اور بیچ کی اینٹوں کے بغیر اوپر کی اینٹیں رکھی جا سکتی ہیں۔ ہر ایک اینٹ کا سلسلہ دوسری اینٹ سے جوڑا ہوا ہے۔ پہلے ہمیں بنیادی اینٹ رکھنا ہوتی پھر آہستہ آہستہ آگے کام ہوگا۔ اس

---

[1] عطش درانی "بچوں کے لیے غیر افسانوی، معلوماتی اور سائنسی کتب" ماہنامہ کتاب (لاہور) جنوری ۱۹۷۹ء ص ۱۳۰۔ مدیر ذوالفقار احمد تابش۔

کام میں بہت ہنرمندی اور صلاحیت اور اہلیت کی ضرورت ہے۔

امریکی ماہر روتھ ٹوز نے اپنی کتاب YOUR CHILDREN WANT TO READ کے صفحہ ۱۶۰ پر بچوں کی معلوماتی اور غیر افسانوی کتب کو ارد گرد کے طبعی دنیا کی ساخت کیا ہے۔ پہلے گروہ میں ایسی کتب آتی ہیں جو بچے کو ارد گرد کی طبعی دنیا کی ساخت سمجھا سکیں۔ ضروری ہے کہ بچہ دنیا میں آنکھ کھولنے کے بعد اس کی طبعی حیثیت کو جانے مثلاً زندگی، اس کا آغاز، ارتقار، جانور، درخت، پودے آسمان اور زمین وغیرہ کے بارے میں عام بنیادی معلومات اسے حاصل ہونی چاہیے۔

دوسرے گروہ میں روتھ ٹوز۔ کے نزدیک ایسی کتابیں آتی ہیں جو بچے کو معاشرتی تعلیم دے سکیں اور تیسرے نمبر پر اس کے نزدیک جذباتی، رومانی، جمالیاتی تسکین سے تعلق رکھنے والی کتابیں ہیں۔ مختلف موضوعات اور معلومات پر مشتمل مواد کو پیش کرنے یعنی بچوں کے لیے معلوماتی اور غیر افسانوی ادب کی پیش کش کا انداز ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں اسلوب کوئی بھی اختیار کیا ہو گیا میری رائے میں بنیادی اہمیت، دلچسپی کو دی جائے گی یعنی پیشکش کا انداز اس نوع کا ہو کہ بچہ بہتر طور کتاب سے دلچسپی لینے پر مجبور ہو جائے۔ عام طور پر غیر افسانوی ادب کے تحت بچوں کے لیے مندرجہ ذیل موضوعات پر کتابیں ملتی ہیں۔

مہمات اور معرکہ آرائیاں:۔

بچہ مہماتی واقعات پر مشتمل کتب میں بہت دلچسپی لیتا ہے۔ اس نوع کی کتب میں تاریخی مہم جوئی اور معرکہ آرائی کے حقیقی واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ ان میں بیک وقت مختلف لوگوں کے متعلق تفصیلات، ان کے مسائل اور رہن سہن کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

جانوروں سے متعلق:۔

جانوروں سے متعلق معلوماتی کتب پسند کرتے ہیں۔ خصوصاً پالتو اور معروف جانوروں کے بارے میں یہ کتابیں ان کی جسمانی حالت، عادات، ضروریات، رہن سہن اور دیگر معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔

سوانح عمریاں:۔

اس قسم کی کتابوں میں ایسی شخصیات کی سوانح عمریاں شامل ہیں جو کسی نہ کسی پہلو سے قومی یا مذہبی اہمیت لی جاتی ہیں یا بڑے شاعر، ادیب وغیرہ ہوں۔ سوانح عمری وغیرہ کے علاوہ ان میں تاریخ، تہذیب، ثقافت، آرٹ اور ادبی کارناموں کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

معلوماتی کتب:۔

غیر افسانوی ادب میں معلوماتی کتب سب سے زیادہ اہم ہیں۔ بچوں کے تجسس، جوش اور جذبے نیز علم کے روزمرہ اضافے کے پیش نظر ان کی تعداد افسانوی ادب کی کتب سے زیادہ ہونی چاہیے۔ ان کتابوں میں سمندر کے اندر کی دنیا، آسمانوں کی سیر، جنگلات اور دیگر دوسرے موضوعات پر مکمل معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ جیسے کی کہانی، خط کی کہانی، فٹ بال کی کہانی، موجوں کی کہانی، گھوڑے کی کہانی اور اس قسم کے دیگر موضوعات میں بچے بہت دلچسپی لیتے ہیں۔

مشاغل اور کھیل کود سے متعلق کتابیں:۔

دورِ جدید میں مشاغل اور کھیل کود سے متعلق کتابیں بچوں میں بہت مقبول ہیں فطری بات ہے کہ بچے کھیل کود کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور عالمی بیانیہ پر اسپورٹس نے بہت اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ کرکٹ ہمارے دور کا سب سے مقبول ترین کھیل ہے۔ کھیل اور کھلاڑیوں سے متعلق کتابیں بچے بہت پسند کرتے ہیں۔ ٹکٹ جمع کرنے، فوٹوگرافی سکھانے، قلمی دوست بنانے سے متعلق اور اسی قسم کے موضوعات پر کتابیں بچوں میں بہت مقبول ہیں۔ ایسے مشاغل کے ساتھ مسئلے حل کرنا بھی بچوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ ان مشاغل اور معموں سے بچے کے علم، تجسس، مہارت اور ذوق وشوق میں اضافہ ہوتا ہے۔

سائنسی ادب:۔

عہدِ حاضر میں سائنس انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اور کسی نہ کسی شکل میں ہر انسان

کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ سائنس نے انسان کے فلسفۂ حیات اور نظریات کو بے حد متاثر کیا ہے جو آج بچے ہیں وہ کل بڑے ہوں گے۔ اگر ابتدا سے ہی بچوں کو سائنسی ادب سے روشناس کرایا جائے تو مستقبل میں وہ سائنس کے میدان میں تیزی سے ترقی کر سکیں گے ہمارے ملک میں سائنس اسکول میں ابتدائی مدارج سے داخل ہے۔ جس کے باعث ذہین بچوں کو شروع سے ہی سائنس سے دلچسپی ہو جاتی ہے۔ اگر بچوں کو ابتدا سے ہی سائنسی ادب بھی فراہم کریں تو ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ بچے درسی سائنس کتب کے علاوہ بھی سائنس سے متعلق بہت سی کتابوں کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ اور اکثر ان کے بارے میں خود والدین بھی نہیں جانتے زمین گول ہے، کیوں گول ہے؟ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یا سورج زمین کے گرد گھومتا ہے؟ چاند زیادہ اونچائی پر ہے یا ستارے؟ سمندر کے اندر کی دنیا کیسی ہے؟ کیا جل پری کا وجود ہے؟ سپر مین کیسے اڑتا ہے؟ اسٹار ٹریک کیا ہے؟ موٹر سائیکل، ہوائی جہاز، ٹیلی ویژن، ریڈیو کیسے کام کرتے ہیں؟ اور ان کا موجد کون ہے؟ سب سے پہلے خلا میں کون گیا؟ یہ تمام باتیں بچوں میں سائنس سے دلچسپی اور سائنسی ادب کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔ دورِ جدید میں ٹیلی ویژن نے سائنس پر فلمیں دکھا کر بچوں کی دلچسپی کو خاصا بڑھایا ہے۔ سائنسی معلومات کتب کے ساتھ ساتھ سائنس فکشن میں بھی بچوں کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے ایسی کتابوں کا وافر ذخیرہ مختلف زبانوں میں بچوں کے لیے موجود ہے لیکن اردو میں ان کی بڑی کمی ہے جس کی تلافی ہونی چاہیے۔

بچوں کے لیے غیر افسانوی، معلوماتی اور سائنسی کتابوں کا لکھنا بہت مشکل اور ذمے داری کا کام ہے۔ یہ کام تو اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب ہندوستانی بچوں کی عمر کے مختلف مدارج اور ان کی ذہنی استعداد کی مناسبت سے ان کے لیے کچھ لکھنے کی کوشش کی جائے۔ خصوصاً ہمارے ملک کی وسعت اور اس کے الگ الگ علاقوں میں پائے جانے والی مختلف آب و ہوا، ماحول، تہذیب و تمدن، اقتصادیات اور مذاہب کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔

بچوں کی پسند اور ناپسند کا تعلق براہ راست بچوں کی اپنی دلچسپی پر منحصر ہے۔ بچہ خود بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا پڑھنا چاہتا ہے۔ کبھی وہ ایک کتاب پڑھتا ہے اور کبھی اس کو چھوڑ کر وہ دوسری کتاب کی طرف لپکتا ہے۔ کبھی اسے جانوروں پر لکھی ہوئی کتاب پسند آتی ہیں تو کبھی وہ سمندر کی دنیا کے بارے میں مکمل معلومات چاہتا ہے اور کبھی وہ مصنوعی سیاروں میں بیٹھ کر آسمان کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ مصنفین کے لیے واجب ہے کہ وہ بچے کی ان تمام جائز خواہشات کا

احترام کریں۔

۴۔ شاعری :۔

شاعری کا تعلق انسانی جذبات سے ہے، انسانی زندگی میں شاعری زبردست اہمیت کی حامل ہے۔ شاعری سے امیر غریب عوام خواص، بوڑھا بچہ سب ہی محظوظ ہوتے ہیں۔ شاعری تہذیب کی علامت ہے۔ انسان میں بچپن ہی سے شاعری سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، معصوم اور شیر خوار بچہ ماں کی لوریوں سے محظوظ ہوتا ہے کیوں کہ ان میں تال، سُر اور میٹھے خوش آہنگ الفاظ کی تکرار ہوتی ہے۔ بچہ جب ذرا بڑا ہوتا ہے تو چھوٹی چھوٹی نظمیں اس کو پسند آنے لگتی ہیں۔ جدید نظام تعلیم میں ابتدائی درجات کو نرسری اور کے جی کہتے ہیں۔ اس منزل میں مختصر ترین نظموں (نرسری رائمس) کے توسل سے بچوں کی دلچسپی تعلیم اور اسکول میں پیدا کی جاتی ہے۔ کہانی اور نظم دو ایسی چیزیں ہیں جو بچے کی تعلیم کا بنیادی وسیلہ رہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی مترنم نظمیں بچے بآسانی یاد کر لیتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم بچپن کے اس قدرتی شوق اور ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بچوں کو اچھے گیت اور نظموں سے مانوس کرائیں تاکہ بڑے ہو کر وہ شاعری سے بخوشی محظوظ ہو سکیں نیز ان کے موضوعات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

بچوں پر شاعری کے اثرات بڑے دُور رس اور مختلف ہوتے ہیں۔ رزمیہ شاعری ان میں جوش پیدا کرتی ہے اور اپنے بزرگوں کی شجاعت اور بہادری سے روشناس کراتی ہے۔ نظم کی ادھوری کہانیاں بچے کو خوابوں کی دنیا میں لے جاتی ہے۔ شعر کی غنائیت ان کے کانوں کو موسیقی سے آشنا کرتی ہے۔ طربیہ گیت، جذباتی نظمیں بچوں پر بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جنھیں بچے پہچانتے ہیں اور ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ گیتوں اور نظموں میں ترنم کے ساتھ ساتھ موضوعات اور الفاظ کی جادوگری ہوتی ہے جن سے بچے متاثر ہوتے ہیں۔ جن میں ترنم بھی ہو اور ایک طلسمی فضا و معنویت کے بھی حامل ہوں۔ ایسے الفاظ جو معنوی اور شعری دونوں اعتبار سے بے اثر ہوں بچے میں شاعری کا ذوق بھی پیدا کرتے ہیں مگر بچہ نظم کے الفاظ اور معنی کی بہ نسبت ترنم اور لے سے زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کو اس بات سے مطلب نہیں ہوتا کہ الفاظ کے ترنم میں معنی بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ والٹر ڈیلامیر کے حوالے سے مشیر فاطمہ لکھتی ہیں :۔۔

"بچے کو شعر کا ترنم زیادہ متاثر کرتا ہے۔" وہ اپنی نظم کے بارے میں کہتا ہے
نظم کے الفاظ کی آواز موسیقی کی آواز سے ملتی ہے۔ اس آواز کو سننا بھلا معلوم ہوتا
ہے۔ نظم میں زیر و بم ہے ٹھہراؤ ہے، اگونج ہے، جیسے شام یا صبح کے وقت چڑیاں
چہچہا رہی ہوں۔ الفاظ کو بآواز بلند پڑھنے میں لطف آتا ہے۔" له

ادب کی دوسری اصناف کے برعکس شاعری بچوں اور بڑوں کو یکساں طور پر متاثر کرتی ہے۔
لیکن بچپن کی مدت مختصر ہوتی ہے اس لیے اس کو عمر کے اس حساس دور میں بہترین شعری ادب
سے روشناس کرانا ہوگا۔ بچوں کے ادب میں گیت، بیانیہ نظمیں، تمثیلی منظوم ڈرامے، منظوم قصے،
کھیل کود کی نظمیں اور بچوں کی اپنی لکھی ہوئی نظمیں مختصر اور غنائیہ نظمیں، نرسری رائمس شامل ہیں۔
مناسب یہ ہے کہ بیانیہ نظمیں بہت لمبی نہ ہوں اور نہ ہی ان میں فلسفہ، سیاست براہ راست مذہب
کی تبلیغ اور پند و نصائح وغیرہ شامل ہوں۔ بڑوں کی ایسی باتیں بچوں کی نظموں میں نہ ہونی چاہئیں
جو بچوں کے تجربے اور سمجھ سے باہر ہوں۔ تاریخی اور رزمیہ واقعات کی حامل مترنم نظموں سے بچے
بہت متاثر ہوتے ہیں۔

بچوں کے ادب میں اکثر نظمیں اور گیت بھی شامل ہیں جن میں کوئی موسیقی، کوئی ترنم نہیں ہوتا
ان کے الفاظ میں کوئی معنی یا تخیل نہیں ہوتا لیکن بچے کا حساس دل اور ذہن ایسی باتیں بہت
پسند کرتا ہے جو ان کے تخیل میں قوت پرواز پیدا کرسکیں اور بچوں کو متاثر کرسکیں۔ بچوں میں خوشی
اور استعجاب کے جذبات پیدا کرسکیں۔

ادب اطفال میں بچوں کی شاعری کو ہم کئی اصناف میں منقسم کرسکتے ہیں۔

۱۔ گیت اور نظمیں ۲۔ کھیل کے گیت ۳۔ تیوہاروں کے گیت ۴۔ لوریاں ۵۔ پہیلیاں
کہہ مکرنیاں ۶۔ منظوم کہانیاں۔

ا۔ گیت اور نظمیں :۔

بچہ نظم پڑھنے، سننے اور اسے دہرانے میں بہت لطف لیتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی نظمیں بچوں
کو جلد یاد ہو جاتی ہیں۔ ایسی نظموں میں نرسری رائمس اور بے مفہوم یا موہوم نظموں کو بچے بہت

له مشیر فاطمہ: بچوں کے ادب کی خصوصیات انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۲ء ص ۹۰۔

پسند کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے جدید اصول تعلیم کے پیش نظر بچوں کو پہلے نرسری رائمز یاد کرائی جاتی ہیں جن کو بچے ایکشن (ACTION) کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ بچوں کے ادب میں ایسی نظموں کی بہت اہمیت اور افادیت ہے۔ عوامی ادب میں بچوں کے گیتوں کی بہت اہمیت ہے۔ تھریسا بی برکلے نے لکھا ہے:۔

"The oldest and most widely diffused of folK-songs, showing great similarity both as to melody and to subject matter all over the world and preserving the vestiges of ancient believes They include the game song, by children themselves and the lullabies etc., sung to children by adults "[1].

ادب اطفال میں بعض لوک گیتوں نے بہت مقبولیت حاصل کی ہے۔ ان میں وہ گیت زیادہ مقبول ہوئے جو مترنم بھی ہیں اور موضوع کے حامل ہیں۔ ان گیتوں میں کھیل کود، قدیم تقریبات کا بیان، تاریخی واقعات، اور وہ لوریاں شامل ہیں جو مائیں اپنے بچوں کو سلاتے وقت گاتی ہیں۔ یہ تمام خوبیاں انگریزی کے چلڈرن سانگس (CHILDREN SONGS) کی ہیں۔ ہندوستانی بچوں کے گیت ان سے قدرے مختلف ہیں۔ بچوں کے گیت کی تعریف ہندی ساہتیہ کوش میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"बच्चों के गीतों में अद्भुत कल्पना का प्रयोग होता है अथवा शिक्षा होती है। यह [illegible] उनके खेलों से सम्बन्धित होते हैं।" [2]

بچوں کے گیتوں میں ان کے اپنے تخیل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ وہ خود بھی تک بندی کرتے

---

1. Thereasa, C Barkiley, "Standard Dictionary of FolK-lore Mythology & Legend." Vol. I. Page 219.

2. "हिन्दी साहित्य कोश" पेज 629

ہیں اور اپنی لے میں وہ گیت دہراتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کو چھوٹی چھوٹی اور عام فہم زبان والی زبان والی نظمیں بے حد پسند ہیں۔

۲۔ کھیل گیت :۔

بچے زیادہ تر شعوری یا لاشعوری طور پر کھیل کھیل میں گیت گاتے رہتے ہیں چونکہ عام طور پر کسی محفل یا انجمن میں ان کو گانے کا موقعہ نہیں ملتا اور ایسی جگہ بچے اپنے دلی جذبات کا بیباکی کے ساتھ اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے کھیلوں کے گیت میں اس جذبے کی آسودگی ہو جاتی ہے۔ اور بچوں کے دلی جذبات کا اخراج ان گیتوں کے وسیلے سے بآسانی ہو جاتا ہے۔

بچوں کو کھیل گیت بہت پسند ہیں۔ لوک گیت (FOLK SONG) جہاں ہوں گے ان میں بچوں کے کھیل گیت ضرور شامل ہوں گے۔ جارج فرزوگ نے کھیل گیتوں کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"Children's game and round songs are found wherever there is Fold-Songs They often contain fragments of songs of grown, ups, and reflections of grow up activities, connected with mimetic play [1]

ہندوستانی عوامی ادب میں ایسے گیت کافی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کی تقریباً تمام قومی اور علاقائی زبانوں میں ایسے گیت موجود ہیں۔ ایسے گیت بندیل کھنڈ میں زیادہ مقبول ہیں۔ وہاں تو یہ گیت لڑکے اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ ہیں۔ یہ گیت مختلف کھیلوں کے توسل سے تفریح اور جسمانی چستی بخشتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ ہندوستانی تیوہاروں اور رسم و رواج کا عکس بھی بچوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

بچے ایسے گیت بھی گنگناتے ہیں جن کا تعلق بڑوں سے قطعی نہیں ہوتا۔ ایسے گیتوں میں

---

1. George Ferzog, "Standard Dictionary of Folk lore. Mythology & Legend "Vol.II. Page 1034..

بچوں کے اپنے بنائے ہوئے کھیل گیت بھی شامل ہیں۔ ان گیتوں میں پہلی لائن کا مطلب دوسری لائن کے مطلب سے قطعی الگ ہوتا ہے۔ یہ بچوں کی اپنی تک بندی بھی ہوتی ہے۔ ایسے گیت مجموعی طور پر بچوں کو بے حد متاثر کرتے ہیں کیونکہ بچے انھیں بے تکلفی کے ساتھ دلی جذبات کا ترجمان بناتے ہیں۔ ترنم اور لے کے ساتھ مزے لے لے کر گاتے ہیں۔

۳۔ تیوہاروں کے گیت :۔

کھیل گیتوں کی طرح بچوں میں تیوہاروں کے گیت بھی بہت مقبول ہیں۔ تیوہاروں کے گیت ہمارے ملک میں جتنے زیادہ تعداد میں ہیں وہ مشکل سے کسی دوسرے ممالک میں ملیں گے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے لوگ ہیں جغرافیائی اعتبار سے ہمارے ملک میں بہت سے علاقائی تیوہار ہیں۔ مذہبی، علاقائی اور قومی تیوہاروں کے ساتھ ساتھ مختلف موسموں مثلاً ساون اور بسنت میں بچے اور بچیاں گیت گاتی ہیں جن میں جھولے کے گیت قابل ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ ہی ہولی، دیوالی، عید، شب برات وغیرہ کے موقعہ پر مخصوص گیت بھی گائے جاتے ہیں۔

۴۔ لوریاں :۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ بچوں کے ادب کی شروعات ان لوریوں سے ہی ہوتی ہے۔ جو صدیوں سے مائیں اپنے بچوں کو سلانے کے لیے گاتی چلی آئی ہیں۔ ان لوریوں میں ترنم بھی ہوتا ہے، ماں کی آواز کا تاثر بھی اور ماں کے سامنے بچے کے بہتر مستقبل کا تصور بھی ہوتا ہے۔ عابد سہیل کا کہنا ہے۔

"بچوں کے ادب کی بنیاد شاید غیر رسمی طور پر سب سے پہلے اس وقت پڑی جب چٹکی چاندنی میں کوئی ماں اپنے چاند کو گود میں لیے آنگن یا جھروکے میں بیٹھی اسے سلانے کی کوشش کر رہی ہوگی اور غیر شعوری طور پر اس کے ہونٹوں سے اس لوری کا پہلا بول یا مصرعہ پھوٹ نکلا ہوگا۔

چندا ماما دور کے
ہم کو دیکھیں گھور کے

آپ کھائیں تھالی میں
ہم کو دیں پیالی میں "[1]

تمام دنیا میں بچوں کو سلانے کے لیے کسی نہ کسی طرح کی لے اور گنگناہٹ کا استعمال مائیں کرتی ہیں اس گنگناہٹ کو کچھ الفاظ سے آمیز کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے لوریاں مختصر ہوتی ہیں۔ جن الفاظ کا استعمال ان لوریوں میں ہوتا ہے وہ بچوں کی سمجھ میں نہیں آتے لیکن یہ ماں کے جذبات تمنا سے مملو ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ "لوری" ماں کا گیت ہے بچوں کے لیے ہندوستانی لوریوں میں عام طور پر ابتدا میں بچے کی تعریف، پھر اس کے بہتر مستقبل کی تمنا اور آخر میں نیند سے متعلق جملے ہوتے ہیں تا کہ بچے اس کا تصور کر کے سو جائیں۔ ڈاکٹر ہری کشن دیوسرے نے بھی لوریوں کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے جن سے لوریوں کی بنیادی خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

"-----लोरियों का बच्चों पर मनोवैज्ञानिक प्रभाव पड़ता है। लोरियां गाते समय बच्चों का ध्यान उसकी लय तथा गुनगुनाहट और न समझ में आने वाले शब्दों की ओर लग जाता है मां की गोद में रहकर या उसे अपने पालने के पास देखकर बच्चों को अपार सुख मिलता है, वे अकेलापन नहीं महसूस करते उन्हें भय नहीं लगता। इस तरह लोरियां जहां बच्चों के मनोरंजन के लिये उपयोगी है, वहीं वह मनोवैज्ञानिक दृष्टि से भी बच्चों के लिये महत्व पूर्ण है।"[2]

چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی لوری کے ترنم سے محظوظ ہوتا ہے۔ لوریاں سن کر خوش ہوتا ہے۔ یہ خوشی اس کو اسی وقت سے حاصل ہونے لگتی ہے جب وہ الفاظ کو سمجھ یا بول نہیں سکتا۔ اس طرح ادب اطفال میں لوری کی حیثیت بنیاد کی سی ہے جس پر آگے چل کر عظیم الشان عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔

---

[1] عادل سہیل "اردو ادب میں بچوں کا ادب" ماہنامہ۔ یادگار لکھنؤ نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء ص ۹۲

2 डा0 हरि कृष्ण देवसरे "हिन्दी बाल-साहित्य, एक अध्ययन," आत्माराम एण्ड सन्स, दिल्ली-6 1969 पृष्ट 75/76

۵۔ پہیلیاں، کہہ مکرنیاں

بچوں کے ادب میں پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کی زبردست اہمیت رہی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ بچے میں شروع ہی سے تجسس کا مادہ زبردست ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کو جاننے کا خواہش مند اور کوشاں رہتا ہے۔ "بوجھو تو جانیں" جیسے موضوعات بچے کو بہت پسند ہیں۔ اردو ادب اطفال میں ہم کو امیر خسرو کی لاتعداد پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں مل جاتی ہیں۔ پہیلیوں سے بچے کی ذہنی نشوونما اور ورزش کے ساتھ اس کی تفریح اور معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کی اہمیت نہ صرف بچوں کے لیے ہے بلکہ بڑے بھی ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پہیلیوں اور مکرنیوں میں نمایاں فرق ہے کہ پہیلی میں اس کا جواب صرف ایک ہوتا ہے کہہ مکرنیوں میں ایک منفصل سوال کے دو جواب ہوتے ہیں جن میں پہلے جواب کو رد کرکے دوسرے کی صحت پر اصرار کیا جاتا ہے۔

بچے ایک دوسرے سے بڑوں کے ساتھ پہیلیاں بوجھتے، بجھاتے اور ان کو الجھا ہوا دیکھ کر بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ اسٹینڈرڈ ڈکشنری آف فاک لور میں لکھا ہے:

"Folk-Lore is the lare or learning or common sense or mother wit of the people as passed down from parent or grand parent to child or grand child, and that folk knowledge must be packed and capsuled for easier transmission down through th e generations "[1]

اسٹینڈرڈ ڈکشنری آف فاک لور میں پہیلیوں کے متعلق مورس فیلڈ کی رائے درج ہے موصوف کی یہ رائے درحقیقت اس ضمن میں بچوں کے اپنے تاثرات ہیں

"-----l om olden times, as an early exercise of the primitive mind in its adjustment to the world about

---

1 Standard Dictionary of Folk-Lore Vol II P 939

it, comes the riddles----- all harmonies and fitness all discrepancies and in consistencies attract the notice of children and child like man Hence children love riddles, hence savages and primitive people put them, all folk-lore is full of them " .

ہمارے یہاں بچوں کے ادب میں پہیلیوں کی اہمیت مسلّم ہے۔ عام طور پر ہندوستانی زبانوں کے ادب میں جو پہیلیاں اور مکرنیاں مقبول ہیں وہ آب و ہوا، رسم و رواج اور روایتی انداز میں مختلف ہونے کے باوجود مزاجاً ایک جیسی ہیں ان کی مدد سے بچوں کو مختلف چیزوں کے رنگ و روپ، ان کی اشکال اقسام ان کی خصوصیات اور بہت سی بنیادی باتیں آسانی سے سمجھائی جا سکتی ہیں۔

۶۔ منظوم کہانیاں :۔

بچوں کے ادب میں منظوم کہانیوں کی ایک انفرادی حیثیت ہے۔ ہندوستانی ادب خصوصاً اردو منظوم کہانیاں بے شمار لکھی گئی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نظمیں مترنّم، لے اور موسیقی کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ بچوں کو کہانیوں کا لطف دیتی ہیں اور اس طرح ان کی حیثیت دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ بہت سی مشہور تاریخی، روایتی اور رزمیہ مذہبی حکایتوں کو ان نظموں کا موضوع بنایا گیا ہے۔ ایسی نظمیں عموماً بیانیہ ہوتی ہیں۔ منظوم کہانیاں عموماً دس سے چودہ سال تک کے بچے زیادہ پسند کرتے ہیں جنہیں زبان کے ساتھ ساتھ ادب کی واقفیت بھی ہوتی ہے اور وہ ان نظموں کو بآسانی پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ ایسی نظموں کے ذریعہ بچوں کی تفریح کا سامان بھی فراہم ہو جاتا ہے اور انھیں اخلاقی تعلیم بھی مل جاتی ہے۔

---

1. Standard Dictionary of Folk-Lore Vol II P.939.

۵۔ درسی کتب :۔

ماہرینِ نفسیات اور ماہرینِ تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ اسکول میں بچوں کو درس و تدریس اور تربیت کا بنیادی وسیلہ ان کی مادری زبان ہی بن سکتی ہے۔ اسکول جانے سے قبل بچہ اپنی مادری زبان میں بولنا شروع کر چکا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اسکول میں درسی تعلیم حاصل کرتے وقت بھی بچہ مادری زبان کے بہت سے عناصر اپنے ماحول سے حاصل کرتا رہتا ہے۔ زبان کی عادت بتدریج شخصیت کا حصّہ بن جاتی ہے جو نہ صرف بولتے اور لکھتے وقت بلکہ سوچتے اور خواب دیکھتے ہوئے بھی ساتھ رہتی ہے۔ یہ ایک مُسلّم امر ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم کو مادری زبان کے توسّط سے ہی معیاری شکل دی جا سکتی ہے۔

ادبِ اطفال کے بنیادی عناصر، نثری اصناف، شاعری، غیر افسانوی، معلوماتی اور اسی نوع کی دیگر چیزیں جو بچے کی نشو و نما اور ذہنی و جسمانی فروغ میں خوراک کا کام دیتی ہیں۔ باین ہمہ اس کے لیے سب سے زیادہ اہمیت کی حامل مادری زبان کی وہ درسی کتابیں ہیں جن کو بچہ زبان سیکھنے کے لیے پڑھتا ہے۔ اس لیے بچوں کے ادب میں درسی کتب کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جن میں بچہ نظم، پہیلیاں، لطائف، کہانیاں، اخلاقی، مذہبی اور معلوماتی مضامین وغیرہ سب سے پہلے پڑھتا ہے۔ بچوں کے مشہور شاعر شفیع الدین نیرؔ نے بچوں کے ادب کو مندرجہ ذیل دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

"(۱) وہ کتابیں جو خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں

(۲) وہ کتب جن کو موضوع، زبان اور آسان اسلوب کے اعتبار سے بچوں کے اسکولی نصاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔" [۱]

درسی کتب میں بچوں کے موضوعات اور بچوں کی عمر کے مختلف مدارج کا خیال رکھنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ درسی کتابیں یا اسکولی نصاب، بچوں کو ایک ایک سیڑھی پڑھنا سکھاتا ہے اور ان کی انگلی پکڑ کر آگے بڑھاتا ہے۔ بچے کی مادری زبان اور اسکولی تعلیم کے بغیر انہیں براہِ راست

---

[۱] محمد شفیع الدین نیرؔ "مقدمہ بہارِ طفلی"، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۶۰ء، ص ۱۶

غیر درسی کتابیں، معلوماتی کتابیں اور پریوں کی کہانیوں وغیرہ سے روشناس نہیں کیا جا سکتا۔ نہ بچے کی دلچسپی دوسری اصناف ادب پیدا کی جا سکتی ہے۔

کہانیاں، قصے، نظم، معلوماتی مضامین، چٹکلے، پہیلیاں اور اسی قسم کی دوسری اصناف کے بارے میں بچے کی دلچسپی کا آغاز درسی کتابوں ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ بعض ناقدین مبصرین اور ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ درسی کتابوں کا تعلق بچوں کے ادب سے نہیں ہے؟ میری رائے اس سے قطعی مختلف ہے۔ کسی بھی ملک اور قوم کی تہذیب و تمدن اور قومی زندگی کا عکس مختلف رنگوں اور مختلف اندازمیں درسی کتب میں ملتا ہے۔ درسی کتب ایک ایسا خزانہ ہے جس میں یہ تمام چیزیں ایک ساتھ دیکھی جا سکتی ہیں۔

درسی کتب میں ہمارا ماضی محفوظ ہوتا ہے۔ ان میں ہمارے حال کا عکس ہوتا ہے اور ہمارے مستقبل کا خاکہ درسی کتب میں جھلکتا ہے۔ ہمارا تہذیبی، تمدنی اور تعلیمی ارتقاء زیادہ تر ان کتب پر منحصر ہوتا ہے۔ کسی بھی زبان کی درسی کتب بچے کی زندگی میں بہت اہم اور نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ طالب علم کا مستقبل پوری طرح ان درسی کتب پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ درسی کتب جو مادری زبان میں ہیں تعلیمی مقاصد پوری کرنے کے ساتھ ساتھ بچے کے نظریات اور نفسیاتی رجحانات کی نشو و نما کرتی ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ ان کتابوں کے ذریعے بچوں میں قومی یکجہتی حب الوطنی اور انسان دوستی کے جذبات بیدار کیے جا سکتے ہیں۔

درسی کتب کی تدوین اور ترتیب بہت اہم اور نازک کام ہے۔ ایڈمن مارین نے لکھا ہے:

"----we have great responsibility for instilling in our boys and girls, the highest ideals of personal development and social orgnaization."[1]

ادب اطفال کا ایک بڑا ذخیرہ ہماری درسی کتب میں موجود ہیں۔ اگرچہ درسی کتب اور بچوں کے ادب کے فرق کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے لیکن اس نمایاں فرق کے باوجود اردو زبان

---

1 EDWARD MARION, "Criteria for Selecting Literature: the middle & upper grade" P 177

جب ہم ایک اچھے عمدہ اسلوب کی کتاب کا تجزیہ کسی درسی کتاب سے کرتے ہیں تو ایسی کتاب میں ایک خاص قسم کا ربط پایا جاتا ہے جو خاص طور پر طالب علم کی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے جو درسی کتب سے پوری طرح غائب ہے۔

ہمارے یہاں درسی کتب کی ترتیب و تدوین کے کام میں اہمیت کی خامیاں نظر آتی ہیں۔ زبان، اسلوب، منظرکشی اور موضوع ہر اعتبار سے یہ کتابیں بلند معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں موجودہ درسی کتب کی پیشکش میں حسن و سلیقے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے لکھا ہے:

"We are greatly dissatisfied with the standard of production of school books and consider it essential, that this should be radically improved. Most of the books submitted and prescribed are poor specimen in every way. If such books are placed in the hand of students, it is idle to expect that they should acquire any love for books or full interest in them."[1].

ایجوکیشنل اسٹیڈیز کمیشن نے ان کتابوں کے موضوعات کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی اصلاح بے حد ضروری ہے۔ زبان (LANGUAGE) اور سماجی علوم (SOCIOLOGY) کی ان کتابوں سے اعلیٰ شہریت، صوبائی اور قومی یکجہتی، آپسی بھائی چارہ، سماجی بہبود کی تعلیم نہیں ملتی۔ کتب کی تدوین کاری اور ترتیب کے فن کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کی وہ مستحق تھیں۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں آگے چل کر کہا ہے۔ کہ درسی کتب جس توجہ کی مستحق ہیں بدقسمتی سے وہ انہیں نہیں ملی۔ اسکولوں میں پڑھائی جانے والی درسی کتب کا معیار بھی پست ہے اور پیش کش (گیٹ اپ وغیرہ) بھی تسلی بخش نہیں۔ خصوصاً علاقائی زبانوں کی کتابیں انتہائی غیر معیاری ہیں۔

1/ Report of the Secondary Education Commission (1952-53), New Delhi Ministry of Education, Govt. of India, Page 96.

تدریسی اور نصابی کتابوں کی تدوین یا ایڈیٹنگ خاصا مشکل کام ہے۔ درسی کتب [illegible]
کاری میں مسلسل کوشش اور سلیقے سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ایک درسی کتاب کی تدوین و ترتیب
میں کم سے کم ایک سال یا اس سے دگنا لگ جاتا ہے اور پھر اس پر نظر ثانی اور تبصرہ پر مزید وقت
صرف ہوتا ہے۔ کریم امامی (ایران) نے اپنے ایک مضمون میں درسی کتب کی تدوین کاری کے سلسلے
میں لکھا ہے۔

"نصابی کتب لکھی نہیں جاتیں بلکہ انھیں معیار کے لحاظ سے بہتر بنایا جاتا ہے
چنانچہ مصنف کے علاوہ (جو کہ عام حالات میں استاد ہوتا ہے) مدیر کے لیے بھی ضروری
ہے کہ اسے پڑھانے کا تجربہ ہو اور مضمون کے بارے میں اس کی معلومات وسیع ہوں
مضمون کی افادیت اور وسعت اسی بات میں مضمر ہے کہ پہلے اس کے بارے میں
مذاکرات کیے جائیں۔ اور یہ طے کر لیا جائے کہ کتاب میں شامل ابواب کی نوعیت
وسعت کیا ہوگی؟۔ مواد کی حدود کیا ہوں گی؟ اس کے لیے کس درجہ اور معیار کی
زبان استعمال کی جائے گی؟ کتاب پر نظر ثانی کا کام صرف ایک شخص تک محدود
نہیں ہونا چاہیے بلکہ کتاب کے مختلف ابواب ٹیم (TEAM) کے مختلف اراکین
میں تقسیم کر دیے جائیں اور پھر ان سے ان کی رائے معلوم کی جائے۔"[1]

غیر نصابی کتابوں کے مقابلے میں نصابی کتابیں ترتیب دینے کے لیے مدیران یا مرتبین کو
زیادہ اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ مختلف مواد کی تدوین و ترتیب کے ضمن میں انھیں اختیار دیا
جانا چاہیے کہ وہ جس حصے کو چاہیں حذف کر دیں اور جہاں چاہیں مناسب ترمیم و اضافہ کریں۔
جن الفاظ کو چاہیں بدل دیں، جہاں چاہیں مترادف کا استعمال بڑھا دیں یا کم کر دیں۔

ہندوستان میں مختلف تعلیمی کمیشنوں، نقادوں، مبصروں اور ماہرین تعلیم کی تنقیدوں،
مبصروں اور مشوروں کے نتیجے میں ریاستی سطح پر درسی کتب کی مختلف کمیٹیاں بنائی گئیں جنھوں نے
بچوں کی مکمل نشوونما، ان کی مناسب ترتیب، حب الوطنی، قومی یکجہتی، بھائی چارہ اور اسی قسم کے
نظریات کے پیش نظر مختلف زبانوں کی کتابوں کو ترتیب دیا۔ اس ضمن میں نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل

---

[1] کریم امامی "کتب کی تدوین کاری" مترجم، عاصم صحرائی۔ ماہنامہ کتاب (لاہور)
دسمبر ۱۹۷۸ء مدیر ذوالفقار تابش)

ریسرچ اینڈ ٹریننگ (نئی دہلی) کا کام سب سے اہم ہے۔ جس نے بچوں کی مختلف عمروں، نفسیاتی
رجحانات، دلچسپیوں اور تعلیمی ضروریات کے پیش نظر کتابیں ترتیب دلائیں اور خوبصورتی کے ساتھ
شائع کی ہیں۔ اردو کی درسی کتابوں کے سلسلے میں این سی ای آر ٹی نئی دہلی کے ورکشاپ منعقدہ
سری نگر میں اس کے کنوینر پی۔ وی۔ موہلے ۔ ۔ ۔ ۔ نے درسی کتب کی ترتیب کے وقت ان
درج ذیل امور کو ملحوظ رکھنے پر زور دیا ہے لے

(۱) زبان اور اسلوب

(۲) اسباق کا مواد۔ (الف) سماجی، قومی ضروریات کی تکمیل

(ب) انسانی زندگی کے سائنسی اور تکنیکی پہلوؤں کا شعور

(ج) ادب کی تمام اصناف کا تدریجی ارتقاء

(۳) کتابت اور طباعت۔

(۴) تصویروں کی افادیت اور فنی معیار

(۵) کتاب کا سائز اور دیگر اشاعتی امور کو خوبصورت بنا سکیں۔

اسی طرح درسی کتب کو سائنٹفک انداز میں از سر نو مرتب کیا جائے تو خاصے مفید نتائج برآمد
ہونے کی توقع ہے۔

لے پی۔ وی۔ موہلے کنوینر ورکشاپ برائے تدوین کاری "اردو درسی کتب حصہ اوّل تا دہم"،
زیر اہتمام نیشنل کونسل آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ نئی دہلی، منعقدہ سری نگر کشمیر، ۵ رجون ۱۹۸۲ء
۱۴ رجون ۱۹۸۲ء

چوتھا باب

ضروریات اور مسائل

'بچے' ہماری قومی امانت ہیں اور اس امانت کا تحفظ قوم کے ہر ذمہ دار اور باشعور شخص کا فرض ہے لیکن ان کا تحفظ اور پرورش محض اچھی غذا، عمدہ لباس اور قیمتی کھلونوں تک محدود نہیں ان کی جسمانی تربیت کے ساتھ ان کی ذہنی تربیت بھی ضروری ہے، اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ انہیں اوائلِ عمری سے ادبی مواد فراہم کیا جائے جو تفریحی بھی ہو اور بامقصد بھی — لیکن ہمارے ملک میں بچوں کی اچھی غذا، عمدہ لباس اور قیمتی کھلونوں سے اگر بات آگے بڑھتی ہے تو بچوں کی تعلیم پر آکر ختم ہوتی ہے۔ تعلیم۔ اسکولی تعلیم۔ مقررہ اور محدود معلومات اور زبان کی تعلیم ایسی تعلیم جو بچے کی شخصیت کے بجائے اس کی زندگی بنانے میں مددگار ثابت ہو۔ زندگی بنانے سے مراد یہ ہے کہ وہ اچھا طرزِ معاش اختیار کر سکے، انجینئر بنیے، بڑا آفیسر بنے انسانی قدریں خواہ ابھریں یا نہ ابھریں۔ ان تمام باتوں کی طرف بڑے دھیان نہیں دے پاتے۔ بچوں کے لیے ایسی کتابیں جن سے اس کی شخصیت کی تعمیر ہو، انسانی قدروں کی تبلیغ ہو، بچوں کے لیے ہمارے یہاں کم ہیں۔

'ادبِ اطفال' کا سب سے بڑا المیہ یہی رہا ہے کہ اس موضوع پر جس سنجیدگی سے غور و فکر ہونا چاہیے، اور جتنی اس موضوع کو اہمیت ملنی چاہیے، وہ نہیں ملی۔ جس کی ایک خاص وجہ یہ رہی ہے کہ یہ سماج بڑوں کا سماج ہے۔ اس سماج میں بچوں کی ضروریات اور حقوق کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ پھر ایسے سماج میں بچوں کے ادب کے بارے میں کون سوچے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ادبِ اطفال ہمارا ہی متعلق ہے۔ ناموشر بچپن کے ادب اور بچوں کے مصنفین کی موجودہ

کیونکہ ان کے بارے میں ایک بہت قدیم کہاوت بھی ہے۔

"غیر ممالک میں بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ وہاں ان کی تخلیقات کی بڑی قدر ہے۔ جبکہ ہمارے ملک میں بچوں کے ادب کو ابھی تک ادب ہی نہیں سمجھا جاتا ایسے مصنف کی ذہنی سطح کو معمولی قرار دیا جاتا رہا ہے وہ سنجیدہ ادب لکھ ہی نہیں سکتا۔ جبکہ بچوں کے لیے اچھا ادب پیش کرنا خود ایک فن ہے۔" [1]

حقیقت یہ ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا ایک باقاعدہ فن ہے۔ فنکار اپنے خیالات اور اپنے قلم کو، بچوں کی نفسیات کے مطابق اور ان کی دلچسپی اور تجسس کے دائرے تک محدود رکھتا ہے۔ نیز انھیں ایک ایسی نئی دنیا کی سیر کراتا ہے جو تخیلی بھی ہو اور حقیقی بھی۔ اس طرح بچوں کے لیے اچھا ادب پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جیسا کہ عام لوگوں کا خیال ہے۔

بہرحال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بچوں کے لیے لکھنے والے مصنفین اور شعرا کو ادب میں کوئی مقام نہیں مل پایا۔ اور نہ ہی بچوں کے ادب کو اہمیت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر اطہر پرویز نے جو بچوں کے ادب پر نظر رکھتے تھے۔ ایک انٹرویو کے دوران مجھے یہ واقعہ سنایا کہ بچوں کے لیے ان کے لکھے ہوئے مضامین وغیرہ دیکھ کر ایک معاصر پروفیسر نے ان سے کہا کہ "تم بچوں کے لیے کیوں لکھتے ہو؟ یہ بھی کوئی لکھنا ہے۔ اچھے تحقیقی اور ادبی مقالے لکھو، کوئی تعمیری کام کرو۔"

ناصرہ شرما نے بھی اس قسم کا ایک واقعہ بیان کیا ہے وہ ادب اطفال پر ایک سمپوزیم اور تقسیم انعامات کے موقع پر کہتی ہیں:۔

"کسی قاری نے میری کہانی پڑھ کر مجھے خط ڈالا تھا کہ آپ سنجیدہ ادب کے ساتھ بچوں کی کہانیاں بھی لکھتی ہیں؟ دیکھ کر تعجب ہوا۔ مجھے آپ جیسی ذہین اور اچھے خیالات والی عورت سے ایسی امید نہ تھی کہ وہ پری کی کہانی لکھنے بیٹھے

---

[1] ناصرہ شرما۔ بال ساہتیہ سیمینار و سماروہ بچوں کے ادب پر سمپوزیم اور تقسیم انعامات [illegible] ۱۹۸۴ء۔ این سی آر ٹی کیمپس نئی دہلی

جائے گی"۔[1]

ڈاکٹر اطہر پرویز اور ناشرہ شرما کی ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ ہماری ادبی دنیا میں بچوں کے لیے لکھنے والوں کو بہت حقیر نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، جب کہ غیر ممالک میں بچوں کے ادیب اور شاعر کو ادب اور سماج میں امتیازی حیثیت حاصل ہے، بچوں کے ادب کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔

ہربرٹ ہووَر نے بچے کے بارے میں کہا ہے۔

"Herbet Hoover, calls children, the most what some part of the race, the sweetest for they are freshest from the hand of God, whimisical, ingenious, mischevious, they feel the work with joy and good honour "[2]

بچوں کا ادب۔ایک چیلنج:۔

بچے قدرت کا ایک کرشمہ ہیں۔ان کی فطرت، دماغی قوت، اخذ کرنے اور محسوس کرنے کا جذبہ ــــ یہ سب لامحدود ہوتے ہیں۔بچہ اپنے تخیّل کی مدد سے دنیا کی ہر شئے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔اس میں چلبلاپن، شوخی اور حرکت ہوتی ہے اس میں تجسّس کا وافر مادّہ ہوتا ہے، وہ ہر چیز کے بارے میں مکمل اور منفصل معلومات چاہتا ہے، یہ تمام باتیں، بچوں کے لیے لکھنے والوں کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کے سامنے مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ بچوں کے لیے کیا

---

[1] ناصرہ شرما، بال ساہتیہ سمیہ اور سجھاؤ، ادبِ اطفال پر سمپوزیم اور تقسیم انعامات مورخہ ۲۸ جنوری تا ۳۰ جنوری ۱۹۸۰ء این۔آئی۔ای کیمپس نئی دہلی (ہندی)

2. Herbet Hoover; reference given in the paper, "children literature, a challenge." by Dr. Kumar Pal Desai, on the occassion of Symposium and Prize distribution function held From 28 Jan. to 30 Jan. 1980 at N.I.E. Campus, New Delhi.

لکھیں۔ وہ کچھ لکھیں جو بچوں لکھیں ہو۔ اگر مصنف اس نظر سے بچوں کے لیے لکھ رہا ہو تو انہیں مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس میں سب سے زیادہ پریشان کن مرحلہ زبان کا ہے لسانی نقطۂ نظر یہ معیار رکھنا لازمی ہے کہ بچہ کس عمر میں کتنی زبان جانتا ہے، بچوں کے ادیب کا فریضہ ہے کہ مختلف شناس مقامات، پرندوں، جانوروں، فطرت انسانی، مناظر قدرت، نیز بچوں کی نفسیات کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہو۔ یہ تمام امور دنیاوی مشاہدات کا خزانہ بچوں کے مصنفین اور شعراء کو پیش رکھنا چاہیے اور اس بات کا احساس بھی کہ بچہ براہ راست نصیحت، خشک باتیں اور محض مذہبی وعظ و پند پسند نہیں کرتا۔

لکھنے سے قبل مصنف کا فرض ہے کہ وہ یہ محسوس کرے کہ جو کچھ وہ لکھ رہا ہے، خود اس کے اپنے لیے ہے، ادبِ اطفال کی تخلیق سے پہلے مصنف کو خود بچہ بننا پڑے گا آج بچوں کے ادب کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ زیادہ تر کتابیں بچوں کے لیے محض سبق آموز، یا نصیحت آموز ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہم بچوں کو کچھ سکھانے کے لیے ان کی شخصیت کی تعمیر کے لیے لکھتے ہیں جس کے سبب وہ تصنیف تاثیر سے عاری ہوتی ہے۔

'بالغ' کی زندگی بہت سے مسائل کا شکار ہوتی ہے ان کے مسائل میں محصور رہ کر بچوں کے دل کو لبھانا، ان میں احساس کی نو جگانا آسان کام نہیں۔ اسی وجہ سے بچوں کے ادب کی تخلیق بہت مشکل کام بن گیا ہے۔ بچوں کے لیے جس صحت مند ادب کی ضرورت ہے، وہ نہیں لکھا جارہا ہے میرے خیال میں بچوں کے لیے صحت مند ادب ایک خاص قسم کے ماحول میں پروان چڑھتا ہے۔ یہ وہ ماحول ہے جس میں بچوں کے حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ بچہ۔ بالغ سے مختلف ہے۔ اس کی اپنی الگ آزاد دنیا ہے۔ جس سماج میں بچپن کے لیے ان باتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا وہاں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ 'بچہ' جتنی جلد ہو بالغ ہو جائے۔ یہی نظریہ ہمارے بچوں کے ادب کا مقصد بن کر رہ گیا ہے۔ وقت بے وقت نصیحت کرنے والا ادب، جلد از جلد سمجھ دار بنانے کی کوشش کرنے والا ادب، جلد از جلد بالغ بنانے والا ادب معلومات میں اضافہ کرنے والا ادب آج کے بچوں کا ادب ہو گیا ہے۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ ماہرین تعلیم، اساتذہ، والدین ادبا، شعراء اور ہمارے صحافی بھی اسی کو بچوں کا ادب کہتے ہیں۔ ایسے قلم کاروں کی تعداد بہت کم ہے جو بچے کی تفریح کا ایسا سامان فراہم کرتے ہیں، جس میں بظاہر کوئی درس یا تعلیم نہ ہو۔

بچوں کو پیار کرنا اور بات ہے اور بچوں کے حقوق کا خیال رکھنا دوسری بات ہے۔ اپنے بچوں
کو سب ہی ماں باپ پیار کرتے ہیں لیکن بچوں کے حقوق کا خیال بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ حقیقت
یہ ہے کہ ایسے والدین جنھیں بچوں کے حقوق کا خیال نہیں ہے، اپنے بچوں کو پیار کرنا بھی نہیں
جانتے، پیار میں حقوق کا احترام ضروری ہے۔ بچوں کے ساتھ ہم جذبات سے زیادہ کام لیتے ہیں
اور یہی جذباتیت ادب اطفال کا معیار بلند نہیں ہونے دیتی۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے بچہ براہ راست نصیحت، خشک وعظ اور محض پندونصائح قطعی
پسند نہیں کرتا۔ انھیں رنگین اور دلچسپ چیزوں نئے مقامات، اشخاص، مبالغہ اور اس قسم کی
دوسری چیزوں کی تلاش رہتی ہے۔ مہماتی کارناموں سے بچے کی تشفی ہوتی ہے، موجودہ تفریح کے
سامانوں مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، وی سی آر، اور سینما وغیرہ نے بچے کی نفسیات پر بڑا اثر ڈالا
ہے جس کے سبب بچوں کے لیے ایک خاص قسم کے لٹریچر کی کمی محسوس کی جا رہی ہے۔

بچوں میں پڑھنے کی عادت اور شوق ان کی عمر کے اعتبار سے بڑھتا ہے۔ بچہ ۴/۵ سال کی
عمر تک حروف کو جوڑ کر کتاب خود پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بار بار کی کوشش سے وہ پڑھنے
میں کامیاب ہونے پر بہت خوش ہوتا ہے۔ ۶/۸ سال تک کے بچے الفاظ ملا کر پڑھنے کے
خواہش مند ہوتے ہیں۔ تصاویر کے سہارے وہ خود پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض الفاظ
کو سمجھنے کے لیے وہ اپنے بڑوں سے مدد چاہتے ہیں۔ اس وقت بچے کی ہمت افزائی اور اس
کی صحیح راہ نمائی کرنے کی ضرورت ہے۔ بچے کے تجربات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا
ہے۔ وہ پہیلیاں، بچوں کی بہادری کی کہانیاں، پڑھ کر اور بڑوں سے پوچھ پوچھ کر اپنی معلومات
میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ آٹھ برس کی عمر کے بعد بچے کے پڑھنے کی رفتار میں اضافہ ہوتا ہے
اور روزمرہ کی چیزوں اور اپنے ماحول کو جاننے کی اس کی خواہش اور بڑھ جاتی ہے۔ بچے کو
پڑھنے کا چسکا سا لگ جاتا ہے، اس کے ہاتھ میں جو بھی کتاب آتی ہے اس کو پڑھنے کی کوشش
کرتا ہے، کلاس میں درسی کتاب کے اندر کہانی کی کتاب چھپا کر پڑھنے میں اس کو بہادری
کا احساس ہوتا ہے۔

بچے ـــــ سیماب صفت ہوتے ہیں وہ خاموش نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ایسی کتابیں
پسند کرتے ہیں جن میں متحرک چیزیں اور واقعات ان کی ذہنی اور جسمانی ردِ عمل ہو جس کتاب
کو پڑھنے سے بچوں کے تخیل میں وسعت پیدا ہو، جو چیزیں بچوں کے ذہن کو آگے بڑھا

کے ساتھ کہانی پڑھنے سے محبت بچوں کو [illegible] جاتے ہیں۔
اگر بچے کو ایک چیز سے اطمینان نہیں ہوتا اس سے اس کی ذہنی نشوونما نہیں ہوتی تو وہ دوسرے ذرائع کی تلاش کرتا ہے۔

چھوٹے چھوٹے بچوں کو آس پاس کے ماحول اور اپنی مختصر سی دنیا کی چیزوں سے لگاؤ ہونا ایک فطری امر ہے۔ مختلف قسم کے جانور، پرندے، قدرتی مناظر، مختلف مشینیں اور مختلف قسم کے کھیل کود میں بچہ بہت دلچسپی لیتا ہے اس کو پریوں کی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں، مگر جیسے ہی بچہ اسکول کا منہ دیکھتا ہے اس کی تخیلی دنیا میں ایک انقلاب سا آجاتا ہے۔ اسکول میں جاکر بچے میں دوسرے بچوں کے لیے محبت کا اشتیاق اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ بہادری کے کارناموں میں بھی دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے، اگر بچہ سب سے متاثر نہ ہو کر اپنے چند مخصوص ساتھیوں یا اساتذہ سے متاثر ہوتا ہے اور وہ ان میں مخصوص دلچسپی لیتا ہے۔ اس طرح بچے میں ہیرو ورشپ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

مزاح کی حس بچے میں عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے۔ بچے ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ مزاحیہ نقلیں، مزاحیہ مضامین اور ہنسنے ہنسانے والی کہانیاں بچوں کو بہت پسند آتی ہیں۔ بچے ایسی کہانی میں اس حد تک کھو جاتے ہیں کہ وہ خود کو کہانی کا ہیرو تصور کرنے لگتے ہیں۔ سماج دشمن کردار کے پٹنے اور سزا دینے میں انھیں لذت اور خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے لیے سماج دشمن کردار وہ ہیں جو خود غرض، لالچی اور دوسروں کا برا چاہنے والے ہیں۔

''ادبِ اطفال' میں جنوں، بھوتوں، دیووں، پریوں، بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کی مافوق الفطرت داستانیں اب بھی ہر پڑھنے والے بچے کے لیے کششِ انگیز اور دلچسپی کا باعث ہیں'' اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ان کرداروں پر ہی تکیہ کیا جاتا ہے اور ان کے متبادل کردار تخلیق کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ یہ درست ہے کہ بچوں کے لیے لکھنے والے حضرات موجودہ صورتِ حال میں بھی چاہتے تو جنوں، بھوتوں، بادشاہوں، اور شہزادوں کے کرداروں کو مناسب فضا اور ماحول کے حوالے سے مفید اور بامقصد کرداروں میں منتقل کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

اسرار زیدی نے بچوں کے ادب کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے :۔
"آج کا دور سائنس اور استدلال کا دور ہے ۔ جنوں، بھوتوں، پریوں
اور بادشاہوں کا عہد عملاً ختم ہو چکا ہے ۔ مافوق الفطرت اور بے مقصد حکایتیں
آج کے غیر معمولی طور پر ذہین اور طباع بچوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں،
یہ جاننے کے باوجود ان کو پڑھنے کے لیے جو مواد فراہم کیا جا رہا ہے اس کا
بیشتر حصّہ بے جواز اور مقصدیت سے عاری ہے اور مذکورہ تخیلی مافوق الفطرت
کرداروں کو خواہ مخواہ پڑھنے والے بچوں کے ذہنوں پر مسلط کرنے کی
کوشش کی جا رہی ہے۔" [۱]

یہ سچ ہے کہ دورِ جدید میں سائنس کی روز افزوں ترقی نے بچوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے ۔ آج کا بچہ اب مافوق الفطرت کردار اور واقعات میں ذہن کو الجھانا نہیں چاہتا۔ اس موقع پر ابصار عبدالعلی کی ایک نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں۔ نظم کا عنوان ہے "چندا ماما پیارے ماما"

ہم کو جو خدا نے ذہن دیا
ہم اس کو کام میں لائیں گے
سوچا، سمجھا، ایجادیں کیں
پھر راکٹ ہم نے بنائیں ہیں
چھوڑے مصنوعی سیارے، کتیا کو خلا میں بھجوایا
ان سیاروں نے تصویروں سے رازِ خلا کا سمجھایا
پھر ہمت کی انسانوں نے
چندا ماما کی طرف سے چلے
تھا نام اپولو آٹھ اس کا
جس میں چندا تک جا پہنچے

---

[۱] اسرار زیدی "بچوں کے ادب کا مسئلہ" ماہنامہ "ماہِ نو" (لاہور) ۔ نومبر، دسمبر ۱۹۷۸ء صفحہ ۸۳
دوپہینہ ایڈیٹر، کشور ناہید

ہم سب نے اتنا جان لیا گو دنیا والے ٹھہرے عقلی ہیں
چندا پہ کوئی رہتا ہی نہیں خالی پڑی ہے اک زمیں[۱]

اظہار حیدر العلی کی نظم دورِ جدید اور اس سائنٹفک دور کے بچے کے بدلتے ہوئے ترقی یافتہ ذہن کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ دور حقیقت پسندی کا دور ہے جس میں مافوق الفطرت اور ہوائی باتوں کی گنجائش کم ہے۔ اس کے باوجود ماضی سے لے کر آج تک بچوں کے لیے جو ادب بالعموم تخلیق کیا گیا ہے۔ اور اس میں جو کردار استعمال کیے گئے ہیں انھیں فوری طور پر مسترد کرنے کے بجائے ایک عبوری مدت تک کے لیے نئے کرداروں کے ساتھ جنوں، بھوتوں، اور پریوں کے کرداروں کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان سے جو روایات وابستہ ہیں ان کی نئی معنویت اور امکانات میں ڈھالا جانا ضروری ہے۔ جدید سائنس ترقیات کے باوجود پریوں کی کہانیوں اور مذہبی کہانیوں کی اہمیت اور مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، پریوں اور تخیلی کہانیوں کو یکسر رد نہیں کر سکتے ان کہانیوں سے بچوں کی قوتِ متخیلہ تیز ہوتی ہے بچہ ان کرداروں میں آج بھی دلچسپی لیتا ہے۔ دردناک قصے، خوفناک مناظر، واقعات اور ماحول بچے کو محظوظ کرتے ہیں لیکن ان کا استعمال حدِ اعتدال میں رہ کر کیا جانا چاہیے۔

بچے میں تجسس کا مادہ فطری ہوتا ہے۔ وہ ایسی کہانیاں اور مضامین پسند کرتا ہے جو اس کی معلومات میں اضافہ کر کے اس کے ذوقِ تجسس کو آسودہ سسپنس کر سکیں۔ وہ ایسی کہانیاں بھی وہ شوق سے پڑھتا ہے جن میں تجسس برقرار رہے، اگر مصنفین اپنی کہانیوں میں (تجسس) کے ساتھ حقیقت کا ہلکا سا عکس بھی پیش کرتے رہیں تو مناسب ہے۔ حقیقت کو خیال کے پیرائے میں اور خیال کو حقیقت کے پیرائے میں پیش کرنے سے رنگینی بھی پیدا ہوگی اور بچے کی دلچسپی بھی برقرار رہے گی۔

عام طور پر درسی کتب میں زبان اور اسلوب دونوں اعتبار سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی ہے بڑے بڑے فارسی ہندی اور انگریزی کے الفاظ کی بھرمار جن کا مطلب اسی صفحے کے نیچے یا کتاب کے آخر میں دیا جاتا ہے بچے کے ساتھ زیادتی ہے۔ جب بچے کی عمر زبان

---

[۱] اظہار حیدر العلی "چندا ماما پیارے ماما" ماہنامہ "نور" رام پور نومبر و دسمبر ۱۹۷۹ء ص ۱۱
بحوالہ پی ایچ ڈی کشور ناہید

سیکھنے کی ہو ان سے استعمال کرانا ٹھیک نہیں۔ اس بات میں بچوں کا اپنا ماحول نہیں شاید یہی وجہ ہے کہ بچے درسی کتب میں دلچسپی کم لیتے ہیں۔ اسی طرح غیر فطری زبان کے سبب ان کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ اگر زبان آسان اور متاثر کرنے والی ہو تو بچہ بھی بہتے ہوئے چشمے کی طرح اس میں بہہ جاتا ہے۔ اور پڑھنے میں اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ لیکن اگر بچے کو ہر سطر میں مشکل الفاظ کا سامنا کرنا پڑا تو وہ گھبرا جائے گا اور پڑھنے میں قطعی دلچسپی نہیں لے گا۔ اسی وجہ سے زیادہ تر والدین کو شکایت ہے کہ بچے درسی کتب سے زیادہ کہانیوں کی کتابیں کومکس (comics) اور ناولوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

بچوں کی کتابوں میں جتنی اہمیت زبان کی ہے اتنا ہی ان کا اسلوب اہم ہے۔ اسلوب مصنف کی انفرادیت کا اظہار ہے۔ بچوں کے ادب میں اسلوب ایسا ہونا چاہیے کہ بچوں کی دلچسپی کا سبب بنے۔ اور اس کے ذہن کو گرفت میں لے لے۔ ان کو غور کرنے اور پڑھنے پر مجبور کرے نیز ان کی دلچسپی آخیر تک برقرار رکھے۔ اس لیے درسی کتب کی تدوین اور ترتیب کے لیے بھی ایسے ہی مصنفین اور اساتذہ کا انتخاب ضروری ہے جو بچوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوں اور ان کی دلچسپیوں اور رجحانات کا گہرا مطالعہ کر چکے ہوں، یہی وجہ ہے کہ کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم دینے والا پروفیسر اسکول کے ننھے منے بچوں کو پڑھنے کی ضرورتوں میں سفید ہاتھی کی مانند ہوتا ہے۔ آج کی کہانیوں میں ایک نفسیاتی تسلسل اور ذہنی تال میل کی کمی ہے۔ جنھیں دور کرنا آسان کام نہیں۔ مناسب اور اچھے مصنفین کو باور کرانا ہوگا کہ ان کی تصانیف کی ادب میں ضرورت ہے اور انھیں ادب اطفال کی بنا پر اہمیت ہوگی۔ ورنہ ملے بندھے مصنفین کا قلم برداشتہ کچھ گھسیٹ دینے سے بچوں کے لیے اچھا ادب وجود میں نہیں آسکتا۔

بچوں کے لیے اچھی کتب تیار کرنا کسی ایک فرد کا کام نہیں، یہ ادیبوں، ناشران کتب، اساتذہ، والدین اور بہت سے لوگوں کے اشتراک سے مکمل ہو سکتا ہے۔ پبلشنگ ایک تجارت ہے اور اس میں کامیابی کے لیے بچوں میں پڑھنے کی عادت کو بڑھاوا دینا ضروری ہے۔ والدین کو بھی سوچنا چاہیے کہ کتب پڑھنے سے بچے کا وقت برباد نہیں ہوتا۔ اسکول میں بچوں کے لیے آزادانہ مطالعہ کا الگ اور اضافی انتظام ہونا چاہیے۔ اس سے کتب کی تعداد اشاعت بڑھے گی اور تاجرانہ نقطہ نظر سے ناشران کتب حوصلہ مند ہوں گے۔

عام طور پر ناشرانِ کتب کو ادبِ اطفال سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی وہ زیادہ تر نصابی نصاب کی چھوٹی چھوٹی کتابیں اور مسودے شائع کرنا پسند کرتے ہیں کیونکہ ایسی کتابیں اسکولوں اور لائبریریوں کے لیے خریدی جاتی ہیں جبکہ عوام میں عام یافتہ کتب کی فروخت برائے نام ہے۔

بچوں کے لیے اچھی صحت مند کتب لکھنے کے سلسلے میں مصنفین کے مسائل مختلف ہیں۔ ان کو ادبِ اطفال کے سلسلے میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔ بچوں کے لیے لکھنے پر ان کو معاوضہ بھی بہت ہی کم ملتا ہے اور بچوں کے ادیب کو ادبی دنیا میں اہمیت بھی کم ملتی ہے۔ ناشرانِ کتب، ایڈیٹروں کو کسی خاص موضوع پر لکھنے کے لیے مجبور کرتے ہیں اور ادیب عجلت میں ناشرانِ کتب کی ضروریات کو (نہ کہ بچوں کی ضروریات) ملحوظ رکھتے ہوئے کتابیں، کہانیاں، مضامین اور نظمیں گھسیٹ دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحقیقی کام کے بجائے وہ کسی نہ کسی شکل میں مشہور کے مضامین کو ہی پیش کرتے رہتے ہیں۔ بچوں کی کتب کی تیاری پر اخراجات بھی زیادہ آتے ہیں۔ ہمارے یہاں بچوں کے رسائل کے لیے اچھے اور تجربہ کار مدیران کی بھی کمی رہی ہے۔ بچوں کے لیے اچھی کتب تیار کرنا ایک علاحدہ فن ہے۔ کتاب کا سرِ ورق، کاغذ، طباعت، کتابت، جلد سازی وغیرہ سب ہی دل کش ہونا چاہیے۔ نیز کتابوں کی قیمت کم سے کم ہونی چاہیے۔

"لوک کتھائیں"، راجہ رانی کی کہانیاں اور دیو پری کی کہانیاں بچوں کو ہمیشہ پسند آتی ہیں۔ یہ کہانیاں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی ہیں اور ان میں سے بہت سی کہانیاں بھلائی بھی جا چکی ہیں پھر بھی کچھ کہانیوں کو لوگوں نے قلم بند کر لیا ہے۔ دنیا کے ہر ملک اور ہندستان کے ہر صوبے کی بیشتر لوک کتھائیں کتابوں کی شکل میں دستیاب ہیں۔ انگریزی زبان میں ایسے درجنوں مجموعے موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کہانیوں کا ہندستان کی ہر زبان میں ترجمہ کیا جائے اور جو کہانیاں ابھی تک قلم بند نہیں کی گئی ہیں انھیں قلم بند کر لیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ لوگ انھیں بھلا دیں گے۔

جب بچہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگتا ہے تو وہ ان چھوٹے چھوٹے گیتوں کو یاد کر لیتا ہے جو بچے کھیلتے وقت گایا کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ لوک کتھاؤں کی طرح بچوں کی لوریاں، پہیلیوں اور کھیل کھیل میں گائے جانے والے گیتوں کو بھی کتابی شکل میں

محفوظ کر لیا جائے۔ کیونکہ رفتہ رفتہ ان کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔ بچوں کو دلچسپ کہانیوں اور گیتوں تک محدود کرنا درست نہیں ہے معلوماتی مضامین کی طرف بھی بچوں کی توجہ دلانی چاہیے۔ اس طرف توجہی کے نتیجے میں ہندوستانی بچوں اور نوجوانوں کی معلومات عامہ (جنرل نالج) میں ناواقفیت قابل افسوس ہے۔ ہمارے یہاں بچوں کے ادب میں انسائیکلو پیڈیا کی زبردست کمی ہے۔ انگریزی میں بک آف نالج جیسی کتب عام ہیں۔ جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے اردو زبان میں بچوں کے لیے ایسی کتاب دستیاب نہیں ہے۔ آکسفورڈ جونیر انسائیکلو پیڈیا اس نوع کی دوسری مشہور کتاب ہے۔ ہندی میں وشو بھارتی विश्व भारती ایک قابلِ تعریف کتاب ہے۔ ہندی ہی کی دوسری کتاب بچتر وشوکوش चित्रित विश्व कोष انگریزی کتاب "گولڈن بک انسائیکلو پیڈیا" کا ترجمہ دس جلدوں میں موجود ہے۔ اردو میں کوئی ایسی تصنیف نہیں ہے جو دنیا کے تمام علوم و فنون کی بنیادی معلومات بچوں کو فراہم کر سکے۔

بچوں کو کچھ نہ کچھ جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ اگر آپ بچوں کی جیبوں اور بستوں کی تلاشی لیں تو آپ کو ان کا خزانہ دیکھ کر حیرت ہوگی بچے کیا جمع کریں؟ کیسے جمع کریں؟ اور جمع کی ہوئی چیزوں کو کیسے رکھیں؟ یہ تمام باتیں بچوں کو سکھانی چاہییے۔ جن کا تعلق فرصت کے مشغلے سے ہے۔ انگریزی میں "کیسے جمع کریں" (HOW TO COLLECT) کے عنوان سے مختلف چیزیں جمع کرنے کے بارے میں نہایت مفید کتابیں دستیاب ہیں ما افسوس کہ ہندستانی زبانوں میں ایسی کتابیں بہت کم ہیں۔

انگریزی زبان میں کیسے بنائیں (HOW TO MAKE) کے عنوان سے مختلف چیزیں بنانے کے بارے میں درجنوں کتابیں بچوں کے لیے بہ آسانی مل جاتی ہیں جن سے ان کی صلاحیت بیدار ہوتی ہے۔ اور وہ بآسانی چھوٹی سی چھوٹی چیزیں بنانا سیکھ جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایسی کتابیں نہیں کے برابر ہیں۔

چینی زبان کی ایک کہاوت ہے "ایک تصویر ہزار الفاظ کے برابر ہوتی ہے"۔ کسی منظر کو ہم الفاظ میں بیان کریں تو ہزاروں الفاظ درکار ہیں پھر بھی وہ منظر بچے کی سمجھ میں نہیں آئے گا جتنا اس منظر کی تصویر دیکھ کر۔ بغیر تصاویر کے بچوں کی اچھی کتاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب میں جتنی زیادہ اور جتنی دل کش تصاویر ہوتی ہیں بچے ان کو اتنا ہی پسند کرتے ہیں۔ بچوں کی بعض کتابوں میں رنگین تصاویر کا ایسا اہتمام کیا جاتا ہے کہ ان کا خاطر خواہ طور پر

قدرت کی کتابیں اسی انداز میں لکھی جا سکتی ہیں۔ غالباً کومکس COMICS کی مقبولیت کا یہی سبب ہے کہ ان میں ایک کہانی کو تصویروں کی زبانی بیان کیا جاتا ہے اور پڑھنے والوں کو پڑھنے میں بہت لطف آتا ہے۔ بچوں کے لکھنے والوں کے سامنے تصاویر کا بھی بہت بڑا مسئلہ ہے، اس کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے کہ تصویر موضوع سے متعلق، عام فہم، دلکش اور رنگین ہو۔ اگر چھ سات سال کے بچے کے لیے کتاب لکھی گئی ہے تو تصاویر کے رنگ شوخ ہوں اور تصاویر میں باریکیاں (DETAILS) کم ہوں۔ اگر بچے کی عمر نو سال سے زائد ہو تو رنگ نسبتاً ہلکے اور باریکیاں زیادہ ہو سکتی ہیں۔

کتابوں کے لیے تصاویر بنانا ایک فن ہے افسوس ہمارے یہاں (خصوصاً اردو کتب کے لیے) ایسے آرٹسٹ کم ہیں جو موضوع کے اعتبار سے دلکش اور مناسب تصاویر بنا سکیں۔ ہندوستان میں بچوں کی کتابوں میں شامل تصاویر زیادہ تر انگریزی کتابوں اور رسائل میں دی ہوئی تصاویر کی بھدّی نقل ہوتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آرٹ کالجوں میں کتابوں کے لیے تصویریں بنانے کی باقاعدہ تعلیم دی جائے اور ہر مصور کسی ایک چیز کی تصاویر بنانے کا ماہر ہو۔ جیسے پھولوں کی تصویر، پیڑوں کی تصاویر، حیوانات کی تصاویر، پرندوں کی تصاویر، انسانی تصاویر، مناظرِ فطرت کی تصاویر ضرورت پڑنے پر ان سب کے اشتراک اور تعاون سے بہترین تصاویر سے آراستہ کتابیں اور رسائل شائع کیے جا سکتے ہیں۔

ہندوستان میں مصنف اور مصور، یا دو تین مصنفین کے مل کر کتاب لکھنے کا رواج بہت کم ہے جب کہ بچوں کے لیے اچھی کتاب لکھنا اصل جماعتی کام TEAMWORK ہے۔ اگر کئی اشخاص مل کر اپنی اپنی صلاحیتوں کا استعمال کریں تو یقیناً ہر لحاظ سے معیاری کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ سائنس کی کتاب لکھنے میں اس دقت کا سامنا اکثر ہوتا ہے۔ عام طور پر جو جانتا ہے اسے بیان کرنا نہیں آتا اور جسے بیان کرنا آتا ہے اس کی معلومات محدود ہوتی ہے۔

ہر چند کہ براہِ راست نصیحت اور اخلاقی تعلیم دینے والی کتابیں بچوں میں کم مقبول ہوتی ہیں لیکن ایسی کتابوں کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ مشیر فاطمہ پال ہانڈ وڈ کے حوالے سے کہتی ہیں۔

"بچوں کی کتابوں میں کچھ اخلاقی تعلیم دی جاتی ہے اور کچھ سچی باتیں بتائی جاتی ہیں تاکہ بچے سچائی اور ایمانداری جیسی اقدار سیکھیں۔ بچوں کے لیے اخلاقی کہانیاں لکھنا بہت نازک اور مشکل کام ہے اس کے لیے ادیب اخلاقی

عمل کو اہمیت دیتا ہے۔ ادیب میں تحقیق اور تخیل کی صلاحیت ہونا چاہیے۔ زبان میں اثر ہونا چاہیے۔ معمولی لکھنے والے اخلاقی کہانیوں کو پیچیدہ اور غلط بنا دیتے ہیں۔"[1]

بچوں کے ادب سے متعلق اور بچوں کے لیے ہندوستان کی ہر زبان میں اب تک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی مکمل کتابیات (BIBLIOGRAPHY) تیار کرنا ضروری ہے۔ جس میں ہر کتاب کے بارے میں ضروری معلومات موجود ہوں۔ ایسی کتابوں کی بھی اشد ضرورت ہے جس میں بچوں کے ادیبوں کی سوانح حیات شامل ہوں، نیز ان ادیبوں کے ادبی کارناموں، تصنیفات اور خدمات کا بھی جائزہ لیا گیا ہو۔

لائبریری دنیا کے تمام علوم و فنون سے متعلق معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ ہماری ذہنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہر سطح پر مواد فراہم کرتی ہے۔ لائبریری کی مدد سے زبان اور ادب دونوں پر عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ بچے کی ذہنی نشو و نما میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بچے میں خود پڑھنے کی عادت ڈالنے اور کتابوں کا انتخاب کرنے میں اسکول لائبریری بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ بچے کو مختلف موضوعات اور عنوانات پر بھرپور مواد لائبریری میں مل جاتا ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، ادب، زبان، سائنس، ٹکنالوجی اور مصوری وغیرہ میں بچے کی دلچسپی لائبریری کی مدد کے بغیر پیدا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ بقول غلام الثقلین نقوی:

"...... ذوق مطالعہ کے لیے جماعت کا کمرہ نہیں بلکہ لائبریری زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے لائبریری کا ماحول اگر زیادہ خوشگوار ہوگا اور یہاں اچھی کتاب پڑھنے کو ملے گی تو بچہ یہاں پہنچ کر جبر سے نہیں بلکہ دلی امنگ کے ساتھ کتاب سے اپنا رشتہ قائم کرے گا۔"[2]

لائبریری اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں بچے بیٹھ کر کتابیں، رسائل اور اخبارات پڑھ سکیں اور اپنے نام جاری کرا کر گھر بھی لا سکیں۔ اگر ابتدا ہی سے بچے کی دلچسپی اچھی کتابوں میں پیدا ہو جائے

۱؎ مشیر فاطمہ، بچوں کے ادب کی خصوصیات، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص ۲۷

۲؎ غلام الثقلین نقوی، بچوں میں ذوق مطالعہ کیسے پیدا کیا جائے، ماہنامہ کتاب، لاہور، جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۱۰۵

تو یہ عادت اس کی شخصیت کی تعمیر میں بے حد معاون ثابت ہوگی۔ اس لیے شروع ہی سے بچے کتاب اور لائبریری کے مابین رابطہ قائم ہونا بہت ضروری ہے۔

اچھی لائبریری اچھی کتابوں سے ہی بنتی ہے اچھے رسائل، اخبارات اور کتب کے انتخاب سے بچوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ لائبریری کے لیے کتب کے انتخاب میں بچوں کی دلچسپی، ان کے مختلف رجحانات، تعلیمی ضروریات اور عمروں کے مدارج کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ والدین اور اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ بچوں کو لائبریری کے فوائد بتائیں؟ انھیں بتائیں اور ان میں احساس پیدا کریں کہ کس قسم کی کتب کا مطالعہ کرنا چاہیے؟ لائبریری سے کتاب کس طرح دے سکتے ہیں؟ مختلف کتب اور رسائل میں بچوں کو اپنے درسی مضامین سے متعلق مواد کس طرح مل سکتا ہے؟ یہ کتب، رسائل، اخبارات جہاں درسی مضامین سے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں وہیں زندگی سے متعلق مختلف موضوعات پر سیر حاصل مواد فراہم کرتے ہیں،

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بچہ عام لائبریریوں کی طرف مڑ کر دیکھتا ہے۔ بقول ریاض صدیقی:۔

"بچوں کے لیے لائبریریوں کا کوئی اہتمام نہیں ہے۔ اسکولوں کی لائبریریوں میں کتب کی خریداری کا انتظام ناقص ہے۔ سڑکوں، اور گلی کوچوں میں تاجرانہ ذہنیت رکھنے والوں نے لائبریریاں کھول رکھی ہیں۔ جہاں بچوں سے معاوضہ لے کر نہایت لچر اور غیر معیاری کتابیں مہیا کی جاتی ہیں اس قسم کی جملہ لائبریریاں حشرات الارض کی طرح پھیلتی جا رہی ہیں۔" [1]

ہمارے اسکولوں میں اول تو لائبریریاں ہیں ہی نہیں اور اگر ہیں بھی تو ان کا معیار نہایت پست ہے۔ جس پر صدیوں کی گرد پڑی ہے اور اسی ماحول کی کتاب بھی بہت سرد مہر ہوتی ہے وہ اپنی طرف کھینچتی ہی نہیں بلکہ پیچھے دھکیلتی ہے۔ لائبریریوں کے لیے کتابوں کے انتخاب میں بچوں کے خیالات، ضروریات، اور دلچسپیوں کا قطعی خیال نہیں رکھا جاتا۔ اور کتابوں کے انتخاب کے سلسلے میں بچوں کا کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا۔ بچوں کو ابھی تک کوئی قانونی حق خود اپنی کتابوں کے

---

[1] ریاض صدیقی: پاکستان میں بچوں کا ادب اور مسائل ماہنامہ ماہ نو (لاہور) نومبر ۱۹۶۹ء ص ۷۰

سلسلے میں حاصل نہیں جن کے ذریعہ بچے تعلیمی اداروں کو اس بات کے لیے مجبور کرسکیں کہ ان کی عمر، دلچسپی اور ضرورت کے اعتبار سے کتابیں خریدی جائیں۔ لائبریری میں بچوں کے لیے کتابیں خریدتے وقت درج ذیل باتوں کو مدّنظر رکھنا چاہیے۔

۱۔ کتب ایسی ہوں جو بچوں میں پڑھنے کے ذوق کو فروغ دیں۔

۲۔ بچوں میں اچھی کتب پڑھنے اور انتخاب کرنے کی عادت پیدا کی جائے۔

۳۔ کتابیں بچوں کے ذہنی اور جسمانی نشوونما میں مددگار ثابت ہوں۔

۴۔ ہر طرح کی دلچسپی رکھنے والے بچوں کے لیے مختلف موضوعات پر کتب ہونی چاہئیں، جیسے کہانی، ناول، ڈرامے، گیت، نظمیں، رنگین تصاویر، پہیلیاں، لطائف، سائنس، تاریخ، سوانح عمری، سیر و سیاحت اور حب الوطنی سے متعلق کتابیں۔

ہر لائبریری میں بچوں کی کتب کا الگ شعبہ ہونا چاہیے۔ بچوں کے لیے ہر شہر اور قصبے میں الگ الگ لائبریریاں ہوں۔

بچوں کا عالمی سال (۱۹۷۹) ساری دنیا میں بڑے جوش وخروش سے منایا گیا۔ لیکن اس کے خاطر خواہ نتائج (جن کی توقع کی جاتی تھی) ابھی تک سامنے نہیں آئے ہیں۔ یونیسکو نے کئی اچھے منصوبے بنائے لیکن ہمارے ملک میں ادب اطفال اور خصوصاً اردو میں بچوں کا ادب ایک ہی مرکز پر ٹھہرا ہوا ہے۔

یورپ، امریکہ اور سوویت دیس میں بچوں کی لائبریری کی اہمیت کو بہت پہلے سمجھ لیا گیا۔ وہاں صرف اسکولوں میں ہی نہیں، شہروں، قصبوں، دیہاتوں، کارخانوں اور فارموں کے ساتھ ملحق لائبریریوں میں بھی بچوں کے لیے علاحدہ سکشن ملتے ہیں۔

بچوں کی لائبریری اور اس کی ترقی کے لیے اجمالاً درج ذیل اصولوں کو مدّنظر رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ ہندستان کی سب ہی زبانوں میں ملنے والی بچوں کے ادب پر کتب کی ایک فہرست تیار کی جائے اور یہ فہرست تمام اسکولوں کی لائبریریوں، اکاڈمیوں اور ناشرانِ کتب کو بھیجی جائے۔

۲۔ تمام اسکول لائبریریوں میں بچوں کی کتب کا الگ شعبہ قائم کیا جائے۔

۳۔ ہر سال سالانہ بجٹ میں بچوں کی کتب خریدنے کے لیے الگ رقم مختص ہونا چاہیے۔

۴۔ اسکول کی لائبریری میں درسی کتب کے ساتھ ساتھ غیر درسی کتابیں بھی ہونی چاہئیں مقررہ مدت میں بچوں کو پسندیدہ کتاب لے کر پڑھنے کی سہولت ہونا چاہیے۔

۵۔ سرکاری اور غیر سرکاری لائبریریوں میں بچوں کے لیے توسیعی مراکز EXTENTION COUNTER قائم کیے جائیں اور چلتی پھرتی لائبریریوں کا رواج بھی عام کیا جائے۔

۶۔ دیہاتوں اور قصبوں کے بچوں کے لیے ان کے ماحول سے مناسبت رکھنے والے موضوعات پر کتابیں نہیں ملتیں اس لیے دیہاتی زندگی اور ماحول سے متعلق کتابوں کی فراہمی ضروری ہے۔

حصہ دوم: اردو میں ادبِ اطفال کا تاریخی ارتقاء

پانچواں باب

بچوں کے ادب کی ابتداء

صدیوں تک بچے کو کوئی سماجی مقام حاصل نہیں تھا وہ ہر معاملہ میں بڑوں کا ہی محتاج تھا۔ انیسویں صدی میں سائنس اور علم نفسیات نے تیزی کے ساتھ ترقی کی اور جدید سائنسی ایجادات سامنے آئیں۔ چنانچہ بچے کے احساسات، جذبات اور نفسیاتی رجحانات کی طرف بھی توجہ دی جانی لگی نیز بچے کو بڑے کی ایک اکائی تسلیم کر لیا گیا۔ سماج میں بچے کی ایک حیثیت مستحکم ہو گئی۔ اس کی حیثیت بیسویں صدی میں پوری طرح اُبھر کر سامنے آئی۔ بچے کا موجودہ تصور (CONCEPT) بیسویں صدی ہی کی دین ہے یہی وجہ ہے کہ بچوں کے ادب کا تصور بھی بیسویں صدی میں ہی اُبھر کر سامنے آیا۔ اور "ادب اطفال" اس ادب کو قرار دیا گیا جو محض بچوں کی درس و تدریس کے لیے نہیں بلکہ ان کی تفریح طبع ان کی دلچسپیوں اور ان کے فطری رجحانات کی نشو و نما کے لیے ہو۔ بقول جیون نائک

"As a remarkable feature of the cultural renaissance, which took place during the present century, creation of literature for children become customary. Literature aimed not to improve or reform but to amuse and inform children of various age groups."[1].

بیسویں صدی میں بچوں کا وہ ادب وجود میں آیا۔ جو بچوں کی تفریح طبع کے ساتھ ساتھ ان

---

1. Jeevan Nayak, "Hindi", "(Children literature in Indian languages', publication, Division Ministry of Information & Broadcasting, Govt. of India, 1982, Edited by Dr. (Miss) K.A. Jamuna, Page 62.

کی زندگی سے متعلق معلومات فراہم کر سکے۔ ڈاکٹر ہری کرشن دیوسرے اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

"آج دنیا میں بچوں کے ادب کو جو منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ صرف ادیبوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہی نہیں بلکہ اس میں بچوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کا بھی اہم دخل رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ لوگ یہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ بچوں کے ادب کی خاص اہمیت ہی نہیں ہے بلکہ اس کا تخلیقی عمل اور مقصد بھی الگ ہے۔"[1]

اگرچہ بچوں کے ادب میں ترقی کا سلسلہ انیسویں صدی سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن بیسویں صدی میں بچوں کے ادب میں ایک زبردست انقلاب آتا ہے۔ اس صدی میں بچوں کا ادب امریکہ اور انگلینڈ میں عروج پر پہنچا۔ امریکہ اور انگلینڈ میں بچوں کے ادب میں یکساں طور پر ترقی ہونے کے باوجود دونوں ممالک کے ادب اطفال میں نمایاں فرق رہا ہے۔ انگلینڈ کا بچوں کا ادب بہت جامع ہے جس کا سبب یہ ہے کہ انگلینڈ میں شروع سے ہی بچے کے مستقبل پر توجہ دی جاتی رہی ہے۔ وہاں ابتدا سے یہ نظریہ رہا ہے کہ مستقبل میں آپ بچوں کو جو کچھ بنانا چاہتے ہیں شروع سے ہی بچوں کی تربیت اسی انداز میں کی جانی چاہئے۔ انگلینڈ میں بچوں کا ادب ہمیشہ بامقصد رہا ہے۔ جو بچوں میں عمل کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔

امریکہ میں بچوں کا ادب انگلینڈ کے ادب اطفال سے کسی اعتبار سے مختلف ہے۔ یہ بچوں میں بطورِ خاص مساوات کی تعلیم عام کرتا ہے، انسانیت سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ امریکہ میں بچے کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ زندگی عیش کے ساتھ کیسے گذاری جاسکتی ہے۔ یعنی انسان کی باطنی اور روحانی ترقی کی بہ نسبت مادی ترقی پر اس کی نگاہ زیادہ ہے۔ تخیلاتی، طلسماتی اور جادو بھری کہانیوں کو وہاں زیادہ اہمیت حاصل نہیں بلکہ یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ایسے موضوعات بچوں کی شخصیت پر منفی اثر ڈالتے ہیں اور ان سے بچے زندگی کی حقیقتوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ ایسی باتوں کے بجائے مشین کی تشکیل، سمندر اور خلا میں سفر کے طریقے جیسی باتوں کا جاننا زیادہ مفید ہے۔ یہی سبب ہے کہ امریکی ادب میں بچوں کی تفریح کا سامان مافوق الفطرت عناصر سے پاک ہوتا ہے۔

روس میں بچوں کی نشوونما اور ان کے مستقبل پر خصوصی توجہ دی جاتی رہی ہے۔

---

[1] ہری کرشن دیوسرے "بچوں کا عالمی ادب" ماہنامہ آج کل نئی دہلی صفحہ ۲۹ (مدیر: شہباز حسین)

ب روس کے بعد ابتدا میں یہ کام حکومت نے کلیتاً اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا وہ بچّوں کے لئے
صحت مند ادب چاہتی تھی جو ان کی شخصیت کی تعمیر میں معاون ہو۔ روس میں حکومت
ں کو کمیونسٹ بنانے کی سعی ابتدا ہی سے کرتی ہے اور ان پر لینن اور مارکس کے
ت ٹھوپ دیئے جاتے ہیں۔ مارگریٹ میڈ نے لکھا ہے۔

"If children have been brought up in the spirit c communist morality if they have mastered the principl of Marxist Leninist philosophy, if their main purposefu life-attitude is to give all their strength and knowledg to the struggle for communism one needs not warr about their future."[1]

روس میں آج کا سماج بچوں کے مستقبل کی طرف بہت توجہ دے رہا ہے۔ وہاں
اصولوں اور نظریات کی تبلیغ کی جاتی ہے جو بچّوں میں تنظیم و تحفظ کا جذبہ عام کریں۔
، دارانہ نظام سے دُور رہنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بچّہ جیسے جیسے بڑا ہوتا ہے ویسے ویسے ماں
ں ذمہ داری بڑھتی جاتی ہے اور والدین کو اپنا مستقبل بنانے میں پوری پوری مدد کرتے ہیں۔
میں نفسیاتی طریقوں سے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ بچے میں اپنے ملک کے تئیں گہری
ری اور اس کی حفاظت کے لیے مر مٹنے کا جذبہ مستحکم ہو جائے روس میں کمیونسٹ نظریات کو فروغ
اتا ہے۔

روس کے بچّوں کو ادب کے وسیلے سے اپنے بزرگوں کی بہادری کے کارناموں کو
نے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ کہانیاں بچّوں پر مترادف اثر ڈالتی ہیں۔ ایسی کہانیوں کو
ہیں بچّوں کے لیے افیون سمجھا جاتا ہے۔ جو بچّوں کو کاہل، بے عمل اور لکیر کا فقیر بناتی ہوں۔ وہاں
ر سپاہی، کسان، مزدور، ڈاکٹر، کاری گر یا سائنس داں بنتا ہے تو اس کو ترقی یافتہ
جاتا ہے۔

فرانس کے بچّوں کے ادب کی اپنی امتیازی خصوصیات ہیں۔ وہاں بچّوں کو ابتدا سے
لوغ کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور انہیں خوش حال زندگی کی خاطر مشکلات کا سامنا کرنے

---

1. Reference "Childhood in contemporary cultures Page 184.

کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تفریح کی وہاں کوئی اہمیت نہیں۔ بنیادی مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ بچے جوان ہو کر کامیاب زندگی گذار سکیں۔

جرمنی میں عالمگیر جنگوں کے بعد بچوں کے ادب میں زبردست تبدیلی آئی ہے۔ وہاں ابتدا ہی سے بچوں کو زندگی کی جدوجہد سے نبرد آزما ہونے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تاکہ وہ کارگاہِ زیست کی الجھنوں، مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کامیاب سپاہی کی طرح کر سکیں لیکن اس کا منفی اثر یہ پڑتا ہے کہ بچے خود اپنی زندگی کے بارے میں کوئی اہم فیصلہ نہیں کر پاتے وہ مصیبتوں اور پریشانیوں سے ہی اُلجھے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے کردار میں جھول آجاتا ہے۔ ساتھ ہی ان کے احساس ذمہ داری میں پختگی نہیں آپاتی۔ نہ ہی بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ جرمنی کے بچوں کے ادب کو وہاں کی سیاست نے بہت متاثر کیا ہے۔ اس ادب کے پروردہ جرمن بچے اپنی زندگی کو ایک خاص بے لچک سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ جس میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس طرح ان کے کردار بھی بے لوچ سخت گیری کے حامل بن جاتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی مغربی ممالک کے ادب اطفال کا اجمالی جائزہ اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔ کہ وہاں ہر دَور میں سیاسی حالات نے بچوں کے ادب کو پوری طرح متاثر کیا ہے اور اس میں زمانے کے ساتھ تبدیلی آتی رہی ہے۔ مغرب میں بچوں کے لیے جو بھی ادب پیش کیا گیا ہے۔ اس کے پس پُشت مادّی مقاصد کارفرما رہے ہیں۔ محض تخیلی کہانیاں اور تفریحی قصے وہاں اپنی اہمیت تسلیم نہیں کرا سکے۔ مغربی ممالک کے بچوں کے ادب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں بچے کی آزادی، نفسیات، ذہنی رجحانات، نظریات، دلچسپیوں اور اس کی اپنی ضروریات کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی جیسے وہ بڑوں کے ہاتھ کی کٹھ پُتلیاں ہوں۔

اس کے برعکس مشرقی ممالک مثلاً ایران اور ہندوستان وغیرہ کے ادب اطفال میں زندگی کے مادی پہلوؤں۔ سیاسی تقاضوں کو مسلسل نظر انداز کیے جانے کی روش اختیار کی گئی۔ اور بچے کے اخلاق و کردار کو بلند کرنے کے لیے پند و نصیحت کا براہ راست وسیلہ "ادب اطفال" کو بنایا گیا۔ چنانچہ مشرقی ممالک کے بچوں کے ادب میں اخلاقیات پر غیر ضروری اصرار کے تحت ایک نوع کا ایک رخا پن نظر آتا ہے۔

حتمی طور پر اس بات کا تعین مشکل ہے کہ بچوں کے ادب کا آغاز کس سن، کس صدی یا

کس ملک میں ہوا ہے۔ اس ضمن میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بطور خاص بچوں کے لیے لکھی گئی سب سے پہلی کتاب جس کا تذکرہ ملتا ہے وہ بیشپ ایلڈہم کی تصنیف ہے جو لاطینی زبان میں لکھی گئی ہے۔ برٹینیکا جونیر انسائیکلو پیڈیا کے مطابق۔

"Before the printing press was invented, books were hand written and were so precious that few were made for children. Those few were kinds of lesson books Bishop Aldhelm (640-709), the Abbot of Malmesbury, in England, wrote a book in Latin Verse, in question and answer forms."[1]

بیشپ ایلڈہم کے بعد تقریباً پندرہ سو منظوم کتب بچوں کے لیے لکھی گئیں جو مکالموں اور سوال و جواب کی شکل میں تھیں۔ ۷۳۵ء ، ۶۷۳ء کے دوران وینیریبل بیڈ نے (جو انگلینڈ کے ایک اسکول میں استاد تھا) لڑکوں کے لیے اولین درسی کتب قلم بند کیں جو لاطینی زبان میں تھیں۔ اس کے بعد کینٹربری کے سینٹ اینسلم آرک بیشپ کا نام آتا ہے، جس نے بچوں کے لیے دنیا کا پہلا انسائیکلو پیڈیا تیار کیا جو عالمی ادب اطفال میں عام معلومات کی پہلی کتاب ہے۔[۲]
۱۰۶۶ء میں جب نارمنس نے انگلینڈ فتح کر لیا تو وہاں کی زبان فرانسیسی ہو گئی اور زیادہ تر کتابیں فرانسیسی زبان میں لکھی جانے لگیں۔ ۱۴۵۰ء کے آس پاس طباعت کا آغاز ہوا۔ ولیم کیکسٹن پہلا ناشر ہے جس نے ۱۴۹۱ء ۔ ۱۴۲۲ء کے دوران کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۶۵۸ء میں پہلی باتصویر کتاب آربیس پکچر شائع ہوئی۔ یہ جان اناس کومینیس کی تیار کردہ تھی اور بیک وقت لاطینی اور جرمن میں پیش کی گئی تھی۔ اس کتاب کا ترجمہ بعد میں انگریزی زبان میں کیا گیا۔[۳]
"ادب اطفال" میں ۱۶۰۰ء سترھویں صدی عیسوی میں مذہبی رجحانات کی شمولیت کا آغاز ہوا اور کتابوں کے وسیلے سے بچوں میں تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ پیوریٹن ازم کی تبلیغ شباب پر پہنچی۔ مذہبی تعلیم دینے والی کتب میں امریکہ کی رائل پرائمر بہت مشہور کتاب ہے۔ بعد ازیں ۱۶۷۱ء میں ایک عیسائی مبلغ جیمس جینسوے نے اے ٹوکن فار چلڈرن نام کی کتاب لکھی جو کہ مذہبی تعلیم کے

---

1 Britanica Junior Encyclopaedia, Vol 4, 1980

۲ جونیر انسائیکلو پیڈیا، جزو ۸۰ ۱۹ء

۳ ایضاً۔

پیشِ نظر تیار کی گئی تھی۔ پیوریٹنس کے علاوہ بھی بچوں اور بڑوں کے لیے بہت سی مذہبی کتابیں لکھی گئیں جن میں جان بنیان ۱۶۲۸ء – ۱۶۸۸ء کی کتاب پلگرمس پروگریس بہت مشہور ہے۔ اسے عیسائیت کی سب سے مشہور تبلیغی کتاب تصور کیا جاتا ہے۔ جس میں ایسے فاتح مذہبی رہنماؤں کے کارناموں کا ذکر شامل ہے جنہوں نے بے شمار خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے مذہب کی توسیع و تلقین کی۔

جوناتھن سوئفٹ ۱۶۶۷ء – ۱۷۴۵ء کی گلیورس ٹراویلس اور ڈینیئل ڈیفو ۱۶۶۰ء – ۱۷۳۱ء کی رابنسن کروسو عالمی ادبِ اطفال میں ایسی دلچسپ ترین کتابیں ہیں جو اصلاً بڑوں کے لیے لکھی گئی تھیں لیکن بچوں نے انہیں اپنے ادب کا جزو تسلیم کیا ہے۔ ان کتب کے ترجمے دنیا کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں ہوئے ہیں۔

۱۶۹۷ء میں فرانس کے مشہور دانشور چارلس پیرالٹ نے مدر گوز ٹیلز تصنیف کی جو آٹھ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ یہ پریوں کی دلچسپ کہانیاں ہیں۔ ان کے عنوانات ہیں "۱۔ بلیو برڈ ۲۔ پوس ان بوٹس ۳۔ سینڈریلا ۴۔ ٹوپ اور مائی تھمپ ۵۔ رکویٹ ود ٹفٹ ۶۔ ڈائمنڈ اینڈ ٹوڈس ۷۔ لیٹل ریڈ رائڈنگ ہوڈ اور ۸۔ سلیپنگ بیوٹی"۔

یہ تمام کہانیاں آج بھی بچوں کے لیے عالمی ادب میں مقبولِ عام ہیں۔ ان کہانیوں میں وقتاً فوقتاً تھوڑی بہت ترمیم ہوتی رہی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کہانیاں دنیا کی مختلف زبانوں میں منتقل ہوئی ہیں اور ضرورت کے تحت معمولی تبدیلیوں کو جگہ دی جاتی رہی ہے۔ "مدر گوز ٹیلس" عالمی ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ جو صرف تفریح کے مقصد سے لکھی گئی ہے نیز جس کے ذریعے بچوں میں کسی قسم کی تبلیغ کرنا یا بچوں کو کوئی پیغام دینا مقصود نہ تھا۔ برٹینیکا جونیر انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے۔

"Mother Goose's Tales, is the true landmark in children's literature. It is the first book written for children's pleasure with out any intention to instruct or improve."[1]

---

1. Britanica Junior Encyclopaedia, Vol. 4, 1980, Page 250B.

جونیر انسائیکلو پیڈیا جزو ۱۹۸۰ء

مدر گوز ٹیلس کی بے پناہ مقبولیت کے زیر اثر عالمی ادب اطفال میں تفریحی کتب کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور تبلیغی درسی، سبق آموز کتابوں کی بہ نسبت تفریحی کتب کی مقبولیت بڑھتی گئی۔

مدر گوز ٹیلس کی مانند بچوں کے عالمی ادب میں قدیم ہندوستانی کہانیوں نے بھی خاصی قبولیت حاصل کی۔ سنسکرت کی لافانی تصنیف "پنچ تنتر" عالمی مقبولیت کی حامل رہی ہے۔ اسے پنڈت وشنو شرما نے جانوروں کی کہانیوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔

سنسکرت کی قدیم کہانیوں میں تین قسم کی کہانیاں ملتی ہیں۔ ۱۔ پریوں کی کہانیاں۔ ۲۔ نصیحت آموز کہانیاں۔ ۳۔ جانوروں کی کہانیاں۔

ان میں جانوروں کی کہانیاں سب سے زیادہ مقبول ہوئی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان کہانیوں میں جانور پرندے اور کیڑے مکوڑے سب ہی انسانوں کی طرح کام انجام دیتے ہیں اور ان ہی کی مانند آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ جانور پرند اور کیڑے مکوڑوں کا یہ روپ بچوں کے لیے ہمیشہ پسندیدہ رہا ہے۔ یہ تمثیلی پیرایہ بچوں کی تفریح طبع کے ساتھ ساتھ تدریسی اعتبار سے بھی بہت موثر رہا۔ بچے جب جانوروں، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کی ایسی کہانیاں پڑھتے یا سنتے ہیں تو ایک عجیب اور انوکھی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ جس میں حیرت بھی ہے اور تجسس بھی۔ پنچ تنتر کی یہ تمثیلی کہانیاں دنیا بھر میں مقبول رہی ہے۔ ہری کرشن دیوسرے نے اپنے مضمون بچوں کے عالمی ادب میں "پنچ تنتر" کی تخلیق کے بارے میں لکھا ہے:۔

"پنچ تنتر" کی تخلیق کا مقصد دلچسپ کہانیوں کے ذریعے اخلاق و حکمت کی تعلیم دینا تھا۔[1]

اسی مضمون میں "پنچ تنتر" کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر ہری کرشن دیوسرے نے وضاحت کی ہے کہ جنوبی ہندوستان کے روپا نگر میں امر کیرتی راجہ راج کرتا تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ چاروں ہی بے وقوف اور جاہل تھے۔ انہیں پڑھانے کے لیے کئی طریقے آزمائے

---

[1] ہری کرشن دیوسرے "بچوں کا عالمی ادب" ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی جنوری ۱۹۷۹ء

گئے۔ مگر سب بے سود ثابت ہوئے۔ آخر کار یہ ذمہ داری پنڈت وشنو شرما کو سونپی گئی کہ وہ ان راج کماروں کو راج کاج کے طریقے سکھلائے اور انہیں اخلاقیات کی تعلیم دیں۔ وشنو شرما نے جانوروں کی وساطت سے انسانی خصوصیات سماجی رشتوں اور انسانی پیچیدگیوں کی تشریح و توضیح کی۔ یہ کہانیاں اتنی دلچسپ ہیں کہ آج بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

جانوروں کی وساطت سے کہانیاں کہنے کا یہ پیرایہ بعد میں بچوں کی جین اور بودھ کہانیوں میں بھی ملتا ہے لیکن "پنچ تنتر" کی کہانیاں انسانی سماج اس کے مسائل اور عام آدمی کے باہمی رشتوں سے زیادہ وابستہ ہونے کے باعث بہت مقبول ہوئیں اور صدیوں بعد آج بھی ان کی دلچسپی برقرار ہے۔ "پنچ تنتر" کی اہمیت بچوں کے عالمی ادب میں مسلّم ہے۔ ہندوستان کے علاوہ ایران، چین اور روس وغیرہ ممالک کی مختلف زبانوں میں ان کہانیوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ تسلیم کرنا ہوگا کہ وشنو شرما کی "پنچ تنتر" سے واقعتاً ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں "ادب اطفال" کی بنیاد پڑی ہے۔

حالاں کہ ہندوستانی ادب اطفال کی بنیاد پنڈت وشنو شرما کے "پنچ تنتر" کو مانا گیا ہے لیکن جہاں تک اُردو میں بچوں کے ادب کا تعلق ہے۔ وہ ان صوفیائے کرام، مفکرین، مصلح قوم، ادباء اور شعراء کا مرہونِ منت ہے۔ جنہوں نے بچوں کی درس و تدریس کی طرف توجہ کی اور بچوں کے لیے نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ان مفکروں، دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقی کاوشوں سے قبل فارسی کتابیں ہی طلباء کی ضروریات پوری کرتی تھیں۔ "گلستان" "بوستان" "حکایاتِ سعدی" اور اسی نوع کی دوسری فارسی کتب ہمارے یہاں بچوں کو پڑھائی جاتی رہی ہیں ہندوستان میں عرصہ تک فارسی سرکاری زبان رہی۔ حالانکہ روزمرّہ کی بول چال میں ہندوستانی (سنسکرت، اپ بھرنش اور فارسی سے ملی جلی عوامی زبان جسے ہم ابتدائی اُردو کہہ سکتے ہیں) تھی۔ لیکن تعلیمی اور سرکاری اداروں میں زبان فارسی کا بول بالا تھا۔ ابتدا میں ہندوستان میں بچوں کے لیے جو کچھ لکھا گیا، اس کی نوعیت تدریسی تھی اور اس میں پند و نصیحت کی بھرمار تھی، یا اس کے ذریعہ مذہبی افکار کی تبلیغ و تلقین کی جاتی تھی۔ اس وقت تک بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کوئی منضبط نظریاتی فلسفہ بھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ ریاض احمد صدیقی لکھتے ہیں :

"برصغیر کی تہذیبی اور معاشرتی تاریخ کی ابتدائی ادوار میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا نہ کوئی نظریاتی فلسفہ ہی وجود رکھتا تھا اور نہ کوئی جداگانہ منظم طریقہ کار رائج تھا

برصغیر کی سرزمین پر تشکیل پانے والی ہند اسلامی تہذیب پر یہ رجحان بدنما داغ یوں ثابت ہوا کہ ظہور اسلام کے بعد خلافت راشدہ اور پھر اس کے بعد سائنسی فکری تحریکات کے ادوار میں بڑوں اور بچوں کی تعلیم و تربیت، قومی زندگی کا نہایت اہم اور ضروری جزو تھا۔ برصغیر کے مسلمان معاشرے میں بچوں کی کسی تعلیم کا آغاز مدرسوں پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ تعلیم محض دینی عقائد تک محدود ہوتی تھی۔[۱]

اردو ادب اطفال کا تاریخی ارتقاء

اُردو ادب میں بچوں کے ادب کی ابتدا ان درسی کتب سے ہوتی ہے جو بچوں کی تعلیم و تربیت کے مقصد سے لکھی گئی تھیں۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اُردو میں ادب اطفال بھی تغیر آشنا ہوتا رہا۔ اُردو میں بچوں کے ادب پر اظہار خیال کرتے ہوئے شفیع الدین نیّر رقم طراز ہیں۔

"اُردو میں بچوں کا ادب کئی روپ اور رنگوں میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس شق میں نصاب کی وہ کتابیں بھی ہیں جو بچوں کو سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی ہیں ان کی معلومات میں اضافہ کے لیے بچوں کے رسالے ہیں۔ ان کے خالی وقت کی دلچسپ مصروفیات کے لیے مختصر حجم کی وہ کہانیاں، قصّے افسانے، ڈرامے اور اس نوع کے دوسرے مضامین ہیں، ان سے بچوں کے لیے مفید شغل مہیا ہوتا ہے۔ اور ان کے خیالات، جذبات ان کی ذہنی اور جمالیاتی تربیت اور نشو و نما میں مدد ملتی ہے۔"[۲]

---

[۱] ریاض احمد صدیقی "پاکستان میں بچوں کا ادب اور مسائل" ماہ نو، لاہور ۱۹۸۰ء صفحہ ۱۰۷، چیف ایڈیٹر: کشور ناہید۔

[۲] شفیع الدین نیّر "بچوں کا ادب اور مسائل" ماہنامہ آجکل دہلی جنوری ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۱ ایڈیٹر: شہباز حسین۔

"اُردو ادب اطفال" کے آغاز اور ارتقاء کے تاریخی پس منظر کو واضح کرنے کے لیے اس کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱ دور اول ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک

۲ دور دوم ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء

۳ دور سوم ۱۹۴۷ء تا حال

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی نے برطانوی حکومت کو استحکام بخشا اور اس کے ساتھ ہی اس جنگ نے ہندوستانیوں کی آنکھیں کھول دیں۔ ملک و قوم کی ناگفتہ بہ حالت اور پسماندگی کو دور کرنے اور انہیں بیچارگی اور مایوسی کے غلبہ سے نجات دلانے کے لیے تبلیغ کا سلسلہ جاری کیا۔ اس دَور میں اپنی تہذیب اور تمدن نیز بزرگوں کی چھوڑی ہوئی میراث کی حفاظت کے لئے ادب کو بھی وسیلہ قرار دیا گیا اور سرسید تحریک کے زیرِ اثر تمام اصناف سخن کو اخلاق کا ایک مناسب تصور۔ انگریزی کے مثبت اور منفی اثرات بھی اُردو ادب پر مُرتب ہوئے اور ساتھ ساتھ تحریک آزادی بتدریج زور پکڑتی گئی جس کا سلسلہ آزادی ہند تک جاری رہا۔ چنانچہ اس دَور کی اہمیت اپنی جگہ مُسلّم ہے۔

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عالمگیر اور ۱۹۳۹ء کی دوسری جنگ عظیم نے بھی ادب پر دیرپا اثرات مرتسم کیے۔ اسی اثناء میں ترقی پسند ادبی تحریک کا بول بالا ہوا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی۔ ظاہر ہے کہ ان تمام تغیرات و محرکات سے اُردو کا "ادب اطفال" بھی متاثر ہوتا رہا۔

۱۹۴۷ء میں ہمارا ملک انگریزی استبداد سے نجات پاگیا۔ تقسیم ہند نے دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو ادب کو بہت متاثر کیا۔ اُردو والوں پر زبان و ادب کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کی اصلاح و ترقی کی ذمہ داری بھی آپڑی اور نئے ہندوستان کی تعمیر میں انہیں دوسری زبانوں کے شانہ بہ شانہ تیز رفتاری سے چلنا پڑا۔

ان حالات میں بتدریج بچوں کے ادب میں بھی یہ تبدیلیاں آئیں۔ اس قسم کی تبدیلیوں کی ایک وجہ یہ بھی کہ بچوں کے بارے میں از سرِ نو غور و فکر کا سلسلہ جاری ہوا اور جدید تعلیمی ضروریات کے زیرِ اثر ادب اطفال میں بھی نئے رُجحانات نے جنم لیا۔ آئندہ صفحات میں ہم ان ہی تین ادوار کے تحت "اُردو ادب اطفال" کے تدریجی ارتقاء کا جائزہ لیں گے۔

چھٹا باب

اُردو اَدب اطفال کا دورِ اوّل

ابتدا تا ۱۹۵۷ء

"اردو میں ادب اطفال" ۔ان درسی کتب کی حیثیت سے وجود میں آیا، جو بچوں کی تعلیم وتربیت کی ضروریات کے پیش نظر لکھی گئی تھیں۔ یہ تعلیم انھیں گھر یا مدرسوں میں دی جاتی تھی۔ اور مدرسے ہی انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان میں تعلیم وتربیت کا وسیلہ بنے رہے۔ انیسویں صدی سے قبل تعلیم کا تصور امرا اور حکمران طبقے اور ان کی پیروی کرنے والے متوسط طبقے تک ہی محدود تھا۔ عوام کی غالب اکثریت پسماندہ اور جاہل تھی۔ حکمران اور اعلیٰ طبقہ نیز ان کے ہم نوا متوسط طبقے کے شرفا اپنے گرد وپیش کی اکثریت کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور ان کے یاان کے بچوں کے لیے تعلیم کی ضرورت کا احساس ہی نہیں تھا۔

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں پر فارسی اور عربی کے اثرات پڑنے لگے۔ یہ نووارد قوم ہندوستان کی مقامی زبانوں مثلاً سنسکرت اور پالی سے ناآشنا تھی۔ فاتح اور مفتوح قوموں کے باہمی ارتباط کے نتیجے میں عربی، فارسی، سنسکرت، پالی اور ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں نے ایک دوسرے سے اثر قبول کیے اور ایک نئی زبان نے جنم لیا۔ جس کو ابتداً "ہندوی" یا ہندوستانی کا نام دیا گیا۔ بتدریج ترقیوں سے گزر کر یہی زبان آگے چل کر "اردو" کہلائی۔

حضرت امیر خسرو

فارسی ابتدا سے ہی اُردو کی تمام ادب پر اثر انداز رہی ہے۔ چونکہ فارسی روزمرّہ

بول چال کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک طویل مدت تک ہندوستان کی سرکاری زبان بھی رہی ہے اس لیے بچوں کے ادب میں جو ابتدائی کتابیں ملتی ہیں۔ ان پر فارسیت غالب ہے۔ "نصاب الصبیان" اس اعتبار سے سرفہرست ہے۔ یہ کتاب ابتدائی اردو میں نصابی نوعیت کی کتابوں کے لیے مثالی نمونے کا کام دیتی رہی ہے۔ اس ضمن میں مولانا محوی صدیقی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"غالباً گزشتہ صدی کے آخر میں بچوں کو پڑھانے کے لیے چھوٹی اور آسان کتابیں لکھنے کی ضرورت کا احساس ہوا اس سے پہلے فارسی زبان میں کبھی کبھی کچھ کتابیں اس مقصد سے لکھی جاتی تھیں۔ ان ہی میں ایک صنف نصاب کہلاتی ہے۔ نصاب کے معنی تھے "نظم میں چھوٹی سی لغت کی کتاب" جس سے بچوں کو دوسری زبان سیکھنے میں آسانی ہو اور شعر کی وجہ سے الفاظ کے معانی جلد یاد ہو جائیں۔ اس قسم کی قدیم کتابوں میں ابونصر فراہی کی "نصاب الصبیان" بہت مشہور ہے اور مدتوں رائج رہا ہے۔ اس میں عربی کے الفاظ فارسی اشعار میں بتائے گئے ہیں"[1]

ڈاکٹر مظفر حنفی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

"نصاب الصبیان" اور اسی نوع کی دوسری تدریسی تصنیفات دراصل عربی فارسی کی مختصر منظوم لغات تھیں کچھ محققین کو اس بارے میں شبہات ہیں اور وہ اسے زیادہ مستند نہیں گردانتے۔ میں ان دوسرے محققین سے اتفاق کرتا ہوں جن کے خیال میں "خالق باری" امیر خسرو (۱۳۲۵ - ۱۲۵۳ء) کی تصانیف کے خیال میں ہے۔ خالق باری بھی دراصل ایک مختصر لغت ہے جو نظم کی ہیئت میں ہے اور اس نظم میں مختلف اجزا مختلف بحور میں ہیں"(۲)

---

[1] محوی صدیقی بالک باغ "معیار ادب بکڈپو بھوپال سنہ ۱۹۷۶ء ص ۲۲
[2] ڈاکٹر مظفر حنفی "اردو میں ادب اطفال" (مشمولہ جہات و جستجو" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ سنہ ۱۹۸۲ء صفحہ ۸۳

محمود الرحمن اپنے مضمون "آزادی کے بعد بچوں کا ادب" میں رقمطراز ہیں۔

"اردو میں بچوں کے ادب کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے ہوتا ہے، اس زمانے میں نوعمر افراد کے لیے متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں۔ جو زیادہ تر لغت پر مشتمل تھیں مثلاً "خالق باری"، "ایزد باری" "صفات باری" وغیرہ۔ ان کتابوں کی غرض و غایت یہ تھی کہ نہایت آسان اور دلچسپ اشعار کے ذریعے عربی و فارسی الفاظ کے معنی سے متعارف کرایا جائے۔"[۱]

اردو ادب میں ادب اطفال کا آغاز اگر خالق باری سے ہوتا ہے جیسا کہ محمود الرحمن نے بھی تسلیم کیا ہے تو ان کا یہ خیال نامناسب معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کے ادب کا آغاز عہد عالمگیر سے ہوا کیوں کہ عہد عالمگیر سے تقریباً چار صدی قبل "خالق باری" تصنیف کی جا چکی تھی۔

ریاض صدیقی بھی "خالق باری" کو بچوں کی پہلی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔

"... تعلیم محض دینی عقائد تک محدود ہوتی تھی اس قسم کی محدود تعلیم کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے سب سے پہلے امیر خسرو نے "خالق باری" لکھی۔"[۲]

مولانا محوی صدیقی نے "خالق باری" کو بچوں کی پہلی کتاب تسلیم کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان کی قدیم ہندی زبان میں اس قسم کی سب سے پہلی کتاب "خالق باری" ہے۔ جس کے مشہور مصنف حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ ہیں۔ اگرچہ بعض ارباب علم کی تحقیق یہ ہے کہ امیر خسرو اس کے مصنف نہیں بلکہ یہ خسرو اور کوئی ہیں"[۳]

---

[۱] محمود الرحمن "آزادی کے بعد بچوں کا ادب" ماہنامہ کتاب (لاہور) بچوں کا ادب نمبر جنوری ۱۹۷۹ء
ص ۹۔ مدیر ذوالفقار احمد تابش

[۲] ریاض صدیقی "پاکستان میں بچوں کا ادب" اور مسائل" ماہ نو (لاہور) ۱۹۷۹ء ص ۷۱ - ۸۰
چیف ایڈیٹر کشور ناہید۔

[۳] محوی صدیقی "تالک باغ" "معیار ادب" بھوپال ۱۹۷۰ء ص ۲۴

"خالق باری" کے سلسلے میں بعض دیگر لوگوں کا خیال ہے کہ امیر خسرو اس کے مصنف نہیں ایسے لوگوں میں محمود شیرانی جیسے محقق بھی شامل ہیں۔ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں دلائل کے ساتھ "خالق باری" کی امیر خسرو کی تصنیف ہونے سے انکار کیا ہے[1]۔ اس ضمن میں ڈاکٹر گیان چند جین کا کہنا ہے کہ محمود شیرانی نے اپنے موقف کی بنیاد "خالق باری" کے اس مخطوطے پر رکھی ہے جس میں مصنف کا نام ضیاء الدین خسرو، کتاب کا نام تحفۃ الشان

تاریخ تصنیف سنہ ۱۰۲۱ ہجری بعہد جہانگیر اور تاریخ کتابت سنہ ۱۱۸۷ ہجری ہے"[2]
آگے چل کر گیان چند جین نے "خالق باری" کے بارے میں لکھا ہے۔

"مستند کتابوں میں سب سے پہلے خان آرزو (متوفی سنہ ۱۱۶۹ ہجری) نے اپنی تصنیف غرائب اللغات، ہندی میں بعض الفاظ کے ضمن میں رسالہ منظومہ امیر خسرو سے سند لی ہے۔ انھوں نے رسالہ کا نام نہیں لیا لیکن مقابلہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی مراد "خالق باری" سے ہے تب ہی سے اسے روایتاً امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن اس کتاب کی ناقص زبان و بیان اور اغلاط معنوی کو دیکھ کر شیرانی سے پہلے بھی اس پر شبہ کیا جاتا تھا۔ سنہ ۱۹۱۸ میں جواہر خسروی کی تمہید میں مولانا محمد امین چریاکوٹی نے ان شبہات کی تردید میں کچھ دلائل پیش کیے"[3]

ڈاکٹر گیان چند جین کے اس بیان سے دو باتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ اول یہ خان آرزو (متوفی سنہ ۱۱۶۹ ہجری) نے اپنی تصنیف "غرائب اللغات ہندی" میں امیر خسرو کی خالق باری سے سند لی۔ دوسرے محض ناقص زبان و بیان اور اغلاط معنوی کو دیکھ کر شیرانی سے قبل اس پر شبہ کیا گیا تھا کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے یا نہیں مگر ۱۹۱۸ میں

---

[1] محمود شیرانی، "پنجاب میں اردو"

[2] ڈاکٹر گیان چند جین "امیر خسرو کی کھڑی بولی کی شاعری" مشمولہ "حقائق" مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ ۱۹۸۷ ص ۲۱

[3] ڈاکٹر گیان چند جین "امیر خسرو کی کھڑی بولی کی شاعری" مشمولہ "حقائق" مکتبہ جامعہ

محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو" سے قبل مولانا امین چریاکوٹی نے "خواص خسرو" میں ان تشبیہات کی تردید کی اور اپنی تردید میں دلائل پیش کیے۔ "خالق باری" امیر خسرو کی تصنیف ہے اس کی تائید میں ڈاکٹر وحید مرزا نے لکھا ہے :-

"موافق اور مخالف دلیلوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ "خالق باری" یا اس کا زائد حصہ امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ امتدادِ زمانہ سے اس میں تصرّف اور تحریف ہوتا رہتا ہے اور بعض ہندی الفاظ کی شکل پیدا ہو" [۱]

ڈاکٹر وحید مرزا کی یہ بات کہ "امتدادِ زمانہ سے اس میں تصرف اور تحریف ہوتا رہا ہو۔ اور بعض ہندی الفاظ کی شکل میں پیدا ہو گئی ہو قابلِ توجہ ہے اور اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ "خالق باری" امیر خسرو کی تصنیف ہے، زمانے کے ساتھ ساتھ زبان کی ترقی اور الفاظ کی تبدیلیوں کے باعث غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ اس خیال کی تائید پروفیسر ممتاز حسین کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی ہو جاتی ہے۔

"حافظ محمود شیرانی کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ جس "خالق باری" کو امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے وہ اصلاً ایک گمنام شخص ضیاء الدین خسرو (گوالیاری) کی تصنیف ہے۔ ضیاء الدین خسرو حفظ اللسان کا موٴلف ہو سکتا ہے لیکن وہ "خالق باری" کا مصنف نہیں" [۲]

"خالق باری" میں روزمرہ استعمال میں آنے والی فارسی الفاظ کے معنی واضح کیے ہیں۔ مثلاً

بیا برادر	آ رے بھائی
بنشیں مادر	بیٹھ ری مائی
مولوی صاحب شرن پناہ	گدا بھکاری خسرو شاہ

---

[۱] وحید مرزا "امیر خسرو" ص ۲۲۶

[۲] پروفیسر ممتاز حسین "امیر خسرو دہلوی" مکتبہ جامعہ نئی دہلی سنہ ۱۹۸۲ء صفحہ ۳۶۷

امیر خسرو کے یہاں "خالق باری" کے علاوہ کچھ بچوں کے لیے پہیلیاں، کہہ مکرنیاں اور دو سخنے ملتے ہیں جو بچوں اور بڑوں میں یکساں طور پر مقبول ہوئے ہیں۔ "دو سخنے" میں صنعت ایہام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دو مختلف النوع سوالات کا جواب ایک ذو معنی جملے سے دیا جاتا ہے۔ جس سے بات میں ایک طلسمی کیفیت، لطف اور انوکھا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً

سموسہ کیوں نہ کھایا　　جوتا کیوں نہ پہنا　　(تلا نہ تھا)
ستار کیوں نہ بجا　　عورت کیوں نہ نہائی　　(پردہ نہ تھا)
گدھا اداس کیوں　　برہمن پیاسا کیوں　　(لوٹا نہ تھا)
انار کیوں نہ چکھا　　وزیر کیوں نہ رکھا　　(دانا نہ تھا)
دیوار کیوں ٹوٹی　　راہ کیوں لوٹی　　(راج نہ تھا)

کہہ مکرنیوں میں اس کے بالکل برعکس کسی ایک مفصل سوال کے دو جواب ہوتے ہیں۔ جن میں پہلے جواب کو رد کر کے دوسرے جواب پر اصرار کیا جاتا ہے۔

وہ آوے تب شادی ہوئے　　اس میں دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگیں اس کے بول　　اے سکھی ساجن نہ سکھی ڈھول (ڈھول)
آٹھ انگل کا ہے وہ اصلی　　اس کے ہڈی نہ اس کے پسلی
نا دھاری گرو کا چیلا　　اے سکھی ساجن نہ سکھی کیلا (کیلا)

اسی طرح امیر خسرو کی پہیلیاں بھی بچوں کی دلچسپی اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ادب اطفال میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ یہ پہیلیاں لفظی اور معنوی اعتبار سے بات کو اس طرح پیچیدہ بنا کر پیش کرتی ہیں کہ اس کا جواب دینے میں خاصے غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے۔

ایک تھال موتیوں سے بھرا　　سب کے اوپر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھالی پھرے　　موتی اس سے ایک نہ گرے
(آسمان)

فارسی بولوں آئی نہ　　ترکی ڈھونڈھی پائی نہ
ہندی بولوں آرسی آئے　　خسرو کہے نہ کوئی بتائے (آئینہ)

حالانکہ امیر خسرو کے دو سخنوں، کہہ مکرنیوں اور پہیلیوں وغیرہ جیسی باتوں سے بہت زیادہ مواد ملتا ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ چیزیں بہرصورت بچوں کے ادب میں شمولیت کا استحقاق اور اولیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا امیر خسرو بچوں کے شاعر ہیں اور خسرو کی تصنیف "خالق باری" بچوں کے ادب کی پہلی تصنیف ہے جس کی تصدیق وحید مرزا،[1] ڈاکٹر مظفر حنفی،[2] محمود الرحمٰن،[3] مولانا محوی صدیقی،[4] اور ریاض احمد[5] کے بیانات سے ہوجاتی ہے۔

"خالق باری" کی تقلید میں اسی اسلوب و پیرائے پر بچوں کے لیے بہت سی نصابی کتب تصنیف کی گئیں۔ ایسی کتب میں عباس رفعت بھوپالی کا "عباس نامہ" اور عبدالصمد بیدل کی "حمد باری" قابلِ ذکر ہیں۔ تاریخی اعتبار سے ہم کئی صدی آگے نکل آئے ورنہ بتدریج ارتقاء کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں رفعت بھوپالی اور عبدالصمد بیدل سے پیشتر دکن میں ادب اطفال پر نظر ڈالنی ہوگی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، اردو زبان نے آنکھ تو کھولی شمالی ہند میں لیکن اس کا بچپن دکن کی سرزمین پر گزرا ہے اور مختلف اصناف سخن نے ابتدائی تصانیف اسی دور میں وجود میں آئی۔ دکن سے ہماری مراد جنوبی دہلی کی خودمختار ریاستوں احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، بیدر اور برار سے ہے ان ہی مقامات پر اردو نے سترہویں صدی عیسوی تک اپنا عہد طفلی گزارا ہے۔ ادب اطفال کے ضمن میں شاہ حسین ذوقی کی مثنوی "ماں باپ نامہ" کو دکن کی جانب سے ایک اضافہ تصور کرنا چاہیے۔ جو بچوں کی نصابی ضرورت کے تحت نہیں لکھی گئی بلکہ اس کے ذریعہ شاعر نے بچوں کو اپنے والدین کی خدمت اور احترام کرنے کی نصیحت کی ہے۔

---

[1] وحید مرزا "امیر خسرو" ص ۳۲۶

[2] ڈاکٹر مظفر حنفی "اردو میں ادب اطفال" مشمولہ "جہات و جستجو" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ ۱۹۸۲ء ص ۸۴

[3] محوی صدیقی۔ بالک باغ معیار ادب بچپال "ماہنامہ کتاب (لاہور) جنوری ۱۹۷۹ء ص ۹

[4] محوی صدیقی۔ بالک باغ معیار ادب بچپال ۱۹۷۹ء ص ۲۴

[5] ریاض احمد صدیقی "پاکستان میں بچوں کا ادب اور مسائل" ماہ نو (لاہور) جنوری ۱۹۷۹ء ص ۱۱

میر تقی میر

بعد ازاں اٹھارھویں صدی عیسوی میں ولی دکنی اور ان کے دیوان کی دہلی میں آمد کے بعد سے شمالی ہندستان میں بھی لکھنے والے اردو میں ادبی تخلیقات پیش کرنے کی جانب مائل ہونے جن میں بچوں کا ادب بھی شامل ہے۔ چنانچہ میر تقی میر جیسے عظیم المرتبت غزل گو کی کلیات میں بھی بچوں کے لیے شعری نمونے نظمیں مل جاتی ہیں۔ یہ اپنے موضوع، اسلوب اور زبان ہر اعتبار سے بچوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ ان میں بطور خاص "موہنی بلی" "بکری اور کتے" "مور نامہ" "مچھر" "کھٹمل" وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں جن کو ہم ادب اطفال میں شامل کر سکتے ہیں۔ بقول اطہر علی فاروقی :-

''اگر نظیر اکبر آبادی کی "گلہری کا بچہ" اور "ریچھ کا بچہ" مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی "گائے" "شیخ الدین نیر کا کیچوا" اس رجحان و بچوں کا ادب کو پورا کرسکتے ہیں۔ اور ان نظموں کو بچوں کی شاعری کے تحت رکھتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ میر تقی میر کی "موہنی بلی" "بکری اور کتے" "تیر کا گھر" کیوں اس ضمن میں نہ رکھے جائیں۔"[1]

ڈاکٹر حسینی پرمی اپنے تحقیقی مقالے "اسمٰعیل میرٹھی حیات اور کارنامے" میں لکھتے ہیں۔

''اپنے ماحول سے مانوسیت اور واقفیت ایک باشعور شاعر کے ذہن کی بیداری اور اس کے نیک دل ہونے کی پہچان ہے۔ "کتے اور بلی" ہندوستانی گھروں کی زندگی کا ایک اہم جز مان لئے گئے ہیں۔ ان کے پالنے کا رواج دراصل بچوں کی دلچسپی اور مصروفیات کا نتیجہ ہے۔ یہ ہمارے گھروں کی زینت کا سامان بن گئے اس لیے شیر خوار بچوں کے لیے گڑیوں کے ساتھ ساتھ کتے، بلی کے کھلونے خرید دیے جاتے رہے ہیں۔"[2]

---

[1] اطہر علی فاروقی "میر تقی میر اور بچوں کی شاعری" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی اپریل ۱۹۸۰ء ص ۱۹

[2] ڈاکٹر حسینی پرمی "اسمٰعیل میرٹھی حیات اور کارنامے" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۶ء صفحہ ۲۴۴

ڈاکٹر سیفی پریمی کے قول کی روشنی میں میر کی متذکرہ بالا نظموں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان نظموں میں مقامی رنگ اور گھریلو زندگی کی تصویریں جس خلوص انداز اور خلوص کے ساتھ پیش کی گئی ہیں ان کی نظیر میر سے قبل نہیں ملتی۔ "موہنی بلی" "کھٹمل" "مچھر" "کتیا اور بلی" "مرغوں کی لڑائی" بچوں کے شاہکار نظمیں ہیں۔

بچوں کے نفسیاتی رجحانات کی ایک کڑی کھیل تماشوں سے بھی ملتی ہے۔ بچے بندر کا تماشہ "ریچھ کا تماشا" "مرغوں کی لڑائیاں" "پہلوانوں کے دنگل وغیرہ دیکھنے کے شائق ہوتے ہیں۔ ان کھیل تماشوں کے جیتے جاگتے مرقعے میر کی بعض نظموں میں فطری انداز میں پیش کیے گئے ہیں ایسی نظموں میں "مرغی کی لڑائی" بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

کچھ لوگوں نے میر کے خستہ حال گھر (مثنوی در ہجو خانۂ خود) کو بھی بچوں کی نظموں میں شامل کیا ہے۔ میرے خیال میں اس مثنوی میں میر نے اپنی خستہ حالی اور پریشانی کا ذکر جس انداز میں کیا ہے اور اس مثنوی کی زبان اور اسلوب جتنا پیچیدہ اور فنکارانہ ہے اس کے پیش نظر اسے ادب اطفال میں شامل کرنا بچوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ محض اس بنا پر کہ مثنوی زیر بحث میں کئی مقامات پر میر نے ظریفانہ طرز بیان اختیار کیا ہے۔ اسے بچوں کی دلچسپی کی چیز نہیں کہا جا سکتا ورنہ اس معیار پر پوری اترنے والی رشید احمد صدیقی اور دوسرے مزاح نگاروں کی سب ہی تخلیقات کو ادب اطفال میں جگہ دینی ہوگی۔ البتہ میر کی نظمیں مچھر اور کھٹمل وغیرہ ظرافت کے ساتھ ساتھ سادہ اور عام فہم زبان کی وجہ سے ضرور بچوں کے ادب میں نمایاں مقام پانے کی مستحق ہیں۔ یہاں اس امر کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ ابتدا سے ہی اردو کے ممتاز ترین شاعر اور ادیب، ادب اطفال کی طرف بھی توجہ دیتے آئے ہیں جس کی روشن مثال میر تقی میر ہیں۔

مجھے اظہر علی فاروقی کے اس خیال سے سو فی صد اتفاق ہے کہ:۔

"بچوں کے شعر و ادب کا مقصد ان کی دلچسپی سے زیادہ ان کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کرنا ہے اور انھیں اچھے سے اچھا شہری بنانا ہے۔ یہ مقصد بھی میر کی ان نظموں سے پورا ہو جاتا ہے۔ جانوروں سے محبت، غرض مندانہ دنیا سے ہمدردی، لین دین میں دیانت داری، سماجی پستی سے تاثر، معمولات میں افراط و تفریط سے احتیاط برتنا وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو میر تقی میر

کی اس شاعری میں موجود ہیں جسے ہم نے بچوں کی شاعری سے تعبیر کیا ہے۔[1]

اس ضمن میں مزید بحث اور تجزیے اگلے باب میں کیے گئے ہیں چنانچہ یہاں تفصیل میں جانے سے گریز کرتا ہوں۔

نظیر اکبر آبادی

میر تقی میر کے بعد بچوں کے شاعر کی حیثیت سے نظیر اکبر آبادی (سنہ ۱۸۳۰-۱۷۳۵ء) کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ نظیر نے بچوں کے لیے بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں کی سب سے بڑی خوبی ان کی سادہ زبان ہے جو عربی، فارسی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ سے پاک ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی نظمیں بچوں میں حب الوطنی کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت میں اخلاقی اقدار اور قومی تشخص کے نقوش کو ابھارتی ہیں۔

محمود الرحمٰن نے نظیر اکبر آبادی کی ایسی شاعری کے بارے میں لکھا ہے۔

> "اردو میں بچوں کے لیے جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس میں نہ صرف پند و نصیحت کی کارفرمائی ہے بلکہ مذہبی عناصر کی جلوہ گری بھی ہے۔ صحیح معنوں میں نظیر اکبر آبادی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے بچوں کے ادب کو مذہب اور لغت کی سنجیدہ بزم سے نکال کر نونہالوں کے بزم میں پہنچا دیا ہے۔ جہاں ان کے اپنے جذبات، احساسات نمایاں ہیں"[2]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، نظیر معلم پیشہ بھی تھے اور ساتھ ہی قادر الکلام شاعر بھی۔ اس طرح ادب اطفال میں ان کی حیثیت دو آتشہ ہو گئی۔ انھوں نے بچوں کے لیے کئی نظمیں مختلف عنوانات کے تحت تخلیق کیں۔ ان کی کلیات میں ایسی بہت سی نظمیں مل جاتی ہیں جو بچوں کے ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اس ضمن میں نظیر اکبر آبادی کی "ایام طفلی" "معصوم

---

[1] اظہر علی فاروقی "میر تقی میر اور بچوں کی شاعری" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی اپریل ۱۹۷۶ء ص ۲۲ مدیر شہباز حسین

[2] محمود الرحمٰن "آزادی کے بعد بچوں کا ادب" ماہنامہ "کتاب" (لکھنؤ) جنوری ۱۹۷۶ء ص ۹۲

بھولے بھالے"، "تربوز"، "کل کوسے اور پتنگ"، "گلہری کا بچہ"، "پوسف اور خدا بخش کی دوستی"، "ریچھ کا بچہ"، "تل کے لڈو"، "ہرن کا بچہ"، "واہ کیا بات کوے رکی کی"، "بلبلوں کا" ان کی پسندیدہ نظمیں ہیں۔ بچوں کے لیے جتنا کچھ نظیر اکبر آبادی نے لکھا ہے۔ اس سے قبل اردو میں کسی دوسرے شاعر نے نہیں لکھا۔ ان کی نظموں کی خاص خوبی یہ ہے کہ ان میں اخلاقی اقدار اور پند و نصائح پر زور دیا گیا ہے باایں ہمہ یہ نظمیں اپنے پُر لطف پیرایہ بیان اور طرز ادا کی وجہ سے خشک اور بے کیف محسوس نہیں ہوتی۔

انشاء اللہ خاں انشاء

اردو میں ادب اطفال کی ابتدا اور نشو و نما شاعری ہی سے ہوئی اور دکنی دور نیز شمالی ہند کے ابتدائی دور میں بچوں کے ادب کے تحت منظومات کا ہی اضافہ ہوتا رہا۔ نثر میں اٹھارہویں صدی کے اواخر تک کوئی قابل ذکر تصنیف ایسی نہیں ملتی جس کو ہم بچوں کے ادب سے تعبیر کر سکیں۔ ۱۷۹۳ء میں سب سے پہلے لکھنؤ کے انشاء اللہ خاں انشا جو نظیر اکبر آبادی کے ہم عصر تھے، نے بچوں کے لیے نثری تصنیف "رانی کیتکی" کی کہانی پیش کی۔ بقول ڈاکٹر مظفر حنفی انشاء اللہ خاں انشا کی یہ کہانی نہ صرف بچوں کے لیے سب سے پہلی نثری کہانی ہے۔ بلکہ ہندی اور اردو دونوں کے افسانوی ادب (FICTION) کی ابتداء بھی انشاء اللہ خاں انشا کی اسی تخلیق سے ہوتی ہے اور اس کو بچوں کے ادب کا سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے"۔[1]

انشا کی اس کہانی کا نمایاں ترین امتیاز اس کی خالص ہندوستانی زبان ہے اور مصنف کا دعویٰ رہا ہے کہ اس میں فارسی اور سنسکرت کے الفاظ سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اس دعوے کی تصدیق مختلف ناقدین نے بھی کی ہے۔ مثلاً

پروفیسر جاوید نہال نے لکھا ہے۔

"رانی کیتکی" انشا کی انوکھی تصنیف ہے۔ کہانی لکھنے میں انشاء نے معجزے کی حد تک کمال کر دیا ہے۔ پوری کہانی میں عربی فارسی کا ایک

---

[1] ڈاکٹر مظفر حنفی "اردو میں ادب اطفال" مشمولہ "جہات و جستجو" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی [illegible]

کتابیں تصنیف کیں اور حسب ضرورت دوسری زبانوں سے ترجمے بھی کیے۔ اس طرح بالواسطہ طور پہ
مقفیٰ نثر میں عبارت آرائی، رنگین بیانی اور مقفیٰ و مسجّع اسالیب نگارش ختم کرنے کی جو کوشش ہو رہی
آ رہی تھی اس کی اصلاح بھی ہو گئی۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین و مترجمین کی تصانیف اور تراجم ظاہر ہے کہ بالغوں کے لیے
تھے لیکن طرزِ عام سے ہٹ کر چونکہ یہ چیزیں شعوری طور پر انتہائی آسان اور عام فہم زبان میں
لکھی گئی تھیں تاکہ ہندوستان میں نو وارد انگریز انھیں کسی دقت کے بغیر سمجھ سکیں۔ اس لیے ان میں
سے اکثر تصانیف بچّوں کی سمجھ میں بھی آ سکتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ اکثر ابتدائی اور ثانوی درجات کی
نصابی کتابوں میں ان کے اقتباسات شامل کیے جاتے رہے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کی متعدد تصانیف
میں سے بطور خاص "باغ و بہار" (میر امن) "خلاقی ہند" (بہادر علی حسینی) "آرائشِ محفل"، "قصہ
حاتم طائی" اور صد حکایات (حیدر بخش حیدری)، "بیتال پچیسی" (مظہر علی ولا) "سنگھاسن بتیسی" (للو
لال جی) وغیرہ ایسی تصانیف اور تراجم ہیں جن میں بچّوں کی دلچسپی کا وافر سامان موجود ہے۔ اردو میں
اچھی استعداد رکھنے والے بچے انھیں بہت ذوق و شوق سے پڑھتے آئے ہیں اور موجودہ زمانے
میں زبان پر کم استعداد رکھنے والے بچّوں کے لیے ان میں سے اکثر کتابوں کو مزید آسان زبان
میں پیش کیا۔

مرزا اسد خاں غالب

دورِ اوّل کے اواخر میں مرزا غالب کا "قادر نامہ" قابلِ ذکر ہے جس کو بچّوں کے ادب میں
خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ "قادر نامہ" بھی امیر خسرو کے "خالق باری" کی طرز پر لکھی گئی ہے۔
اس کی سب سے بڑی خوبی اس کا دل نشین اسلوب ہے۔ محوی صدیقی "قادر نامہ" کے بارے میں
رقمطراز ہیں:۔

> "ہندوستان کے سب سے بڑے مجدد اور مجتہد شاعر مرزا غالب نے
> اپنا "قادر نامہ" تصنیف کیا یہ چھوٹی سی کتاب مثنوی کی صورت میں بحر رمل مسدس
> میں ہے۔ جس کا وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔ فرق یہ ہے کہ "خالق باری"
> مختلف بحروں میں ہے اور "قادر نامہ" شروع سے آخر تک ایک ہی بحر میں ہے۔"[1]

---

[1] محوی صدیقی۔ "بالک باغ" معیارِ ادب بھوپال ۱۹۶۴ء ص ۲۶،۲۵

"قادر نامہ" مرزا غالب نے اپنے بھتیجے زین العابدین خاں عارف کے بچوں باقر علی اور حسین علی خاں کو فارسی لغویات کے پیش نظر لکھی تھی۔ ان بچوں کی پرورش غالب نے کی تھی۔ قادر نامہ کا پہلا ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔

"خالق باری" امیر خسرو کی طرح ہی غالب کے "قادر نامہ" کے بارے میں بھی ماہرین کے درمیان اختلاف رائے ہے کہ یہ غالب کی تصنیف ہے یا نہیں۔ غلام رسول مہر اسے تصنیف غالب تصور نہیں کرتے لیکن بیشتر ماہرین غالبیات جن میں مالک رام، امتیاز علی عرشی، پروفیسر عبدالقوی دسنوی وغیرہ شامل ہیں جو اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ "قادر نامہ" غالب کی ہی تصنیف ہے اور ہمیں ماہرین کی کثیر رائے سے اتفاق کرنا چاہیے۔

"قادر نامہ" میں بھی "خالق باری" کی طرز پر فارسی کے کثیر الاستعمال الفاظ کے معنی اردو میں نظم کیے گئے ہیں۔ چند مثالیں قادر نامہ سے پیش ہیں۔

چاہ کو ہندی میں کہتے ہیں کنواں
دود کو ہندی میں کہتے ہیں دھواں
ہندی میں عقرب کا بچھو نام ہے
فارسی میں بھوں کا ابرو نام ہے

محوی صدیقی "بالک باغ" صفحہ ۷ پر لکھتے ہیں کہ "قادر نامہ" میں بچوں کے لیے غالب کی تخلیق کردہ دو غزلیں بھی شامل ہیں ان غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

لال ڈگی پر کرے گا جا کے کیا
پل پہ چل ہے آج دن اتوار کا
وہ چرائے باغ میں میوہ جسے
پھاند جانا یاد ہو دیوار کا

کیا کہیں کھائی ہے حافظ جی کی مار
آج ہنستے آپ جو کھل کھل نہیں
جس نے قادر نامہ سارا پڑھ لیا
اس کو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

محوی صدیقی نے "قادر نامہ" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نظامی مطبعہ کانپور کے نسخے میں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آخر میں شفقہ کی بہت سی نظمیں، قطعات اور مثنوی کی صورت میں دو دو تین تین چار چار پانچ پانچ شعروں کی مختلف عنوانات پر تھیں۔ مثلاً ذیل چھیل مکتب "ہاتھی" وغیرہ یہ کتاب ہندوستان کے اکثر پریسوں از PRESS میں لاکھوں کی تعداد میں چھپی اور بے حد مقبول ہوئی تھی۔ تقریباً ہر بچہ پڑھتا تھا لیکن یہ انقلاب زمانہ ہے کہ چالیس پچاس سال کے اندر نایاب بلکہ مفقود ہو گئی" [۱]

باوجود تلاش بسیار کے مطبع نظامی کانپور کا زیر بحث نسخہ نہیں مل سکا! ورنہ بالخصوص محولہ بالا دونوں غزلوں اور محوی صدیقی کی متذکرہ نظموں کے غائر مطالعہ اور تجزیہ سے نہ صرف اردو کے ادب اطفال بلکہ غالبیات کے میدان میں بھی کارآمد اور نئی باتیں کہی جا سکتی تھیں۔ کلام غالب کی نمایاں اور بنیادی خصوصیات کے تناظر میں ان غزلوں کا اسلوب اور مزاج کہیں سے غالب کے ذوق اور تخلیقی امتیازات سے میل کھاتا نظر نہیں آتا نہ ہی ان نظموں اور غزلوں کا ذکر کسی اور ماہر غالبیات نے اپنی کسی تحریر میں کیا۔ محض تکمیل گفتگو کی خاطر ان چیزوں کا ذکر شامل مقالہ کر دیا گیا ہے۔ ورنہ میں ڈاکٹر مظفر حنفی کے اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ ان تخلیقات کا مزاج غالب کے مزاج شعری سے مختلف ہے اور مجھے ان نظموں کے تخلیقات غالب ہونے پر شبہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ صرف "قادر نامہ" کو ہی غالب کی ایسی مستند تخلیق تسلیم کرنا چاہیے جو ادب اطفال میں شامل کی جا سکتی ہے۔

ساتواں باب

اردو ادبِ اطفال کا دورِ دوم

سنہ ۱۸۵۷ء تا سنہ ۱۹۴۷ء

غلام احمد فروغی

سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد بچوں کے ادب میں پہلا قابلِ ذکر نام غلام احمد فروغی کا ہے۔ جنھوں نے غالب کے "قادر نامہ" کی طرز پر "قادر نامہ فروغی" تیار کیا۔ فروغی ریاست الور کے رہنے والے تھے۔ فارسی زبان کے عالم تھے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصّہ بھوپال میں گزرا۔ موصوف باعتبارِ پیشہ مدرّس تھے۔ انھوں نے بچوں کے لیے درسی کتابیں لکھیں۔ غلام احمد فروغی کی کتابوں میں "قادر نامہ فروغی" کے علاوہ "فیضِ شاہجہانی" "نصابِ عزیزی" کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ غلام احمد فروغی کو بچوں کی درسی کتب لکھنے پر ملکہ حاصل تھا۔ ان کتب کے ذریعے فروغی بچوں میں اردو، فارسی اور عربی کی استعداد بڑھانا چاہتے تھے۔ یہ کتابیں چونکہ محض درسی مقصد کے تحت لکھی گئی تھیں اس لیے ان میں بچوں کو خشکی اور بے کیفی کا احساس ہوتا تھا۔ محوی صدیقی، جو فروغی کے شاگرد بھی تھے لکھتے ہیں:

> "انھیں اس قسم کی کتابیں لکھنے میں عجیب ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے ایک کمال یہ کیا کہ برائے بیت یعنی بھرتی الفاظ آنے ہی نہ تھے مگر اس سے طالب علم کے لیے کوئی دلچسپی کی چیز نہیں رہتی۔ رٹنا اور یاد کرنا بہت پڑتا تھا"[1]

---

[1] محوی صدیقی۔ بانک باغ۔ ادب بنگلہ بھوپال ۱۹۶۷ء ص ۲۶

سنہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے مزید استحکام
کا موجب ہوئی اور پورا ملک براہ راست حکومت برطانیہ کے زیر نگیں آگیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب
انگریزی کے زیر اثر ادب نو کی تشکیل کا رجحان پیدا ہوا جس نے ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں
کے ساتھ ساتھ اردو میں "بچوں کے ادب" پر بھی مثبت اثرات مرتسم کیے۔ ادب اطفال پر خاطر خواہ
توجہ دی جانے لگی۔ ویسے بھی سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اسی جذبے کے تحت
سرسید احمد خاں نے نظم و نثر کو عام فہم اور سادہ بنا کر انھیں ملک و قوم کے لیے افادی بنانے
کی تحریک چلائی۔ ریاض احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

"سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہزار سالہ تہذیبی، فکری، علمی اور معاشرتی اقدار
کا پورا محل ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ انگریزوں کے زیر اثر فروغ پانے والی
نئی روشنی سے استفادہ کرنے والوں نے پہلی بار بچوں کی تعلیم و تربیت اور مستقبل
میں ان کے کردار کی اہمیت کو محسوس کر لیا۔ اس مرحلے پر جو نام ہمارے سامنے
آتے ہیں وہ ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی
کے ہیں"[۱]

سرسید احمد کی تحریک کے تحت محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی
نعمانی، مولوی ذکاء اللہ وغیرہ نے اردو میں مختلف اصناف اور موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔ ان لوگوں
کی تحریروں میں بچوں کے لیے بھی بہت سی تخلیقات نظم و نثر میں موجود ہیں۔ شفیع الدین نیر اس
دور کے تغیر پذیر ادبی ماحول اور اصلاحی تحریکات کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"ڈاکٹر جان گلکرسٹ، ڈاکٹر اسپرنگر اور کرنل ہالرائڈ کے نام اردو زبان
و ادب کی ترقی سے خاص طور پر وابستہ ہیں۔ سرسید احمد خاں اور ان کے
ادبی رفقاء اور احباب کی بدولت بھی اردو میں علمی اور ادبی کتابیں کافی تعداد
میں مہیا ہوئیں مگر بچوں کے ادب کی طرف توجہ نہیں ہو سکی تاہم پنجاب میں کرنل
ہالرائڈ کی سرکردگی میں جو لٹریچر وجود میں آیا اس میں بیش بہا ذخیرہ
ایسا بھی ہے جسے بچوں کے ادب میں بجا طور پر پیشرو کا درجہ دیا جا سکتا

---

۱ ریاض احمد صدیقی "پاکستان میں بچوں کا ادب اور رسائل" ماہنامہ ماہ نو (لاہور) نومبر ۱۹۷۹ء
صفحہ ۱۷ ۔ بحوالہ [illegible] کشور ناہید

شفیع الدین نیرؔ نے بچوں کے ادب کے جس حافظ فرخ وغیرہ کا ذکر کیا ہے[1] وہ محمد حسین آزاد، حالی
ڈپٹی نذیر احمد اور سرسید احمد خاں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس حقیقت سے بھی کوئی منکر نہیں ہو سکتا
کہ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہنگامے نے پورے ہندوستان بالخصوص مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ
دیا تھا اور یہ قوم جو خواب غفلت کا شکار تھی اسے اپنی پسماندگی اور شکست خوردگی کا احساس ہونے لگا
اس جنگ آزادی نے زندگی کی قدروں کو بدلنے اور انسانی شعور کو متحرک کرنے کے ساتھ ساتھ زبان
و ادب پر بھی اپنے اثرات مرتسم کیے۔ حقیقت یہ کہ "اردو ادب اطفال" میں سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ
آزادی ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ جس کے زیر اثر شعر و ادب کی قدیم اور فرسودہ روایات میں
ایک تغیر رونما ہوا۔ تخیل سے کنارہ کشی کر کے حقیقت نگاری کی طرف توجہ مبذول کی گئی۔ معاشرے اور
پوری ادبی دنیا میں بدلتے ہوئے ان حالات نے بچوں کے ادب کو بھی متاثر کیا۔

یہ وہ سیاسی اور سماجی ماحول تھا جس میں حالی، شبلی، نذیر احمد اور آزاد کی پیروی
میں چکبست، اقبال، سرور جہاں آبادی، اسماعیل میرٹھی، تلوک چند محروم، جیسے شعرا نے بچوں کے
اخلاق عادات اور ان کے ذہنی نشو و نما سے متعلق مفید اور ادبی حسن سے آراستہ نظموں اور کہانیوں
کی تخلیق کی اور اپنی تخلیقی کاوشوں کے ذریعے ادب اطفال کی بنیادیں مستحکم کیں۔ ان فنکاروں نے
بچوں کے جذبات اور خیالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسی تخلیقات پیش کیں جن میں نہ صرف بچوں کی
دلچسپی کا سامان بکثرت تھا بلکہ یہ ان کے سن و سال اور مذاق و مزاج سے مطابقت و موافقت
بھی رکھتی تھیں۔

محمد حسین آزاد

ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ہالرائڈ کی فرمائش پر محمد حسین آزاد نے بچوں کے لیے درسی
کتابیں مرتب کیں اور ان میں شامل کرنے کی غرض سے خود بھی بہت سی نظمیں اور نثری مضامین
لکھے۔ آزاد کی مرتب کردہ یہ ریڈریں بچوں کی اخلاقی تربیت اور درس و تدریس کے مطالبات
پورے کرنے کے ساتھ انھیں مادری زبان یعنی اردو کی تعلیم بھی دیتی تھیں۔

---

[1] شفیع الدین نیرؔ، "بچوں کا ادب" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی۔ جنوری ۱۹۶۹ء ص ۲۷۔ مدیر فہمیدہ حسین

بچوں کے لیے درسی کتب ترتیب دیتے وقت آزاد کے ذہن میں یہ احساس موجود تھا کہ بچوں کے لیے بلکی پھلکی شیریں زبان ہی نہیں بلکہ ایسے موضوعات بھی درکار ہیں جو اطراف کے ماحول کی ترجمانی کرتے ہوں اور بچے اپنے ذوق کے جانوروں، پودوں، درختوں اور دوسری اشیاء سے اچھی طرح واقف ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد نے بچوں کے ادب میں خاکوں اور تصاویر کی شمولیت بھی ضروری سمجھی۔ آزاد نے اس ضمن میں لاہور آرٹس کالج کے پرنسپل جان لاک وڈ جو انگریزی کے معروف ادیب رڈیارڈ کپلنگ کے فرزند تھے) سے بھی استفادہ کیا گویا صحیح معنوں میں ہمارے یہاں بچوں کے ادب کی شیرازہ بندی کرنے اور درسی کتب کو جدید تقاضوں کے مطابق منظم کرنے کا ابتدائی معرکہ آزاد ہی نے سر کیا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی[1] اور اسد اریب[2] نے محمد حسین آزاد کو بچوں کی درسی کتب کا بانی قرار دیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر حسن اختر اس رائے سے اختلاف کرتے ہیں اور اپنے تحقیقی مضمون "اردو کی پہلی کتاب" (ماہنامہ "کتاب نما" نئی دہلی، مدیر شاہد علی خاں، بابت فروری سنہ ۱۹۸۴ء، ص ۲۸ تا ۳۴) میں خاصے دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد سے پیشتر کئی درسی کتب دوسرے مصنفین نے مرتب اور شائع کی ہیں۔ مثلاً قاسم بیگ کی "تعلیم الاطفال" (مطبوعہ سنہ ۱۸۵۹ء) اور ڈاکٹر واکر، پنڈت جے شنکر اور پنڈت مکن لال کی مرتبہ "مبتدی کی پہلی کتاب" (مطبوعہ سنہ ۱۸۶۱ء) آزاد کی ریڈروں سے پہلے منظر عام پر آ چکی تھیں۔ جب کہ آغا سلمان باقر کے بقول محمد حسین آزاد کی ریڈریں سنہ ۱۸۶۸ء میں قلمبند کی گئی تھیں[3]

اردو دنیا میں ایک عام غلط فہمی یہ بھی رائج رہی ہے کہ محمد حسین آزاد نے چار ریڈریں (اردو کی پہلی کتاب) تیار کی تھیں۔ مثلاً پروفیسر ممتاز حسین نے اردو کی پہلی کتاب (مطبوعہ ترقی اردو بورڈ کراچی سنہ ۱۹۸۳ء) اور ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے تحقیقی مقالے "محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف" (حصہ اول و دوم) میں یہی خیال ظاہر کیا ہے لیکن ڈاکٹر حسن اختر کے محولہ بالا مضمون (اردو کی پہلی کتاب) میں متعدد شواہد اور دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے صرف "اردو کی پہلی کتاب" اور "اردو کی دوسری کتاب" ہی مرتب کی تھیں۔ اور اس سلسلے کی بقیہ دو ریڈریں

---

[1] ڈاکٹر اسلم فرخی، "اردو کی پہلی کتاب" حصہ اول تا چہارم، ترقی اردو بورڈ کراچی ۱۹۸۳ء پیش لفظ

[2] ڈاکٹر اسد اریب "بچوں کا ادب" کاروان ادب ۱۹۸۴ء ص ۸۴

[3] آغا سلمان باقر "محمد حسین آزاد" سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۱ء ص ۴۱

"اردو کی تیسری کتاب" "اردو کی چوتھی کتاب" پیارے لال آشوب کی مرتب کردہ تھیں۔

قرین قیاس کہا جاسکتا ہے کہ درسی کتب کے علاوہ بھی محمد حسین آزاد نے بچوں کے لیے بہت سی نظمیں بھی تخلیق کیں۔ ان نظموں میں "سلام علیک" "بیسا پاؤ ویسا بوؤ" "بے امتحان سر پر کھڑا" "زمستان" "شب سرما" "شب ابر" وغیرہ مشہور و مقبول رہی ہیں۔ محمد حسین آزاد کی بیشتر نظمیں موضوع زبان اور اسلوب ہر اعتبار سے بچوں کے لیے افادیت اور دلچسپی کی حامل ہیں۔

منظومات کے علاوہ محمد حسین آزاد نے نثر میں بھی بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا ہے جن میں "آئینۂ صحت" "قصص الہند" "نصیحت کا کرن پھول" وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ "دھوبی کپڑا دھو رہا ہے" "صبح کی ہوا خوری" "مرغ" "کوا" "گلہری" "کھانا پک رہا ہے" "لڑکا مدرسہ جاتا ہے" "لڑکے کھیل رہے ہیں" "نیزہ بازی" ایسے نثری مضامین ہیں جو ان کی تیار کردہ درسی کتب اردو کی پہلی اور دوسری کتاب میں شامل ہیں۔ ان تحریروں میں بھی آزاد کی انشاپردازی کا جوہر صاف جھلکتا ہے۔ بلاشبہ وہ ادب اطفال کے بھی نغز نگار ہیں۔

پیارے لال آشوب:-

اردو کی ابتدائی درسی کتب کی ترتیب و تدوین کا فریضہ انجام دینے والوں میں منشی پیارے لال آشوب کا نام قابل ذکر ہے۔ جنھوں نے محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر کرنل ہالرائڈ کی فرمائش پر "اردو کی تیسری کتاب" اور "اردو کی چوتھی کتاب" مرتب کیں۔ پچھلے صفحات پر اس امر کی وضاحت کی جاچکی ہے کہ مدتوں اردو والے ان دونوں کتابوں کا مرتب بھی مولانا محمد حسین آزاد ہی کو سمجھتے رہے۔ حالانکہ انھوں نے اس سلسلے کی ابتدائی دو کتابیں ہی مرتب کی تھیں۔ جدید تحقیقات سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ اردو کی تیسری کتاب اور اردو کی چوتھی کتاب پیارے لال آشوب نے ترتیب دیں۔ بقول ڈاکٹر حسن اختر:

> "... شروع میں مولانا کی طرح پیارے لال آشوب کی کتابوں پر ان کا نام نہ چھپتا تھا بعد میں ان کا نام شائع ہونے لگا"[ل]

ل ڈاکٹر حسن اختر "اردو میں لسانی مباحث کا آغاز" (مشمولہ) قومی زبان (کراچی) مارچ ۱۹۸۵ء ص ۱۸۔ مدیر جمیل الدین عالی وغیرہ۔

یہ درسی کتب بھی سنہ ۱۸۷۰ء کے آس پاس تیار کی گئیں۔ پیارے لال آشوب کی تحریر کا چند سطری نمونہ درج ذیل ہے جو ان کے مضمون "اردو زبان کی حیثیت (مشمولہ) اردو کی تیسری کتاب" سے مقتبس ہے۔

"ہندوؤں کے راج میں ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں اور اس وجہ سے کہ سنسکرت سے نکلیں تھی۔ پراکرت کہلاتی تھیں کیونکہ اس زبان میں اس لفظ کے معنی نکلے ہوئے ہیں۔ وہ زبان جو متھرا اور آگرہ کے نواح میں بولی جاتی تھیں اس کا نام شورسینی بھاکا تھا۔"[1]

اس مضمون کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری کتاب کے مقابلے میں شامل موضوعات زیادہ دقیق اور زبان قدرے مشکل ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد:۔

محمد حسین آزاد کے ہم عصر ڈپٹی نذیر احمد کا نام بچوں کے ایک ممتاز ادیب کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ نذیر احمد نے بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ جن میں "منتخب الحکایات" کا نام سرفہرست ہے۔ علاوہ ازیں ڈپٹی نذیر احمد کی متعدد تصانیف میں "نصاب خسرو" وغیرہ بھی بچوں کے ادب میں قابل ذکر اضافے ہیں۔

مغرب کے ادب اطفال میں جناتی کہانیوں مثلاً ایڈونچر و نڈرلینڈ کا دور دورہ تھا۔ اس دور میں ڈپٹی نذیر احمد بچوں کی تعلیم و تربیت اور ذہنی کشادگی کے لیے "منتخب الحکایات" اور "چند پند" جیسی کتابیں لکھ رہے تھے۔ یہ کتابیں انتہائی دلنشین اور آسان زبان میں لکھی گئی تھیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی مناسب ہوگی کہ "چند پند" نذیر احمد نے اپنے بیٹے بشیر احمد کی رہبری کے لیے لکھی تھی اور بچیوں کی تربیت کے لیے "منتخب الحکایات" تخلیق کی تھی۔ علاوہ ازیں "حکایات لقمان" بھی اردو میں ترجمہ کی۔

ڈپٹی نذیر احمد کی کچھ ایسی نظمیں بھی مل جاتی ہیں جنہیں ادب اطفال میں جگہ دی جا سکتی

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر حسن اختر "اردو میں لسانی مباحث کا آغاز" (مشمولہ) قومی زبان (کراچی) مارچ سنہ ۱۹۸۵ء ص ۱۷۔ مدیر جمیل الدین عالی وغیرہ۔

ہے۔ لیکن ان میں ادبی چاشنی کا فقدان ہے اور بحیثیت مجموعی ان نظموں کو برائے بیت کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے۔

"چند پند" جو ایک نصیحت آموز کتاب ہے سنہ ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی تھی اس کتاب میں مختلف عنوانات مثلاً صفائی، صحت، لالچ، تکبر، ادب اور بات چیت کے تحت مفید اور معلوماتی مضامین آسان زبان میں قلمبند کیے گئے ہیں۔ آخر میں مذہب اور بعض پیغمبروں کے بارے میں کارآمد مذہبی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

"منتخب الحکایات" میں ستر کہانیاں ہیں جن میں کچھ طبع زاد ہیں کچھ مروجہ عام کہانیاں ہیں۔ کچھ حکایتیں دوسری زبان سے ماخوذ ہیں۔ اور ہر حکایت میں کوئی نہ کوئی نصیحت پنہاں ہے جس کی آخر میں وضاحت کر دی گئی ہے۔

"نصاب خسرو" امیر خسرو کی خالق باری کی تبدیل شدہ شکل ہے۔ یہ اٹھائیس صفحات کی ایک نظم ہے جس میں عربی فارسی کے زیادہ استعمال ہونے والے الفاظ یاد کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ نذیر احمد نے متروک الفاظ کو نظم سے خارج کرکے بہت سے اشعار کا اضافہ کر دیا ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی :۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے نظم و نثر کی مختلف اصناف سخن میں بہت سے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے سرسید تحریک کو کامیاب بنانے میں نمایاں رول ادا کیا۔ اس ضمن میں قوم کے نونہالوں کی فلاح و بہبودی ان کا مطمع نظر رہی ہے۔ حالی مصلح قوم تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ محکمہ تعلیم میں گزرا۔ اسں لیے فطری امر تھا کہ وہ بچوں کی نفسیات ان کی ضروریات اور ان کی دلچسپیوں سے بخوبی واقف ہو جاتے۔ حالؔی نے بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں جن میں "خدا کی شان"، "جواں مردی کا کام" "غوث اعظم"، "میں کیا بنوں گا"، "مرچی سپاہی"، "چٹھی رساں"، "پلیشہ"، "دھان لونا" "روٹی کیوں کر میسر آتی ہے"، "گھڑیال اور گھنٹے"، "مرغی اور اس کے بچے"، "شیر کا شکار" "لاڈلا بیٹا" "راست گوئی"، اور "امید" وغیرہ زیادہ مقبول ہوئیں۔

حالی کی ایسی شاعری کے بارے میں صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے۔

"نظم میں ان کی زبان اور زیادہ رواں، سہل، دلکش اور شستہ ہے۔ وہ اردو میں ہندی کے آسان اور خوب صورت لفظ بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر "حبّ وطن" "برکھارت" تو خوبصورت لفظوں کی ایسی لڑیاں ہیں جیسے سچے سڈول موتیوں کی لڑیاں پرو دی گئی ہوں۔ عام بول چال کی زبان کے لفظ، محاورے بھی وہ استعمال کرتے ہیں۔ اس سے ان کی زبان میں زیادہ میٹھا پن اپناپن اور خوبصورتی پیدا ہوجاتی ہے"[1]

حالی نے بچوں میں حبّ الوطنی اور قوم پرستی کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے بہت سی نظمیں، لکھیں جو اس بات کی مظہر ہیں کہ حالی کو اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ انھوں نے اپنی مشہور نظم "حبّ وطن" میں وطن سے سچی اور اصلی محبت کا طریقہ بتایا ہے کہ حقیقی محبّ وطن کو اپنے ہم وطنوں سے محبت کرنا اور ان کی بھلائی کے کام سرانجام دینے چاہئیں۔

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو — اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
جب کبھی زندگی کا لطف اٹھاؤ — دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ

حالی بچوں کو بھی وطن سے محبت کرنے کی تلقین کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ملک ہیں اتفاق سے آباد — شہر ہیں اتفاق سے آباد

حالی کو لڑکیوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت کی بڑی فکر رہتی تھی۔ انھوں نے بچیوں کی تعلیمی ضرورت کے تحت اولین درسی کتاب "مجالس النساء" تیار کی جو دو جلدوں میں ہے۔ اس سے قبل جو درسی کتب لکھی گئیں ان میں بچوں اور بچیوں کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ حالی نے اس سمت سب سے پہلے پیش رفت کی۔

حالی نے اپنی نیچرل شاعری اور حبّ الوطنی سے متعلق نظموں میں بچوں کی دلچسپی کے نئے نئے پہلو نکالے ہیں۔ ان نظموں میں ایسی حکایات بھی شامل ہیں جو کارآمد خیالات کی ترسیل کرتی ہیں اور بچوں میں شجاعت، حبّ الوطنی اور انسان دوستی کے جذبات کو بیدار کرنے میں کامیاب ہیں۔ اس طرح اردو ادب اطفال میں الطاف حسین حالی نے اپنے لیے ایک ممتاز مقام

---

[1] صالحہ عابد حسین۔ "حالی" ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی۔ ۱۹۸۲ء ص ۹۵

بتایا ہے۔

شبلی نعمانی:۔

شبلی نعمانی بحیثیت مورّخ، سوانح نگار، نقاد اور شاعر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ آزاد اور حالی کی طرح اپنے عہد کے ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے۔ محکمہ تعلیم سے وابستہ ہونے کی بنا پر انھیں بچوں کی ضروریات اور نفسیات کا خاصا تجربہ ہے کچھ درسی کتابوں کی ترتیب وتدوین میں معاونت اور اصلاح کرنے کے علاوہ شبلی نے طریقۂ تعلیم اور تدریس کی ترویج وبہبود میں کافی دلچسپی لی۔ شبلی نے کچھ ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں جنھیں ادب اطفال میں جگہ مل سکتی ہے مثلاً "مثنوی صبح امید" "عدل جہانگیر" آخرالذکر میرے خیال میں اپنی نوعیت کی منفرد تاریخی نظم ہے۔ جس میں شبلی نے مغل شہنشاہ جہانگیر کے جاہ وجلال کے ساتھ اس کے عدل وانصاف کی موثر داستان بیان کرکے اس پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی۔

شبلی کی اس نظم کی زبان بچوں کے لیے قدرے مشکل ہے اس لیے خیال ہوتا ہے کہ غالباً یہ نظم تخلیق کرتے وقت شبلی کے مخاطب صرف نونہالان قوم نہیں بلکہ پوری قوم ہے۔

مولوی ذکاء اللہ:۔

مولوی ذکاء اللہ سرسید کے رفقاء کار میں شامل تھے اور علی گڑھ تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ انھوں نے اپنے قلم کو بچوں کی درسی کتب کے لیے وقف کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے سائنس، سماجی علوم، معاشیات جیسے کئی مضامین پر مشتمل کتابیں انگریزی سے بچوں کے لیے اردو میں منتقل کیں، جو بچوں کے ادب میں قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں۔

> "ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، ادب، اخلاق، طبعیات، کیمیا، سیاست وغیرہ مطبوعہ کتابوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو سے کم نہ ہوگی۔ تصانیف کی کیفیت یہ ہے کہ زیادہ تر اسکولوں کے طلبا کے لیے لکھی گئی ہیں۔ لہٰذا رنگینی اور عبارت آرائی اور ایک ادبی شان بالکل نہیں ہے"[1]

---

[1] رام بابو سکسینہ "تاریخ ادب اردو" ترجمہ مرزا محمد عسکری۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور ص ۹۵۸

حالی، آزاد، نذیر احمد، شبلی اور ذکاء اللہ کے ساتھ یہاں سر سید احمد خاں کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ جنھوں نے اپنے رسالے "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے قوم کی اصلاح اور بیداری کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اگرچہ سر سید احمد خاں نے بچوں کے لیے اپنے ہم عصروں کی طرح باقاعدہ نہیں لکھا۔ تاہم "تہذیب الاخلاق" میں ان کے قلم سے نکلے ہوئے ایسے ہلکے پھلکے مضامین بھی ملتے ہیں۔ جو بچوں کے لیے بھی مفید ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ نذیر احمد، حالی، آزاد اور شبلی کے ادبی کارنامے سر سید احمد خاں کی تحریک ہی کا نتیجہ ہیں۔ جس میں "ادب اطفال" بھی شامل ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے آزادئ ہند تک بچوں کے ادب پر جس قدر کام ہوا ہے اس پر کسی نہ کسی زاویے سے سر سید تحریک اثر انداز رہی ہے۔

اسماعیل میرٹھی :۔

اب ہمارا یہ جائزہ اسماعیل میرٹھی کے ذکر تک آ پہنچا ہے۔ جو از ابتدا تا حال اردو "ادب اطفال" میں سب سے بڑا نام ہے۔ حالانکہ موصوف نے اردو نظم و نثر کی مختلف اصناف میں اور بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن ان کی حیات جاوداں کا سبب وہی نظمیں اور نثری تحریریں بنیں جو موصوف نے بچوں کے لیے تخلیق کی تھیں۔ حتیٰ کہ آج بیشتر لوگ انھیں محض بچوں کے ادیب اور شاعر کی حیثیت سے ہی جانتے ہیں اور "ادب اطفال" میں اس بڑھی ہوئی شہرت کے باعث ان کی دیگر علمی اور ادبی تصانیف ثانوی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔

اسماعیل میرٹھی کا نام بچوں کی درسی کتب کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں نہایت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ انھوں نے سر رشتہ تعلیم ممالک متحدہ آگرہ اور اودھ اور صوبہ جات بہار و اڑیسہ کی تجویز پر اردو زبان کا پہلا قاعدہ مرتب کیا جو بہت مقبول ہوا ۱۹۵۰ء تک اس کے ایک سو پچیس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ بعد ازاں اس سلسلے کی پانچ اور کتابیں اردو کی پہلی کتاب تا اردو کی پانچویں کتاب منظر عام پر آئیں

ان میں سے "اردو زبان کا قاعدہ" اور "اردو کی پہلی کتاب" پہلی بار سنہ ۱۸۹۲ء میں تیار ہوئی تھیں ان کی بقیہ چاروں کتابوں کی تصنیف و اشاعت سنہ ۱۸۹۲ء سے سنہ ۱۸۹۴ء کے دوران عمل میں آئی۔ ڈاکٹر سیفی پریمی اپنے تحقیقی مقالے "اسماعیل میرٹھی حیات اور کارنامے" میں رقمطراز ہیں۔

مولانا اسماعیل نے سب سے پہلے ایک قاعدہ "اردو کی پہلی کتاب" مرتب کی تھی یہ رسالہ پیرس کی پہلی بار ۱۸۷۰ء میں چھپی تھی۔ مولانا نے خود ان کو طبع کرایا۔ دوسرے برس گرمیوں کی تعطیل میں مولانا نے میرٹھ جانا ملتوی کر دیا اور آگرہ میں قیام کر کے اس سلسلے کی بقیہ چار کتابیں مرتب کیں سنہ ۱۸۹۴ء میں ٹیکسٹ بک کمیٹی نے یہ سلسلہ منظور کیا اور ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم کے حکم سے یو پی کے تمام ابتدائی مدرسوں میں یہی سلسلہ داخلِ نصاب ہوا۔[1]

اسماعیل میرٹھی کی تیار کردہ درسی کتب کے زیادہ تر مضامین نظمیں، حکایات، کہانیاں، خود ان کی طبع زاد ہیں اور کچھ فارسی اور انگریزی سے ماخوذ ترجمے ہیں۔ ان کی یہ درسی کتب ایک صدی گزرنے کے بعد بھی بچوں کے ادب میں اسی مقبولیت اور اہمیت کی حامل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کتابوں سے کروڑوں بچے فیضیاب ہوئے محمد حسین آزاد اور اسماعیل میرٹھی کے علاوہ درسی کتب تیار کرنے والے بیشتر مرتبین نے کلاسیکل سرمائے اور معاصر شعرا اور ادباء کی منتخب تخلیقات نظم و نثر مرتب کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن اسماعیل میرٹھی کا کام عام مرتبین سے منفرد، مختلف اور زیادہ مفید ہے۔ اس ضمن میں کسریٰ منہاس رقمطراز ہیں۔

> "برصغیر میں اردو کی بہترین درسی کتابیں وہ ہیں جو اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے مرتب کیں۔ اسماعیل میرٹھی نے اتنا ہی نہیں کیا کہ موزوں انتخابات بچوں کی عمر کے لحاظ سے مرتب کر دیے بلکہ انھوں نے محسوس کیا کہ اردو زبان میں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ مختلف عمر کے بچوں کے لیے موزوں نظمیں موجود نہیں ہیں اس کمی کو خود انھوں نے پورا کیا"۔[2]

ان کتابوں کے لیے اسماعیل میرٹھی نے جو حکایات خود لکھی ہیں ان میں سے بیشتر کے ماخذ فارسی کی "بوستان حکمت" اور "انوار سہیلی" ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کی یہ حکایات اخلاقیات و مذہب کی تعلیم اور پند و نصائح پر مبنی ہیں۔ ان میں بہادروں کے کارنامے بھی شامل ہیں۔

۱۔ سیفی پریمی "اسماعیل میرٹھی حیات اور کارنامے" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ص ۲۴۳

۲۔ کسریٰ منہاس "بچوں کا ادب اور اسماعیل میرٹھی" سالنامہ نیرنگ خیال (راولپنڈی) ۱۹۷۶ء مدیر اعلیٰ حکیم یوسف حسن۔ ص ۲۷۲

"باجے کا بھوت" "ایک شیر اور چیتا" "خود رائی کا نتیجہ" "محمود غزنوی اور بڑھیا" "محنت سونے سے بہتر ہے" "سرکشی کا ثمرہ" "تحمل اور ایفائے وعدہ" ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔ ان کی درسی کتابوں میں معلوماتی مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔ جو بچوں کو مختلف موضوعات پر سیر حاصل معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ایسے مضامین میں "ہوا اور پانی" "کوئلے کی کان" "نئی دنیا کا پانا" "ریلوے انجن کا موجد جارج" "چھاپہ کی ایجاد" "زمین اور اس کی اصلیت" "زراعت کے مویشی" "قوس قزح" "ہاتھ" اور "ارسطو" قابل ذکر ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے تاریخی مضامین بھی لکھے جو تاریخی شخصیتوں سے روشناس کراتے ہیں۔ اور بچوں میں حبّ الوطنی اور قومی یک جہتی کا جذبہ ابھار کر ان کی شخصیت کو اعلیٰ کردار کا حامل بناتے ہیں۔ اس نوع کے تاریخی مضامین میں "جلال الدین محمد اکبر" "نور جہاں بیگم" "راجہ بکرماجیت" "شیر شاہ سوری" "محمود غزنوی اور بڑھیا" "ارسطو" "ابوالفضل فیضی" خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔

اسماعیل میرٹھی کے ان مضامین کے مطالعہ سے بچوں کے ذہن میں وطنیت کا محدود تصوّر مرتسم نہیں ہوتا نہ ہی ان میں شخصیت پرستی کا مادہ پرورش پاتا ہے، جس کی حدیں عصبیت سے مل جائیں۔ یہ تخلیقات رنگ، نسل، اور ذات پات کے امتیازات کو بچے میں پروان نہیں چڑھنے دیتیں اور بچوں میں یہ صلاحیت پیدا کرتی ہیں کہ وہ برے بھلے کی پہچان، سچائی اور خلوص کے ساتھ کرسکیں۔ کہانیوں اور مضامین کے ساتھ ساتھ اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے مختلف موضوعات پر بہت سی نظمیں بھی لکھیں۔ ان نظموں میں اخلاقیات پر زور دیا گیا ہے لیکن اخلاقی اقدار اور تعلیمی ضروریات پر اس توجہ کے باوصف اسماعیل میرٹھی کی نظمیں اور مضامین کہیں بھی غیر دلچسپ نہیں ہونے پاتے۔ ان کا طرز نگارش بہت آسان، سادہ اور دلچسپ ہے۔ اکثر بہت سی نظمیں منظوم قصوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ "بارش کا پہلا قطرہ" "جگنو اور بچہ" "ایک گدھا شیر بنا" "ناقدردانی" "ملمع کی انگوٹھی" "ایک لڑکا اور بیر" "دال کی فریاد" "ایک پودا اور گھاس" "پن چکّی" ان کی بہت مشہور و مقبول نظمیں ہیں۔

پابند نظموں کے علاوہ اسماعیل میرٹھی نے اردو کی پہلی نظم معریٰ "تاروں بھری رات" لکھی۔ ان کی دوسری نظم معریٰ "چڑیا کے بچے" ہے۔ ان دونوں نظموں پر اظہار خیال

کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا ہے۔

"انھوں نے (اسماعیل میرٹھی) بے قافیہ نظمیں بھی لکھی ہیں (چڑیا کے بچے) اور ایسی نظمیں بھی جن میں مروجہ بحروں کے اوزان کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے مصرعہ ترتیب دیے گئے ہیں (تاروں بھری رات) بعد میں حلقہ ارباب ذوق کے شاعروں اور ترقی پسند شاعروں نے آزاد نظم اور نظم معریٰ کے جو تجربے کیے ان سے بہت پہلے عبد الحلیم شرر، نظم طباطبائی، اور نادر کاکوری اور ان سے بھی پہلے اسماعیل میرٹھی ان راہوں سے کانٹے نکال چکے تھے"۔[1]

محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے "انجمن پنجاب" کے وسیلے سے نیچرل شاعری کی جو بنیاد ڈالی تھی، اسماعیل میرٹھی نے اس تحریک کا دائرہ "ادب اطفال" تک وسیع کر دیا۔ ان کی تمام نظمیں نیچر (فطرت) کی واقفیت اور اصلیت پر مبنی ہیں۔ اسماعیل میرٹھی نے ایسی جزئیات کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا جو عام زندگی اور معاشرے میں بظاہر معمولی لیکن حقیقتاً اہم ہیں۔ "ہوا چلی"، "پن چکی"، "ساون کی گھڑی"، "اسلم کی بلی"، "ہمارا کتا"، "ایک وقت میں ایک کام"، "آم کی تعریف"، "بارش کا پہلا قطرہ" اس خیال کی تائید کرتی ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کو زبان اور بیان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ وہ الفاظ کے ذریعے تصویر کشی میں ماہر تھے۔ ان کی نظمیں بچوں کے تخیل کی پرواز بلند سے بلند تر بناتی ہیں۔ ان کی نظموں کے بہت سے اشعار زبان زد ہو گئے تھے مثلاً۔

بد کی صحبت میں مت بیٹھو، بد کا ہے انجام بُرا
بد نہ بنے تو بد کہلائے، بد اچھا بدنام بُرا

اسماعیل میرٹھی نے معمولی معمولی چیزوں پر بڑی دلچسپ اور نصیحت آموز نظمیں لکھی ہیں۔

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں
ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں

---

[1] پروفیسر گوپی چند نارنگ، پیش لفظ، "اسماعیل میرٹھی حیات اور کارنامے" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۷۹ء ص ۶-۷

راستی سیدھی سڑک ہے اس میں کچھ کھٹکا نہیں
کوئی رہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں
بٹھاتے نہیں بے ادب کو قریب
یہ سچ بات ہے بے ادب بے نصیب

اسماعیل میرٹھی نے اس سیریز درسی کتب میں اپنی منظومات، حکایات، مضامین کے علاوہ قدیم اور ہم عصر شعرا اور ادبا کی بچوں کے لیے قابل فہم اور آسان نظمیں بھی شامل کی ہیں۔ ایسے مضامین اور نظموں میں جبدالحلیم شرر کی نظم "علم بھلا زندگی ہے" "آتش کی آسان غزلیں"، "مثنوی سحرالبیان" کے آسان اقتباسات، حالی، نظیر اکبرآبادی، رنگین دہلوی وغیرہ کی نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔

اسماعیل میرٹھی کے ادبی کارناموں کا سب سے اہم جزو "ادب اطفال" ہے۔ بلاشبہ اسماعیل میرٹھی اردو میں بچوں کے سب سے بڑے شاعر اور ادیب ہیں۔ وہ اطفال کے تمام مطالبات سے انتہائی ذمہ داری اور خلوص کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے۔ مجموعی حیثیت سے اُردو کے "ادب اطفال" میں سب سے بلند قامت فنکار ہیں۔

پنڈت برج نرائن چکبست:۔

پنڈت برج نرائن چکبست بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ چکبست نے بچوں کے لیے نظمیں لکھ کر "ادب اطفال" میں جگہ بنالی ہے، چکبست کے مجموعہ کلام "صبح وطن" میں بچوں کے کام کی مندرجہ ذیل نظمیں ملتی ہیں۔

"ہمارا وطن دل سے پیارا وطن"، "وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک"، "گائے"، "خاک ہند" وغیرہ۔ چکبست کی نظم "لڑکیوں سے خطاب" بچوں میں بہت مقبول ہوئی۔ ان کی نظموں میں قوم پرستی اور حب الوطنی کا جذبہ ہے۔ چکبست نے اپنی نظموں کے ذریعے بچوں کو اپنے ہم وطنوں سے محبت کرنے کا درس دیا ہے۔ "خاک ہند" بھی چکبست کی شاہکار نظموں میں سے ایک ہے جس میں وطن کی قدیم تاریخ، وطن کے مناظر، وطن کے مشاہیر کا ذکر بڑی خوش اسلوبی اور فنی چابکدستی سے کیا ہے۔ یہ نظم سوز و گداز کی حامل ہے۔ چکبست نے خاک ہند میں مذہبی بزرگوں اور ہندوستان کے عظیم سنہرے ماضی کی نہایت دلکش اور پرتاثیر عکاسی کی ہے۔

اسی طرح چکبست کی نظم "وطن کو ہم، وطن[۸۵] ہم کو مبارک" بچوں کی مقبول وطنی نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس نظم کی زبان نہایت پاکیزہ، سلیس اور آسان ہے اور اس میں مناظر قدرت کی صاف ستھری، دھلی دھلائی اور جیتی جاگتی تصاویر پیش کی گئی ہیں۔ ان کی نظم "ہمارا وطن" اپنے قومی موضوع، سادہ اور سلیس، دلکش اسلوب کے اعتبار سے بچوں کی عمدہ نظم ہے۔ ان نظموں کے علاوہ چکبست نے بچوں کے لیے دیگر موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ "گائے" کو اپنی افادیت اور مذہبی عظمت کی بنا پر مقدس تصور کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی بچوں کے دل و دماغ پر اس کی عظمت کا سکہ بٹھایا گیا ہے۔ چکبست کی نظم "گائے" نہ صرف ان کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے بلکہ اردو "ادب اطفال" کے ہر اچھے انتخاب میں شمولیت کی مستحق ہے۔

جس طرح حالی نے بطور خاص بچیوں کے لیے "مجالس النساء" تیار کی اسی طرح چکبست کو بھی یہ شرف حاصل ہے کہ ان کے مجموعۂ کلام میں "صبح وطن" میں خاص طور پر لڑکیوں کے لیے متعدد نظمیں ملتی ہیں۔ جن میں بطور خاص "پھول مالا" قابل ذکر ہے۔

اکبر الہ آبادی:

ہر چند کہ شعوری طور پر اکبر الہ آبادی نے بچوں کے لیے قلم نہیں اٹھایا لیکن ان کی نظموں میں سے چند اپنے مزاج نوعیت اور ظریفانہ انداز کی وجہ سے بچوں میں مقبول ہوئیں۔ ان میں "دریا کی روانی" اور "دلی دربار" اس لائق ہیں کہ ان کا "ادب اطفال" کے ضمن میں تذکرہ کیا جائے۔

نظم "دریا کی روانی" انگریزی شاعرساودی (SOUTHE) کی نظم کا آزاد ترجمہ ہے۔ جس میں ایک تیز رفتار دریا کے پانی کی رفتار کی کیفیت فنکارانہ انداز میں پیش کی گئی ہے دریا کے بہاؤ اور پیچ و تاب کو خوبصورتی کے ساتھ ایسے الفاظ میں نظم کیا گیا ہے کہ خود اشعار میں دریا کی سی روانی پیدا ہو گئی ہے۔ نیز صوتی اعتبار سے بھی الفاظ موضوع سے ہم آہنگ محسوس ہوتے ہیں۔ جس بے تکلفی سے اکبر عجیب و غریب قوافی کا جوڑ بٹھاتے ہیں وہ بھی لائق تحسین ہے۔

اسی طرح "دلی کا دربار" بھی ایسی نظم ہے۔ جو موضوع، اسلوب اور زبان کے اعتبار سے بچوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتی ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ

محض ان دو نظموں کی "کلیات اکبر" میں موجودگی کی بنا پر انھیں بچوں کا اہم شاعر نہیں سمجھا جاتا۔

سر محمد اقبال :-

بیسویں صدی کو بچوں کے ادب کا سنہرا دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ جہاں انیسویں صدی کے اواخر میں بچوں کے لیے آزاد اور اسماعیل میرٹھی جیسے قد آور فن کاروں نے درسی کتب کا بیڑا اٹھایا تھا وہاں بیسویں صدی کے اہم تخلیق کاروں نے غیر درسی ادب اطفال کے سرمائے میں بیش بہا اضافے کیے۔ سر محمد اقبال جیسے شاعر، مفکر اور دانشور نے بھی بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھی ہیں نیز اپنی نظموں کے وسیلے سے ہندوستانی بچوں کو ترقی یافتہ نظریات سے روشناس کرایا۔ اقبال فلسفی شاعر، مفکر اور سچے محب قوم و وطن تھے۔ ادب اطفال کے لیے نظمیں تخلیق کرنے کے علاوہ انھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے عنوان سے اپنے بالکل ابتدائی دور میں ہی ایک مضمون قلمبند کیا تھا جو ماہنامہ "مخزن" (لاہور) کے جنوری سنہ ۱۹۰۲ء کے شمارے میں شائع کیا تھا۔ اور بعد ازاں عبدالغفار شکیل کی مرتبہ کتاب "اقبال کے نثری افکار" میں شامل اشاعت کیا گیا۔ یہ مضمون اس بات کا شاہد ہے کہ اقبال کو ابتدا سے ہی بچوں کی تعلیم و تربیت کا خیال تھا نیز بچوں کی نفسیات پر گہری نظر تھی۔

اقبال نے بچوں کے لیے طبع زاد، اصلاحی، اخلاقی اور وطنی نظمیں لکھیں۔ اور انگریزی سے کئی مفید مطلب نظمیں اخذ و ترجمے کے وسیلے سے اردو میں منتقل کیں۔ اقبال کی ایسی شاعری کے بارے میں عبدالقوی دسنوی رقمطراز ہیں۔

> "وہ بچے کے ذہن کی تعمیر اس طرح کرنا چاہتے تھے۔ جس سے وہ ایسا انسان بن سکے جو خدا آگاہ ہو۔ صداقت شعار ہو، حریت پسند ہو، ہمدرد مجسم ہو، غرور و تکبر کی لعنت سے پاک ہو، محسن شناس ہو، خدمت گزار ہو، غریبوں کا مددگار ہو۔ کمزوروں کا حامی ہو، وطن پرست ہو، انسان دوست ہو، برائیوں سے پاک ہو، اور پیکر عمل ہو۔"[۱]

اقبال کی ان تخلیقات کو "ادب اطفال" میں شاہکار نظموں کا درجہ حاصل ہے۔ یہ نظمیں زبان اسلوب اور موضوعات کے اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ اقبال کی ایسی نظمیں

---

[۱] عبدالقوی دسنوی "بچوں کے اقبال" نسیم بکڈپو، لکھنؤ ۱۹۷۶ء ص ۳۹/۳۸

مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت "بانگ درا" میں شامل ہیں۔

(۱) ایک مکڑا اور مکھی (۲) ایک پہاڑ اور گلہری (۳) ایک گائے اور بکری

(۴) بچے کی دعا (۵) ہمدردی (۶) ایک پرندہ اور جگنو

(۷) پرندے کی فریاد (۸) ہندوستانی بچوں کا گیت (میرا وطن)

مندرجہ بالا نظموں میں پہلی چھ نظمیں انگریزی سے ماخوذ ہیں اور مؤخر الذکر نظمیں اقبال کی طبع زاد تخلیقات ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ اقبال کی فلسفیانہ نظمیں "عہد طفلی" "بچہ اور شاعر" "بچہ اور شمع" "طفل شیر خوار" "ماں کا خواب" وغیرہ اس بات کی شاہد ہیں کہ ابتدا ہی سے اقبال بچوں کے بارے میں غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ تمام نظمیں سنہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء کے دوران لکھی گئی ہیں اور بانگ درا میں شامل ہیں۔

"ایک مکڑا اور مکھی" "ایک پہاڑ اور گلہری" "ایک گائے اور بکری" "بچے کی دعا" "ہمدردی" "ایک پرندہ اور جگنو" ایسی نظمیں ہیں جو ماخذ ہیں۔ ابتدا میں خیال کیا جاتا رہا ہے کہ یہ نظمیں محض ترجمہ ہیں بعد کی تحقیقات سے واضح ہوا کہ ان نظموں کے خیالات انگریزی سے اخذ کر کے اقبال نے ان کی تخلیق نو کی ہے اس کے نتیجے میں ان نظموں کے کردار اور موضوعات میں اصل ماخذ سے قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔

"اقبال کی نظم "ایک مکڑا اور مکھی" میری ہوٹ (MERRY HOWITT) کی نظم اسپائڈر اینڈ دی فلائی[۱] کے مرکزی خیال پر مبنی ہے۔ جس میں یہ نکتہ بچوں کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دشمن کی خوشامدانہ بات میں آ کر اپنی حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے نظم کی زبان نہایت رواں اور عام فہم ہے۔

"ایک پہاڑ اور گلہری" کا مرکزی خیال ایمرسن (R.W EMERSON) کی نظم "دی ماؤنٹین اینڈ دی اسکوارل" سے مستعار[۲] ہے یہ نظم اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ دنیا میں کوئی شے حقیر اور ناکارہ نہیں اور خدا نے ہر چیز کو کسی خاص مصلحت

۱۔ عبد القوی دسنوی "بچوں کے اقبال" نسیم بکڈپو لکھنؤ ۱۹۷۶ء ص ۲۶

۲۔ ڈاکٹر حنیف نقوی۔ "بچوں کے اقبال" ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ۔ نومبر، دسمبر ۱۹۷۶ء ص ۴۰۔ مدیر خورشید احمد صدیقی۔

اور ضرورت کے تحت پیدا کیا۔

اقبال کی نظم "ایک گائے اور بکری" کا مرکزی خیال جین ٹیلر کی نظم "دی کاؤ اینڈ دی ایس" (THE COW AND THE ASS) سے ماخوذ ہے[1]۔ یہاں گدھے (ASS) کے کردار کو اقبال نے بکری کی حیثیت میں بدل دیا ہے۔ "ایک گائے اور بکری" احسان شناسی کی تلقین کرتی ہے۔

"بچے کی دعا" اردو میں بچوں کے لیے لکھی گئی مقبول ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اس کی مقبولیت کا راز اس کے تاثر میں پوشیدہ ہے۔ جو وقت اور عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ ہلکا ہونے کے بجائے اور گہرا ہوجاتا ہے۔ اگرچہ انتخاب الفاظ، انداز بیان اور تشبیہات وتمثیلات کے اعتبار سے یہ نظم دوسری نظموں کے مقابلے کسی قدر مشکل ہے لیکن الفاظ کا حسن ترتیب، بیان کی شگفتگی اور مصرعوں کی ہم آہنگی اسں قدر موثر اور دلنشین ہے کہ بعض نامانوس عناصر کی موجودگی کے باوجود ہر مصرع ذہن پر ایک نقش مرتسم کرتا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے بچپن میں یہ نظم پڑھی ہے یا بچوں کو ذوق وشوق کے ساتھ اسں کا ورد کرتے ہوئے سنا ہے[2] ان کو اس کیفیت کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

اقبال کی نظم "ہمدردی" کا مرکزی خیال ولیم کوپر (WILLIM COPPER) کی نظم سے لیا گیا ہے[3]۔ اس نظم کے علامتی کردار بلبل اور جگنو ہیں۔ غم خواری اور دستگیری کی یہ منظوم کہانی بچوں میں باہم ہمدردی کے جذبات بیدار کرتی ہے۔

"ایک پرندہ اور جگنو" بھی ولیم کوپر (WILLIAM COPPER) کی نظم (اے نائٹ اینگل اینڈ بلو وارم) کے مرکزی خیال پر مبنی ہے[4]۔ اقبال کی اسں نظم کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر کا کہنا ہے۔

"اس نظم میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ دنیا میں سوز وساز دونوں کے دم قدم سے رونق ہے۔ جب انسان کو سکھ کے ساتھ دکھ پہنچے وہ زندگی

---

[1] ڈاکٹر اکبر حسین قریشی۔ "سہ ماہی اردو" کراچی۔ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۲۷

[2] ڈاکٹر حنیف نقوی۔ "بچوں کے اقبال" ماہنامہ "نیا دور" نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء ص ۱۴۲ مدیرہ خورشید احمد صدیقی

[3] مطالب بانگ درا از غلام رسول مہر ص ۹۱

کا راز بخوبی نہیں سمجھ سکتا۔ خوشی وغم کے پہلو بہ پہلو وارد ہونے ہی سے انسان ترقی کے منزلیں طے کرکے کامیاب زندگی بسر کرتا ہے۔[1]

نظم "پرندے کی فریاد" میں ایک قیدی پرندے کی دل دوز گریہ وزاری کا بیان ہے جو اپنے معنی اپنے آشیانے اور اپنی آزادی کے ایام یاد کرکے احساس اسیری پر آنسو بہاتا ہے۔

"ہندوستانی بچوں کا گیت" بھی بچوں میں بہت مقبول اور مشہور ہوا ہے۔ اس نظم کے ذریعے اقبال نے قوم کے نونہالوں کو ان کے تاریخی، ثقافتی، علمی اور روحانی ورثے کی عظمت اور اہمیت سے روشناس کیا ہے۔ "ہندوستانی بچوں کا گیت" بچوں میں وطن پرستی کے جذبے اور اسلاف شناسی کے رجحان کو فروغ دینے کی کامیاب کوشش ہے۔

متذکرہ نظموں کے علاوہ اقبال کی عام نظموں میں بھی کچھ ایسی ہیں جنھیں جزوی طور پر "ادب اطفال" میں شمار کر سکتے ہیں۔ ایسی نظموں میں "ترانۂ ہندی" سرفہرست ہے۔ یہ ترانہ غالباً اقبال کی مشہور ترین نظم ہے جو بڑوں اور بچوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ شاید ہندوستان کی تمام زبانوں میں ایسی بے پناہ مقبولیت، رابندر ناتھ ٹیگور کی "جن من گن" (قومی ترانہ) کو چھوڑ کر کسی دوسری نظم کے حصے میں نہیں آئی۔

"عہد طفلی"، "طفل شیر خوار"، "بچہ اور شمع"، "ایک آرزو"، "جگنو"، "نیا شوالہ"، "چاند اور تارے" بھی ایسی نظمیں ہیں۔ جو اپنے اسالیب، موضوعات کی بنا پر بچوں کے ادب میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے سچ کہا ہے۔

> "اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے اقبال کو بڑی دلچسپی تھی۔ بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے انھوں نے ایسے مضامین بھی لکھے ہیں جنھیں پڑھ کر قوم بچوں کی بہبودی کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے اور ایسی دلکش نظمیں بھی کہیں جنھیں بچے شوق سے پڑھ کر اور ان میں بیان کی ہوئی تعلیمات پر عمل کر کے اپنے ملک ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔"[2]

---

[1] مطالب بانگ درا۔ از غلام رسول مہر

[2] جگن ناتھ آزاد۔ "اقبال کی کہانی" ترقی اردو بورڈ دہلی ۱۹۷۹ء ص ۱۰

اب تک بچوں کی جن نظموں کا اقبال کے ضمن میں ذکر ہوا وہ سب "کلیات اقبال" میں موجود ہیں۔ لیکن بچوں کے لیے اقبال کی کئی ایسی نظمیں بھی دستیاب ہیں جنھیں ان کے کسی مجموعہ کلام یا کلیات میں جگہ نہیں مل سکی۔ دراصل اقبال نے اپنے عہد کی نصابی کتابوں کے لیے بچوں کی تعلیمی ضروریات اور اخلاقی تقاضوں کے پیش نظر چند نظمیں لکھی تھیں۔ حال ہی میں فقیر سید وحید الدین نے انھیں اپنی کتاب "روزگار فقیر" (جلد دوم) میں شائع کر دیا ہے۔

ان نظموں میں "محنت"، "شہد کی مکھی"، "چاند اور شاعر"، "گھوڑوں کی مجلس"، "جہاں تک ہو سکے نیکی کرو" اور "بچوں کے لیے مفید نصیحتیں" قابلِ ذکر ہیں۔ نظم "محنت" میں بچوں کو جفاکشی کی تعلیم دی گئی ہے۔ "شہد کی مکھی" میں انھیں تجسس کا درس دیا گیا ہے۔ "جہاں تک ہو سکے نیکی کرو" کے وسیلے سے اقبال نے بچوں کو دوسروں کی مدد کرنے کی تلقین کی ہے اور اس نظم کا انداز کم و بیش اسی قسم کا ہے جیسا کہ اسماعیل میرٹھی کی مشہور نظم "بارش کا پہلا قطرہ" میں اختیار کیا گیا ہے۔ نیز "بچوں کے لیے چند نصیحتیں" میں انھیں محنت، ورزش، شیریں بیانی، اور نیکی کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی طرح ان کی نظم "چاند اور شاعر" نونہالوں کو فلک کے آفتاب سے روشنی حاصل کرنے کی ہدایت کرتی ہے۔

مندرجہ بالا نظموں کی طرح ممکن ہے کہ آگے چل کر بچوں کے لیے لکھی گئی اقبال کی کچھ اور نظمیں بھی منظر عام پر آئیں۔

درگا سہائے سرور :۔

درگا سہائے سرور جہاں آبادی کی بہت سی نظمیں اپنے اسلوب، زبان کی سادگی اور موضوع کے اعتبار سے بچوں کے ادب کا جزو ہیں۔ سرور جہاں آبادی نے بچوں کے لیے مناظر قدرت اور مذہبی موضوعات پر متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ انھوں نے زندگی کے عام واقعات کو بھی اپنی نظموں کا موضوع قرار دیا ہے۔

سرور کی ایسی نظموں میں "گنگا جی"، "گلزار وطن"، "حب وطن"، "بچپن" وغیرہ مشہور اور مقبول ہوئیں۔ "بچپن" میں عہد طفلی کی دلچسپیوں، مشغلوں اور کھیلوں کا پر لطف بیان ہے۔ "گنگا جی" ایک مذہبی نظم ہے جس میں ہندوستان کی مشہور ندی گنگا کی عظمت کا احساس دلایا گیا ہے۔ درگا سہائے سرور نے اپنی نظموں میں ہندوستانیت اور ہندوستانی عناصر سے بچوں کو متعارف

کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے "ناکام پرندہ" اپنے ملک سے محبت کا جذبہ مستحکم ہے۔ اس اعتبار سے سرور جہان آبادی کی نظموں میں "گلزار وطن" اور "حب الوطن" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

منشی پریم چند :۔

اردو کے عظیم افسانہ نگار منشی پریم چند نے بھی بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں موصوف "پیام تعلیم" کے ایڈیٹر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"پیام تعلیم کے تین پرچے ملے۔ شکریہ۔ جو لطیفے تو ان کی نظمیں اور مضامین اور تصاویر سبھی بچوں کے لیے خاص طور پر دلچسپ معلوم ہوتی ہیں۔ چھوٹو مرغ خوب ہیں۔ "ایجادوں کی تاریخ" چند لفظوں میں بڑی خوبصورتی سے بیان کر دی گئی ہے۔ لطیفے جن لڑکوں نے بھیجے ہیں ان کے حسن مذاق کی داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ اس کی سیاحتی دلچسپی اور بڑھائی جاسکے اور کچھ سوانح عمریاں بھی دی جاسکیں تو پرچہ زیادہ مفید ہو جائے"[1]

مکتوب پریم چند کے مندرجہ بالا اقتباس سے بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انھیں ذاتی طور پر بچوں اور بچوں کے ادب سے بے حد شغف تھا۔ نیز وہ ادب اطفال کی مختلف اصناف اور بچوں کے لیے دلچسپ موضوعات کے سلسلے میں غور و فکر کرتے تھے۔ پریم چند کا بڑا وصف یہ تھا کہ وہ دیہات کے سادہ لوح بچوں کے جذبات، احساسات کے نبض شناس تھے اور ان کے ماحول کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتے تھے۔ "نادان دوست" میں پریم چند نے دو معصوم بچوں کی بے لوث محبت کی عکاسی کی ہے۔

منشی پریم چند انسپکٹر آف اسکول تھے اور بچوں کی تعلیم سے ان کا براہ راست تعلق تھا۔ ان کے یہاں ایسی کہانیاں بھی ملتی ہیں جن میں نوعمر طالب علموں کے مسائل کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اور انھیں راہ راست پر چلنے کی تلقین کی ہے۔ پریم چند کی ایسی کہانیوں میں "سچائی کا انعام"

---

[1] منشی پریم چند "پریم چند کا خط" ۔ ایڈیٹر پیام تعلیم کے نام ۔ پیام تعلیم نئی دہلی ۔ اگست ۔ سنہ ۱۹۳۶ء ۔ ص ۳۴۔

خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کہانی میں دلچسپ واقعات کے ساتھ نہایت دلنشیں پیرایے میں یہ سبق دیا گیا ہے۔ کہ خواہ ابتدا میں سچ بولنے والے کو کتنی ہی پریشانی سے کیوں گزرنا پڑے انجام کار وہ سربلند ہوتا ہے۔

"عبرت" بھی بچوں کی پسند پر پورا اترنے والا ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ جس میں معلّم کے پاکیزہ پیشے کی عظمت اور رفعت کا احساس دلانے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔

ہندوستان کے دیہات، مزدور اور کسانوں کے مسائل کی ترجمانی کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے کئی تاریخی افسانے بھی تخلیق کیے جن میں قدیم ہندوستان کے عظیم کرداروں کے نقوش اجاگر کیے گئے ہیں جو بچوں کے کردار میں حب الوطنی، مساوات، انسان دوستی، قومی یک جہتی، اور صدق شعاری کے جذبات کو فروغ دیتے ہیں۔

"ایفائے وعدہ" "جیل" "شکار" "آخری حیلہ" "دوستی" "طلوعِ محبت" "کشمیری سیب" "نئی دنیا" "نمک کا داروغہ" "اناتھ لڑکی" "جگنو کی چمک" "معصوم بچہ" "نوک جھونک" "ہولی کی چھٹی" "گلی ڈنڈا" "سوتیلی ماں" وغیرہ کہانیاں ادبِ اطفال میں پریم چند کی قیمتی سوغات کی حیثیت رکھتی ہیں۔

دیہاتی ماحول کی منظر کشی، کرداروں کی جذبات نگاری، معاشرے کی پیچیدگیوں پر گہری نظر اور اخلاقی اقدار کی موثر تلقین نہایت عام فہم لیکن دلنشیں ادبی زبان میں پیش کرنے کا جیسا ہنر پریم چند کو آتا تھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

تلوک چند محروم:۔

بچوں کے شاعر کی حیثیت سے تلوک چند محروم کا نام امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ محروم نے بچوں کے لیے بے شمار نظمیں لکھیں۔ "خدا کے جلوے" "بچہ" "اچھا آدمی" "ہلالِ عید" "ترانۂ بیداری" وغیرہ ان کی مقبولِ عام نظمیں ہیں۔

تلوک چند محروم کی زندگی درس و تدریس میں بسر ہوئی۔ اس لیے بچوں کے مسائل ضروریات اور نفسیات پر ان کی نگاہ گہری اور مشاہدہ وسیع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں بھرپور غنائیت اور دلکشی کے ساتھ اعلیٰ اقدار پر عمل پیرا ہونے کا سبق دل نشیں، موثر اور سادہ زبان میں دیا گیا ہے۔

مولوی چاند محروم کی ایسی نظموں کے دو مجموعے "بہار طفلی" اور "بچوں کی دنیا" کے نام سے منظر عام پر آچکے ہیں۔

حامد اللہ افسر:-

اسماعیل میرٹھی کی طرح حامد اللہ افسر میرٹھی کا نام "ادب اطفال" کے تخلیق کاروں کی صف میں آتا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی مانند، افسر میرٹھی بھی بچوں کے استاد تھے۔ اس لیے وہ ان کی نفسیات، عادات اور کردار سے بخوبی واقف تھے انھوں نے بچوں کے لیے صحت مند ادب کی کمی محسوس کرتے ہوئے ادب اطفال کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اخلاقی اور اصلاحی کہانیاں نیز حب الوطنی اور قومی اتحاد کے جذبات کو بیدار کرنے والی پرتاثیر نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں میں مشکل ہی سے کوئی لفظ ملے گا جو بچوں کو معلوم نہ ہو یا جسے سمجھنے میں انھیں دقت ہو۔ ان کی ہر نظم سادگی، سلاست اور روانی کی حامل ہے۔ "بہار کے دن" "میرا دیس" "خضر کا کام کروں راہ نما بن جاؤں" ان کی پیاری نظمیں ہیں۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں۔

> "بچوں کیلئے جو کہانیاں یا نظمیں انھوں نے لکھی ہیں اس میں انھیں کامیابی اسی لیے ہوئی کہ خود ان کی طبیعت میں ایک طرح کی معصومیت تھی جو انھیں بچوں کے احساسات کے قریب کر دیتی تھی۔ وہ ان چھوٹی موٹی چیزوں پر بھی لکھنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ جو بچوں کے لیے اہمیت رکھتی ہیں" [1]

نورالحسن ہاشمی کا یہ بیان صد فی صد درست ہے اور اس کا جیتا جاگتا ثبوت حامد اللہ افسر کی نظمیں "اسکول کی گھڑی" "میری تکلی" "کلیوں کی چوری" "مچھر اور مچھرانیاں" "صبح کی دعا" "چاند کا بچہ" "علم کی مایا" "چاند میں پریاں آتی ہیں" "بیٹے کا جھوٹ" "جیتا جاگتا ہیرا" "ننھا چمن" وغیرہ ہیں۔ حامد اللہ افسر کی تخلیق کردہ بچوں کی نظموں کے دو مجموعے "بچوں کا افسر" اور "گہوارے کا گیت" کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی "بچوں کے افسر" ماہنامہ "نیا دور" (لکھنؤ) نومبر، دسمبر ۱۹۷۰ء۔ ص ۳۵۔ مدیر خورشید احمد صدیقی۔

"بچوں کا افسر" نظموں کا مجموعہ ہے۔ "گہوارے کا گیت" میں اطفال سے متعلق گیت اور لوریاں یکجا کردی گئی ہیں۔ افسر میرٹھی نے درسی کتب کی ترتیب و تدوین میں بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کی مرتب کردہ درسی کتب "قومی ادب" جو دو حصوں میں ہے۔ آج بھی اپنی معنویت اور افادیت کے پیش نظر اترپردیش کے ثانوی درجات میں تقریباً تیس برس سے پڑھائی جاتی ہے۔ "قومی ادب" میں حامد اللہ افسر نے دوسرے اہل قلم کی تخلیقات کو شامل کرنے کے ساتھ خود بھی قومی موضوعات پر "ہمارا پہلا جشن آزادی" (مضمون) جیسی تخلیقات خود لکھ کر شامل اشاعت کیں۔

نظموں کے علاوہ حامد اللہ افسر نے بہت سی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ان کہانیوں کے دو مجموعے "چار چاند" اور "جانوروں کی عقلمندی" منظر عام پر آچکے ہیں۔ حامد اللہ افسر کے "ادب اطفال" پر اظہار خیال کرتے ہوئے نور الحسن ہاشمی نے لکھا ہے۔

> "مختلف ملکوں کی مشہور کہانیوں کے ترجمے بھی کیے ہیں جو ابھی تک طبع نہیں ہوسکے۔ لیکن کسی کاتب سے خوش خط لکھوائے مسودے کی شکل میں محفوظ ہیں۔
>
> افسر صاحب کی عادت تھی کہ اپنی تصنیفات یا تخلیقات کو کسی خوشنویس سے لکھوا لیتے تھے۔ ان کی مطبوعہ نظموں کے مجموعے "پیام روح" (۱۹۲۰ء) اور "جوئے رواں" (۱۹۵۰ء) ہیں۔ ان میں بھی ایسی نظمیں شامل ہیں جو صرف بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں"[1]

اس میں شک نہیں کہ افسر میرٹھی کے ہم وطن اور پیشرو مولوی اسماعیل میرٹھی نے "ادب اطفال" کی جو صحت مند، مفید اور دلچسپ روایت قائم کی تھی۔ اسے حامد اللہ افسر میرٹھی نے بہت آگے بڑھایا۔

خواجہ حسن نظامی:۔

مشہور انشاپرداز خواجہ حسن نظامی نے بھی بچوں کے لیے بہت سے مضامین لکھے ہیں۔

---

[1] نور الحسن ہاشمی "بچوں کے افسر" ماہنامہ "نیا دور" (لکھنؤ) نومبر، دسمبر ۱۹۶۹ء صفحہ ۳۵
مدیر خورشید احمد صدیقی۔

مذہب، اخلاق، طنز و ظرافت سے تعلق رکھتی ہیں۔ "بیگم کا جنازہ"، "بچپن کی سرگذشت"، "میلاد نامہ"، "بیگم ۱۸۵۷"، "سال کی ڈائری"، "مستقبل شہزادہ"، ان کے مجموعہ مضامین ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں سادگی، بے ساختگی، روانی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ معمولی معمولی بات کو بڑے دلچسپ انداز اور انوکھے ڈھنگ سے لکھنے میں انھیں کمال حاصل ہے۔ حسن نظامی کو مصور فطرت کہا جاتا ہے۔ مذہب، اخلاق، تعلیم، تاریخ غرضیکہ ہر موضوع پر ان کا قلم جوہر دکھاتا ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھی ہیں جو بچوں کے رسائل اور اخبارات کی زینت بنیں۔ "چڑیا چڑے" جیسی روایتی کہانیاں بھی خواجہ حسن نظامی نے لکھی ہیں وہ خود لکھتے ہیں۔

> "چڑیا چڑے کی کہانی میری زندگی کے ابتدائی زمانے میں اتنی زیادہ مشہور تھی کہ اس وقت کے بہت سے پرلطف مضامین لکھنے والے ادیب مختلف طریقوں سے چڑیا چڑے کی نئی نئی کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ اور میں نے بھی سنہ ۱۹۱۹ء میں اخبار "ہمدم" (لکھنؤ) میں ایک نئی چڑیا چڑے کی کہانی شائع کرائی تھی جس کو پڑھ کر حضرت اکبر الہ آبادی نے مجھے بہت زیادہ داد دی تھی"[1]

ان کہانیوں کے علاوہ خواجہ حسن نظامی نے بچوں کے لیے مختلف رسائل میں کہانیاں لکھیں جن میں "پوپلا نہ کہنا" بچوں کا باغ لاہور (اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء) اور "شہزادی کی بپتا" بچوں کا باغ لاہور نومبر سنہ ۱۹۴۳ء قابلِ ذکر ہیں۔

لیلےٰ خواجہ بانو:۔

خواجہ حسن نظامی کے ساتھ ہی ان کی اہلیہ لیلےٰ خواجہ بانو کا نام بچوں کے ادیب کی حیثیت سے آتا ہے۔ لیلےٰ خواجہ بانو نے اپنے عہد میں رائج معصوم بچوں کی عوامی روایتی کہانیوں کو قلمبند کیا یعنی یہ کہانیاں لیلےٰ خواجہ بانو کی طبع زاد نہیں ہیں۔ لیلےٰ خواجہ بانو نے سنہ ۱۹۱۹ء

---

[1] خواجہ حسن نظامی نوٹ (مشمولہ) "بچوں کی کہانیاں" مصنفہ لیلےٰ خواجہ بانو دفتر خواجہ حسن نظامی دہلی۔ ۱۹۵۱ء ص ۲۰

میں یہ کہانیاں قلمبند کی تھیں۔ جن کو خواجہ حسن نظامی نے سنہ ۱۹۵۱ء میں دفتر خواجہ حسن نظامی سے "بچوں کی کہانیاں" کے نام سے شائع کیا۔ آج بھی یہ کہانیاں چھوٹے چھوٹے بچوں کو سنائی جاتی ہیں اور بچے انھیں بڑی دلچسپی کے ساتھ سنتے ہیں۔ لیلےٰ خواجہ بانو کی یہ کہانیاں نہایت مختصر اور بچوں کی معصوم زبان میں ہیں۔

بچوں کی کہانیاں "مٹکاؤں اپنی چونچ" "چڑیا چڑیا پٹ کھول دے" "سمجھتا تو موسے تو" "بھوبھل کا روٹ" "میں کیا تجھ سے روٹھی تھی" "چوہیا نے ہاتھی سے پاؤں دبوائے" "بوا ہنکارا منکارا" "ان سہاگن چونچ میں" "ماما قمر کی شادی" "الک پلک پٹ کھولو" "سمڑ ملیا بیٹا کرم کرم" "خالہ خیرو" "کھیلوں بتاشوں کا منہ" "بدتمیز مینڈکی" "عقلمند کی دور بلا" "میں کٹ مروں گا" کل سولہ کہانیاں ہیں۔ اس کتاب کے سرورق پر یہ عبارت لکھی ہے۔

> **بچوں کی کہانیاں:۔**
> جو دہلی کے گھروں میں صدیوں سے عورتیں چھوٹے بچوں کو سنایا کرتی تھیں اور جن کے سننے سے لڑکوں اور لڑکیوں میں سمجھ اور نیکی پیدا ہوتی ہے۔
> لیلےٰ خواجہ بانو اہلیہ خواجہ حسن نظامی دہلوی نے سنہ ۱۹۱۹ء میں ان کو قلمبند کیا تھا اور خواجہ حسن نظامی کے مرید یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم حیدرآباد نے اس کی تصویریں بنائی تھیں۔ صفر ۱۳۷۱ قمری نومبر سنہ ۱۹۵۱ء شمسی میں دفتر خواجہ حسن نظامی نے چھٹی بار چھپوا کر شائع کیا۔

کتاب میں شامل ہر کہانی کے آخر میں حسن نظامی نے اپنی رائے اس طرح شائع کی ہے جس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ یہ کہانی حسن نظامی ہی کی قلمبند کردہ اور لیلےٰ خواجہ بانو کے نام سے شائع کردی گئی۔ مثلاً پہلی کہانی "مٹکاؤں اپنی چونچ" کے آخر میں لکھتے ہیں۔

"اگرچہ مجھے یاد ہے کہ جب مجھے یہ کہانی اماں سناتی تھیں تو میں پوری طرح سمجھتا نہیں تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ منظوم فقرے میری زبان پر چڑھ گئے تھے اور کنوئیں کے پانی، کمہار اور لوہار کا کام بھی مجھے اس وقت معلوم

ہوگیا تھا جبکہ ان چیزوں کو میں بالکل نہیں جانتا تھا۔[۱]

ان آخری جملوں سے واضح ہوتا ہے کہ حسن نظامی کی والدہ انھیں یہ کہانیاں سناتی تھیں جسے بعد میں انھوں نے خود قلمبند کیا۔ اسی طرح کہانی "خالہ خیرو" کے آخیر میں لکھتے ہیں۔

"خالہ خیرو کا اثر میرے دل پر اتنا ہوا تھا کہ جب میں بڑا ہوا اور کتابیں اور مضامین لکھنے لگا تو خالہ خیرو کے لفظوں سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا۔"[۲]

الغرض اسی طرح موصوف نے ہر کہانی کے آخر میں اپنی رائے ایسے انداز میں درج کی ہے کہ پڑھنے والے بیساختہ اس کتاب کا سہرا انھیں کے سر باندھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

حفیظ جالندھری:۔

مشہور شاعر حفیظ جالندھری نے بچوں کے لیے خود بھی لکھا اور اپنے ہم عصر شعراو ادبا کو بھی "ادب اطفال" تخلیق کرنے کی ترغیب دی۔ وہ لاہور سے شائع ہونے والے بچوں کے مشہور رسالے "نونہال" (سنہ ۱۹۲۳ء) اور "پھول" (سنہ ۱۹۲۴ء) کے مدیر بھی رہے اور ان رسالوں کے لیے بے شمار نظمیں اور کہانیاں تخلیق کیں۔ حفیظ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بچوں کی دلچسپی کی چیزوں کو انھیں کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انھیں کے الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ موضوعات میں تنوع کے علاوہ انھوں نے اپنی نظموں میں ترنم اور نغمگی کا بندوبست کیا ہے۔ وہ ان نظموں کے وسیلے سے بچوں کو یہ احساس بھی نہیں ہونے دیتے کہ بحیثیت استاد یا بزرگ کوئی چیز پڑھانا یا سکھانا چاہتے ہوں بلکہ ان کی نظمیں ازخود اتنی دلکش ہیں کہ بچے ان کی طرف مائل ہوتے ہیں اور غیر شعوری طور پر مثبت اثر بھی قبول کرتے ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی مقبول عام نظموں میں "حمد" "دعا" "چڑیا بلی اور ننھے منے بچے" "استاد آگئے"

---

[۱] خواجہ حسن نظامی۔ "نوٹ۔ مشمولہ بچوں کی کہانیاں" مصنفہ لیلیٰ بانو خواجہ دفتر۔ خواجہ حسن نظامی۔ دہلی۔ ۱۹۵۱ء۔ ص ۳

[۲] خواجہ حسن نظامی۔ "نوٹ۔ مشمولہ بچوں کی کہانیاں" مصنفہ لیلیٰ بانو خواجہ دفتر، خواجہ حسن نظامی۔ دہلی۔ ۱۹۵۱ء۔ ص ۳

"کبڈی"، "دیوالی"، "دھنک"، "بول میرے مرغے"، "شبرات"، "لڑکیوں کا ڈھولک گیت"، "بھکاری"، "تاروں کا دریا" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان کی نظموں کے مجموعے "حفیظ کے گیت اور نظمیں" (چار جلدیں) اور "بہار کے پھول" شائع ہو چکے ہیں۔ یہاں اس امر کی طرف خصوصی اشارہ کرنا بھی لازمی ہے کہ حفیظ جالندھری نے جتنی کثیر تعداد میں پُر تاثیر "حمدیں" اور "دعائیں" منظوم کی ہیں۔ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ بھی صورت الحال کی منظوم کہانی کے مجموعے "ہندوستان ہمارا" کی ہے۔

حفیظ جالندھری بچوں کے پہلے شاعر اور ادیب ہیں جنھوں نے اپنی طبع زاد تخلیقات نظم و نثر کے علاوہ کلاسیکی نثر سے مناسب چیزیں منتخب کرکے از سر نو دلچسپ پیرائے میں ڈھال کر بچوں کی زبان میں پیش کیں۔ داستان "امیر حمزہ" اور "طلسم ہوشربا" کے مشہور کردار عمرو عیار کے دو جلدوں پر مشتمل کارنامے اس کی مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مشہور داستان "الف لیلیٰ" سے بھی حفیظ نے بچوں کے لیے مناسب مواد اخذ کرکے انھیں کے زبان میں از سر نو قلمبند کیا۔ اور کتابی شکل میں پیش کیا۔ ان کی نثری کاوشوں کی زبان میں "ادب اطفال" میں بیش قیمت ہے۔ کہانیوں میں "بدر بادشاہ" اور "جواہر شہزادی" بطور خاص بچوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حفیظ جالندھری نے اپنی نظموں، گیتوں اور کہانیوں کی شکل میں بچوں کے ادب کو بہت کچھ دیا ہے اور بچوں کے لیے لکھنے والوں میں ان کا ادبی قد بھی نہایت بلند ہے۔

محوی صدیقی:۔

بچوں کے ادیب اور شاعر کی حیثیت سے محوی صدیقی کا نام توجہ کا مستحق ہے۔ محوی صدیقی نے بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھی ہیں جن میں پند و نصیحت کے ساتھ ساتھ دلچسپی کے تمام ادبی لوازمات موجود ہیں۔ محوی صدیقی کی نظمیں اردو کے تمام مشہور ادبی رسائل میں شائع ہوئیں۔ بچوں کے لیے تخلیق کردہ ان نظموں کا مجموعہ "بالک باغ" کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ جسے محوی صدیقی نے سنہ ۱۹۴۷ء میں مرتب کیا تھا لیکن سنہ ۱۹۷۶ء میں شائع ہو سکا۔ اس مجموعے کی اچھی نظموں میں "لو آئی عید"، "سہانی رات"، "برسات کا موسم"

"بندر بیچارا"، "سیپیوں کی یاد"، "گھی کی بات" اور "منتقل" وغیرہ کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں محوی صدیقی نے اور بھی بہت سی نظمیں "بالک بندھ" میں شریک نہیں کیں۔ ان میں سے "عقل"، "ہمارے بچے کی"، "گھر کی چڑیا"، "برسات کا پہلا مینہ"، "ذاکر حسین"، "سونا کا تحفہ"، "گرمیوں کی رات"، "گرمی کی رات"، "نوید بہار" وغیرہ نظمیں "پیام تعلیم" نئی دہلی کے سنہ ۱۹۴۲ء سے پیشتر کے شماروں میں میری نگاہ سے گزر چکی ہیں۔

بچوں کے لیے نظموں کے علاوہ محوی صدیقی نے بہت سی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ان کہانیوں میں "ایک قیمتی ہیرا"، "اکبر کی دلاوری"، "ایک بادشاہ کی کہانی"، "ابوبکر اور دو چوہے" بہت مشہور ہیں۔ محوی صدیقی نے بزرگوں اور قومی رہنماؤں کی زندگی اور کارناموں پر مبنی بہت سی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ان کی ایسی تخلیقات دو جلدوں میں "سچی کہانی" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں، ماہنامہ پیام تعلیم (نئی دہلی) کی پرانی جلدوں میں ان کی تاریخی، اخلاقی اور معلوماتی کہانیاں نیز مضامین "ایمانداری"، "سلطان بایزید کی حق پسندی"، "عید"، "مامون خلیفہ اور ایک چور غلام"، "حضرت عمر بن عبدالعزیز کی دیانت"، "امام سلفی مصر کا بادشاہ"، "دنیا کا مدرسہ اور ہم تم"، "گرمی اور جنگل" بھی میری نظر سے گزرے ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں مجموعے کی شکل میں مرتب کر کے شائع اور محفوظ کر لیا جائے۔

سنہ ۱۹۲۸/۲۹ء کے دوران محوی صدیقی نے جنوبی ہند کے طلبا کی ضروریات کے پیش نظر کئی ریڈریں بھی مرتب کیں جنھیں مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو سے شائع کیا۔[1]

مجموعی حیثیت سے محوی صدیقی کا نام انھیں "ادب اطفال" میں کافی عرصہ تک زندہ رکھے گا۔

اختر شیرانی:۔

بلند پایہ شاعر اختر شیرانی نے بھی بچوں کے ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے

---

[1] میرزا ادیب "بچوں کا ادب۔ کہانی" ماہنامہ "ماہ نو" (لاہور)، نومبر ۱۹۷۹ء ص ۴۰۔
چیف ایڈیٹر کشور ناہید

مختلف موضوعات پر نہایت آسان اور عام فہم زبان میں نظمیں تخلیق کی ہیں۔ مجموعہ میں میٹھی میٹھی لوریاں اور دل کو بھانے والے گیت بھی شامل ہیں۔ "ایک لڑکی کا گیت" "جھولا" "لوری" "باغوں کی بہاریں" "آخری امید" "ساون کی گھٹا" "مدرسے کی لڑکیوں کی دعا" "میرا ننھا جواں ہوگا" "ایک سہیلی کی یاد میں" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو "ادب اطفال" کے تحت سے تحت انتخاب میں بھی جگہ پانے کی مستحق ہیں۔ بچوں کے لیے اختر شیرانی کی بیشتر نظمیں ان کے مجموعہ کلام "نغمہ حرم" میں شریک اشاعت ہیں۔

امتیاز علی تاج:۔

امتیاز علی تاج بچوں کے ادب میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے مشہور رسالے "پھول" (لاہور) کی ایک طویل عرصہ تک ادارت بھی کی۔ یہ (پھول) ان کے والد ممتاز علی نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے پیش نظر جاری کیا تھا۔ امتیاز علی تاج نے اپنی متعدد نگارشات سے بچوں کی ان ضروریات کو پورا کیا۔ انھوں نے مختلف مضامین اور کہانیاں "پھول" کے لیے لکھیں۔ تاج کو مختلف موضوعات پر کہانیاں لکھنے کا ملکہ حاصل تھا۔ ان کی کہانیوں کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ بظاہر خالص تفریحی کہانیوں میں بھی نونہالوں کے لیے کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ تاج کا طریقہ کار سائنٹفک ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر کونین کی گولی کو شہد میں لپیٹ کر دیا جائے تو وہ کام و دہن میں تلخی پیدا کیے بغیر حلق سے نیچے اتر جاتی ہیں اور معدے میں پہنچ کر اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تاج کی نثری تخلیقات "ادب اطفال" کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ موصوف کی بچوں کے لیے قلمبند کردہ کہانیوں کی کتابوں میں "موت کا راگ" "بچوں کی بہادری" "چڑیا خانہ" (حصہ اول و دوم) "گدگدی" (حصہ اول و دوم) "پرستان" اور "بچوں کی کلیاں" نیز بچوں کی نظموں کا مجموعہ "پھول باغ" کتابی شکل میں دفتر "پھول" (لاہور) سے شائع ہو چکے ہیں۔

امتیاز علی تاج بچوں کی دلچسپیوں، مشاغل اور ضروریات پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔

لے میرزا ادیب "بچوں کا ادب کہانی" ماہنامہ "ماہ نو" (لاہور) نومبر ۱۹۷۹ء ص ۴۶ بحوالہ مذ تیر کشور ناہید۔

فیز ان کو بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ تھا۔ میری استانیاں" اور "میرے استاد" (مطبوعہ کھلونا جنوری ۱۹۴۹ء) "طالب علم کا فرض" (پھول دہلی اکتوبر سنہ ۵۹ ۱۹۴۹ء) ایسے مضامین ہیں جن کے وسیلے سے بچوں کے دلوں پر استاد کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

امتیاز علی تاج نے دیگر زبانوں کی کہانیوں سے بھی مرکزی خیال مستعار لے کر انھیں اردو کے قالب میں منتقل کیا ہے۔ ان کی ایسی تخلیقات میں "ابوالحسن" بہت مشہور اور اردو کی عمدہ داستان ہے۔

حجاب امتیاز علی :۔

امتیاز علی تاج کے ساتھ ہی حجاب امتیاز علی کا نام بھی "ادب اطفال" سے منسلک ہے جن کی کہانیاں، بچوں کے ادب میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ حجاب کی کہانیاں، موضوعات اور اسلوب ہر دو اعتبار سے ایک الگ ذائقہ اور امتیازی رنگ کا احساس دلاتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں خوابناک ماحول "طلسماتی فضا" "تخیلی دنیا" اور بچوں کی رومانی دنیا کا حسین امتزاج ہے موصوفہ کی کہانی " الہ دین کا چراغ اس خیال کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہے۔ حجاب امتیاز علی کی تخلیقات پاکستان اور ہندوستان کے رسائل میں یکساں مقبولیت کے ساتھ شائع ہوئیں۔ ان کی نگارشات میں "طوطے کا پنجرہ" (کھلونا جنوری ۱۹۷۵ء) "شہزادی گل رخ" (پھول دہلی اکتوبر سنہ ۵۹ ۱۹ء) قابل ذکر ہیں۔

چراغ حسن حسرت :۔

بچوں کی روایتی اور تاریخی کہانیاں لکھنے میں چراغ حسن حسرت کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ حسرت بھی بچوں کو براہ راست نصیحت کرکے شخصیت کی تعمیر کرنے کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے قدیم روایتی، تاریخی اور مذہبی کہانیوں کو اس انداز میں از سر نو قلمبند کیا ہے کہ بچوں کی سیرت اور شخصیت کی تعمیر میں معاون ہوں۔ ان کی تصانیف " تاترک"، "خلیفہ عبدالرحمان" اور "شریعت عالی" ادب اطفال کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

غلام رسول مہر:۔

غلام رسول مہر کا نام "ادب اطفال" میں محتاج تعارف ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے صرف کہانیاں ہی نہیں لکھیں بلکہ مختلف موضوعات پر معلوماتی مضامین بھی قلمبند کیے۔ "بلیم اثلی" "میرے اندر کیا ہے" اور "سو تاریخی واقعات" وغیرہ تصانیف خصوصیت کی حامل ہیں "میرے اندر کیا ہے" بچوں کے لیے معلومات عامہ پر اپنی طرز کی منفرد کتاب ہے جبکہ "بلیم" اور اثلی" بچوں کو جغرافیائی معلومات فراہم کرتی ہیں۔

ایم۔ اسلم:۔

مشہور ناول نویس ایم اسلم "پھول" گروپ کے ہی ایک اہم رکن ہیں۔ ان کی کہانیاں ہندو پاک کے معیاری رسائل کی مسلسل زینت بنتی رہی ہیں۔ انھوں نے بچوں کے ذاتی مسائل، ان کی نفسیاتی ضروریات اور ذہنی استعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت شگفتہ زبان میں کہانیاں قلمبند کیں۔

"عجیب روپیہ" (کھلونا جون سنہ ۵۰ء) "انعام" (کھلونا نومبر سنہ ۵۶ء) "چالاک سلیم" (کھلونا اکتوبر ۱۹۵۷ء) ایم اسلم کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔

موصوف کی دلچسپ کہانی "باورچی شہزادہ" کتابی صورت میں بھی دستیاب ہے۔

غلام مصطفیٰ تبسم:۔

بچوں کے شاعر کی حیثیت سے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے اپنے دور میں بڑی مقبولیت حاصل کی تھی اور آج بھی ان کی نظمیں ویسی ہی تازہ اور شگفتہ محسوس ہوتی ہیں۔ صوفی تبسم کی نظمیں ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل کی زینت بنیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھی ہیں جن میں "ٹوٹ بٹوٹ کی لاری"، "گپ شپ" قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے "حمد" اور "نعت" کافی لکھی ہیں۔ جن میں "حمد" (کھلونا فروری سنہ ۱۹۵۷ء) نئی دہلی اور "نعت" (ماہ نو لاہور نومبر سنہ ۱۹۶۹ء) خصوصیت کی حامل ہیں۔ ان کی ایسی نظموں کا مجموعہ جھرنے" کتابی شکل میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔ پھول دہلی

"پھولوں کا باغ" (لاہور) "نونہال" (لاہور) "تعلیم و تربیت" (لاہور) "کھلونا" (نئی دہلی) اور "دوست" (حیدرآباد) میں ان کی شعری تخلیقات مسلسل شائع ہوتی رہی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں ان کی نظموں کے خیالات احساسات، جذبات کو انوکھے انداز سے کہنا اور نظموں میں ہیئت کے دلچسپ تجربات سے گزرنا بھی ان کی انفرادیت رہی ہے۔

احمد ندیم قاسمی:۔

"پھول" (لاہور) کے ایک اور مدیر احمد ندیم قاسمی بھی تھے۔ جنہوں نے بچوں کے لیے مختلف موضوعات پر متعدد نظمیں اور کہانیاں لکھیں۔ "چوہوں کی بارات" (مطبوعہ بچوں کا باغ لاہور، اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء) "میاں بدھو" (مطبوعہ ہدایت لاہور، جنوری سنہ ۱۹۵۰ء) "لڑو شرارتی" (کھلونا نئی دہلی سنہ ۱۹۵۴ء) ان کی نظموں میں قابل ذکر ہیں۔ "کہانیوں میں "جلیبیاں" (ماہ نو لاہور نومبر سنہ ۱۹۷۹ء) وغیرہ بچوں کی مشہور کہانیاں ہیں۔

مرزا ادیب:۔

"پھول" گروپ کے اہل قلم میں مرزا ادیب نے بچوں کے لیے کہانیاں، ڈرامے اور نظمیں تخلیق کیں۔ وہ کہانی اور ڈرامے کی تکنیک سے پوری طرح واقف ہیں۔ موصوف بچوں کے ان مقبول ترین کہانی کاروں میں سے ہیں جن کی کہانیاں ہندو پاک کے تمام بچوں کے رسائل میں شائع ہوئیں۔ ان طبع زاد کہانیوں میں "بی بی فاختہ اڑتی جاتی" (کھلونا نئی دہلی فروری ۱۹۷۵ء) "میں ہوں تمہارا دوست" (کھلونا دسمبر سنہ ۱۹۷۸ء) "یہ نہیں ہوگا" (کھلونا نئی دہلی ۱۹۸۵ء) قابل ذکر ہیں۔

"ایک خرگوش اور غار" "عرب کی کہانی" "استاد جی" ان کی کہانیاں کتابی شکل میں کھلونا بکڈپو نئی دہلی نے شائع کیں۔ علاوہ ازیں ان کی کہانی "پریوں کے محل" نسیم بکڈپو لکھنؤ نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کی ہے۔

مرزا ادیب نے بچوں کے لیے ڈرامے بھی تخلیق کیے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں "انعام" (کھلونا نئی دہلی دسمبر سنہ ۱۹۵۴ء) "استانی" (کھلونا دسمبر سنہ ۱۹۵۵ء) قابل ذکر ہیں۔ "ایک مسافر" "ایک دفعہ کا ذکر ہے" ان کے دو ڈرامے کتابی شکل میں کھلونا بکڈپو نئی دہلی نے شائع

کیے۔ "ایک پہاڑ اور گلہری" علامہ اقبال کی نظم پر عمدہ ڈرامہ ہے۔

ڈراموں اور کہانیوں کے ساتھ ساتھ میرزا ادیب نے بچوں کے لیے منظوم کہانی، غزل اور مزاحیہ نظمیں تخلیق کیں۔ "ایک لڑکی کا خط اپنی ناراض سہیلی کے نام" (پیام تعلیم نئی دہلی نومبر سنہ ۱۹۵۳ء) "مزاحیہ غزل" (پیام تعلیم نئی دہلی دسمبر سنہ ۱۹۵۳ء) "بیمار بلی" (کھلونا نئی دہلی اگست سنہ ۱۹۵۲ء) "نہ بنے" (کھلونا نئی دہلی سنہ ۱۹۵۳ء) "ایک کھلنڈرے لڑکے کا گیت" (کھلونا اگست سنہ ۱۹۵۲ء) وغیرہ ان کی ایسی نظمیں ہیں جو اپنی زبان، اسلوب اور موضوعات کے اعتبار سے لاثانی ہیں۔ ان کی ایسی نظموں کا شعری مجموعہ "ڈالیاں" کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

میرزا ادیب نے بچوں کے لیے جو نظمیں، کہانیاں اور ڈرامے تخلیق کیے ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بچوں کے مزاج، رجحان طبع، دلچسپی، احساس اور جذبات کے بڑے نباض ہیں۔ تخلیقات میں بچوں کے ساتھ ہنستے ہنساتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھیلوں میں شریک نظر آتے اور بچوں کو اپنی تخلیقات کے سلسلے سے عجائبات عالم کی سیر کراتے ہیں۔ "ادب اطفال" میں میرزا ادیب کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

عظیم بیگ چغتائیؒ:-

عظیم بیگ چغتائی کو بچوں کے ادیب کی حیثیت سے اکثر درسی کتب میں جگہ دی جاتی ہے مثال کے طور پر ان کا ڈرامہ "نوجوان ڈاکٹر"[۱] اور "میچ"[۲]، درسی کتب میں شامل کیے گئے ہیں لیکن ان تخلیقات کا غائر مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ دراصل یہ نگارشات بطور خاص بچوں کے لیے قلمبند نہیں کی گئی تھیں بلکہ مختلف درسی کتب کے مرتبین نے عظیم بیگ چغتائی کی مزاحیہ تخلیقات میں سے ایسے مناسب اقتباسات اپنے طور پر اشاعت کے لیے منتخب کر لیے ہیں جو اپنے اندر بچوں کی عمومی دلچسپی کا سامان رکھتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میرزا عظیم بیگ

---

[۱] "نوجوان ڈاکٹر" عظیم بیگ چغتائی مشمولہ "ہماری زبان" (حصہ اول) سررشتہ تعلیم اتر پردیش لکھنؤ

[۲] "کرکٹ میچ" عظیم بیگ چغتائی، مشمولہ "شاہکار نثر" مولفہ مولوی محمد ابراہیم / مولوی خدا بخش۔

چغتائی کا اسلوب مقالات سے شروع اول اور ختم تک ہے۔ جو مزاحیہ، طنزیہ اور تنقیدی تحریروں میں پوشیدہ رہ گیا۔ واقعہ یہ ہے عظیم بیگ چغتائی نے اپنے زمانہ طالب علمی میں بچوں کے لیے اردو میں پہلا ناول "قصرِ صحرا" تصنیف کیا جو کہ دارالاشاعت پنجاب لاہور سے تین حصوں میں شائع ہوا۔ اس ناول کا زمانۂ تصنیف سنہ ۱۹۲۰ء کے آس پاس کا ہے۔ "قصرِ صحرا" پر ڈینیل ڈیفو کی شہرۂ آفاق "رابنسن کروسو" کا بڑا اثر ہے۔ یہ مہماتی ناول انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کا ایک دھندلا سا خاکہ بھی بچوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں چغتائی نے بچوں کے لیے ایک اور ناول بعنوان "بحرِ جنوبی کا سفر" بھی تصنیف کیا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس ناول میں ایک سمندری مہم کی پرلطف داستان بیان کی گئی ہے۔

بڑوں کے لیے اپنی ظریفانہ نگارشات کے علاوہ ادبِ اطفال میں پہلے ناول نگار کی حیثیت سے بھی عظیم بیگ چغتائی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

جامعہ کے مصنفین :-

سنہ ۱۹۲۲ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا قیام عمل میں آیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے جو خود بھی ماہرِ تعلیم تھے، بچوں کی تعلیم و تربیت میں درسی اور غیر درسی کتابوں کی اہمیت کو محسوس کیا۔ انھوں نے بہت سے مصنفین اور شعرا کو جن میں جامعی اور غیر جامعی دونوں شامل تھے "ادبِ اطفال" کی تخلیق پر آمادہ کیا اور خود بھی تخلیقی کاموں کا آغاز کر کے ان لوگوں کی رہبری کی اور بچوں کے لیے ڈاکٹر عابد حسین کی ادارت میں بچوں کا رسالہ "پیامِ تعلیم" جاری کیا۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

> "اردو میں عام طور پر بچوں کے لیے، جو کچھ لکھا گیا اسے پڑھ کر لکھنے سے استادوں کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے یا پھر نانی اماں سے سنی ہوئی جنوں اور پریوں کی کہانی یاد آجاتی ہے۔ ان کے بیان میں چاشنی اور لہجہ بھی نہیں ملتا جو نانی اماں کی کہانیوں سے ملتا ہے۔ جامعہ ملیہ میں ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے پہلے پہل بچوں کے ادب پر باضابطہ توجہ کی اور ان کے لیے ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھی۔ اس اسلوب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سائنس اور فلسفے کے مسائل کو بھی

اسی طرح دلچسپ بنایا جائے جس طرح جنوں اور پریوں کی کہانیاں ہوتی ہیں"۔[1]

ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں شفیع الدین نیر، الیاس برنی، عبدالغفار مدھولی، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، قدسیہ زیدی، صالحہ عابد حسین، حسین حسان، عبدالواحد سندھی، مسعود حسین خاں، رشید احمد صدیقی، نورالحسن ہاشمی، اطہر پرویز، رئیس احمد جعفری، رضیہ سجاد ظہیر، آل احمد سرور، حامد حسن قادری، مقبول احمد سیوہاروی، ذکی انور، سلامت اللہ، عبداللہ ولی بخش قادری، جیسے مفکرین اور شعراء، ادباء اور ماہرین تعلیم نے "پیام تعلیم" کے لئے نگارشات لکھ کر اردو "ادب اطفال" کو صحت مند بخشا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین:۔

مختلف اصناف ادب سے متعلق ان فنکاروں کی نگارشات مثلاً کہانیاں، نظمیں، ڈرامے معلوماتی مضامین اور تراجم وغیرہ "پیام تعلیم" میں متواتر شائع ہوتے رہے۔ اور بذات خود ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی "ادب اطفال" میں متعدد کہانیاں کا اضافہ کیا۔ "ابوخاں کی بکری" "مرغی اچیر چلی" "کچھوا اور خرگوش" ڈاکٹر ذاکر حسین کی مشہور کہانیاں ہیں۔ اولاً "پیام تعلیم" میں ان کی کہانیاں ان کی بیٹی رقیہ ریحانہ کے نام سے شائع ہوئیں مثلاً "پودی کڑھائی سے نکل بھاگی" "پیام تعلیم" مارچ سنہ ۱۹۳۰ء) "سیدہ کی ماں" (پیام تعلیم مئی سنہ ۱۹۳۰ء) "پن چکی" پیام تعلیم جولائی سنہ ۱۹۳۰ء) اور "ابوخاں کی بکری" (پیام تعلیم جون سنہ ۱۹۳۰ء) رقیہ ریحانہ کے نام سے منظر عام پر آئی تھیں۔ مزید دو کہانیاں "بیکار کا" اور "مرغی اچیر چلی" بھی سنہ ۱۹۳۴ء میں مکتبہ جامعہ دہلی نے کتابی شکل میں رقیہ ریحانہ کے نام کے ساتھ شائع کیں۔ ان کہانیوں کے ساتھ ہی ماہنامہ "پیام تعلیم" (دہلی) میں "آدمی کی کہانی ایک ستارے کی زبانی" سنہ ۱۹۳۱ء میں رقیہ ریحانہ کے نام سے قسط وار شائع ہوئیں۔ بعد ازاں یہ تمام کہانیاں مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے وقتاً فوقتاً ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیں جن میں "چودہ کہانیاں"[1]

---

[1] رشید احمد صدیقی: پیش لفظ "کلکی کلیہ" اطہر پرویز، اردو گھر علی گڑھ جولائی ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۱

بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے سنہ ۱۹۳۱ء میں جامعہ کے یوم تاسیس کے موقع پر ایک تمثیلی ڈرامہ "دیانت" تیار کیا جو بچوں کی دلچسپی کا حامل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔ جس کے مطالعے سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ یہ طبع زاد تخلیق نہیں کسی انگریزی ڈرامہ سے ماخوذ ہے۔ "دیانت" کے علاوہ "کھوٹا سونا" بھی ان کا مشہور ڈرامہ ہے۔ یہ ڈرامے کتابی صورت میں چھپنے کے علاوہ جامعہ کی مختلف تقریبات کے موقع پر کامیابی کے ساتھ پیش کیے گئے۔ اور اپنے وقت کے مقبول ڈرامے قرار پائے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (سنہ ۱۸۹۷ء۔ سنہ ۱۹۶۹ء) کے مشہور ماہر تعلیم تھے۔ ان کو بچوں کی ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا وسیع تجربہ تھا۔ وہ بیسک ایجوکیشن اسکیم یعنی گاندھی تحریک کے شریک کار تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی نگاہ محض بچوں کی ابتدائی تعلیم تک محدود نہ تھی بلکہ وہ ہندوستانی بچوں کے مستقبل کے بارے میں ہمیشہ غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ اور یہ سلسلہ تا زیست جاری رہا۔ ذاکر حسین کا خیال تھا کہ اچھی کتاب بچوں کی زندگی کو سدھارنے میں بڑا اہم کردار ادا کر سکتی ہے اور انھیں اچھی اور مفید باتیں سکھانے کا ایک موثر ترین وسیلہ کتاب ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بچوں کے لیے ان کی تمام تخلیقات بچوں ہی کے انداز، ان ہی کی زندگی کے متعلق اور ان ہی کی زبان میں ہیں۔

مصنف کی تحریر اور تقریر عموماً خود اس کی شخصیت کا عکس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہر کہانی پر شخصیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ذاکر حسین کو عام طور پر ماہر تعلیم اور عظیم رہنما کی حیثیت سے جانا جاتا ہے لیکن اردو "ادب اطفال" کے ایک ادیب کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ کچھ کم نہیں۔

ڈاکٹر عابد حسین:۔

بچوں کے ادیب کی حیثیت سے مشہور مفکر، دانشور اور ماہر تعلیم ڈاکٹر عابد حسین کا نام آتا ہے۔ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے ان ساتھیوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگیاں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ ڈاکٹر عابد حسین بچوں کے رسالے "پیام تعلیم" (دہلی) کے ایڈیٹر بھی رہے۔ انھوں نے پیام تعلیم کو معیاری بنانے اور سنوارنے کے ساتھ

بچوں کے ادب کی بقا کے لیے بنیادی کام انجام دیے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے خود بھی بچوں کے لیے نثری تخلیقات پیش کیں۔ اور دوسروں کو بھی "پیام تعلیم" کے لکھنے پر آمادہ کیا۔

"تعلیمی لطائف" اور ڈرامہ "شریر لڑکا" ان کی بچوں کے لیے مشہور کتابیں سنہ ۱۹۲۹ء میں مکتبہ جامعہ نے شائع کیں۔ "شریر لڑکا" قبل ازیں "پیام تعلیم" میں قسط وار شائع ہو چکا تھا موصوف کی بچوں کے لیے ایک اور دلچسپ کہانی "چچکلا بلا" مارچ سنہ ۱۹۴۷ء میں کتابی دنیا (دہلی) نے شائع کی۔ ڈاکٹر عابد حسین نے اپنی تحریروں میں بچوں کی نفسیات، ان کی تعلیمی ضروریات ان کی دلچسپیوں اور ان کی صلاحیتوں کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔

محمد مجیب :-

پروفیسر مجیب ڈاکٹر ذاکر حسین کے دست راست تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فروغ و ترقی میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ مدتوں شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دینے اور مختلف و وسیع موضوعات پر کتابیں تصنیف کرنے کے ساتھ موصوف نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں، ڈرامے اور نظمیں تخلیق کیں۔ جو "پیام تعلیم" اور بچوں کے دیگر رسائل میں شائع ہوئیں۔ ان کی تصانیف "سور عقاب، اور لومڑی" "پیام تعلیم" ستمبر سنہ ۱۹۲۷ء) "فاطمہ اور رحیم الدین" (پیام تعلیم نومبر سنہ ۱۹۳۱ء) اور "آؤ ڈرامہ کریں" (ڈرامہ) پیام تعلیم اکتوبر ۴۶ء۱۹) میں شامل اشاعت ہیں۔ بعد ازاں ان کا ڈرامہ "آؤ ڈرامہ کریں" کتابی شکل میں منظر عام پر آچکا ہے۔ "فلسفی اور مالی، کسان، لومڑی" (پیام تعلیم جولائی سنہ ۱۹۲۷ء) اور "مسافر" (پیام تعلیم اپریل سنہ ۱۹۴۹ء) جرمنی زبان سے اردو میں منتقل کیں۔ ان کے معلوماتی مضامین میں "ڈرامہ کیا ہے" (پیام تعلیم فروری سنہ ۴۳ء۱۹) "آپا جان" (پیام تعلیم مئی سنہ ۱۹۴۳ء) جامعہ سے امریکہ تک" (پیام تعلیم فروری تا اپریل سنہ ۱۹۵۰ء) قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر کی دو اور دلچسپ کتابیں "غوطہ خور" اور "شیدلا" سنہ ۱۹۳۶ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیں۔ پروفیسر مجیب کی ان تحریروں کی زبان، اسلوب اور موضوعات سب ہی بچوں کے لیے مفید اور دلچسپ ہیں۔ آزادی ہند کے بعد بڑھتی ہوئی مصروفیات کے باعث پروفیسر مجیب کے لکھنے کی رفتار مدھم ضرور ہو گئی تاہم اس دور میں بھی انھوں نے بچوں کے لیے "متاخر گوش" "جیب سے کیا نکالا" "جیسے ساتھی ویسے تم" "کنجوس اور دھوکا

کہانیاں مضامین جو جرمن زبانوں سے ماخوذ ہیں۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی کی طرف سے تیار کردہ ابتدائی درجات کی درسی کتابوں پر تیسیر میں پروفیسر مجیب کا نام بھی شامل ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ موصوف کو بچوں کی تعلیم و تربیت سے اپنی عمر کے آخری دور تک دلچسپی رکھتے ہیں۔

صالحہ عابد حسین :۔

صالحہ عابد حسین نے بچوں اور خصوصاً بچیوں کے لیے ادبی اور معلوماتی مضامین قلمبند کیے۔ بچوں کے لیے ان کی اکثر تخلیقات پیام تعلیم دہلی میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں "دستکاری" (پیام تعلیم فروری سنہ ۱۹۴۷ء) "شملے کی سیر" (پیام تعلیم مئی سنہ ۱۹۴۷ء) "شملے کے کتے" (پیام تعلیم اگست سنہ ۱۹۴۷ء) "آپس کا برتاؤ" (پیام تعلیم مئی سنہ ۱۹۴۵ء) "کشمیری بچے" (پیام تعلیم نومبر سنہ ۱۹۵۱ء) "راشٹر پتی" (پیام تعلیم نومبر سنہ ۱۹۵۵ء) "مولانا حالی بچوں کے ساتھ" (پیام تعلیم ، مارچ ۱۹۶۵ء) "بال ہٹ" (پیام تعلیم مارچ سنہ ۱۹۶۸ء) "بڑا مزا اس ملاپ میں ہے" (پیام تعلیم فروری سنہ ۱۹۷۲ء) اور "قومی خدمت" (پیام تعلیم جنوری سنہ ۱۹۷۵ء) موصوفہ کی چند اہم تحریریں ہیں۔ صالحہ عابد حسین کی کچھ اور کتابیں "سندر چنار" "ایک دیس ایک خون" مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیں۔ علاوہ ازیں نہرو بال پستکالیہ (نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی نے بھی ان کی کچھ کتابیں، مختلف سیریز میں شائع کیں۔ ان میں "باپو" "بڑا پانی" "خواجہ الطاف حسین حالی" "میرا" قابل ذکر ہیں۔ بڑا پانی (لیلا مجمدار) "میرا" (ملک راج آنند) دوسری زبانوں کے ترجمے ہیں۔

صالحہ عابد حسین قومی رہنماؤں کی زندگی کی سبق آموز واقعات اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے والے قصوں کے ذریعے اپنی تحریروں کو بچوں کے لیے افادی بناتی ہیں۔ "زعفران پریوں کے دیش میں" ان کی مشہور کتاب جو اخضر بریلوی نے جاوید پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع کی ہے "بچوں کے چار بزرگ دوست" صالحہ عابد حسین کی ایسی دلکش اور دلچسپ کتاب ہے جس میں بچوں کو علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پنڈت نہرو جیسی شخصیتوں سے متعارف کرایا گیا ہے۔ "انوہا اور کالا کوا" غیر ملکی زبان سے ماخوذ کہانی ہے۔

شفیع الدین نیر

شفیع الدین نیر بچوں کے وہ بڑے ادیب اور شاعر ہیں جنھوں نے صرف بچوں کے ادب کو اپنا مطمع نظر جانا اور زندگی کی آخری سانس تک "ادب اطفال" کی خدمت کرتے رہے۔ انھوں نے اس سے ہٹ کر بڑوں کے لیے لکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ موصوف نے بچوں کے لیے جو کچھ لکھا ہے وہ یہ سوچ کر لکھا ہے کہ ایک مقدس قومی اور انسانی فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ان کا تعلق جس قومی تعلیمی ادارے یعنی جامعہ ملیہ اسلامیہ سے رہا ہے اس کی اعلیٰ قدروں اور آدرشوں نے بھی ہمیشہ انھیں اس کام کو بہتر سے بہتر انجام دینے کا حوصلہ بخشا ہے۔ ان کی تصانیف نے اردو جاننے والوں کی کم و بیش چار نسلوں کی ذہنی تربیت میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ شفیع الدین نیر مولوی اسماعیل میرٹھی کی قائم کردہ روایت کو اس طرح بہت آگے لے گئے کہ آج وہ "بچوں کے شاعر" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ بچوں کے لیے ان کے کلام میں ہمیشہ ایک اخلاقی پیام ہوتا ہے جسے وہ بچوں ہی کی زبان میں اور محاکات میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں درجہ بندی کی ایسی کوشش کی گئی ہے کہ ہر عمر کا بچہ اپنی استعداد اور مذاق کے مطابق نظم کا انتخاب کر سکتا ہے۔ ان نظموں میں یاد ہو جانے کی بھی خوبی پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین "اعتراف حق" کے عنوان سے شفیع الدین نیر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

> "ان میں بچوں کے ذہن کو سمجھنے اور ان سے محبت کرنے کی وہ صفت ہے جو پیدائشی معلم کا جوہر ہوتی ہے۔ نیز ذوق ادب اور ذوق جمال کی سمت بچوں کی رہنمائی کے لیے جس صلاحیت کی ضرورت ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہے" [۱]

شفیع الدین نیر کی پہلی تعلیمی نظم "صبح" سنہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔ وہ جامعہ

---

[۱] "پیام تعلیم" شفیع الدین نیر نمبر ستمبر ۱۹۷۸ء ص ۹

پیاسا میں ثانوی مدرسے میں اردو کے معلم تھے۔ وہ بچوں کو اردو پڑھاتے اور ان سے اپنی تخلیقات کے لیے مواد حاصل کرتے تھے۔ وہ بچوں کے نفسیاتی معاملات، ذوق اور پسند اور ناپسند کا اندازہ کرنے میں بخوبی ماہر تھے۔ انھوں نے بچوں کے لیے لاتعداد کہانیاں نظمیں، ڈرامے اور مضامین لکھے ہیں جو کتابی شکل میں شائع ہوئے ان کی بیشتر کہانیوں اور نظموں کی اشاعت کتابی شکل میں کئی کئی بار ہو چکی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نیر بچوں کی نفسیات کو پوری طرح سمجھتے بلکہ ان کے تغیرات کا بھی پورا شعور رکھتے تھے جو عمروں کے تفاوت سے لازمی طور پر ان کے جذبات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ بچوں کے ذہن ماحول اور نشیب و فراز کو سمجھنے میں بھی مہارت رکھتے تھے ان کی شعری اور نثری تخلیقات میں بچوں کی عمر نفسیات اور ذہنی استعداد کا شعور ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔

شفیع الدین نیرؔ کی زبان ہلکی پھلکی اور عام فہم ہے۔ بچوں کو ان کی بات سمجھنے میں دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ ان کی نظموں میں نغمگی کے ساتھ شگفتگی اور روانی ہے۔ نظموں کے موضوعات زندگی سے متعلق ہیں اور ان میں تنوّع کی کمی کا مطلق احساس نہیں ہوتا۔ ان کی نظموں کے موضوعات بچوں کو اخلاقی تعلیم دینے کا وسیلہ ہیں وہ چاہتے تھے کہ بچے نیک صلح کن، صداقت شعار، مودب و مہذب، محنتی، سمجھدار، عبادت گزار، انسان دوست اور محب ملک و قوم بنیں۔

حب الوطنی اور قومی یک جہتی سے معمور نظموں میں "آزادی کا مبارک دن" "جھنڈا اونچا رہے گا" "دیش پریمی کی دعا" "برکھا رت" "اچھے شہری" "وادی کشمیر" "یاد جواہر"۔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی ایسی نظموں کا مجموعہ "وطنی نظموں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی غرض سے تخلیق کی جانے والی نظمیں ان کے مجموعوں "اسلامی نظمیں" اور "اخلاقی نظمیں" شامل ہیں۔ شفیع الدین نیرؔ نے ان نظموں میں اسلام کا جو تصور پیش کیا ہے وہ بنیادی طور پر خدا پرستی، انسانی مساوات اور مذہبی رواداری کا حامل ہے ان کی یہ نظمیں بچوں کی اخلاقیات اور انسانیت کا درس دینے کے ساتھ انھیں اپنی ذہنی اور عملی قوتوں کو انسان کی فلاح اور بہبود کے لیے وقف کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔

"بچوں کا تحفہ" ان کی تعلیمی نظموں کا مجموعہ دو حصوں میں پھیلا ہوا ہے۔ حصہ اول

شفیع الدین نیر

شفیع الدین نیرؔ بچوں کے وہ بڑے ادیب اور شاعر ہیں جنھوں نے صرف بچوں کے ادب کو اپنا مطمح نظر جانا اور زندگی کی آخری سانس تک "ادب اطفال" کی خدمت کرتے رہے انھوں نے اس سے ہٹ کر بڑوں کے لیے لکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ موصوف نے بچوں کے لیے جو کچھ لکھا ہے وہ یہ سوچ کر لکھا ہے کہ ایک مقدس قومی اور انسانی فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ان کا تعلق جس قومی تعلیمی ادارے یعنی جامعہ ملیہ اسلامیہ سے رہا ہے اس کی اعلی قدروں اور آدرشوں نے بھی ہمیشہ انھیں اس کام کو بہتر سے بہتر انجام دینے کا حوصلہ بخشا ہے۔ ان کی تصانیف نے اردو جاننے والوں کی کم و بیش چار نسلوں کی ذہنی تربیت میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ شفیع الدین نیرؔ مولوی اسماعیل میرٹھی کی قائم کردہ روایت کو اس طرح بہت آگے لے گئے کہ آج وہ "بچوں کے شاعر" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ بچوں کے لیے ان کے کلام میں ہمیشہ ایک اخلاقی پیام ہوتا ہے جسے وہ بچوں ہی کی زبان میں اور محاکات میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں درجہ بندی کی ایسی کوشش کی گئی ہے کہ ہر عمر کا بچہ اپنی استعداد اور مذاق کے مطابق نظم کا انتخاب کر سکتا ہے۔ ان نظموں میں یاد ہو جانے کی بھی خوبی پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین "اعتراف حق" کے عنوان سے شفیع الدین نیر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

> "ان میں بچوں کے ذہن کو سمجھنے اور ان سے محبت کرنے کی وہ صفت ہے جو پیدائشی معلم کا جوہر ہوتی ہے۔ نیز ذوق ادب اور ذوق جمال کی سمت بچوں کی رہنمائی کے لیے جس صلاحیت کی ضرورت ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہے"[1]

شفیع الدین نیر کی پہلی تعلیمی نظم "صبح" سنہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ وہ جامعہ

---

[1] "پیام تعلیم" شفیع الدین نیر نمبر ستمبر ۱۹۷۸ء ص ۹

[illegible] ۔ وہ بچوں کے درمیان رہ کر اپنی تخلیقات کے لیے مواد حاصل کرتے تھے۔ وہ بچوں کے نفسیاتی مطالبات، ذوق اور پسند اور ناپسند کا اندازہ کرنے میں بخوبی ماہر تھے۔ انھوں نے بچوں کے لیے لاتعداد کہانیاں، نظمیں، ڈرامے اور مضامین لکھے ہیں جو کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ ان کی بیشتر کہانیوں اور نظموں کی اشاعت کتابی شکل میں کئی کئی بار ہو چکی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نیر بچوں کی نفسیات کو پوری طرح سمجھتے بلکہ ان کے تغیرات کا بھی پورا شعور رکھتے تھے جو عمروں کے تفاوت سے لازمی طور پر ان کے جذبات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ بچوں کے ذہنی ماحول اور نشیب و فراز کو سمجھنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی شعری اور نثری تخلیقات میں بچوں کی عمر، نفسیات اور ذہنی استعداد کا شعور ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔

شفیع الدین نیر کی زبان ہلکی پھلکی اور عام فہم ہے۔ بچوں کو ان کی بات سمجھنے میں دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ ان کی نظموں میں نغمگی کے ساتھ شگفتگی اور روانی ہے۔ نظموں کے موضوعات زندگی سے متعلق ہیں اور ان میں تنوع کی کمی کا مطلق احساس نہیں ہوتا۔ ان کی نظموں کے موضوعات بچوں کو اخلاقی تعلیم دینے کا وسیلہ ہیں وہ چاہتے تھے کہ بچے نیک، صلح کن، صداقت شعار، مودب و مہذب، محنتی، سمجھدار، عبادت گزار، انسان دوست اور محب ملک و قوم بنیں۔

حب الوطنی اور قومی یک جہتی سے معمور نظموں میں "آزادی کا مبارک دن"، "جھنڈا اونچا رہے گا"، "دیش پریمی کی دعا"، "برکھا رت"، "اچھے شہری"، "وادی کشمیر"، "یاد جواہر"، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی ایسی نظموں کا مجموعہ "وطنی نظموں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی غرض سے تخلیق کی جانے والی نظمیں ان کے مجموعوں "اسلامی نظمیں" اور "اخلاقی نظمیں" شامل ہیں۔ شفیع الدین نیر نے ان نظموں میں اسلام کا جو تصور پیش کیا ہے وہ بنیادی طور پر خدا پرستی، انسانی مساوات اور مذہبی رواداری کا حامل ہے۔ ان کی یہ نظمیں بچوں کی اخلاقیات اور انسانیت کا درس دینے کے ساتھ انھیں اپنی ذہنی اور عملی قوتوں کو انسان کی فلاح اور بہبود کے لیے وقف کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔

"بچوں کا تحفہ" ان کی تعلیمی نظموں کا مجموعہ دو حصوں میں پھیلا ہوا ہے۔ حصہ اول

میں چھبیس اور حصہ دوم میں چوبیس نظمیں ہیں۔ ان نظموں کے ذریعے بچوں کو اپنے گرد و پیش کی زندگی کا مشاہدہ کرنے کی طرف مائل کیا گیا ہے۔ "بچوں کا تحفہ" کی نظموں کی خصوصیات کے بارے میں شفیع الدین نیر نے خود لکھا۔

"ان نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ میں نے ان نظموں کے ذریعے بچوں کو گرد و پیش کی چیزوں سے دلچسپی لینے اور ان کا بغور مشاہدہ کرنے کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی ہے۔
اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضرورت تھی کہ:۔
اول: زبان سلیس، عام فہم، اور بامحاورہ ہو۔
دوم: خیالات سادہ ہوں۔
سوم: عام اور مفید معلومات فراہم کی جائیں۔
چہارم: بغیر نصیحت کا پیرایہ اختیار کیے ہوئے اخلاقی تعلیم کا پورا لحاظ رکھا جائے۔
پنجم: نظموں میں روانی اور اختصار ہو۔
ششم: عنوانات میں تنوع ہو۔
ہفتم: بحریں قابل ترنم ہوں۔"[1]

شفیع الدین نیر نے اپنی تمام نظموں میں ان خصوصیات کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ "بچوں کا تحفہ" کی مقبولیت اور افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اس کا پہلا ایڈیشن اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا اور جون سنہ ۱۹۴۶ء تک وہ گیارہ بار چھپا جس کی کل تعداد اشاعت چالیس ہزار تھی۔ مجموعہ محکمہ ہائے تعلیم صوبہ جات، صوبہ متحدہ صوبہ بمبئی، صوبہ دہلی اور ریاست حیدر آباد دکن کے مدارس کے لیے سرکاری طور پر منظور شدہ تھا۔ علاوہ ازیں ان کی منظوم پہیلیوں کا مجموعہ "گمی شئے" کے نام سے شائع ہوا۔ جو بچوں میں آج تک مقبول ہے۔ نظموں پر مشتمل ان کے دوسرے مجموعے "منی کے گیت" "منی کا تحفہ" "بچوں کا کھلونا" اور "ہماری لغت" منظر عام پر آچکے ہیں۔ موضوعات کے تنوع اور زبان کے

---

[1] "بچوں کا تحفہ" حصہ اول سولہواں ایڈیشن ۱۹۵۱ء نیر کتاب گھر (نئی دہلی) ص اول

[illegible] شفیع الدین نیر کی [illegible] آبادی کیا جائے تو یہ جاننا ہوگا۔
کہانیوں کے علاوہ "ستارہ کا تحفہ" "پرستان کی سیر" "ریڈیو کا بھوت" "بلے کا انصاف" "گنگا کی دوڑ" "مکھی کا ڈبہ" "مگر کا آئینہ" "بلیع شہزادی" "چمن خوش" "پری کی چھڑی" "میاں مٹھو" "منی کا پرستان" "بونے کا جوتا" شفیع الدین نیر کی مشہور اور مقبول کہانیاں ہیں۔

آزادی ہند سے پہلے کے پیام تعلیم (دہلی) کی فائلوں میں شفیع الدین نیر کی تقریباً بہتر نظمیں، دس مضامین، آٹھ نثری ترجمے اور بارہ کہانیاں میری نگاہ سے گزریں۔

یہ تخلیقات سنہ ۱۹۲۷ سے سنہ ۱۹۴۶ء تک کے شماروں میں بکھری ہوئی ہیں۔ ۱۹۴۷ء تک شفیع الدین نیر کا مرتبہ بچوں کے ایک اہم اور معتبر فن کار کی حیثیت سے مستحکم اور مستند ہو چکا تھا۔ آزادی ہند کے بعد بھی ان کا تخلیقی سفر مسلسل جاری رہا۔ اس اثنا میں انھوں نے نظمیں، لوریاں، نعت، قوالی، پہیلیاں، کہانی اور ڈرامے ہر صنف پر طبع آزمائی جاری رکھی اور "پیام تعلیم" نیز ہند و پاک کے بچوں کے دیگر رسائل میں متواتر ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ ان اصناف کے علاوہ شفیع الدین نیر نے بچوں کے لیے درسی، معلوماتی، اور اخلاقی مضامین بھی لکھے ہیں۔ "یو این او" "تعلیمی میلے کی دھوم" "تعلیمی میلہ" "ایک پہیلی" "باپو کی یاد" وغیرہ ان کے قابل ذکر مضامین ہیں۔ نیر نے بچوں کے لیے دیگر زبانوں سے بھی کتابیں ترجمہ کی ہیں جو نہرو بال پستکالیہ دہلی کے زیر اہتمام منظر عام پر آئیں۔ ایسی کتابوں میں "پرندوں کی دنیا" اور "خالہ بلی کا خاندان" خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ شفیع الدین نیر نے بچوں کے لیے مرزا غالب کی حیات اور کارناموں پر مشتمل "غالب کی کہانی" بھی قلمبند کی ہے۔ اس کتاب کی خوبی اس کا عام فہم اور دلنشین انداز بیان اور مواد کی ہنرمندانہ ترتیب ہے۔

شفیع الدین نیر نے اپنی تخلیقات میں تعقل، کشادہ نظری اور انسان دوستی کا ایک ایسا نظریہ حیات پیش کیا جو بچوں کو اس دور ترقی میں خود اعتمادی کے ساتھ زندہ رہنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ شفیع الدین نیر کی ادبی خدمات کے اعتراف میں "پیام تعلیم" دہلی نے دو حصوں میں ان پر خاص نمبر شائع کیا جو بالترتیب ستمبر سنہ ۱۹۷۷ء اور نومبر سنہ ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آئے۔ جن میں ڈاکٹر مسعود حسین خان، خوشونت سنگھ، ظہیر احمد صدیقی، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر تنویر علوی، ڈاکٹر قمر رئیس اور احمد جمال پاشا جیسے اہل قلم

نے شفیع الدین نیر کی زندگی میں ہی ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے خراجِ تحسین پیش کیا۔

مجموعی طور پر شفیع الدین نیر کی کتابی شکل میں شائع شدہ نثری تصانیف کی تعداد تینتیس ہے جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) گنگلے کی دوڑ
(۲) میں گھر جاؤں تو کیسے
(۳) مکھن کا ڈبہ
(۴) ڈھول کا پول
(۵) آٹے کا پتلا
(۶) ہوشیار حسن
(۷) تارہ کا ڈنڈا
(۸) انار راجہ
(۹) بطخ شہزادی
(۱۰) ریڈیو کا بھوت
(۱۱) بونے کا بٹوا
(۱۲) پری کی چھڑی
(۱۳) پرستان کی سیر
(۱۴) بونے کا انصاف
(۱۵) چھن منن
(۱۶) منی کا پرستان
(۱۷) ٹلو میاں
(۱۸) انوکھی چھتری
(۱۹) میاں مٹھو
(۲۰) طلسمی مینا
(۲۱) کھلو میاں
(۲۲) ہماری زندگی
(۲۳) یادگار انگوٹھی
(۲۴) بدھو کی بیوی
(۲۵) جنگو منگو
(۲۶) پیسے کا صابن
(۲۷) گھر کا آئینہ
(۲۸) عید کے کھلونے
(۲۹) باپ کی ناؤ
(۳۰) مزدور کا بیٹا
(۳۱) شیر خاں کے معرکے
(۳۲) غالب کی کہانی
(۳۳) نئی کہانیاں۔

اگرچہ شفیع الدین نیر کی نثری تصنیفات کتابی شکل میں زیادہ ہیں۔ مگر ان میں زیادہ تر چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں جو بچوں کے لیے بہت موٹے موٹے حروف میں لکھی گئی ہیں۔ ایک ایک کہانی کو کتابی شکل دی گئی جب کہ "بچوں کا تحفہ" میں ہی کل چالیس نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان، پاکستان کا کوئی رسالہ ایسا نہیں جس میں شفیع الدین نیر

[illegible]

حسین حسّان

شفیع الدین نیر کے ہم عصر اور ساتھی حسین حسان بچوں کے ادیب کی حیثیت سے معروف ہیں۔ وہ کافی عرصے تک بچوں کے مشہور رسالے "پیام تعلیم" کے ایڈیٹر رہے اور اس پرچے کی تدوین و ترتیب کے ساتھ خود بھی تندہی کے ساتھ بچوں کے لیے کہانیاں اور مضامین لکھتے رہے۔ انھوں نے آزادی ہند سے قبل اور اس کے بعد بھی بچوں کے ادب میں جتنا وسیع و وقیع اضافہ کیا ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ "پیام تعلیم" کی پرانی فائلوں میں سنہ ۱۹۴۷ء تک حسین حسان کی بائیس کہانیاں، پانچ ترجمے اور پچیس متفرق مضامین ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ "پیام تعلیم" کے اداریے "ادب اطفال" سے متعلق کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اور دیباچے وغیرہ بھی ان کے قلم سے نکلتے رہے۔ حسین حسان کی کہانیوں میں "چھوٹا چتو" "شریر موتی" "گیند کھو گئی" "اونٹ کی پیٹھ پر کب" "انوکھا کھیل" "انوکھا ساتھی" "دانت میں چھید" "ڈولفن کا سرکس" "تم کہاں ہو" "توتا چشتی" "الٹا چناؤ" "لچکدار کمان" "ایک ذرا سی عقل بھی" قابل ذکر ہیں۔ ان کہانیوں میں بھی بچوں کے لیے عام فہم زبان استعمال کی گئی ہے۔ اور ان کہانیوں کے وسیلے سے مفید مطلب موضوعات نہایت پر اثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان کی "ہم آزاد ہیں" اور "پنیر کی دعوت" ترجمہ کردہ کہانیاں ہیں جو "پیام تعلیم" میں چھپنے کے بعد کتابی شکل میں بھی منظر عام پر آئیں۔ "ننھا صوفی" "دولتی" "بڑے آدمیوں کا دیس" "محترم" "پانی" "نیک نکولس" "خلیفہ مامون کا بچپن" "تانبیل خاں" "سر فضل حسین" "اژدہے کا شکار" "جانوروں کی نمائش" "مریخ" "پیام تعلیم کی کہانی" "حفاظتی انجمن" "پانی اور تیل کا میل" "گولکنڈہ کی تاریخی سیر" سنہ ۱۹۴۷ء میں "ہمالیائی بھیں" "مرزا غالب اگر گلی میں جائیں" ان کے مشہور دلچسپ اور معلوماتی مضامین ہیں۔ حسین حسان نے بچوں کی سیرت سازی کی غرض سے "سرکار دو عالم" "حضور پر نور سرور کائنات کی سیرت" نامی کتاب تصنیف کی۔ علاوہ ازیں "مختلف ملکوں کے بچے" "اٹلی اور اس کے باشندے" "ہماری سرزمین" "دنیا کے بچے" "سیاح اور سیاح" "سیلون" "کالی ماتا کو نینڈا" وغیرہ

حسین حسان کے ایسے مضامین ہیں جن کے ذریعے بچوں کو مختلف ممالک کے بارے میں [illegible]
مطلب قسم کی معلومات فراہم کی گئی ہے۔

بچوں کیلئے حسین حسان کی تصانیف میں "سرکس" "بندر والا" "چنبیلی" "نیا محسوس نامہ" "دیمک" "برف کا گھر" "آستین کا سانپ" "چاند" "میر تقی میر" "دنیا کے بچے" "انوکھا عجائب خانہ (چار حصے)" "میر انیس" "تانبیل خاں" "جیت کس کی" "دعوت ملا جی کی" "چینی کی گڑیا" "بہادر سیاح" "چچا غالب" وغیرہ کتابیں خصوصیت کی حامل ہیں۔

ماہنامہ "پیام تعلیم" (نئی دہلی) نے حسین حسان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے نومبر سنہ ۱۹۷۴ء میں "حسین حسان نمبر" شائع کیا۔ جس میں اردو کے بہت سے نقادوں، فنکاروں نے "ادب اطفال" میں حسین حسان کی خدمت کا بھرپور اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہاں اس نکتے کی جانب اشارہ کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک نثری تحریروں کا تعلق ہے، معیار و مقدار ہر دو اعتبار سے حسین حسان کا کام شفیع الدین نیر کی نثری تصنیفات سے زیادہ وقیع ہے۔ البتہ شفیع الدین نیر کی شعری کاوشوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو "ادب اطفال" کو ان کی دین حسین حسان سے وقیع تر قرار پاتی ہے۔

قدسیہ زیدی:

بچوں کے ادب میں باتصویر کہانیوں کی روایت کو فروغ دینے والوں میں قدسیہ زیدی کا نام اہم ہے۔ انھوں نے بھی اپنے قلم کو صرف بچوں کے لیے وقف رکھا۔ معلوماتی مضامین اور تراجم کے علاوہ قدسیہ زیدی نے کئی اچھی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ مکتبہ جامعہ سے شائع ہونے والی ان کی باتصویر کہانیوں میں "جاں باز سپاہی" "بھن بھن بھانو" "ان تھک جان" "گاندھی بابا کی کہانی" "گلابی چوہیا اور غبارے" شامل ہیں۔ کتابی دنیا دہلی نے بھی ۱۹۷۴ء میں قدسیہ زیدی کی کتاب "کیسے چلپہ دیا" شائع کی۔ ان کے متفرق معلوماتی مضامین میں "کچھ پرواہ نہیں" (پیام تعلیم، ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء) "راشٹرپتی" (پیام تعلیم نومبر سنہ ۱۹۵۴ء) "ننھے فنکاروں کی تصویریں" (پیام تعلیم مارچ سنہ ۱۹۵۴ء) "فقیر دادا" (پیام تعلیم جنوری / فروری سنہ ۱۹۵۴ء) وغیرہ اپنی افادیت کے اعتبار سے پڑھنے والوں کی توجہ بیساختہ اپنی جانب مبذول کر لیتے ہیں اور آج بھی ان کی افادیت میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا۔ (سنہ ۱۹۷۴ء)

کے بعد موصوف نے بچوں کے لیے مغربی طرز پر کتابیں لکھیں۔ ان کی تخلیقات میں [illegible]
اور نئے فنکاروں کی تصویریں" "سطح پر ہوا اور غبارے" اور دنیا کے جانور قابل ذکر ہیں
جو نیشنل بک ٹرسٹ دہلی نے ذاکر حسین سیریز کے تحت شائع کیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو:۔

اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ اردو "ادب اطفال" میں پنڈت جواہر لال نہرو کا نام بھی شامل ہے اس کے ثبوت میں ان کے "پیام تعلیم" دہلی میں شائع شدہ مضامین پیش کیے جا سکتے ہیں۔ "دنیا کی سب سے جاندار اشیاء" (جنوری سنہ ۱۹۳۰ء) "دنیا کی تاریخ کیسے لکھی گئی" (مارچ سنہ ۱۹۳۰ء)، "ایک عقلمند آدمی" (نومبر سنہ ۱۹۵۵ء)۔ "ہمارا ملک" (اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء) وغیرہ تمام مضامین معلوماتی ہیں۔ اس طرح اس دلچسپ حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ انگریزی کے علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو کے قلم سے اردو میں بھی کچھ تحریریں بچوں کے لیے نکلیں۔ ان مضامین کی زبان اور طرز تحریر نہایت عام فہم ہے لیکن طوالت کا یہ عالم ہے کہ موضوع کی خشکی کا پڑھنے والوں کو چنداں احساس نہیں ہوتا۔

الیاس احمد مجیبی:۔

الیاس احمد مجیبی بھی "ادب اطفال" کو جامعہ کی ہی دین ہیں جن کا نام بچوں کے ان ادیبوں کی صف میں شامل ہے جنھوں نے تاریخی، مذہبی اور اخلاقی کہانیاں بڑی تعداد میں تخلیق کیں۔ ان کی قابل ذکر تصانیف میں "پیار کی سوئی" "صفو دادا" "پاشو" "کیا کھاد کیا پیو" "نصیب کھلے پھول کھلے" "الف لیلیٰ کی کہانی" "دیو مار لڑکا" "چور" "خدا کی باتیں خدا ہی جانے" "منشی جی" "امانت" وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔
"ولیوں کی باتیں" "آں حضرت" "دس علتی" "سرکار کا دربار" مذہبی موضوعات پر ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ "ننھی منی کہانیاں" میں انھوں نے حالی، عبد الحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر مجیب کی لکھی ہوئی کہانیاں مرتب کی ہیں۔ الیاس مجیبی نے بچوں کے لیے نوع بنوع موضوعات پر نثر میں طبع آزمائی کی۔ منشی پریم چند کی کچھ کہانیوں کے ترجمے بھی الیاس مجیبی نے اردو میں کیے ہیں، جن میں "کشمیری سیب" قابل ذکر ہے۔

عبدالواحد سندھی :۔

عبدالواحد سندھی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ابتدائی مدرسہ میں معلم تھے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ اپنے وطن سندھ چلے گئے۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تقریباً پندرہ سال تک استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی نظریات کے پیش نظر عبدالواحد سندھی نے بچوں کے لیے بہت سی مفید اور دلچسپ کتابیں لکھیں۔ جن میں معلوماتی، اخلاقی، اصلاحی اور مذہبی کئی نوعیتوں کی کہانیاں اور مضامین ملتے ہیں۔ مذہبی نوعیت کی کتابوں میں "اسلام کیسے شروع ہوا" "اسلام کے مشہور سپہ سالار" (دو حصے) قابل ذکر ہیں۔ دلچسپ کہانیوں میں "تاک دنا دن تاکے سے" "روٹی کس نے پکائی" "پھر میں چکوں کیا خاک" "پانچ بونے" "چیونٹی رانی" "بچوں کی کہانی" "پکڑو دم کٹے کو" "مدو رانا پردیس چلے" "سوچو" "پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا" وغیرہ بچوں کے لیے اپنے اندر دلچسپی کا وافر سامان رکھتی ہیں۔

عبدالواحد سندھی نے چھوٹے درجات میں پڑھنے والے بچوں کا خاص خیال رکھا ہے ان کی کتابوں میں کئی تو اتنی آسان ہیں کہ دوسری، تیسری جماعت کا بچہ انھیں اپنے طور پر پڑھ کر لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ اصلاحی اور اخلاقی تعلیم کے لیے اتنی مدھم اور دلچسپی کے عنصر سے اس طرح آمیز ہے کہ چلبلے بچوں کے مزاج اور پسند کی چیز بن گئی ہے۔

عبدالواحد سندھی نے بھی اپنی کتابوں میں بچوں کی عمروں کے مختلف مدارج اور ذہنی استعداد کے فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔ "پھر میں چکوں کیا خاک" "روٹی کس نے پکائی" اور "تاک دنا دن تاکے سے" وغیرہ پانچ سے آٹھ سال تک کے بچوں کے لیے تخلیق کی گئیں۔ "بچوں کی کہانیاں" (چار کہانیوں کا مجموعہ ہے) "پانچ بونے" "چیونٹی رانی" وغیرہ نو برس سے چودہ برس کے بچوں کے لیے لکھی گئیں۔

عبدالغفار مدھولی :۔

جامعہ کے ایک اور استاد عبدالغفار مدھولی نے، بچوں کے لیے متعدد ڈرامے تصنیف

کیے۔ انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی تعلیمی تحریک اور بچوں کی تعلیم و تربیت میں جو اہم کردار ادا
کیا ہے۔ وہ پہلے ابتدائی مدرسے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پھر اساتذہ کے مدرسے میں معلم تھے
عبدالغفار مدھولی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو خط و کتابت کورس کے روح رواں
رہے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی سرکردگی میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اصلاحی "ادب اطفال"
کی جو تحریک چلائی گئی اس کے تحت مختلف مصنفین کے لیے خاص میدان مقرر کر دیے گئے۔
چنانچہ عام طور پر شفیع الدین نیر نے نظمیں، حسین حسان نے کہانیاں اور عبدالغفار مدھولی نے
ڈرامے لکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبدالغفار مدھولی نے "ادب اطفال" میں اردو ڈرامے کو اس کا
مناسب حق دلایا۔ عام طور پر اردو ادب میں ڈرامے کو باعتبار مقدار کم ور ترین صنف سمجھا جاتا
ہے۔ ادب اطفال میں تو یہ صنف اور بھی زیادہ کمیاب تھی۔ اکا دکا چیزوں کے علاوہ یہ میدان
خالی سا نظر آتا ہے۔ عبدالغفار مدھولی نے اس خلا کو اپنی تخلیقی کاوشوں سے بڑی حد تک پُر
کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے بچوں کے لیے ایسے ڈرامے تخلیق کیے جنھیں مختلف العمر بچے
خود کھیل (PLAY) سکیں۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں ان کے تین ڈرامے "قوم پرست طالب علم" "اسکول
کی زندگی" اور "محنت" مکتبہ جامعہ کے وسیلے سے منظر عام پر آئے بعد ازاں ان کے کچھ ڈرامے
کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ جن میں "چھوٹا لڑکا" "چور لڑکا" "بچوں کی عدالت میں" "وعدے"
"مدکا پلیٹ" وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی لکھی ہوئی کہانیاں بھی مل
جاتی ہیں۔ "بچوں کا انصاف" "مکتب کا ایک بچہ" "ایک غلط فہمی کا ازالہ" "بچے بڑوں سے
کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں" "مقصدی طریقہ تعلیم" اور بچوں کی تعلیم و تربیت کی ایسی نثری تخلیقات
ہیں جو بچوں کی دلچسپی کو اپنے میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

عبدالغفار مدھولی نے پرائمری اور مڈل اسکول کے طلبہ کے لیے کئی درسی کتابیں بھی
مرتب کیں جو جامعہ کے علاوہ دہلی کے سرکاری مدارس میں عرصے سے پڑھائی جارہی ہیں۔
جامعہ کے خط و کتابت کورس کے لیے بھی موصوف نے کچھ کتابیں مرتب کیں۔ ان کا ایک بڑا
کارنامہ "کیمپ فائر کی نظمیں" ہے۔ اس کتاب میں اسکاؤٹ بچوں کے لیے نہایت دلچسپ اور
کارآمد مواد خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً ہنسنے ہنسانے کی نقلیں، خاص طرز کے لوگوں
کی نقلیں، نظمیں پڑھنے کی اداکاری۔ مزاحیہ گانے۔ اسکاؤٹنگ کے نعرے، جنگل کے ناچ۔

رتب کے کھیل وغیرہ۔

مجموعی اعتبار سے عبدالغفار مدھولی "ادب اطفال" میں ایک منفرد نوعیت کی تصانیف کے باعث مدتوں یاد کیے جائیں گے۔

پروفیسر عبدالغفور:۔

پروفیسر عبدالغفور کا نام آزادی ہند سے پہلے بچوں کے ادیب کی حیثیت سے خاصا معروف تھا۔ انھوں نے بچوں کے لیے معلوماتی درسی مضامین اور اچھی اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں "سونے کی چڑیا"، "بڑے دادا کی کہانی" اور "انوکھی ملاقات" کتابی صورت میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ علاوہ ازیں "بچوں کی دکان" (پیام تعلیم مئی سنہ ۴۳ء) "پگڈنڈی کی کہانی" (پیام تعلیم جولائی سنہ ۴۳ء) "تاریخی جوڑے سیر کو چلے" (پیام تعلیم اکتوبر سنہ ۴۵ء) "دنیا کا استاد" (پیام تعلیم سنہ ۴۵ء) ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔ "پیام تعلیم" دہلی میں شائع ہونے والے معلوماتی اور جغرافیائی مضامین کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ جن میں "زمین کا جسم" (جنوری سنہ ۴۶ء) "زمین کی عمر" (فروری سنہ ۴۶ء) "زمین کے کھیل" (اپریل سنہ ۴۶ء) "ابوالہول کے بنانے والے" (جنوری سنہ ۴۵ء) "ٹھوکنے کی عادت" (اپریل سنہ ۴۵ء) اور "یانگ سی کیانگ کی وادی" (جون سنہ ۴۵ء) خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

مشتاق احمد اعظمی:۔

مشتاق احمد اعظمی بھی جامعہ کے مصنفین کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے معلوماتی مضامین زیادہ تعداد میں لکھے ہیں جو بیشتر آزادی ہند سے قبل پیام تعلیم (دہلی) کے مختلف شماروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں اکثریت سائنسی مضامین کی ہے۔ مثلاً "نمک" (جنوری سنہ ۴۳ء) "پودے" (فروری سنہ ۴۳ء) "بجلی کا کڑکا" (مارچ سنہ ۴۳ء) "ہم کیوں سوتے ہیں" (مارچ سنہ ۴۳ء) "کشتی" (اگست سنہ ۴۳ء) "بجلی کے کھیل" (ستمبر سنہ ۴۳ء) "مزے مزے کے کھیل" (اکتوبر سنہ ۴۳ء) "انڈوں کا گلدستہ" (ستمبر سنہ ۴۵ء) "ہماری زمین" (فروری سنہ ۱۹۵۱ء) اور "ابتدائی آدمی کی کہانی" (مئی سنہ ۱۹۵۴ء) وغیرہ ان کی مشہور تصنیف "تاریخ ہند کی کہانیاں" جو چار جلدوں پر مشتمل

سید انصاری :۔

سید انصاری بھی بچوں کے لیے لکھتے رہے ہیں۔ وہ ماہر تعلیم تھے اور جامعہ کے استادوں کے مدرسے سے منسلک تھے۔ موصوف نے بھی بچوں کے لیے کئی معلوماتی اور تاریخی مضامین لکھے جن میں سے بیشتر آزادی ہند سے قبل کی تصنیفات ہیں۔ "محمد بن قاسم" ۔ غیاث الدین بلبن" ، "کولمبس" ، "سلطان فیروز تغلق کی تخت نشینی اور تخت کشی" ، "کشمیر بہشت نظر" قابل ذکر مضامین ہیں۔ سید انصاری نے بچوں کی کہانیاں بھی قلمبند کی ہیں جن میں "فرش سے عرش پر" ، "بھولا بچہ" اور "طلسمی انگوٹھی" بطور خاص توجہ طلب ہیں۔ "طلسمی انگوٹھی" ایک جرمن کہانی کا اردو ترجمہ ہے اور کتابی شکل میں منظر عام پر آچکی ہے۔ "بچوں کے حالی" ایک اور ادبی معلوماتی کتاب مکتبہ جامعہ نے شائع کی۔

ڈاکٹر سلامت :۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماہرین تعلیم میں ڈاکٹر سلامت اللہ کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ موصوف نے بچوں کے لیے بھی معلوماتی مضامین اور دلچسپ کہانیاں تخلیق کیں۔ جامعہ کے جامعہ کے استادوں کے مدرسے سے منسلک ہونے کی وجہ سے انھیں بچوں کی نفسیات، ان کی دلچسپیوں اور ان کی تعلیمی ضروریات سے مکمل آگاہی تھی۔ "ستاروں کے جھمکے" ، "سورج کے گرد زمین کا چکر" ، "سورج کی کہانی" ، "ہم چاند کیوں دیکھتے ہیں" ، "چاند کی شکلیں" ، "چاند گرہن" ، "سورج گرہن" ان کے مفید اور معلوماتی مضامین ہیں۔ جن میں سائنسی نکات خوش اسلوبی کے ساتھ بچوں کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ "بچوں کا شاعر" ان کی ایک دلچسپ تخلیقی کاوش ہے۔ یہ تمام مضامین سنہ ۱۹۴۷ء سے پیشتر "پیام تعلیم" کے مختلف شماروں میں اشاعت پذیر ہوئے۔

نشان خاطر رہے کہ پروفیسر عبدالغفور جیسے ایک آدھ اہل قلم کو چھوڑ کر مصنفین جامعہ میں بیشتر سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی بچوں کے لیے تصنیف و تالیف کے میدان میں سرگرم عمل رہے۔ اس لیے ان کا ذکر دور سوم میں بھی کیا جا سکتا تھا لیکن چونکہ ان لوگوں کی ادبی حیثیت

آزادی ہند سے پیشتر ہی مستحکم ہو چکی تھی لیکن ان کی تحریروں کا زیادہ تر حصہ ۱۹۴۷ء سے پیشتر ہی زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا تھا۔ اس لیے ان کے تذکرے دورِ دوم میں شامل کیے گئے ہیں۔

"ادبِ اطفال" کے دورِ دوم کا یہ جائزہ کوثر چاند پوری، شجاع احمد قائد، مسلم ضیائی، حامد حسن قادری، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، نور الحسن ہاشمی، مسعود حسین خاں، رئیس احمد جعفری، خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گا۔ بڑوں کے لیے لکھنے والوں میں نامور فنکاروں نے سنہ ۱۹۴۷ء سے قبل بچوں کے لیے بھی قلم اٹھایا، کسی نے زیادہ کسی نے کم "ادبِ اطفال" میں اضافہ ضرور کیا ہے۔ اس گروپ کے مصنفین کی اکثریت پیشۂ تدریس سے وابستہ تھی اور اگر چند لوگ اس پیشے سے منسلک نہ تھے تو ان کا تعلق کالج یا یونیورسٹی کی تعلیم سے تھا۔ اس لیے مجموعی طور پر ان کی تخلیقات بیشتر تفریحی نوعیت کی ہیں۔ جن میں براہ راست سبق دینے یا کردار کی اصلاح کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

حامد حسن قادری :-

حامد حسن قادری نے بچوں کے لیے کچھ نظمیں لکھی ہیں جن میں "جاڑے کی بہار" (پیامِ تعلیم جنوری سنہ ۱۹۴۲ء)، "فوارہ" (پیامِ تعلیم مارچ سنہ ۱۹۴۲ء) "میری گڑیا" (پیامِ تعلیم اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء) اور "ننھا کسان" (پیامِ تعلیم دسمبر سنہ ۱۹۴۳ء) قابلِ ذکر ہیں۔

رشید احمد صدیقی :-

رشید احمد صدیقی جیسے طنز و مزاح نگار بھی بچوں کے لیے لکھنے سے پیچھے نہیں رہے۔ "مطولا کہانی" (پیامِ تعلیم مئی سنہ ۱۹۴۴ء) اور "خوانچے والا" (پیامِ تعلیم اپریل، مئی سنہ ۱۹۴۶ء) ان کی قابلِ ذکر کہانیاں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی "احتیاط علاج سے بہتر ہے" (پیامِ تعلیم جون ۱۹۴۳ء) اور "ایک باپ کا خط اپنے بیٹوں کے نام" رشید احمد صدیقی کے معلوماتی مضامین ہیں۔ "شیخ نیازی" رشید احمد صدیقی کی تین کہانیوں کا مجموعہ کتابی شکل میں منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ زبان کا چٹخارہ اور ہلکی سی طنز کی چاشنی رشید احمد صدیقی کی تحریروں کا امتیازی

وصف ہے۔

کوثر چاند پوری :۔

کہنہ مشق ادیب کوثر چاند پوری نے بھی بچوں کے لیے کہانیاں لکھی ہیں۔ "چالاک مرغا" "لڑکے کا خواب" "چوہیا بیگم" "گاؤں کا مکھیا" "چالاک بھیڑیا" "سمندر کا شہزادہ" "سونا دار دوست" "دغاباز دوست" "مزدور کا انجام" اور "دکبڑ جادوگر" کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کہانیوں کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ ہر کہانی کئی کئی چھوٹی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ یعنی ان میں کہانی در کہانی کی تکنیک برتی گئی ہے۔ کہانیوں کی زبان بچوں کی استعداد کے مطابق ہے اور موضوعات ان کی دلچسپی کے حامل ہیں۔ انداز بیان ایسا سلیس اور رواں دواں ہے کہ بچے کہانی ختم کیے بغیر کتاب ہاتھ سے نہ رکھیں۔ ان کا ایک وصف یہ ہے کہ تقریباً ہر کتاب باتصویر ہے اور کہانیوں کے درمیان دلچسپ اسکیچز کی شمولیت نے انھیں بچوں کے لیے مزید پرکشش بنا دیا ہے۔

ان کہانیوں کے علاوہ ان کی کہانیاں "بال ہٹ" (ہمدرد صحت دہلی جولائی ۱۹۳۵ء) "اوپر جانے کا زینہ" (کھلونا فروری سنہ ۱۹۷۵ء) "ننھے ایڈیٹر" (کھلونا فروری سنہ ۱۹۷۶ء) اور "سونے کی اینٹ" (کھلونا جولائی سنہ ۱۹۷۷ء) مختلف رسائل میں شائع ہونے والی قابلِ ذکر کہانیاں ہیں۔ آگے چل کر کوثر چاند پوری نے بڑوں کے لیے مختلف اصناف ادب میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں کہ ان کے انبار میں لکھی گئی محولہ بالا کہانیاں تقریباً فراموش کر دی گئیں۔ عام طور پر "ادب اطفال" کے ضمن میں لکھے گئے مضامین میں کوثر چاند پوری کی خدمات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ انھوں نے جیسا اور جتنا کچھ لکھا ہے اس کا اعتراف برمحل موقعہ پر کرنے کی ضرورت ہے۔

مسلم ضیائی :۔

مسلم ضیائی نے بچوں کے لیے لاتعداد کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کے قلم بند کی ہوئی کہانیوں میں "کالا دیو" "بولتی کیتلی" "قمر قم تماقیل" "شیشی تارو" اور "چھٹکی خاں" کتابی شکل میں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ کتابوں کے عنوانات سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں کیسے

عجیب و غریب واقعات پر پُرلطف کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ مسلم ضیائی بھی ان فنکاروں میں سے ہیں جن کی "ادب اطفال" کے لیے خدمات کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ان کی تخلیقات کتابی صورت میں عبدالحق اکیڈمی (حیدرآباد) نے ہی شائع کی ہیں۔

شجاع احمد قائد:-

شجاع احمد قائد نے بچوں کے لیے کہانیاں، ڈرامے اور معلوماتی مضامین لکھے۔ جو کتابی شکل میں عبدالحق اکیڈمی (حیدرآباد دکن) کے وسیلے سے سنہ ۱۹۴۵ء میں منظرِ عام پر آئے۔ "لاڈلا بیٹا" "دکھنی مٹی بتیاں" "رابن سن کروسو" (ماخوذ) "عید" اور "سمندر کا جہاز" ان کے قلمبند کیے ہوئے ڈرامے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ موصوف کی معلوماتی اور اخلاقی موضوعات پر مشتمل کتابوں "سادہ زندگی" "دستر خوان" "جنگ کے بعد کیا ہوگا"؟ "چیونٹی کی فوج" "پڑوسی" "پرواز کی آواز" "کیڑے" قابلِ ذکر ہیں۔

علاوہ ازیں "آنکھ مچولی" (پیامِ تعلیم جون سنہ ۱۹۴۲ء) اور "اسکول" (پیامِ تعلیم اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء) ان کے دو ڈرامے بھی ملتے ہیں۔ شجاع احمد قائد بھی جانے کیوں بچوں کے ادیب کی حیثیت سے اتنے معروف نہیں ہوئے جتنا کہ ان کا حق تھا۔

آل احمد سرور:-

آل احمد سرور نے بچوں کے لیے مفید معلوماتی مضامین کے ساتھ ساتھ دلچسپ نظمیں لکھی ہیں۔ ان کا مضمون "ایورسٹ کی داستان اور ننگا پربت" ایک طویل اور معلوماتی مضمون ہے۔ جس میں موصوف نے دنیا کی سب سے بلند چوٹی ایورسٹ کو سر کرنے کی مختلف کاوشوں کی حکایت لذیز بیان کی گئی ہے۔ یہ مضمون پیامِ تعلیم (دہلی) میں مارچ ۱۹۳۷ء سے جون سنہ ۱۹۳۷ء تک قسط وار شائع ہوا۔ بعد ازاں مکتبۂ جامعہ نے کتابی صورت میں بھی یکجا پیش کر دیا ہے۔ سرور کی نظموں میں "نئی پود" (کھلونا نمبر سنہ ۱۹۵۴ء) اور "تین فقتے" (کھلونا فروری سنہ ۱۹۵۶ء) قابلِ ذکر ہیں۔ جن کے موضوعات بچوں کی دلچسپی کے حامل ہیں۔

نورالحسن ہاشمی :۔

نورالحسن ہاشمی نے بچوں کے لیے چند نظمیں اور معلوماتی مضامین قلم بند کیے۔ "کیوں کیوں کر کیسے" (پیام تعلیم ستمبر سنہ ۳۹ ۱۹ء) "سائنس دانوں کی کہانی" (پیام تعلیم فروری سنہ ۱۹۴۳ء) اور "موجدوں کی کہانی" (پیام تعلیم فروری ۱۹۴۳ء) مفید معلوماتی مضمون ہیں۔ نظموں میں "نرالی گھنٹی" (پیام تعلیم نومبر سنہ ۱۹۵۰ء) "چاند" (پیام تعلیم مارچ سنہ ۱۹۵۴ء) اور "لکھنؤ کی سیر" (پیام تعلیم نومبر سنہ ۱۹۵۴ء) قابلِ ذکر ہیں۔

مسعود حسین خاں

ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے بھی بچوں کے لیے اچھی نظمیں اور کہانیاں تخلیق کیں۔ "کرن سے" (پیام تعلیم نومبر سنہ ۱۹۴۹ء) اور "بنگالی بابو" (پیام تعلیم نومبر سنہ ۱۹۵۴ء) ان کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔ کہانیوں میں "دروازہ کس طرف بند ہوتا ہے" (پیام تعلیم سالگرہ نمبر ۱۹۴۲ء) اور "پردہ" (پیام تعلیم اپریل سنہ ۱۹۴۲ء) کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان کہانیوں اور نظموں کی زبان آسان اور عام فہم ہے اور اسلوب نگارش دل کشی کا حامل ہے۔

رئیس احمد جعفری :۔

رئیس احمد جعفری نے بھی بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں قلمبند کیں۔ جن میں "تین ساتھی" (پیام تعلیم مئی سنہ ۱۹۴۳ء) اور "چھوٹی آپا" (پیام تعلیم اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء) ایسی کہانیاں ہیں، جو تجسس اور سنسنی کا عنصر اپنے میں سموئے ہوئے ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی :۔

بچوں کے شاعروں اور ادیبوں کے زمرے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کا نام بھی شامل

ہے۔ انھوں نے متعدد نظمیں اور معلوماتی مضامین قلمبند کیے۔ "بادل" (پیام تعلیم اکتوبر، سنہ ۱۹۴۵ء) "میری دعا" (پیام تعلیم نومبر سنہ ۱۹۴۵ء) "کھیل" (پیام تعلیم، دسمبر، سنہ ۱۹۴۵ء) "قومی ترانہ" (پیام تعلیم اگست سنہ ۱۹۴۷ء) ان کی قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔

"خطوں کا البم" ایک طویل مضمون ہے جو پیام تعلیم (دہلی) میں اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء سے فروری سنہ ۱۹۴۴ء تک قسط وار شائع ہوا۔ اس دور میں مذکورہ بالا اہل قلم کے علاوہ کئی اور معروف شاعروں اور ادیبوں کی اکّا دکّا تخلیقات بچوں کے لیے مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ جن میں بہت سے مشہور اور معروف افسانہ نگاروں، شاعروں اور نقادوں کے نام بھی شامل ہیں۔ مثلاً مولوی عبدالحلیم شرر، مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خاں، جوش ملیح آبادی، صلاح الدین احمد، سید سلیمان ندوی، شاد عارفی، مالک رام، احسن مارہروی، عبدالباری عاصی، سجاد ظہیر، عبدالقوی دسنوی، مخلص بھوپالی، تنظیم طباطبائی، حمایت علی شاعر، سالک لکھنوی، وقار عظیم، ہاجرہ بیگم، بدرالدین چینی، برکت علی فراق، قیصر زیدی، محمد امین اعظمی وغیرہ کی تخلیقات نظم و نثر بچوں کے مختلف رسائل میں تلاش کرنے پر مل جاتی ہیں۔ ضرورت ہے ایسے مشہور و معروف لکھنے والوں کی تخلیقات انتخاب کرنے کی شکل میں جمع کر دی جائیں تاکہ آئندہ نسلوں کے نونہال ان سے مستفیض ہو سکیں۔

اشاعتی ادارے:۔

اس دور کا جائزہ ختم کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان خاص خاص اشاعتی اداروں کا اجمالاً ذکر بھی کر دیا جائے جن کے زیر اہتمام "ادب اطفال" کی مختلف اصناف پر مشتمل کتابیں قابل لحاظ تعداد میں منظر عام پر آئیں۔ مثلاً دارالاشاعت (پنجاب) فیروز سنز (لاہور) شیخ غلام علی (بکڈپو) لاہور، انڈین پریس (الہ آباد) مکتبہ جامعہ (نئی دہلی) عبدالحق اکیڈمی (حیدرآباد دکن) نیر کتاب گھر، نئی دہلی) خواجہ حسن نظامی اشاعتی ادارہ (نئی دہلی) اشاعت اردو (دکن حیدرآباد دکن) سنگم کتاب گھر (دہلی) وغیرہ نے بطور خاص اچھے اور صحت مند ادب کی ترویج و اشاعت میں زیادہ نمایاں حصہ لیا۔

آٹھواں باب

اردو ادب اطفال کا دورِ سوم

۱۹۴۷ء تا حال

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو مکمل طور پر ہمارے ملک کو فرنگی استبداد سے نجات ملی اور ہم آزادی کی برکتوں سے بہرہ ور ہوئے۔ لیکن اس کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ تقسیم ہند کے نتیجے میں سرحد پار کے اردو رسائل اور کتابوں کی آمد ہندستان میں، اور ہمارے یہاں کے رسائل اور کتب کا داخلہ پاکستان میں تقریباً بند ہو گیا۔ جس کے اثرات تحقیقی کام کرنے والوں پر خاص طور پر منفی رہے ہیں۔ کیونکہ اب اُردو کے کسی موضوع پر کام کرتے ہوئے تمام ماخذ تک رسائی تقریباً ناممکن ہو گئی۔ تقسیم ملک کی بنا پر بہت سے لکھنے والوں نے ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت بھی کی چنانچہ ہجرت کرنے والے ایسے فن کاروں کا جائزہ جو ۱۹۴۷ء کے بعد بھی لکھتے رہے، مکمل طور پر پیش کرنا بے حد دشوار ہو گیا۔ بہر طور اس باب میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ سب ہی اہم فنکاروں کا تذکرہ ممکنہ تفصیل کے ساتھ قلمبند کر دیا جائے۔

ناظر کاکوروی نے اس دور کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے:۔

"جو کارواں ادب منزل بہ منزل مجبوراً ماورائے ہند بہ حسرت و یاس، چلا گیا۔ اس قافلے میں یقین کیجیے ہمارے بہترین دماغ تھے۔ ہاں ایک فائدہ بھی ہوا بہت سے ادیب مستقلاً ہندستان آ گئے ... حالات اور تقسیم ہند کے دیرپا اثرات سے قومی ادب بھی متاثر ہوا"[1]

---

[1] ناظر کاکوروی جائزے "ادارہ انیس اردو الہ آباد ۱۹۶۰ء ص ۹۱

تقسیم ہند کے زیر اثر دوسری اصناف ادب کی طرح ادب اطفال بے انتہا متاثر ہوا۔ اس واقعے کے بعد اردو ادب اطفال دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ حفیظ جالندھری، عبد الواحد سندھی، رئیس احمد جعفری، امتیاز علی تاج، حجاب امتیاز علی، مرزا ادیب، شوکت تھانوی، احمد ندیم قاسمی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، انتظار حسین، سلیم ضیائی، عبد المجید سالک، جیسے درجنوں ممتاز ادیب اور شاعر جنھوں نے بچوں کے ادب کے فروغ اور اس کی نشوونما میں نمایاں رول ادا کیا پاکستان کے ہو گئے، فیروز سنز لاہور، تاج کمپنی لاہور، شیخ غلام علی بکڈپو لاہور، اور دارالاشاعت لاہور جیسے ادارے بھی جو ادب اطفال کی ترویج و اشاعت میں پیش پیش تھے۔ ہندوستان کے نہیں رہے۔ تقسیم ہند کے بعد اردو زبان و ادب سے بے اعتنائی کی جو فضا بنی اس نے کم و بیش دو نسلوں کو متاثر کیا اور ذرائع ابلاغ نے اردو کے ادب اطفال سے بے توجہی برتی۔ بعض اخبارات اور رسائل میں بچوں کے لیے کچھ صفحات خال خال نظر آتے ہیں۔ بچوں کے ادب اور ان کی تعلیم و تربیت کا درد رکھنے والے متعدد دانشور ماہرین تعلیم اور اہل قلم ان مایوس کن حالات میں اردو کے ادب اطفال کو سہارا دیتے رہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، شفیع الدین نیر، حسین حسان، عبد الغفار مدھولی، اور جامعہ کے دیگر مصنفین اور شعرا شامل تھے۔ نیز ان کے شانہ بشانہ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بکھرے ہوئے نمایاں فنکاروں میں خورشید الاسلام، نور الحسن ہاشمی، حامد اللہ افسر، آل احمد سرور، حامد حسن قادری، کوثر چاند پوری جیسے اہل قلم آزادی ہند کے بعد بھی بچوں کے لیے لکھتے رہے اور یہی صورت حال محولہ بالا پاکستانی قلم کاروں کی بھی تھی۔ چونکہ ان تمام فنکاروں کی بیشتر ادبی حیثیت سنہ ۱۹۴۷ء سے پیشتر مستحکم ہو چکی تھی۔ اس لیے دور دوم کے جائزے میں ان کی تحریروں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو آزادی ہند کے بعد وجود میں آئیں۔ تاکہ ان کے سلسلے کی تمام معلومات ایک ہی جگہ یکجا ہو جائیں ورنہ انھیں دور سوم میں بھی شامل رکھنے کی صورت میں ان ہی باتوں کا اعادہ پھر کرنا پڑتا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے واقعے نے ہندو مسلم فرقہ واریت کو اشتعال دلایا اور دونوں قوموں کے درمیان ایک بڑی خلیج پیدا ہو گئی۔ رہنمایان ملک و قوم کے سامنے ہندوستان میں قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ اتحاد کو بحال کرنے کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ہمارے رہنمایان قوم، نیز شاعروں اور ادیبوں نے اس اہم مسئلے کی طرف پوری توجہ کی خصوصاً قومی یک جہتی، مساوات اور انسان دوستی جیسے موضوعات کو ہندوستان کی ہر زبان میں فوقیت دی جانے لگی۔ محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، گاندھی

جواہر لال نہرو، حکیم اجمل خاں، اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے عظیم المرتبت رہنماؤں نے ایک خوشحال
اور مضبوط ہندوستان کی تعمیر کے لیے پوری قوم کو آمادہ کیا۔ ہندوستانی بچوں میں بھی ان ہی جذبات
اور خیالات کو عام کرنے کی سعی کی گئی اور اردو چونکہ اپنی ابتدا سے ہی ایک سیکولر اور وسیع المشرب زبان
رہی ہے، اس لیے ان قومی تقاضوں کو اس نے فی الفور اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔

آزادی کے بعد نئے تقاضوں کے تحت ہندوستان کو لاتعداد مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان
میں بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ سب سے اہم ہے جس کی وجہ سے کئی اور مسائل مثلاً غذا کا مسئلہ
حفظانِ صحت کا مسئلہ، تعلیم کا مسئلہ، رہائش کا مسئلہ، روزگار کا مسئلہ اور ایسے ہی بے شمار
دوسرے مسائل نے رہنمایانِ قوم اور دانشوروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ برطانوی حکومت
نے ہندوستانی صنعت کو زبردست دھکا پہنچایا تھا۔ جس کے سبب ہماری معیشت بری طرح
مجروح ہوئی۔ تعلیم کا مقصد محض ملازمت کے حصول کو سمجھ لیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد
خواہ وہ انجینئر ہوں یا ڈاکٹر بیرونی ممالک میں روزگار تلاش کر کے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے
کے خواہش مند ہو گئے۔ جو لوگ بیرونی ممالک نہ جا سکے انھوں نے اپنے گاؤں، قصبات چھوڑ کر
بڑے شہروں کی طرف رخ کیا۔ جبکہ آزادی کے بعد ہمارے ملک کی آبادی کا تقریباً تین بٹہ چار
حصہ دیہاتوں پر مشتمل تھا اور ڈاکٹروں، انجینئروں اور دیگر ماہرینِ فن کی ضرورت دیہاتوں
اور قصبوں میں زیادہ تھی۔

مادیت پرستی کا بول بالا ہونے کے نتیجے میں ہماری تہذیب بری طرح مجروح ہوئی اور بوڑھے
والدین کو بار سمجھا جانے لگا۔ مشترکہ خاندان کی روایت آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی۔ معاشرے
میں استاد جیسی عظیم المرتبت شخصیت کو وہ عزت و احترام نہیں ملا جو آزادی سے قبل حاصل
تھا۔ زبان کے جھگڑے، رنگ و نسل کا فرق، علاقائیت، علاحدگی پسندی کے جذبات اور قومی
یکجہتی کی کمی جیسے ہولناک مسائل ابھر کر سامنے آئے۔

گزشتہ اڑتیس برسوں میں ہمارے ملک کی سیاست نے کئی کروٹیں بدلیں۔ اس مختصر
سی مدت میں ہندوستان کو چین اور پاکستان کی یلغاروں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دوران میں
جو سیاسی سماجی، اخلاقی، اقتصادی بحران کی یلغاروں کا سا ملک میں آئے۔ ان سے تمام ہندوستانی
زبانوں کا ادب پوری طرح متاثر ہوا۔ پھر اردو "ادبِ اطفال" کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔

ہندستان کی تعمیر میں نونہالوں کے مستقبل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نئے ہندستان
کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بچوں کی درسی کتابیں اور ادبِ اطفال کو بھی
وسیلہ بنایا گیا اور اس کے نتیجے میں بچوں کے ادب میں بھی مناسب اور خوشگوار تبدیلیاں آئیں۔

علاوہ ازیں پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے رہنماؤں کی خصوصی دلچسپی
کے نتیجے میں بچوں کا میلہ، بچوں کی کتابوں کا میلہ، بچوں کے لیے اچھی اور صحت مند کتابیں
تیار کرنے والے ادارے مثلاً چلڈرن بک ٹرسٹ، اور نیشنل بک ٹرسٹ وغیرہ وجود
میں آئے۔ مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے ابتدائی تعلیم (بیسک ایجوکیشن) کی جو اسکیم
آزادی سے قبل تیار کی تھی اسے بہتر طور پر عملی شکل دینے کی صورت ۳۶ء دور میں پیدا ہوئی۔
بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ اس دور کے ادبِ اطفال کی تمام اصنافِ، شاعری، کہانی،
ڈرامہ، ناول، اور مضامین وغیرہ میں قومی یکجہتی، حب الوطنی اور ملک کے عصری تقاضوں سے
اُبھی کے عناصر نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد ادبِ اطفال کے
موضوعات بدلے ہیں۔ چنانچہ دورِ سوم کے تمام لکھنے والوں کے یہاں ان تبدیلیوں کے نقوش
نظر آئیں گے اس عہد کے لکھنے والوں نے ادبِ اطفال میں ان تمام موضوعات اور
مسائل کا احاطہ کیا ہے جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں بچوں کے لیے لکھنے والوں کی تعداد
بھی اردو میں ہندستان کے دیگر علاقائی زبانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ ڈاکٹر
کے۔ اے جمنا کی مرتبہ کتاب چلڈرن لٹریچر ان انڈین لینگویجز
کے اشاریۂ مصنفین سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادبِ اطفال کے ہندستانی مصنفین میں
سے تقریباً ایک تہائی اردو کے ادیب اور شاعر ہیں اور بقیہ دو تہائی مصنفین نے باقی ماندہ
چودہ علاقائی زبانوں (بہ شمول ہندی) میں طبع آزمائی کی ہے۔

کرشن چندر

عظیم افسانہ نگار کرشن چندر نے بچوں کے لیے خلاسیہ مہماتی اور سائنسی فکشن

کا اسلوب ہے انھوں نے اپنی تخلیقات میں طنزیہ بہ طنز کا استعمال کیا ہے۔ موصوف کی طنزیہ تر
کہانیاں تمثیلی اور طنزیہ ہیں جن میں مزاح کی چاشنی سے مقصدیت کو خوشگوار بنایا گیا ہے۔ ان
کی تخلیقات میں کچھ تو پریوں کی کہانیاں ہیں اور کچھ خیالی دنیا کی سیر کراتی ہیں۔ "چڑیوں کی
الف لیلیٰ"، "بیوقوفوں کی کہانیاں" "سونے کی صندوقچی"، "سونے کا سیب"، "غیلان کا تحفہ"
۱۹۶۱ء، "لاج" اور "الٹا درخت" کرشن چندر کی مقبول کہانیاں کتابی شکل میں ہیں۔ "الٹا درخت"
اردو میں بچوں کا بہترین فنطاسیہ ناول ہے جو اپنے دل کش اسلوب اور انداز بیان کے سبب
بچوں اور بڑوں دونوں میں مقبول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "الٹا درخت" ہمارے خود غرض اور
مفاد پرست سماج پر زبردست طنز ہے۔

کرشن چندر نے بچوں کے لیے کہانیاں، افسانے اور ناول کے ساتھ ڈرامے بھی لکھے
ہیں ان کی بیشتر تخلیقات میں انسان کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو اس خوبصورتی کے ساتھ
پیش کیا گیا ہے کہ بچے فرضی کہانی کو بھی حقیقی زندگی کا جزو سمجھنے لگے ہیں۔ کرشن چندر کی بیشتر
طویل کہانیاں اور ناول ماہنامہ کھلونا (نئی دہلی) میں قسط وار شائع ہوتے جس کے نتیجے میں
بچہ بچہ ان کے نام سے واقف ہو گیا اور ان کی یہ کتابیں محض لائبریریوں کی زینت بننے
سے بچ گئیں۔ "الٹا درخت" (دسمبر ۱۹۵۳ء) "ستاروں کی سیر" (اکتوبر ۱۹۵۷ء) "کھلونا" اکتوبر
میں قسط وار شائع ہوئیں۔ اور ۱۹۶۱ء کھلونا بکڈپو نئی دہلی نے ہی انھیں اہتمام کے ساتھ کتابی
شکل میں شائع کیا۔ "ستاروں کی سیر" کا نیا ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے
شائع کیا۔ اس ادارے سے موصوف کی دوسری طویل کہانی "خرگوش کا سپنا" ۱۹۶۵ء میں
کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

کرشن چندر۔ نہ صرف فنطاسیہ، مہماتی اور سائنسی فکشن لکھنے میں بے مثال ہیں بلکہ انھوں
نے بچوں کی عام زندگی کو بھی اپنی تحریروں میں فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ "بیوقوفوں
کی کہانیاں" اس کی عمدہ مثال ہے جس میں "بیوقوف نمبردار"، "بیوقوف بڑھیا"، "بیوقوف
امیر" اور "بیوقوف بھیڑیا" جیسی چار کہانیاں شامل ہیں۔ یہ کہانیاں بچوں کی تفریح طبع کے لیے
مزاحیہ پیرایہ میں لکھی گئی ہیں۔ ناول اور طویل کہانیوں کے علاوہ انھوں نے بہت سی مختصر
کہانیاں اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ جن میں کہانی "ہمارا گھر" (کھلونا اکتوبر ۱۹۶۵ء) اور ڈرامہ
"دو عینک" قابل ذکر ہیں۔

کرشن چندر بیسویں صدی کے پہلے نامور ادیب ہیں جنھوں نے جدید سائنسی اور تکنیکی دنیا کے پس منظر میں بچوں کے لیے بطور خاص ناول، کہانی اور ڈرامے تخلیق کیے ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی تخلیقات، زبان، اسلوب و طرز نگارش غرضیکہ ہر اعتبار سے بچوں کے مزاج و ماحول سے ہم آہنگ ہیں۔ وہ بچوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں نیز بچوں کے ساتھ ساتھ بچہ ہی بن جاتے ہیں ان کی حیثیت اس بڑے کی نہیں ہے جو بچوں کو انگلی پکڑ کر چلاتا ہے۔

یکتا امروہوی

یکتا امروہوی بچوں کے ان مقبول و معروف شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی شعری نگارشات اور منظوم کہانیاں ہند و پاک کے تقریباً بچوں کے ہر معیاری رسالے میں شائع ہوئی ہیں۔ عام طور پر یکتا نے بچوں کی دلچسپیوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ "ہندو ہائی اسکول" (کھلونا دہلی جنوری ۱۹۵۳ء) "ڈھینچک شعراء" (پیام تعلیم نومبر ۱۹۵۴ء) "ہم لوگ" (پیام تعلیم دہلی مارچ ۱۹۵۵ء) "استاد کا ڈنڈا" (ہدایت لاہور، فروری ۱۹۵۹ء) اور "سعید ٹم بلی" (کھلونا جنوری ۱۹۶۵ء) ان کی چند مقبول مختصر نظمیں ہیں۔

یکتا اپنی منظوم کہانیوں کے سبب اردو ادبِ اطفال میں یکتا اور منفرد ہیں۔ انھوں نے روایتی داستانوں، اور تاریخی یا مذہبی قصوں کو منظوم نہیں کیا بلکہ ایسے انوکھے اور دلچسپ موضوعات کا انتخاب کیا اور انھیں ایسے دلکش اسلوب میں نظم کیا کہ یہ بچے کو بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ "برگد میاں کی حجامت" (کھلونا دہلی اگست ۱۹۵۳ء) "امتحانستان" (کھلونا جون ۱۹۵۴ء) "خالد پیارا" (کھلونا اگست ۱۹۵۴ء) "ہرچرن ہرن کو پھانسی" (کھلونا ستمبر ۱۹۵۴ء) "گڑیوں گڈو کا جلسہ" (کھلونا جنوری ۱۹۵۵ء) یکتا کی قابلِ ذکر طویل منظوم کہانیاں ہیں۔ جن کے عنوانات سے ہی ان کی دلچسپی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یکتا امروہوی کی یہ کہانیاں نہ صرف منظوم ہیں، بلکہ مدیرانِ رسائل نے انھیں اکثر دلکش تصاویر کے ساتھ شائع کیا ہے۔

"امتحانستان" میں ۴۳ اشعار ہیں۔ اس نظم میں ایک طالب علم کے دلچسپ خواب کو کہانی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ "برگد میاں کی حجامت" ۵۷ اشعار کی مزاحیہ نظم ہے۔

۔ [illegible] میں "مسافر" [illegible] "خالو پہلوان" ۲۵ اشعار پر مشتمل طویل نظم ہے۔ "خالو پہلوان" میں خالو کے خیالات کو مافوق الفطرت واقعات کے ساتھ جوڑ کر بچوں کو عجائبات کی سیر کرائی گئی ہے۔

"بیرچرن ہرن کو پھانسی" ۲۰ اشعار کی دلچسپ نظم ہے۔ اس نظم میں ایک دیہاتی ہرن کی داستان بیان کی گئی ہے۔ عدالت، جج، وکیل اور پولیس وغیرہ کے دلچسپ کرداروں سے بچے کی دلچسپی کو گرفت میں لے لیا ہے۔

"چڑیا کی فریاد" (مطبوعہ کھلونا فروری ۱۹۵۹ء) غالب کی غزل کی پیروڈی ہے۔ اسی طرح "قسم استاد کی" (کھلونا فروری ۱۹۵۹ء) طلبہ کے شوخ جذبات پر مشتمل دلچسپ مزاحیہ نظم ہے۔ یکتا کی یہ نظمیں موضوعات کے اعتبار سے بچوں کی بے مثل نظمیں ہیں۔ اور زبان و اسلوب نیز رنگین بیانی کے سبب بچے ان کی نظموں کو (طویل ہونے کے باوجود) دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ یکتا نے بچوں کے لیے کچھ نثری کہانیاں بھی قلمبند کی ہیں۔ "انوکھی چڑیا" ان کی نثری کہانیوں میں سے ایک ہے جو کتابی شکل میں منظر عام پر آچکی ہے۔ بحیثیت مجموعی کمیت و کیفیت، ہر دو اعتبار سے یکتا بچوں کے اہم ترین شاعروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔

واثق جون پوری :-

مشہور ترقی پسند شاعر واثق جون پوری نے بھی بچوں کے لیے مختلف موضوعات پر کئی پیاری پیاری نظمیں تخلیق کیں۔ ان کی نگارشات میں مزاحیہ نظمیں، حب الوطنی سے معمور نظمیں اور دوسرے مختلف موضوعات پر نظمیں شامل ہیں۔ "نوری" (پیام تعلیم دہلی ۱۹۵۲ء) "نیا سال" (پیام تعلیم دہلی جنوری ۱۹۵۷ء) "امن کا گیت" (کھلونا جنوری ۱۹۵۶ء) "سلو چیل" (کھلونا ستمبر ۱۹۵۷ء) "مدار ستارہ" (کھلونا اکتوبر ۱۹۵۶ء) اور "ڈھکوسلہ" (کھلونا نومبر ۱۹۵۶ء) ان کی خوبصورت اور دلچسپ نظمیں ہیں۔ "مدار ستارہ" اور "ڈھکوسلہ" بچوں کو مزاح کی چاشنی کے ساتھ توہم پرستی سے دور رہنے کا سبق دیتی ہیں۔ "امن کا گیت" اور "نیا سال" کے ذریعہ حب الوطنی کی تلقین کی گئی ہے۔

واثق نے بچوں کے لیے کچھ معلوماتی اصلاحی مضامین بھی لکھے ہیں۔ "زمین کی کہانی" (پیام تعلیم، نومبر ۱۹۵۲ء) "ہماری بری عادتیں" (کھلونا فروری ۱۹۵۵ء)، ایسے ہی مضامین اور

معلوماتی مضامین ہیں۔

عصمت چغتائی

اردو کی عظیم افسانہ نگار، عصمت چغتائی بھی بچوں کے لیے اچھی کہانیاں تخلیق کرنے میں پیچھے نہیں رہیں۔ انھوں نے بچوں کی دلچسپیوں اور ان کی ضروریات کو ہمیشہ مدِ نظر رکھا اور بچہ بن کر ان کے لیے دلچسپ تخلیقات پیش کیں۔ ان کی کہانیوں میں "سفید جھوٹ" (کھلونا ستمبر ۱۹۵۶ء) "بی کا کرشمہ" (کھلونا، اکتوبر ۱۹۵۸ء) "قدرت کا مذاق" (کھلونا، فروری ۱۹۶۵ء) "بشیرے کی ماں" (کھلونا دہلی فروری ۱۹۶۷ء) قابلِ ذکر ہیں۔ کہانیوں کے علاوہ انھوں نے ایک ناول "تین اناڑی" بھی لکھا ہے جس میں بچوں کے مسائل کو ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کے پیشِ نظر حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دلچسپ ناول (کلّو، ببلو اور ٹیٹو) تین شوخ و شنگ لڑکوں کی شرارتوں پر مبنی ہے۔

کنہیالال کپور

منفرد طنز نگار کنہیالال کپور نے بچوں کے لیے بہت سے مضاحیہ مضامین اور کہانیاں لکھی ہیں جو بچوں کے نثری ادب میں طنز و ظرافت کی کمی کو بڑی حد تک پورا کرتی ہیں۔ کنہیالال کپور کی خوبی یہ ہے کہ وہ واقعات اور الفاظ دونوں سے مزاح کے پہلو ابھار کر بچوں کو ہنساتے ہیں اور ہنسی ہنسی میں کام کی بات بھی کہہ جاتے ہیں۔ "مرزا وہمی" (مطبوعہ، اکتوبر ۱۹۵۷ء) اس کی بہترین مثال ہے۔ اس زمانے میں فلو کا مرض بہت عام تھا۔ مرزا (کہانی کے ہیرو) فلو کے نہیں، بلکہ وہم کے شکار ہو جاتے ہیں اور اپنی حماقتوں سے قارئین کو ہنسنے پر مجبور کرتے ہیں وہ لاشعوری طور پر بچوں کو توہم پرستی سے بچنے کا سبق بھی دیتے ہیں۔

"مجھے میرے بزرگوں سے بچاؤ" (کھلونا ستمبر ۱۹۵۲ء) اور "ہمارے استاد" (کھلونا ستمبر ۱۹۵۶ء) کپور کے دو مزاحیہ فیچرز ہیں۔ کہانیوں میں "کہیے کیسی رہی" (کھلونا جنوری ۱۹۶۵ء) اور "نواب صاحب" (پھول، جنوری ۱۹۵۶ء) قابلِ ذکر ہیں۔

سلام مچھلی شہری:۔

سلام مچھلی شہری نے بچوں کے لیے نظمیں بھی لکھیں، دلچسپ کہانیاں اور معلوماتی مضامین بھی قلم بند کیے۔ ان کی شعری تخلیقات میں کئی منظوم کہانیاں، اور مختلف موضوعات پر مختصر نظمیں، آسان اور عام فہم زبان میں مل جاتی ہیں۔ "سونے کی چڑیا" (کھلونا، ستمبر ۱۹۵۳ء) ان کی ایک منظوم کہانی ہے۔ "کاش" (کھلونا، ستمبر ۱۹۵۸ء) ایک بچہ اور ایک بچّی کے مابین دلچسپ مقالمہ ہے۔ جس میں بچوں نے اپنی خواہشات کا بے تکلف اظہار کیا ہے۔ "بھکاریوں کا کورس" (کھلونا، اگست ۱۹۵۳ء) "چاند" (کھلونا، جنوری ۱۹۵۶ء) "بے رحم لیڈر بکس" (کھلونا، اکتوبر ۱۹۵۸ء) "تتلی" (جگنو، بھوپال، اپریل ۱۹۶۱ء) سلام کی شاہکار نظمیں ہیں۔ سلام مچھلی شہری نے بچوں کے لیے متعدد قوالیاں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً "اب کون سنے ہم بچوں کا دکھ درد بھرا یہ افسانہ" (کھلونا، نومبر ۱۹۵۵ء) اور "قسم ہے زندگی کا راز ہم سمجھاتے جائیں گے۔" (کھلونا، مئی ۱۹۵۶ء) ایسی قوالیاں بھی جن سے بچوں کے نفسیات اور ان کی دلچسپیاں صاف عیاں ہوتی ہیں۔

سلام مچھلی شہری نے سادہ اور آسان زبان میں چند کہانیاں بھی لکھیں جن میں "ماں کی یاد" (کھلونا، اگست ۱۹۵۶ء) اور "مسٹر چپ" (جگنو بھوپال جنوری ۱۹۶۵ء) قابلِ ذکر ہیں۔ اپنے عام گیتوں اور نظموں کی طرح بچوں کی نظموں میں بھی سلام نے ہیئت اور تکنیک کے تجربات کو روا رکھا ہے۔

غلام ربانی تاباں:۔

معروف ترقی پسند شاعر غلام ربانی تاباںؔ نے بچوں کے لیے کئی کہانیاں اور معلوماتی مضامین قلمبند کیے۔ "صندل کے جنگل" (پیامِ تعلیم، نومبر ۱۹۵۲ء) "مولانا حالی اور عبدالحق" (پیامِ تعلیم، حالی نمبر، مارچ ۱۹۶۵ء) "غالب کے زمانے کی دلی" (پیامِ تعلیم، ستمبر ۱۹۶۹ء) "گھروں کی کہانی" (پیامِ تعلیم، نومبر ۱۹۶۳ء) "مچھلیوں کی تعلیم" (پیامِ تعلیم، جولائی ۱۹۶۴ء) ان کے قابلِ ذکر مفید اور معلوماتی مضامین ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ غلام ربانی تاباںؔ بھی ذاکر حسین تحریک سے وابستہ ہونے کے سبب، بچوں کی عام معلومات میں اضافہ کرنے اور تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے مقصدی ادب پیش کرنے پر مائل رہے ہے۔ مقامِ حیرت ہے کہ ایسے قادر الکلام اور

پختہ شاعر کے قلم سے ادبِ اطفال میں تخلیقی نوعیت کی کسی چیز (نظم یا کہانی) کا اضافہ نہیں ہوا۔ یا کم از کم میری نگاہ سے ایسی کوئی تخلیق نہیں گزری۔

قرۃ العین حیدر:۔

اردو ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر کا نام نہایت عزت و احترام کا مستحق ہے۔ موصوفہ نے بچوں کے ادب کی طرف بھی ایک مخصوص زاویے سے توجہ کی ہے۔ اور غیر ملکی زبانوں کی کہانیوں نیز معلوماتی دلچسپ مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کا ناول "جن حسن عبدالرحمٰن" سرِ فہرست ہے جو ایل لاگن کے انگریزی ناول کا پر لطف ترجمہ ہے۔ یہ ناول دو جلدوں پر مشتمل ہے اسے اردو ادبِ اطفال کے سائنس فکشن میں شرفِ اولیت حاصل ہے۔ الہ دین کے چراغ ، کی کہانی پرانی ہو چکی ہے اور ہمارے ترقی یافتہ عہد کا بچہ اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا ہے۔ یہ "جن حسن عبدالرحمٰن" ایک ایسے بچے کی کہانی ہے جو سیکنڈری اسکول کا طالب علم ہے۔ وہ صراحی کی قید سے جن کو آزاد کراتا ہے، جن اپنی صلاحیتوں اور طاقتوں کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے لیکن قدم قدم پر لڑکا اس کو ٹوکتا ہے اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سائنسی کرشمات دیکھ کر جن خود حیران رہ جاتا ہے۔ ناول میں بچوں کو سائنس کے کرشموں سے نفسیاتی طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے بچوں کے لیے جو کتابیں دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل کیں ان میں "شیر خاں" "بھیڑیے کے بچے" ، "میاں ڈھینچو کے بچے" اور "بہادر" بہت دلچسپ ہیں۔ یہ کتابیں پہلے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے شائع کیں اور بعد ازاں نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) نئی دہلی نے ان کتابوں کے مصوّر ایڈیشن نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیے۔

" فراشک " (لومڑی کے بچے) اوپیروفسکایا کی تمثیلی کہانی کا ترجمہ ہے۔ ان تراجم میں قرۃ العین حیدر نے ایسی رواں دواں زبان اور بے ساختہ طرزِ بیان اختیار کیا ہے کہ کہیں بھی ترجمے کا احساس نہیں ہوتا۔ ادبِ اطفال میں قرۃ العین حیدر کو ایک اچھے مترجم کی حیثیت سے مدتوں یاد کیا جائے گا۔

ہیل عظیم آبادی:۔

معروف ترقی پسند افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی نے بچوں کے لیے چند کہانیاں لکھی ہیں
کہانیاں مختلف معیاری رسائل کی زینت بنیں۔ ان کی کہانیوں میں بچوں کے لیے نصیحتیں شامل
تی ہیں۔ وہ بچوں کو اچھا اور نیک انسان دیکھنا چاہتے ہیں۔

"نیک دل انسان" (کھلونا، جنوری ۱۹۵۵ء) "علم اور سچائی کی دولت" (پیام تعلیم، جولائی
۱۹۵۱ء) "نیت کا پھل" (پیام تعلیم، مارچ ۱۹۵۹ء) اور "اچھے بچے" (آجکل، اکتوبر ۱۹۵۹ء) ان
، قابل ذکر کہانیاں ہیں۔

ادل رشید:۔

عادل رشید بھی اردو کے ان نامور ناول نگاروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے بڑوں کے
اتھ ساتھ، بچوں کے لیے بھی بڑی تعداد میں کہانیاں تخلیق کیں۔ انھوں نے سماجی کہانیاں مہماتی
ہانیاں، نصیحت آموز کہانیاں، استعجاب انگیز طلسماتی کہانیاں اور مزاحیہ کہانیاں غرض
تلف النوع قسم کی تخلیق سے ادب اطفال میں گراں بہا اضافے کیے ہیں۔

"خونی ڈاکو"، "آخری خواہش"، "جادو کا ہار"، "ایران کی شہزادی"، "چوہوں کی حکومت"
ہ کی طویل کہانیاں ہیں۔ جنھیں کھلونا بک ڈپو، نئی دہلی نے کتابی شکل میں اہتمام کے ساتھ شائع کیا
ہے۔ "خونی ڈاکو" مہماتی کہانی ہے جبکہ "آخری خواہش" میں ایک لڑکے کے اندر کے بے جا لاڈ، پیار
ے بگڑ جانے کی داستان بیان کی گئی ہے۔ "جادو کا ہار" حیرت انگیز کرشموں سے مملو ہے۔ "ایران
ی شہزادی" روایتی داستان ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ عادل رشید نے مختلف موضوعات پر اپنے
بد کے بچوں کے معیاری رسالوں کے لیے بھی بہت سی کہانیاں تخلیق کیں۔ ان میں "شہزادی کی
اندی کب ہوگی" (کھلونا، اگست ۱۹۵۲ء) "جادو کی گیند" (کھلونا، ستمبر ۱۹۵۶ء) "ماستا کا شکار" (کھلونا
روری ۱۹۵۶ء) "رحم اور انصاف" (جولائی ۱۹۵۸ء) "نونہال کانفرنس" (کھلونا، اکتوبر ۱۹۵۸ء)
ور "گرد بازیاں" (کھلونا، اپریل ۱۹۵۹ء) قابل ذکر کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کے عنوانات سے
ہ کی دلچسپی اور موضوعات کے تنوع کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ عادل رشید نے اپنی کہانیوں
بچوں کی ضروریات اور ان کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور مسائل کے حل بھی پیش کیے

ہیں۔ کہانیوں کی خوبی صرف موضوعات کی رنگا رنگی ہی نہیں بلکہ زبان اور دلکش اسلوب بھی دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

نثری ادبِ اطفال میں عادل رشید کی خدمات کا کما حقہٗ اعتراف نہیں کیا گیا حالانکہ وہ بچوں کے بلند مایہ ادیبوں میں شامل کیے جانے کے مستحق ہیں۔

شوکت تھانوی :۔

مزاحیہ ناول نگاری میں شوکت تھانوی کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ موصوف نے بچوں کے لیے بھی ہنساتے ہنساتے پیٹ میں بل ڈالنے والی کئی کہانیاں تخلیق کیں، ان کہانیوں میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ ہلکا سا طنز کا عنصر بھی چھپا ہوتا ہے، جس کا احساس بعض اوقات قاری کو نہیں ہوپاتا اور شوکت جو کہنا چاہتے ہیں، کہہ جاتے ہیں۔

تیسری ال، "گولر کا پھول" "مریخ" اور "کالامنہ" ان کی قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔ "گولر کا پھول" بچوں کا ناول ہے۔ ان کی طویل کہانی "کالامنہ" ستمبر ۱۹۵۴ء میں ماہنامہ کھلونا دہلی میں قسط وار شائع ہوئی۔ بعدازاں کھلونا بکڈپو دہلی نے اسے کتابی شکل دی۔ ہندستان میں شوکت کی بیشتر کہانیاں نسیم بکڈپو لکھنؤ اور کھلونا بکڈپو نئی دہلی نے شائع کی ہیں۔ ان کی کہانیاں بچوں کے معیاری رسائل کی زینت بھی بنیں جن میں "چھوٹا بھائی" (کھلونا ستمبر ۵۶ء) "چندا باجی" (کھلونا اکتوبر ۵۶ء) "مولوی صاحب" (کلیاں لکھنؤ جنوری ۱۹۶۸ء) قابلِ ذکر ہیں۔

طنز و مزاح نگاری کی حیثیت سے شوکت تھانوی کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ ان کی دیگر نگارشات گوشۂ تاریکی میں جا پڑیں۔ ورنہ بچوں کے ادیب کی حیثیت سے بھی وہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

رضیہ سجاد ظہیر:۔

ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر کی بیگم اور مشہور افسانہ نگار رضیہ سجاد ظہیر نے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھی ہیں اور دوسری زبانوں کی منتخب کہانیوں اور مضامین کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر کی طبع زاد کہانیوں میں "ولی عہد" (کھلونا، فروری ۱۹۵۵ء) سنگیت کا

"[illegible]" (کھلونا، جنوری ۱۹۵۹ء)، "[illegible]" (پیامِ تعلیم، مئی ۱۹۶۰ء)، "مہرِ شہزادہ" (... ۱۹۶۱ء)، "[illegible]" (... ۱۹۶۱ء)، "ستارے کہاں" (پیامِ تعلیم، نومبر ۱۹۶۲ء) قابلِ ذکر ہیں۔ "دل جلا" ان کی ایک طویل کہانی ہے جو ماہنامہ کھلونا نئی دہلی میں فروری ۱۹۶۸ء سے مئی ۱۹۶۸ء تک قسطوں میں شائع ہوئی۔ "مہرِ شہزادہ" ایک پرانی لوک کتھا پر مشتمل ہے۔ "پہاڑی بندریوں کی کہانی"، "بہت دل چسپ ہے"، "جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں" ان کی وہ کتابیں ہیں جو دیگر زبانوں سے اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ "سلطان زین العابدین بڈشاہ" ان کی طبع زاد تاریخی کہانی ہے۔ یہ تمام کتابیں نہرو بال پستکالیہ نئی دہلی کے زیرِ اہتمام منظرِ عام پر آئی ہیں۔

پرکاش پنڈت:-

شاہراہ اور دوسرے رسائل کے مشہور مدیر اور ترقی پسند ادیب پرکاش پنڈت بچوں کے ان مصنفین میں سے ایک ہیں جنھوں نے سائنس فکشن تخلیق کر کے اردو ادبِ اطفال کی اس کمی کو دور کیا۔ ان کی بیشتر کہانیاں اور ناول حیرت انگیز واقعات اور سائنس کے کرشموں پر مشتمل ہیں۔ "چاند کی سیر" ان کا طبع زاد ناول اور "سرکس کے کھیل" سائنسی موضوع پر طویل کہانی ہے۔ "چاند کی چوری" میں ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، اور نائٹروجن بم سے دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کو ختم کرنے کی سازش، سائنسدانوں کے چاند کو چرالانے کے منصوبے اور اس نوع کے دیگر واقعات بہت دل کش اور پرلطف پیرایے میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ تمام کتابیں کھلونا بکڈپو، نئی دہلی نے شائع کی ہیں۔ ان کے علاوہ پرکاش پنڈت نے کئی مختصر کہانیاں بھی لکھی ہیں جن میں "پالش" (کھلونا، ستمبر ۱۹۵۸ء) "ہمارے ستارے" (پیامِ تعلیم اکتوبر ۱۹۵۸ء) قابلِ ذکر ہیں۔

اردو کے سائنس فکشن میں پرکاش پنڈت بہر اعتبار اہم مرتبے کے مستحق ہیں۔

جگن ناتھ آزادؔ:-

مشہور شاعر اور اقبالیات کے ماہر جگن ناتھ آزادؔ نے بچوں کے لیے متعدد ڈرامے، نظمیں، اور مضامین تخلیق کیے۔ ان کی تخلیقات میں بچوں کی نفسیات اور ان کی دلچسپیوں کو ہر جگہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ آزادؔ کے ڈراموں میں "بچوں کے اقبال" (کھلونا، فروری ۱۹۵۸ء) "ہمارے تہوار" (کھلونا، دسمبر ۱۹۶۶ء) "بنگال کا جادو" (کھلونا، فروری ۱۹۶۷ء) قابلِ ذکر ہیں۔ آزادؔ کی اہم بامعنی کہانیاں

"گڑیا" "جمہوریت" "چاند" "دو پیسے ہوا بلانہ" اور "اتفاق" وغیرہ سو انظمیں بچوں کے مختلف رسائل کی زینت بنیں اور بعد ازاں ان کا مجموعہ "بچوں کی نظمیں" کے عنوان سے کتابی شکل میں ترقی اردو بورڈ دہلی کے وسیلے سے اشاعت پذیر ہوا۔

"اقبال کی کہانی" بچوں کو شاعر مشرق کی شخصیت اور شاعرانہ عظمت سے روشناس کراتی ہے۔ یہ کتاب بھی ترقی اردو بورڈ نے ہی شائع کی ہے۔ مکتبہ پیام تعلیم، دہلی سے شائع کردہ کتاب "ریڈیو فیچر" میں آزاد کے دو دلچسپ ڈرامے "ہندستان ہمارا" اور "جنگل کا جادو" شامل ہیں۔ ان ڈراموں میں پلاٹ، زبان، مکالمے وغیرہ سب ہی عناصر اس انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ بچے انھیں بآسانی اسٹیج کر سکتے ہیں۔

رام لعل:-

رام لعل بحیثیت افسانہ نگار محتاجِ تعارف نہیں انھوں نے بچوں کے لیے مختلف موضوعات پر متعدد کہانیاں تخلیق کیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں، بچوں کے روز مرہ زندگی کے مسائل کا آئینہ ہیں۔ یہ بچوں کو مسائل سے چھٹکارا پانے کا راستہ بھی دکھاتی ہیں۔ رام لعل کی بیشتر کہانیاں ماہنامہ کھلونا، دنئی دہلی) میں شائع ہوئیں۔ ماہنامہ کھلونا کے بالکل ابتدائی دور سے لے کر ۱۹۸۲ء تک شائع ہونے والی ان کہانیوں میں "گونگا" "لیٹر بکس" "بہادر ڈرائیور" "مفت کی سواری" "میری سالگرہ" "جنگلی الاؤنس" "موٹروں کا گھر" "ڈیڈی کی چوری" "کھٹ کھٹ" "پھولوں کی چوری" "انوکھے چور" "پھولوں کے چور" "میرے بچے" "ٹافیاں کھانے کی ترکیب" خاص طور پر قابل توجہ رہیں۔ ان میں رام لعل کی تخلیقات میں نمایاں خوبی ان کی زبان اور دلچسپ اسلوب نگارش ہے۔ یہ کہانیاں ان بچوں کے لیے ہیں جو بچپن کی چوکھٹ پار کر کے لڑکپن کی حد میں قدم رکھتے ہیں، ان کہانیوں کو پڑھ کر بچوں میں کچھ کر دکھانے کی ہمت پیدا ہوتی ہے۔

راجہ مہدی علی خاں

صاحب طرز ظریف شاعر اور مقبول فلمی نغمہ نگار راجہ مہدی علی خاں نے بھی 'ادب اطفال' کو بہت کچھ دیا ہے۔ ان کی تخلیقات مسلسل ہند و پاک کے بچوں کے معیاری رسائل کی زینت بنتی رہیں۔ راجہ مہدی علی خاں کی فطری شوخی اور طنز و ظرافت پر مہارت نے ان کی تخلیقات

جس طرح طرح کے گل بوٹے کھلاتے ہیں جو معصوم ذہن و معصوم دل بچوں کو فی الفور اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اور مندرجہ ذیل نظموں کے عنوانات سے بھی ان کی دلچسپی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جلوے کا خواب" (کھلونا، اگست ۱۹۵۶ء)، "الو" (کھلونا، جولائی ۱۹۵۶ء)، "دو ننھے ڈاکو اور ایک الّو" (کھلونا، اگست ۱۹۵۷ء)، "گڑیا کا مرثیہ" (کھلونا، ستمبر ۱۹۵۳ء)، "کیا ہم" (کھلونا، ستمبر ۱۹۵۷ء)، "استانی جی کا تبادلہ" (جولائی ۱۹۵۷ء)، "کاش کہ ہم تم بھالو ہوتے" (کھلونا، ستمبر ۱۹۵۸ء)، "استانی جی کا تبادلہ" (دوست، لاہور، فروری ۱۹۵۸ء)، "تمنا" (کھلونا اکتوبر ۱۹۵۸ء)، "رباعیات عمر خیام" (کھلونا، ستمبر ۱۹۵۸ء)، "چار بجے" (کھلونا، اکتوبر ۱۹۵۸ء) وغیرہ مختلف موضوعات پر انوکھے پیرایے میں راجہ مہدی علی خاں کی ایسی نظمیں ہیں جنہیں ادبِ اطفال میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

راجہ مہدی علی خاں کی نثری کاوشوں میں "جادو کا گھوڑا" (کھلونا اگست ۱۹۵۲ء) اور "ٹیلیفون" (دوست جنوری ۱۹۵۸ء) قابلِ ذکر کہانیاں ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں کی کہانیوں پر مشتمل تین کتب ہیں "اقلیدس کی کتاب" "موٹر نمبر ۸۶"، "اور سونے کی بکری" کھلونا بکڈپو نئی دہلی نے شائع کی ہیں۔ اپنی انفرادیت اور مخصوص طرزِ نگارش کی بنا پر راجہ مہدی علی خاں کو بچوں کے ممتاز فنکاروں میں جگہ ملنی چاہیے۔

قتیل شفائی:۔

دورِ جدید کے مشہور شاعر اور پاکستان کے مقبول فلمی نغمہ نگار قتیل شفائی نے بھی بچوں کے لیے جدید موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ انھوں نے تخیلی کہانیوں، روایتی قصوں اور مافوق الفطرت کرداروں کی دنیا سے نکال کر بچے کو آج کی دنیا کی سیر کرائی ہے۔ اس سائنسی دور میں بچے کا ذہن بہت تیزی سے ارتقا کی اعلیٰ منزلیں طے کر رہا ہے جو اپنے پیشرو بچوں سے کہیں زیادہ ذہین ہے۔ قتیل نے بیشتر نظمیں اسی کی ضروریات کے پیش نظر لکھی ہیں۔ "لوہے کا پرندہ" (کھلونا ستمبر ۱۹۵۸ء) اور "چاند کی بڑھیا کہاں گئی" (کھلونا جولائی ۱۹۶۱ء) دورِ جدید کی شاہکار نظمیں کہی جانے کی مستحق ہیں۔ علاوہ ازیں قتیل شفائی کی بہترین تخلیقات میں "گنتی" (کھلونا ستمبر ۱۹۵۶ء)، "پہیلیاں" (کھلونا فروری ۱۹۵۶ء)، "کھانڈ کی چڑیا" (کھلونا اکتوبر ۱۹۵۸ء) اور "شانی میرا منا" (کھلونا دسمبر ۱۹۵۶ء) وغیرہ بھی شمار کی جاسکتی ہیں۔

زکی انور:۔

مشہور افسانہ نگار زکی انور بچوں کے لیے متعدد کہانیاں اور ڈرامے لکھتے رہے۔ ان کی تخلیقات کے موضوعات اچھوتے، اور بچوں کے لیے پسندیدہ نیز ان کی ضروریات اور نفسیاتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ زکی انور اپنی تخلیقات میں خود بچہ بن جاتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں "چڑیل" (کھلونا نئی دہلی ستمبر ۱۹۵۷ء) "ناگ اور رات" (کھلونا جولائی ۱۹۵۶ء) "بلا مل گئی" (کھلونا، اپریل ۱۹۵۸ء) "چٹ لی مالا لیش" "رام" (کھلونا دسمبر ۱۹۵۸ء) "فسطوہ کا بھائی بوستور" (کھلونا نومبر ۱۹۵۸ء) اور "کالی بلا" (پھلواری دہلی مئی ۱۹۶۳ء) انفرادیت کی حامل ہیں۔ زکی انور نے بچوں کے لیے کئی ڈرامے بھی تخلیق کیے ہیں۔ ان ڈراموں کی خوبی یہ ہے کہ بچے انہیں اسٹیج پر کھیل (PLAY) سکتے ہیں۔ ان ڈراموں میں "بھتنا شاہ" (پھلواری، جنوری ۱۹۵۹ء) "گویا جاسوس" (کھلونا، فروری ۱۹۶۰ء) اور "لال تماشا" (کھلونا مئی ۱۹۶۰ء) لائق ذکر ہیں۔ افسوس کہ زکی کی بے وقت شہادت نے "ادب اطفال" کا ایک روشن چراغ گل کر دیا ورنہ ان کے قلم سے مزید اضافوں کی پوری توقع تھی۔

اے۔ آر۔ خاتون:۔

خاتون ناول نگاروں میں اے آر خاتون کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کے قلم سے بچوں کے لیے کچھ دلچسپ طویل کہانیاں بھی نکلی ہیں۔ جو مختلف رسائل میں شائع ہونے کے بعد مکتبہ کلیاں، لکھنؤ کے وسیلے سے منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ایسی کتابوں میں "سات کھلاڑی" "سات کھلاڑی" "ثمین" "بھائی بہن" "ساڑھے تین یار" "زمانہ" "آبشار" "شہزادی کا ماہ رخ" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اے آر خاتون کی ایک اور کتاب "سلیقہ بیگم معہ بربادی بیگم" مکتبہ علم و ادب لکھنؤ نے شائع کی ہے موصوفہ نے اخلاقی اور اصلاحی کہانیاں لکھ کر بچوں کے ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ لیکن ان کا انداز ناصحانہ نہیں وہ دلچسپ پیرائے میں کہانی اس طرح بیان کرتی ہیں کہ پڑھنے اور سننے والے از خود اپنی اصلاح پر مائل ہوں۔

حرمت الاکرام :-

ممتاز شاعر حرمت الاکرام نے بچوں کے لیے مختلف موضوعات پر متعدد دلکش نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان کی نظمیں ہند و پاک کے معیاری رسائل میں مسلسل شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حرمت الاکرام کی نظموں میں حب الوطنی، قومی یک جہتی، اور ہندستانی عناصر کی جھلک نمایاں ہے۔

"نیا سال" (پیام تعلیم جنوری ۱۹۶۵ء) "ننھے سپاہی" (پیام تعلیم جولائی ۱۹۶۵ء) "ہندستان ہمارا" (کھلونا جولائی ۱۹۶۶ء) "چودھویں کی رات" (پیام تعلیم جنوری ۱۹۶۶ء) "پرندوں کی دیوالی" (پیام تعلیم دسمبر ۱۹۶۶ء) "برسات آگئی" (پیام تعلیم اکتوبر ۱۹۶۷ء) "دریا کی شام" (پیام تعلیم جنوری ۱۹۶۸ء) "غالب کی ظرافت" (پیام تعلیم ستمبر ۱۹۶۹ء) "گرمی کا سورج" (پیام تعلیم مئی ۱۹۷۲ء) "دھرتی کا سیلدہ" (پیام تعلیم نومبر ۱۹۷۲ء) "کیسے کیسے پھول" (پیام تعلیم دسمبر ۱۹۷۵ء) حرمت الاکرام کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ ان تخلیقات کی روشنی میں حرمت الاکرام بھی بچوں کے ایک اہم شاعر کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

عبداللطیف اعظمی :-

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایسے ادیبوں میں جو ۱۹۴۷ء سے قبل بھی بچوں کے معلوماتی مضامین لکھ رہے تھے اور بعد میں بھی لکھتے رہے ہیں، عبداللطیف اعظمی سرِ فہرست ہیں چونکہ ان کی تخلیقات کا غالب حصہ آزادی ہند کے بعد منظر شہود پر آیا اس لیے موصوف کو دورِ سوم میں شمولیت کا مستحق سمجھا گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل "پیام تعلیم" (دہلی) میں ان کے کئی معلوماتی مضامین شائع ہوئے ان میں "سلیٹ" (مئی ۱۹۳۳ء) "لڑائی کے ہتھیار" (جولائی ۱۹۴۱ء) اور "ولیس کی باتیں" (اپریل ۱۹۲۶ء) قابلِ ذکر ہیں۔ "ولیس کی پسندیدہ باتیں" (مطبوعہ کتابی دنیا دہلی) لطیف اعظمی کی قلمبند کردہ معلوماتی کتاب ہے۔ انھوں نے بچوں کی معلومات کے لیے دلچسپ اور لطیف پیرایہ میں مختلف جانوروں پر متعدد مضامین لکھے ہیں جو "پیام تعلیم" دہلی کے مختلف شماروں میں منظرِ عام پر آئے مثلاً "ریچھ" (مارچ ۱۹۶۷ء) "شیر" (اپریل ۱۹۶۷ء) "چیتا" (جون ۱۹۶۷ء) "ہاتھی" (اگست ۱۹۶۷ء) اور "زرافہ" (دسمبر ۱۹۶۷ء)۔

علاوہ ازیں عبداللطیف اعظمی نے بچوں کو اُردو کی کچھ ادبی شخصیتوں سے متعارف کرانے کی غرض سے مولانا حالی اور شبلی کے متعلق "پیامِ تعلیم، مارچ ۱۹۶۵ء" اور "بچوں کے شاعر اور مخلص استاد شفیع الدین نیر" (پیامِ تعلیم، اپریل ۱۹۶۵ء) جیسے مضامین بھی لکھے ہیں۔ "دارالمصنفین کی گولڈن جبلی" (اپریل ۱۹۶۵ء) کے ذریعہ ایک اہم علمی درسگاہ سے نونہالوں کو روشناس کرایا گیا ہے۔

نریش کمار شاد

اپنے دور کے مشہور و مقبول شاعر نریش کمار شاؔد کو بھی ادبِ اطفال نے اپنی جانب مائل کیا ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے کئی معیاری نظمیں اور کہانیاں لکھیں۔ ان کی نگارشات کے موضوع معصوم بچوں کی شرارتیں، آپسی چھیڑ چھاڑ اور روزمرہ زندگی کے واقعات ہیں۔ "سمے کی لہر" (کھلونا، فروری ۱۹۶۵ء) "بچوں کا مشاعرہ" (کھلونا، ستمبر ۱۹۵۷ء)، "پچی" (کھلونا، اکتوبر ۱۹۵۷ء) وغیرہ شاؔد کی لائقِ ذکر نظمیں ہیں۔

نثری کاوشوں میں "انھوں نے سینما دیکھا" (کھلونا جنوری ۱۹۶۵ء) "قمو میاں کی شرارت" (جگنو، بھوپال جنوری ۱۹۶۱ء) اور "مِٹھو" (جگنو، بھوپال مئی ۱۹۶۱ء) ان کی نمائندہ کہانیاں کہی جا سکتی ہیں۔ شاؔد کی کہانیوں کا مجموعہ "چینی بلبل" کھلونا بکڈپو نئی دہلی کے زیرِ اہتمام منظرِ عام پر آچکا ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری :-

عبداللہ ولی بخش قادری کا شمار بھی ان ادیبوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے ہمیشہ بچوں کے لیے صحت مند ادب کی طرف توجہ دلائی۔ اچھے مضامین اور کہانیاں لکھیں، نیز بچوں کے لیے درسی کتب بھی مرتب کیں۔ جن میں سے بیشتر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی بورڈ آف ایجوکیشن اور محکمۂ تعلیم جموں و کشمیر کے ثانوی درجات تک آج بھی شاملِ نصاب ہیں۔ عبداللہ ولی بخش قادری جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ٹیچرز کالج میں درس و تدریس کے پیشے سے منسلک رہے

اس کے میدان مخصوص میں تسلیم شدہ مسائل تعلیم، فلسفۂ تعلیم اور تعلیمی نفسیات ہیں۔ اردو زبان و ادب خصوصاً بچوں کے ادب کی ترویج و ترقی پر ہمیشہ ان کی گہری نگاہ رہی ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری کی تخلیقات میں "منی کے ترل کی کہانی" (پیام تعلیم، ستمبر ۱۹۵۳ء) "پھلکا پارک" (پیام تعلیم دسمبر ۱۹۵۳ء) "بنایا تھا چڑیوں نے جو گھونسلہ" (پیام تعلیم، جنوری ۱۹۶۰ء) "پڈی" (پیام تعلیم نومبر ۱۹۶۵ء) "ایک ننھا بیا ٹال مٹول" (پیام تعلیم، جنوری ۱۹۶۹ء) "ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے" (پیام تعلیم ستمبر ۱۹۶۱ء) "حسین حسان ایک یاد" (پیام تعلیم، نومبر ۱۹۶۷ء) اور "تیز صاحب نے کہانی سنائی" (پیام تعلیم ستمبر ۱۹۷۰ء) قابل ذکر ہیں۔ قادری صاحب نے اپنی تصانیف میں بچوں کی نفسیات، ان کی زبان، ان کی دلچسپیوں اور ان کی تعلیمی ضروریات کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے۔ وہ "پیام تعلیم" دہلی کے خاص لکھنے والوں میں سے ہیں۔

سراج انور:۔

معروف ناول نویس سراج انور، بچوں کے ان مقبول ترین ادیبوں میں سے ہیں، جنھوں نے اردو ادب اطفال کو جاسوسی، سائنس فکشن اور فنطاسیہ سے ایک نئے انداز میں روشناس کرایا ہے۔ سراج انور نے لڑکپن ہی میں گیارہ سال کی عمر سے بچوں کے لیے لکھنا شروع کردیا تھا، ان کی پہلی کہانی "پتنگ" (بچوں کا باغ، لاہور اکتوبر ۱۹۴۳ء) کے شمارے میں چھپی تھی۔ سراج انور نے گوناگوں موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے لیکن ان کا خاص میدان سائنس فکشن ہے۔ اپنی سائنسی کہانیوں اور فنطاسیوں میں سراج انور نے مافوق الفطرت واقعات و کردار کو بھی اس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ وہ حقیقت پسند اذہان کو بھی مانوس سے لگتے ہیں۔

سراج انور کو طویل کہانیاں اور ناولوں کی تخلیق سے دلچسپی ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ انھوں نے مختصر کہانیوں سے کلیتاً گریز کیا ہو۔ آزادیٔ ہند کے بعد شائع ہونے والے بچوں کے رسائل میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے سراج کی کہانیاں نہ چھاپی ہوں۔

"تمثیلچہ" (بازیچۂ اطفال مارچ ۱۹۴۹ء) "ناصر کی مکڑی" (ہدایت لاہور، اپریل ۱۹۵۱ء) حقیر (کھلونا، اکتوبر ۱۹۵۲ء) "جانور" (چاند، ناگپور جنوری ۱۹۵۳ء) "اختر کی عید" (پھول دہلی جون ۱۹۵۴ء) "عجیب دوست" (دوست، فروری ۱۹۵۶ء) "جانوروں کی دنیا" (ننھا حیدرآباد ۱۹۵۸ء) "کتاب کا راز" (پھلواری، دہلی ۱۹۵۵ء) "جانوروں کی دنیا" (شگوفہ حیدرآبادی ۱۹۵۹ء)

"جان پہچان" بچپن، بریلی، اگست ۱۹۹۶ء) "تجوری" بچوں کا آجکل، اپریل ۱۹۹۴ء "سونے کا شہتیر" (آواز، دہلی اپریل ۱۹۸۱ء) وغیرہ ان کی نمائندہ کہانیاں ہیں اور محولا بالا مثالوں سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ سراج کا حلقۂ قارئین کتنا وسیع رہا ہے اور بچوں کے ادیب کی حیثیت سے انھیں کس قدر مقبولیت حاصل رہی۔ میں نے ہر رسالے سے محض ایک کہانی حوالے کے لیے منتخب کی ہے ورنہ کم و بیش ہر رسالے میں ان کی متعدد تخلیقات مستقل منظرِ عام پر آئی ہیں۔

سراج انور نے بچوں کے ادب کو بہت سے فنتاسیے بھی دیے ہیں جن میں مہمات، حیرت انگیز واقعات، عجائبات اور تحیر و استعجاب سے لبریز فضا تخلیق کی گئی ہے۔

سراج انور کا سب سے پہلا ناول "خوفناک جزیرہ" ہے "کالی دنیا" "نیلی دنیا" اور "آخری چیخ" اس سلسلے کی اگلی کڑیاں ہیں۔ ان چاروں ناولوں میں نواب شہزادہ فیروز کی مافوق الفطری چار سیاحوں کی داستان پیش کی گئی ہے۔ یہ تمام ناول کتابی شکل میں منظرِ عام پر آنے سے پیشتر ماہنامہ (کھلونا دہلی) میں قسط وار بھی شائع ہوئے ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں طارق پبلیکیشنز دہلی نے سراج انور کی آٹھ کہانیاں، "شیخ چلی کی شامت، سونے کا شہر، گنجا ڈاکو" "تجوری کا راز" "طوطا تل کا قیدی" "تیس مار خاں" "بھیانک نقاب" اور "جادو کی آنکھیں" کتابوں کی شکل میں شائع کی ہیں۔

ان تمام کہانیوں میں سراج انور کا فن اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ تحیر و استعجاب کی نئی نئی دنیائیں تشکیل کرنے اور انوکھے کردار گڑھنے میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات بچوں میں ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ سراج کی طویل کہانیاں "پھولوں کا خزانہ" "سونے کا چہرہ" "جادو کا دروازہ" "خون کا دریا" "مجبوروں کا بادشاہ" اور "آخری شرارت" بھی کھلونا بکڈپو دہلی کے ذریعہ کتابی شکل میں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔
سراج انور مسلسل بچوں کے لیے لکھ رہے ہیں ان کا قلم ابھی بوڑھا نہیں ہوا، توقع کی جاتی ہے کہ ابھی وہ ادبِ اطفال کو اپنی تخلیقات سے اور بھی مالا مال کریں گے۔ میری حقیر رائے میں بچوں کے لکھنے والوں کی موجودہ نسل میں سراج انور صفِ اوّل میں جگہ پانے کے حقدار ہیں۔

خان محبوب طرزی:-

خان محبوب طرزی، اردو ادبِ اطفال میں روایتی اور طلسماتی طویل کہانی لکھنے والوں میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے متعدد کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں ماہنامہ "کلیاں" لکھنؤ میں شائع ہوئیں۔ بعد ازاں انھیں مکتبہ کلیاں (لکھنؤ) نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ خان محبوب طرزی کی ایسی کتابوں میں "جادو کا ہنس"، "جادو کی بوتل"، "فولادی پتلے"، "گورکھ دھندا"، "ترپالی"، "دو دیوانے"، "سفر طورا"، "خونی پجاری"، "جنگل کا راجہ" خصوصیت کی حامل ہیں۔

اطہر پرویز:-

پیام تعلیم کے مدیران میں اطہر پرویز بھی شامل رہے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۴ء تک اس پرچے کی ادارت کے فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیے۔ اطہر پرویز نے طبع زاد کہانیاں اور مفید معلوماتی مضامین لکھے۔ علاوہ ازیں انھوں نے مختلف زبانوں کی کہانیاں اور مضامین بھی اردو میں منتقل کیے ہیں۔

موصوف نے تقریباً نوع بہ نوع موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے: "ہمدردی" (فروری ۱۹۵۲ء) - "خوابوں کی حقیقت" (دسمبر ۱۹۵۲ء) "مرغی چور" (جنوری ۱۹۵۲ء) "ایک تھے نجومی" (جنوری ۱۹۵۲ء) "جیسے کو تیسا" (جنوری ۱۹۵۲ء) - "ایماندار لکڑہارا" (اپریل ۱۹۵۲ء) "شیخ جی نے منت مانی" (مئی ۱۹۵۲ء) "بے گھڑی کا دن" (دسمبر ۱۹۵۲ء) "خالہ بلی" (دسمبر ۱۹۵۲ء) "دو دوست" (اکتوبر ۱۹۵۲ء) "بھید کی بات" (جنوری ۱۹۵۳ء) "نیکی اور سچائی" (اپریل ۱۹۵۳ء) "کیا خوب آدمی تھے" "شیخ چلی" (جون ۱۹۵۲ء) "یمن عالم ایک ملاح" (جولائی ۱۹۵۲ء) "چالاک شہزادہ" (دسمبر ۱۹۵۲ء) "چینی بچوں کا تھیٹر" (سالنامہ ۱۹۵۶ء) "یمن کچھوے" (اپریل ۱۹۷۱ء) پیام تعلیم دہلی میں شائع ہونے والی مختلف موضوعات پر قابلِ ذکر طبع زاد کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کے علاوہ اطہر پرویز نے مختلف زبانوں سے جو کہانیاں اردو میں ترجمہ کی ہیں ان میں میڈم صفیہ یان ناس کی کہانی "ظالم بادشاہ اور کتا" (پیام تعلیم مارچ ۱۹۵۱ء) "سومناتھ در د کی کہانیاں"، "جیسی کرنی ویسی بھرنی" (پیام تعلیم اکتوبر ۱۹۵۰ء) اور "وینڈی اور جن کی کہانی" (پیام تعلیم اپریل ۱۹۵۲ء) شیکسپیئر کی "وینس کا سوداگر" (پیام تعلیم مارچ ۱۹۵۳ء) اور کوریا کی ایک لوک کتھا "ہمشیر خوار بچہ" (پیام تعلیم

اکتوبر ۱۹۵۳ء) کے ترجمے قابلِ ذکر ہیں۔

کہانیوں کے علاوہ اطہر پرویز نے بچوں کے لیے علمی ادبی، اخلاقی، اور معلوماتی مضامین بھی لکھے ہیں۔ جو "پیامِ تعلیم" دہلی کے مختلف شماروں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے ہیں۔ "تہذیب سے رسم و رواج" (مارچ ۱۹۵۱ء) "انڈونیشیا کی کچھ رسمیں" (جولائی ۱۹۵۱ء) "ہنگری کے بچّے" (اگست ۱۹۵۲ء) "لکھنے پڑھنے کی کہانی" (دسمبر ۱۹۵۲ء) "ہندستانی ریلوں کی کہانی" (جون ۱۹۵۳ء) "کھیل کو کھیل کی طرح کھیلو" (جولائی ۱۹۵۳ء) "اقوام متحدہ" (نومبر ۱۹۵۳ء) "کابل" (نومبر ۱۹۵۳ء) "فاہیان کا سفر" (اپریل ۱۹۵۴ء) "چائے" (مئی ۱۹۵۴ء) "ننھے منے پودے" (جون ۱۹۵۵ء) اطہر پرویز کے مفید و معلوماتی مضامین ہیں۔

اطہر پرویز کی بچوں کے لیے قلمبند کردہ معلوماتی کتابوں میں "ادب کیا ہے" "سجاد و کے کھیل" "نجومی آپا" "پودوں اور جانوروں کی دنیا" "چارلس ڈارون" "بدبا پو کے قدموں میں" "بچوں کے اقبال" "محمد شفیع الدین نیر" قابلِ ذکر ہیں۔

"پودوں اور جانوروں کی دنیا" اپنی نوع کی منفرد کتاب ہے، جو ۱۹۶۹ء میں ترقی اردو بورڈ دہلی نے شائع کی۔ یہ کتاب بچوں کو حیاتیات (BIOLOGY) سے بہت عام فہم انداز میں روشناس کراتی ہے۔ "نجومی آپا" بھی ان کی ایک دلچسپ معلوماتی کتاب ہے جس میں بچوں کو انوکھے پیرایہ میں جغرافیہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ "چارلس ڈارون" ۱۹۸۱ء میں مجلس اشاعت ادب دہلی نے شائع کی ہے۔ اس کتاب میں اطہر پرویز نے ڈارون (DARWIN) اور اس کی تھیوری سے بچوں کو متعارف کرایا ہے۔ "باپو کے قدموں میں" منوبہن گاندھی کی کتاب کا ترجمہ ہے جو ترقی اردو بورڈ دہلی نے شائع کی۔ اس کے علاوہ بچوں کی سیرت سازی کی غرض سے کچھ مذہبی شخصیتوں سے منسوب دلچسپ واقعات کہانی کے اسلوب میں پیش کیے ہیں۔ جن میں "حضرت علی کا انصاف" (آجکل، نئی دہلی، اگست ۱۹۶۹ء) قابلِ ذکر ہیں۔

اطہر پرویز نے قدیم کلاسیکی داستانوں سے ماخوذ قصوں پر مشتمل کچھ کتابیں بھی لکھی ہیں جو ترقی اردو بورڈ کے وسیلے سے منظرِ عام پر آئیں۔ ان میں "نائی اور رنگساز کا قصہ" "مشینی گھوڑا" خاص مقبول ہوئیں۔ علاوہ ازیں "گلی گلیلیو" (مطبوعہ اردو گھر علی گڑھ) ڈرامہ اس نہج کی ایک اور کتاب ہے۔

اطہر پرویز کی تخلیقات طبع زاد ہوں یا ماخوذ ہوں، وہ بچوں کی نفسیاتی استعداد اور ذہنی

جھونک، شرارتیں، ایک دوسرے سے حسد وغیرہ ان کی نظموں، کہانیوں اور ڈراموں کے موضوعات رہے ہیں۔

"فٹ بال"، "پتنگ کا مرثیہ"، "گھمی ٹھگر"، "ناچ میرے بندر"، "چٹکی ماموں"، "مولیس سے ماں نے کہا"، "امتحان ہال میں"، "مداری کا بندر"، "اور وہ رونے لگا"، "مزدور کا نغمہ"، "برا بھر کا گیت"، "جمو کا غصہ"، "میں سوچتا ہوں"، "چار پھول"، "یہ قول بہت سچا ہے"، "برسات"، "گیند کھو گئی نالی میں"، "جی حامد نے"، "شرارتیں"، "کھٹ کھٹ"، "بھولا لام گئے بازار"، "تیمن غوغ بندر"، "ہماری فریاد"، "مظفر حنفی کی مختلف موضوعات پر دلچسپ نظمیں ہیں، جو بچوں کے مختلف رسائل مثلاً "دوست" (کراچی) فنکار (کراچی) کھلونا (دہلی)، بچوں کا اچھل (دہلی)، "کلیاں" (لکھنؤ) "شانی" (مالیگاؤں) "پھلواری" (دہلی) "جگنو" (بھوپال) "کرنیں" (کانپور) "چاند" (ناگپور) "رہنمائے تعلیم" (دہلی) میں وقتاً فوقتاً چھپتی رہی ہیں۔ ان کا فنطاسیہ "بندروں کا مشاعرہ" ایک لطیف تمثیل ہے۔ بچوں کو اس کتاب میں اپنی شرارتیں نظر آتی ہیں، بندر شرارتی بچوں کی طرح حرکتیں کرتے ہیں، باغوں میں کودتے، پھاندتے، ہنگامہ کرتے ہیں۔ یہ بندر ایک مزاحیہ مشاعرہ برپا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب نظم و نثر کا دلچسپ امتزاج ہے۔

مظفر حنفی کی چودہ کہانیوں اور ڈراموں کا مجموعہ "نیلا ہیرا" مکتبہ پیام تعلیم دہلی کے توسط سے منظر عام پر آچکا ہے۔ یہ ان مقبول کہانیوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء کے دوران طالب علمی کی تھیں اور اس دور کے، بچوں کے معیاری رسالوں میں شائع ہوئی تھیں۔ ۱۹۸۳ء میں بچوں کا اچھا ادب کے سلسلے میں اردو اکیڈمی دہلی نے "نیلا ہیرا" کو پہلے انعام کا حقدار قرار دیا۔ نیلا ہیرا، میں بارہ کہانیاں اور دو یک بابی ڈرامے ہیں۔ "نرالا گڈا" (پھلواری، دہلی نومبر ۱۹۵۱ء) "جھمنا" (پھلواری، جون ۱۹۵۲ء) "خلیل کا غصہ" (پھلواری جون ۱۹۵۲ء) "تاج کی دیگت" (چاند ناگپور اگست ۱۹۵۲ء) "بہادر کون" (پھلواری، ستمبر ۱۹۵۳ء) "مچھلی کا شکار" (چاند، اکتوبر ۱۹۵۳ء) "نیلا ہیرا" (کھلونا، جولائی ۱۹۵۳ء) "حلوہ چور" (پھلواری دہلی دسمبر ۱۹۵۳ء) "بدلہ" (سالنامہ پھلواری ۱۹۵۳ء) "چنچل پری" (چاند، ناگپور دسمبر ۱۹۵۳ء) "پر اسرار قیدی" (کھلونا، اپریل ۱۹۵۴ء) "خزانے کا بھوت" (پھلواری جون ۱۹۵۴ء) "دوستی جاگتی ہے" (پھلواری سالنامہ ۱۹۵۵ء) اور "سائیکل ریس" (پھلواری اپریل ۱۹۵۵ء) شریک اشاعت ہیں۔ علاوہ ازیں دو کہانیاں "جنگ مصنف ہاتھ" (پھلواری، جون ۱۹۵۵ء) اور "اچھی سی کہانی" (چاند ناگپور جنوری ۱۹۵۶ء)

بھی شائع ہو چکی ہیں۔ مظفر حنفی نے چند سائنسی مضامین بھی لکھے ہیں جو ان کی متعلقہ سے سائنسی بچوں کی درسی کتب میں شامل ہیں۔ مثلاً جنت کے ہاسپر بیسرا ہیں"، اور شہد کا چھتہ"۔

مظفر حنفی ہمیشہ ادب اطفال کے مسائل اور ان کی ضروریات پر غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ وہ ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے تخلیقی کام کے علاوہ ان معدودے چند نظریاتی اور تاریخی تناظر میں دیکھا اور اس کے بارے میں متواتر تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔ مثلاً "اردو میں ادب اطفال" (مطبوعہ رسالہ زبان و ادب، پٹنہ ستمبر ۱۹۹۳ء)، "بچوں کا ادب ایک سرسری جائزہ" (تعمیر ہریانہ، چنڈی گڑھ)، "موجودہ ہندستان میں بچوں کے ادب کے موضوعات" (رسالہ شاہین امروہہ شمارہ ۱۹۸۵ء)، "اردو میں بچوں کا ادب، نصابی تکنیکی کتابیں اور تراجم" (ماہنامہ قومی زبان کراچی ۱۹۸۵ء) ان کے اس نوع کے مقالات ہیں۔

این سی ای آر ٹی (N.C.E.R.T.) اور نیشنل بک ٹرسٹ جیسے اداروں کی جانب سے منعقدہ سیمیناروں اور ورکشاپ وغیرہ میں وہ اردو ادب اطفال کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ 'چلڈرن لٹریچر ان انڈین لینگویجز' (CL-ILANGUAGES) کے نام سے پبلیکیشن ڈویژن دہلی نے جو ہندستان گیر سروے کیا تھا۔ اس سروے میں بھی اردو ادب اطفال کی نمائندگی مظفر حنفی نے کی ہے، ان کی خدمات کے پیش نظر نیشنل کانفرنس آن چائلڈ ایجوکیشن دہلی، نے نومبر ۱۹۸۵ء میں اردو ادب اطفال کے نمائندے کی حیثیت سے انھیں قومی اعزاز کا مستحق قرار دیا۔

الغرض مظفر حنفی صرف بچوں کے ادیب اور شاعر ہی نہیں بلکہ وہ ادب اطفال کے محقق اور نقاد کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔

اظہر افسر :-

معروف ڈرامہ نگار اظہر افسر نے بچوں کے لیے متعدد ڈرامے اور چند کہانیاں لکھی ہیں۔ انھوں نے دلچسپ موضوعات کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ "دانت کا درد" (کھلونا مئی ۱۹۵۴ء)، "بقلم خود" (کھلونا، نومبر ۱۹۵۵ء)، "خطا کی سزا" (کھلونا، اکتوبر ۱۹۵۶ء)، "آئینے

کافی ہو گئی" (کھلونا نومبر ۱۹۵۵ء) "شیشے کا تاج محل" (کھلونا جنوری ۱۹۵۶ء) "مسافر" (کھلونا جولائی ۱۹۵۶ء) "ایک تھا ریچھ ایک تھا اکڑو" (کھلونا فروری ۱۹۷۸ء) "ہنستا ہوا جنگل" (کھلونا فروری ۱۹۷۹ء) "بڑے دنوں کے بعد" (کھلونا جولائی ۱۹۸۱ء) "دوست ہو تو ایسا" (کھلونا جولائی ۱۹۸۳ء) "اداکار" (کھلونا نومبر ۱۹۸۳ء) وغیرہ موصوف کے قابلِ ذکر اور مقبول ڈرامے ہیں۔

اظہر افسر کی کہانیوں میں "پرنس ملا تھا" (کھلونا ستمبر ۱۹۸۲ء) "سچ جو بچپن کر دے" (کھلونا اکتوبر ۱۹۸۲ء) اور "ایک تھا قاسم اور ایک تھا علی بابا" (کھلونا، اکتوبر ۱۹۸۵ء) خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی کتاب "سچائی جالی" کہانیوں پر مشتمل ہے جو منظرِ عام پر آ چکی ہے۔

اظہر افسر نے بچوں کی اخلاقی اور مذہبی تعلیم پر بھی توجہ صرف کی ۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۵ء کھلونا دہلی کے بیشتر شماروں میں مذہبی اور اخلاقی صفحے کے تحت ان کی تحریریں اس ضمن میں لائقِ توجہ ہیں۔

اردو ادبِ اطفال میں خاص طور پر اپنے ڈراموں کی بنا پر اظہر افسر کو منفرد مقام حاصل ہے۔

مقبول احمد سیوہاروی:۔

بچوں کے لیے مذہبی اور اخلاقی موضوعات پر کہانیاں اور نظمیں لکھنے والوں میں مقبول احمد سیوہاروی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی بیشتر نگارشات ماہنامہ "پیامِ تعلیم" (نئی دہلی) کے مختلف شماروں کی زینت بنیں۔

"حضرت فاروق" (جنوری ۱۹۵۵ء) "ریل کا کھیل" (اگست ۱۹۵۵ء) "یہ لونا ہے کھلونا ہے" (اگست ۱۹۵۵ء) "عبدالکریم میں شیر کا شکار" (مئی ۱۹۵۵ء) "میری اماں" (اپریل ۱۹۵۶ء) "شاہ فقیر ہے" (مئی ۱۹۶۵ء) "حکومت آنکھ کھول کر کی جاتی ہے" (جون ۱۹۶۵ء) "بندروں کی لڑائی" (جولائی ۱۹۶۵ء) "غیاث پور" (نومبر ۱۹۶۵ء) "پندرہ سیر کی اشرفی" (دسمبر ۱۹۶۵ء) "کیا دیکھا" (جنوری ۱۹۶۶ء) "سفرنامہ ابن بطوطہ" (فروری ۱۹۶۹ء) "ابن بطوطہ" (اپریل ۱۹۶۹ء) "جنت اور دوزخ کے اشارے" (جنوری ۱۹۷۰ء) "کچی اینٹوں کی مسجد" (نومبر ۱۹۷۱ء) وغیرہ مقبول احمد سیوہاروی کے دلچسپ معلوماتی، اخلاقی مضامین اور کہانیاں ہیں۔

بچوں کے لیے ان کی کل آٹھ کتابیں بسوا احمد بجنور) میں اسلامی کتاب گھر سیوہارہ نے شائع کی ہیں۔ جن میں تیجا ماسے کے ٹکٹ" "کرشن کنہیا" گرونانک اور بھگت کبیر" "اجمیری خواجہ" "گوتم بدھ" وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے بچوں کے لیے صرف اسلام سے متعلق ہی کتابیں نہیں لکھیں بلکہ وسیع المشربی کی تلقین کرنے کے لیے مختلف مذاہب کے سنتوں فقیروں اور ولیوں کے بارے میں بھی خامہ فرسائی کی ہے۔

افتخار احمد اقبال :-

بچوں کے لیے جاسوسی، مہماتی، سائنسی کہانیاں لکھنے والوں میں افتخار احمد اقبال کا نام بھی شامل ہے۔ دورِ جدید کے سائنسی تقاضوں اور مغربی رجحانات کے غلبے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے افتخار احمد اقبال نے بچوں کے لیے "موت کے شعلے" (کھلونا ستمبر ۱۹۵۶ء) "سونے کا بت" (کھلونا اپریل ۱۹۵۷ء) "زنگا" (کھلونا جون ۱۹۵۷ء) "چلتی تصویریں" (کھلونا جولائی ۱۹۵۸ء) "پُراسرار انسان" (کھلونا اکتوبر ۱۹۵۸ء) جیسی متعدد دلچسپ کہانیاں قلم بند کیں۔

۱۹۵۷ میں ان کا جاسوسی ناول "خونی دروازہ" اور سائنس فکشن "پاگل ڈاکٹر" کتابی شکل میں کھلونا بکڈپو دہلی سے شائع ہوئے۔ قبل ازیں یہ دونوں ناول ماہنامہ کھلونا دہلی میں قسط وار چھپ چکے تھے اپنی خدمات کی بنا پر انھیں بھی ادبِ اطفال میں مدتوں یاد رکھا جائے گا۔

ظفر گورکھپوری :-

جدید نسل کے مشہور شاعر ظفر گورکھپوری نے ادبِ اطفال میں بھی اپنا ایک منفرد مقام تسلیم کرا لیا ہے۔ ان کی نظمیں اور کہانیاں بچوں کی دلچسپی کے سامان فراہم کرنے کے ساتھ انھیں اخلاقیات کی تعلیم بھی دیتی ہیں ان کی نظموں کے مجموعہ "ناچ میری گڑیا" میں شامل ہوا سویرا۔ "چچا غالب" "پیارا ہندوستان" "منے کا خواب" "برکھا رانی" تخلیقات دامنِ دل کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ ظفر گورکھپوری کی نظموں کی خصوصیت ان کی سادہ زبان، دلکش اسلوب اور موضوعات کا تنوع ہے یہ حب الوطنی، اور قومی

یکجہتی کی آئینہ دار ہیں۔
ظفر کی کہانیوں کا مجموعہ "سچا ئیاں" منظرِ عام پر آچکا ہے۔ جس میں شامل "دو دوست" "کھٹا میٹھا"، "مشاعرہ" اور "بلی" نمائندہ کہانیاں ہیں۔ ظفر کی بیشتر کہانیاں سبق آموز ہیں۔

احمد جمال پاشا:۔

دورِ جدید کے ممتاز مزاح نگار احمد جمال پاشا نے بچوں کے لیے بھی بہت سی کہانیاں اور ڈرامے قلمبند کیے ہیں۔ پاشا کی کہانیوں کے اوصاف ان کی سادہ لیکن شگفتہ زبان، ظرافت آمیز طرزِ نگارش اور اچھوتے موضوعات ہیں۔ پاشا نے موضوعات کا انتخاب بچوں کی نفسیات ان کی ضروریات اور دلچسپیوں سے پیش نظر کیا ہے۔ پاشا نے بچوں کو طلسمات کی سیر کرائی ہے۔ جادو کے کھیل دکھائے ہیں، پرستان کی پریوں سے ملوایا ہے۔ اور بچوں کے مسائل کی عکاسی بھی کی ہے۔

پاشا کی کہانیوں اور ڈراموں میں "نیا کھیل" (پیام تعلیم اپریل ۱۹۵۵ء) "کام کے وقت کام" (پیام تعلیم ستمبر ۱۹۵۵ء) "گڈو، بڈو" (کھلونا جنوری ۱۹۶۵ء) "میاں نٹ کھٹ اور کھلنڈرے کے کارنامے" (پیام تعلیم اپریل ۱۹۷۱ء) "عزمی" "لوسی، چبا اور چبی" (کھلونا فروری ۱۹۷۰ء) "جادو کی بوتل" (کھلونا۔ نومبر ۱۹۷۶ء) "ڈاکٹر زندہ طلسمات" (کھلونا نومبر ۱۹۷۰ء) "ڈھل مل بھائی" (پیام تعلیم، دسمبر ۱۹۷۷ء) "لیٹ لطیف" (کھلونا، جون ۱۹۸۲ء) اور جادوگر کا تحفہ قابلِ ذکر ہیں۔

احمد جمال پاشا نے کچھ ایسی کہانیاں بھی لکھی ہیں جو دوسری زبانوں کی کہانیوں اور لوک کتھاؤں سے ماخوذ ہیں۔ بچوں کے لیے تین کتابیں "بہادر شہزادہ" "آسمانی یاقوت" اور "طلسمی کہانیاں" منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

اظہار اثر:۔

اظہار اثر نے عوامی مقبولیت کے حامل در جنوں جاسوسی ناول لکھے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کئی جاسوسی اور سائنسی کہانیاں قلمبند کی ہیں۔ جن میں تجسس، سسپنس، حیرت، استعجاب اور بچوں کی دلچسپی کے دیگر لوازمات موجود ہیں۔ البتہ ان کی کہانیوں

میں لکھی گئی ہیں جو اس حد تک قابلِ ذکر ہے کہ تجسّس و مہارت گری کے ان قصّوں کو پڑھ کر بچوں کے ذہن پر مثبت اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

"تین جاسوس" (کھلونا مئی ۱۹۵۱ء) "کیمیاگر" (کھلونا فروری ۱۹۵۳ء) "ایٹمی دور کا جن" (کھلونا اپریل ۱۹۶۰ء) ان کی طویل جاسوسی اور سائنسی کہانیاں ہیں۔ بعد ازاں یہ تینوں کہانیاں کتابی شکل میں کھلونا بکڈپو نئی دہلی سے ہی منظرِ عام پر آئی ہیں۔

علاوہ ازیں "شیخ کنگ کا ٹنگ" (کھلونا مئی ۱۹۵۲ء) "بائیسکل کی کہانی" (کھلونا ستمبر ۱۹۵۶ء) "گمشدہ کی تلاش" (کھلونا جون ۱۹۵۷ء) "سجدہ ایل" (کھلونا اپریل ۱۹۵۸ء)، "ایک گلاس پانی" (کھلونا، نومبر ۱۹۵۸ء) "دادی اماں کی یادداشت" (کھلونا فروری ۱۹۶۰ء) وغیرہ مختلف موضوعات پر دلچسپ مختصر کہانیاں ہیں۔ اظہار اثر بچوں کے لیے مسلسل جاسوسی اور سائنسی کہانیاں تخلیق کر رہے ہیں۔ اور توقع ہے کہ ان کے فن میں ابھی اور نکھار پیدا ہوگا۔

کیف احمد صدیقی:-

کیف احمد صدیقی ان جدید شعرا میں سے ہیں جو بچوں کے لیے صحت مند منظوم ادب پیش کرنے میں پیشرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات بچوں کے تقریباً ہر معیاری جریدے میں جگہ پاتی رہی ہیں۔ کیف کی نظموں کی زبان آسان ہے لیکن انھوں نے بچوں کی استعداد بڑھانے کے لیے مشکل الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، جو کہ بچوں کے لیے پریشان کن ثابت ہو سکتے ہیں۔ مثلاً "رمضان کا مہینہ" "دیوالی" "اندرا گاندھی" "بارش نور" "بزرگوں کی نصیحت" ایسی ہی نظمیں ہیں۔

بچوں کی نفسیات اور ان کی دلچسپیوں سے کیف پوری طرح واقف ہیں اس واقفیت سے بچوں کی نظموں میں مناسب استفادہ بھی کرتے ہیں، وہ اپنی نظموں کے ذریعہ بچوں کو حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کی بے شمار نظمیں ان خصوصیات کی حامل ہیں۔ "جشنِ آزادی" "یومِ جمہوریہ"، "چھبیس جنوری" "میرا ہندوستان"، "وہ گاندھی" "چاچا نہرو" "وطن کی شان" "اندرا گاندھی" "جنگ نہ ہونے پائے" "شہیدانِ وطن کے بچوں کے نام" وغیرہ اس کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

کیف احمد صدیقی نے بچوں کی دلچسپی کے پیش نظر کئی مزاحیہ غزلیں بھی کہی ہیں ۔ ان میں سے بیشتر غالب کی غزلوں کی پیروڈی ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی شعری کاوشوں میں، پہیلیاں، اور قوالیاں بھی شامل ہیں۔ موصوف کے تین شعری مجموعے "سدا بہار نظمیں" "دلچسپ نظمیں" اور "دیدی نظمیں" منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اور انھیں اتر پردیش اکادمی سے انعام بھی ملے ہیں۔

عفت موہانی :-

اس دور کی متعدد ناولوں کی مصنفہ عفت موہانی ادبِ اطفال کے میدان میں ایک انوکھے انداز سے داخل ہوئیں۔ اور موصوفہ نے امتیاز علی تاج کے ناقابلِ فراموش مزاحیہ کردار چچا چھکن کی طرز پر بچوں کے لیے دلچسپ کردار نانی اماں تخلیق کیا۔ اور اپنی کہانیوں میں ان ہی کے معصوم اور پر لطف واقعات کو بچوں کی عام فہم زبان میں تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کی یہ کہانیاں زیادہ تر ماہنامہ "کلیاں"، (لکھنؤ) کے اوراق کی زینت بنیں اور بعد ازاں مکتبۂ کلیاں، لکھنؤ نے ہی انھیں کتابی شکل دی۔ ان کہانیوں میں "نانی اماں شادی میں گئیں" "نانی اماں بیمار ہوئیں" "نانی اماں اور بھوت" "نانی اماں نے بلی پالی"، "نانی اماں نے بہادری دکھائی"، "نانی اماں نے چغل خوری کی" اور "نانی اماں نے ڈینگ ہانکی" شامل ہیں۔ اس طرح عفت موہانی اپنے اس انوکھے کردار کی بنا پر بچوں میں کافی دنوں تک یاد رکھی جائیں گی۔

مظہر الحق علوی :-

بچوں کے لیے اپنی مہماتی، سائنسی اور تاریخی کہانیوں، نیز ناولوں کی بنا پر مظہر الحق علوی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں اور ناولوں میں کچھ ایسی دلکشی ہے کہ بچے ان میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ مظہر الحق علوی نے تاریخی اور مافوق الفطرت کہانیاں بڑی تعداد میں قلمبند کی ہیں۔ موصوف نے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ ان کی تخلیقات کے مطالعے سے بچے بے خوف اور باہمت بنیں۔ ان کے ناول "تلاش"، "سنہرا خزانہ"

"سمندری شیطان" اور "جل پری" وغیرہ ان کہانیوں کے علاوہ ہیں۔ ان ناولوں میں بہادری کے کارناموں کے ساتھ جغرافیہ، تاریخ اور سائنس سے متعلق مفید معلومات فراہم کی گئی ہے۔ عقلمندی اور چالاکی کے کارناموں پر مبنی کہانیوں میں "ہکلا طوطا" اور "لاش کی سرگوشی" ان کی قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔

مظہر الحق کی کہانیوں میں "جن کا مقابلہ"، "چچا مرغی سسرال گئے"، "بلی دلالی"، "جادو کی ڈبیہ" ایسی تخلیقات ہیں جو ماہنامہ "کلیاں" لکھنؤ میں قسط وار شائع ہوئیں اور بعد ازاں مکتبۂ "کلیاں" لکھنؤ کے توسط سے کتابی شکل میں منظرِ عام پر آئیں۔ اسی ادارے سے ان کی طویل کہانی "طلسمی کہانیاں"، "دنیا کے دشمن"، "جل پری"، "موت کی منزل"، "خفیہ خزانہ"، "سمندری لٹیرے"، "خوفناک آدمی"، "ہیرا ڈاکو"، "نیلا ستون"، "مچھیروں کا خزانہ"، "شہر سلیمان"، "چچا مرغی نے سرکس دیکھا"، "چچا مرغی نے سیٹی بجائی"، "سمندری شیطان"، "فرعون کا خزانہ"، "شہزادہ اشدیا"، "جن اور پتھر"، "تین جلوس"، "تلا غنی"، "جن سے مقابلہ"، "جادوگر کا انتقام"، "فقیر شاہ"، "تین دن ایک کہانی" اور "ٹمٹماتا تارہ" وغیرہ بھی کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔

مظہر الحق علوی نے طبع زاد کہانیوں اور ناولوں کے علاوہ مختلف زبانوں کی کہانیوں اور ناول کے اردو ترجمے بھی کیے ہیں۔ ایسی کتابوں میں "درختوں کی دنیا"، رسکن بانڈ اور "ہکلا طوطا" رائیڈر ہیگرڈ کے ناول کا ترجمہ ہے۔

الغرض مظہر الحق علوی بچوں کے فکشن نگاری کی حیثیت سے ممتاز درجہ پر فائز ہیں۔

محمود نیازی:۔

محمود نیازی کا نام بچوں کے لیے جاسوسی، مہماتی اور طلسماتی کہانیاں لکھنے والوں میں قابلِ ذکر ہے۔ ان کی بیشتر کہانیاں رسالہ "کلیاں" لکھنؤ میں قسط وار شائع ہوئیں بعد ازاں مکتبۂ "کلیاں" نے ان کو کتابی شکل بھی دی۔ ایسی کتابوں میں "قاتل کا شہر"، "انسان اور جانور"، "نیز جادو کی کھجور" ان کی طبع زاد تخلیقات ہیں۔ انھوں نے رائیڈر ہیگرڈ کے

ایک ناول کا ترجمہ "سلیمان کا خزانہ" کی شکل میں پیش کیا۔ ان کی ایک اور تصنیف "سانپوں کی ملکہ" ہے جو الف لیلیٰ کی ایک داستان سے ماخوذ ہے۔

الیاس سیتاپوری:۔

الیاس سیتاپوری اس دور کے مقبول تاریخی ناول نگار ہیں۔ موصوف نے بچوں کے ادب میں بھی اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کیا۔ الیاس سیتاپوری نے اپنی کہانیوں کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو بچوں کی دلچسپی کے ساتھ معلومات بھی فراہم کریں۔ ان کی مشہور کہانیاں "بگڑا فرشتہ"، "ماں کا ظلم"، "ظالم بادشاہ"، "جن پکڑا گیا"، "ہیبت خاں" اور "خونی بچاری" لائق ذکر ہیں جنھیں کتابی صورت میں کھلونا بکڈپو دہلی نے شائع کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں بعض مقامات پر عبارت گنجلک ہو جاتی ہے اور کہیں کہیں بچوں کی استعداد کے برعکس مشکل الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ بہ ایں ہمہ ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اخگر مشتاق رحیم آبادی:۔

اختر مشتاق بچوں کے معروف شاعر ہیں۔ موصوف کی تحریروں میں دلکشی کا عنصر نمایاں ہے نظموں میں بچوں کی نفسیات پر بھی ان کی نگاہ عمیق ہے۔

"طوفانِ میل" (پیام تعلیم دہلی جولائی ۱۹۴۷ء) "عرفان ماموں" (پیام تعلیم، اپریل ۱۹۴۹ء) "عرفان ماموں کی عینک" (پیام تعلیم جون ۱۹۴۹ء) "کرکٹ" (پیام تعلیم، اگست ۱۹۴۹ء) "ساون کی گھٹا" (پیام تعلیم، اکتوبر ۱۹۴۹ء) "معاہدے" (پیام تعلیم نومبر ۱۹۴۹ء) "علم و عمل" (پیام تعلیم اپریل ۱۹۵۰ء) "کھلونے" (پیام تعلیم، ستمبر ۱۹۵۲ء) "نئی دنیا" (پیام تعلیم، نومبر ۱۹۵۲ء) وغیرہ اخگر کی متنوع اور نمائندہ نظمیں ہیں۔ ان کی شعری نگارشات کا مجموعہ "پیاری نظمیں" ادارہ فکر و فن لکھنؤ سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اخگر نے بچوں کے لیے ایک آدھ کہانی اور معلوماتی مضمون بھی قلمبند کیا ہے "مختصر کہانیاں" (پیام تعلیم، نومبر ۱۹۵۳ء) اور "دروشنائی اور جاذب" (پیام تعلیم فروری ۱۹۵۵ء) مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

مقبول احمد دہلوی :۔

مقبول احمد دہلوی بھی بچوں کے ان ادیبوں میں سے ہیں جن کی اہمیت ہندو پاک کے اردو ادب اطفال میں یکساں طور پر تسلیم کی گئی۔ بچوں کے لیے بیشتر تاریخی، روایتی اور طلسماتی کہانیاں قلم بند کی ہیں۔ ان کی تخلیقات میں ایک لوک کہانی سے ماخوذ "شہزادی نجمہ" ماہنامہ "کلیاں" (لکھنؤ) اور "بچوں کی دنیا" (لاہور) میں بیک وقت قسط وار شائع ہوتی رہی ہیں۔ اور بعد میں مکتبہ کلیاں (لکھنؤ) نے کتابی صورت میں پیش کیا۔ یہ کہانی اسلوب، زبان اور موضوع ہر اعتبار سے معیاری ہے۔ "بچوں کی چڑیا" اور "اُلو کا درخت" ان کی دو اور کہانیوں کی کتابیں ہیں جو مکتبہ کلیاں، لکھنؤ کے توسط سے منظرِ عام پر آئیں۔

مقبول احمد دہلوی کی دیگر قابلِ ذکر کہانیاں ماہنامہ کلیاں، لکھنؤ میں شائع ہوئیں جن میں "شہزادی گلِ رخ" (جنوری ۱۹۷۷ء) "موتیوں کی شہزادی" فروری ۱۹۷۷ء) "طلسمی گھوڑا" (مارچ ۱۹۷۷ء) "اجنبی شہزادہ" (جولائی ۱۹۷۷ء) "چاند کی شہزادی" (اگست ۱۹۷۶ء) "عقلمند لڑکی" (اکتوبر ۱۹۷۷ء) "کنول شہزادی" (نومبر ۱۹۷۶ء) شامل ہیں۔ "بچوں کی دنیا" (لاہور) میں مقبول احمد دہلوی کی مطبوعہ کہانیوں میں "شہزادی مینڈکی" (اگست ۱۹۷۶ء) "مور بادشاہ" (ستمبر ۱۹۷۷ء) "اڑنے والا درخت" (اکتوبر ۱۹۷۶ء) "عجیب ملک" (نومبر ۱۹۷۶ء) "جادوگرنیاں" (نومبر ۱۹۷۶ء) "قسمت کا فیصلہ" (دسمبر ۱۹۷۶ء) اس جائزے میں شمولیت کی مستحق ہیں۔ ان کہانیوں کے عنوانات سے ہی موضوعات کی رنگارنگی اور دلچسپی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بیشک مقبول احمد دہلوی ادبِ اطفال میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔

سیّد مُنیر الحسن

سید منیر الحسن "پیامِ تعلیم" دہلی کے خاص مصنفین میں سے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے متعدد کہانیاں، معلوماتی مضامین اور کچھ نظمیں قلم بند کی ہیں، موصوف کی نگارشات پیامِ تعلیم کے مختلف شماروں میں بکھری ہوئی ہیں۔

"سونے کی گھڑی" (جون ۱۹۵۳ء) "تین چراغ" (مارچ ۱۹۵۳ء) "چار کوتے" (رتی

۱۹۵۳ء) "صحرا کا جہاز" (جولائی ۱۹۵۳ء) "بجلی کا کمال" (اکتوبر ۱۹۵۳ء) "بچوں کی کانفرنس" (دسمبر ۱۹۵۳ء) "جب تک یہ دنیا قائم ہے" (نومبر ۱۹۵۴ء) اور "وہ دوست بن گئے" (مئی ۱۹۵۶ء) ان کی قابلِ ذکر کہانیاں ہیں۔

مختلف موضوعات پر ان کے مضامین میں "جامعہ" کے تعلیمی سلسلے میں "(جنوری ۱۹۵۵ء) "دوربین" (جنوری ۱۹۵۵ء) "جوہری بم" (فروری ۱۹۵۵ء) "آبی قوت" (مارچ ۱۹۵۵ء) "روشنی کا سفر" (اکتوبر ۱۹۵۵ء) شامل ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، منیر الحسن نے بچوں کے لیے نظمیں بھی کہی ہیں۔ "ہم" (جون ۱۹۶۵ء) "برسات کا زمانہ" (جولائی ۱۹۶۵ء) "مچھر" (اگست ۱۹۶۵ء) "پیام عید" (فروری ۱۹۶۵ء) ان کی نمائندہ نظمیں ہیں۔

اسرار ندوی :-

"پیام تعلیم" گروپ میں اسرار ندوی کا نام بھی آتا ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے کہانیاں اور مضامین لکھے ہیں۔

"سیٹھ چندو لال" (پیام تعلیم، جنوری ۱۹۵۳ء) "مرزا غالب کی حاضر جوابیاں" (پیام تعلیم مارچ ۱۹۵۳ء) "فقیر شہزادہ" (پیام تعلیم، اکتوبر ۱۹۵۴ء) اور "دیمن شمنگ" (پیام تعلیم، اکتوبر ۱۹۶۰ء) ان کی تخلیقات میں لائقِ ذکر ہیں۔ سائنس اور تاریخی موضوعات پر مشتمل "آریہ بھٹ" (پیام تعلیم جولائی ۱۹۷۵ء) اور "بہار کے چند تاریخی مقامات" (پیام تعلیم، مئی ۱۹۵۵ء) موصوف کے قابلِ ذکر مضامین ہیں۔

اسرار ندوی کی تحریریں شگفتگی اور لطیف مزاح کی حامل ہیں۔ اس کی روشن مثال ان کی کتاب "ایک کچھوری تیل میں" ہے جسے مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔

محمد امین اعظمی :-

محمد امین اعظمی نے بچوں کے لیے تاریخی، جغرافیائی اور نفسیاتی مضامین قابلِ لحاظ تعداد میں قلمبند کیے ہیں۔ "پیام تعلیم" (دہلی) کے مختلف شماروں میں شائع ہونے والے ان کے معلوماتی مضامین میں "کوریا" (اگست ۱۹۵۰ء) "آسام کا زلزلہ" (نومبر ۱۹۵۰ء)

"کشمیر پر ایک جغرافیائی نظر" (نومبر سنہ ۱۹۵۱ء) "ایران" (اگست سنہ ۱۹۵۱ء) "سورج گرہن" (مئی سنہ ۱۹۵۲ء) "ذہانت یا پناگی" (اگست سنہ ۱۹۵۷ء) "دنیا کی آب دیکھا بچول رہی ہے" (اکتوبر سنہ ۱۹۵۲ء) اور "امریکی خلاباز" (نومبر سنہ ۱۹۷۷ء) قابل توجہ ہیں۔ محمد امین اعظمی نے اپنے ان معلوماتی مضامین میں آسان زبان نیز سادہ اسلوب اختیار کیا ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی:۔

اردو ادب اطفال میں مناظر عاشق ہرگانوی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں طلسماتی، مہماتی اور اخلاقی کہانیاں قلمبند کی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں حیرت و استعجاب، تجسس اور بچوں کی دیگر دلچسپیاں موجود ہیں۔

ذر کی تلاش (پیام تعلیم جون سنہ ۱۹۷۰ء) "توتے کی زمینداری" (پیام تعلیم اپریل سنہ ۱۹۷۲ء) "ایک سے بھلے تین" (پیام تعلیم جولائی سنہ ۱۹۷۳ء) گدھے کے پنجے" (کلیاں دسمبر سنہ ۱۹۷۶ء) "کائیں کائیں" (کھلونا نومبر سنہ ۱۹۷۷ء) "بندر اور شیر" (کھلونا اکتوبر سنہ ۱۹۸۵ء) "دوستی" (پیام تعلیم اکتوبر سنہ ۱۹۸۵ء) مناظر عاشق ہرگانوی کی طبع زاد کہانیاں ہیں۔ موصوف نے کچھ کہانیاں دوسری زبانوں سے بھی ماخوذ کی ہیں۔ جن میں "بھیڑیا اور گیدڑ" "کھوٹا سکہ" "مغرور گیدڑ" قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بہت سے معلوماتی مضامین قلمبند کیے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا طویل مضمون "دنیا کے عجیب و غریب جانور" قابل ذکر ہے۔ جو ماہنامہ پیام تعلیم میں اپریل سنہ ۱۹۷۳ء سے مسلسل نومبر سنہ ۱۹۷۴ء تک قسط وار شائع ہوا۔

ان کی طویل کہانیاں "نجات" "کھیل ہی کھیل میں" "اغوا" "تلخ میوہ" "جنگل کا ڈاکو" "گدھے کے پنجے" کتابی شکل میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن کی اشاعت مکتبہ "کلیاں" (لکھنؤ) کے توسط سے عمل میں آئی۔

مناظر عاشق ہرگانوی بچوں کے لیے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ اور امید ہے "ادب اطفال" میں ان کے قلم سے اور اضافے ہوں گے۔

غلام حیدر:۔

غلام حیدر کا نام بچوں کے ادیب کی حیثیت سے "ادب اطفال" میں شامل کیے جانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ ان کی طبع زاد کہانیاں بچوں کی دلچسپی کے تمام لوازمات کی حامل ہیں۔

"سرخ مچھلی" (پیام تعلیم اگست سنہ ۱۹۷۰ء) "نیلم اور فرح" (پیام تعلیم فروری ۱۹۷۱ء) "ہوشیار بیوی" (پیام تعلیم اگست سنہ ۱۹۷۰ء) "چار گویے" (پیام تعلیم اگست سنہ ۱۹۷۱ء) "ہماری پوسی" (پیام تعلیم جون سنہ ۱۹۷۵ء) ان کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔

غلام حیدر نے دیگر زبانوں کے معلوماتی کتب کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے "پیسے کی کہانی"، "خط کی کہانی" ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ موصوف کا سب سے اہم کام ناول "غار سے جھونپڑی تک" ہے جس میں ابتدائی دور کے انسان کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے پر لطف واقعات اور ارتقائی مدارج بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ناول اتر پردیش اردو اکیڈمی نے تصویروں کے ساتھ شائع کیا ہے اور عظیم بیگ چغتائی کے "قصر صحرا" کے بعد اپنی نوعیت کی دوسری اہم تصنیف ہے۔

انیس مرزا:۔

متعدد ناولوں کے مصنف انیس مرزا نے بچوں کے لیے جاسوسی اور مہماتی ناول لکھے ہیں ساتھ ہی طلسماتی اور روایتی طویل کہانیاں بھی قلمبند کی ہیں۔ ان کی تخلیقات میں بچوں کی دلچسپی کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ "میں راجہ ہوں" (پیام تعلیم مارچ سنہ ۱۹۵۵ء) "دیوتا کی آنکھ" (پیام تعلیم جولائی سنہ ۱۹۸۱ء تا فروری سنہ ۱۹۸۲ء) اور "زہریلی سوئی کا کھلونا فروری سنہ ۱۹۷۵ء) ان کی دلچسپ کہانیاں ہیں۔ "دیوتا کی آنکھ" بعد ازاں کھلونا بکڈپو دہلی نے کتابی شکل میں شائع کی۔

بچوں کے لیے انیس مرزا کے لکھے ناولوں میں "مقدس کھوپڑی"، "کالی گھوڑی کا

"ستارہ" "خلا کا قیدی" "سرکس سے بھاگے" "اور" "سمندر کا بچھڑا" ... تعجب سے تکتی ہیں
"قصہ چہار درویش" "گم شدہ شہزادی" "سجادو کا محل" "سہانا ... کا شہزادہ"
موصوف کی نمائندہ کہانیاں ہیں جو کتابی شکل میں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

شکیل انور:۔

شکیل انور تازہ دم فنکاروں میں سے ہیں جو بچوں کے اچھے مصوّر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ موصوف نے بچوں کے مختلف رسائل مثلاً کھلونا (دہلی) "چاند" (مراد آباد) "ہلال" (رام پور) اور "چندا نگری" (مراد آباد) میں تصویری فیچرز کے لیے جاذبِ توجہ اسکیچز بنائے ہیں۔

علاوہ ازیں خود بھی مختصر مختصر باتصویر کہانیاں تخلیق کی ہیں جن میں "دوستی" "سمندری راجہ" "پتھر کے بت" "خالی تابوت" "ننھے میاں" "پرنسیہ ٹرانسسٹر" "فنکار" "فریب" قابلِ ذکر ہیں۔ جو کہ ماہنامہ کھلونا (نئی دہلی) میں وقتاً فوقتاً شائع ہو کر بچوں کی دلچسپی کا سبب بنتی رہیں۔

شکیل انور نے بغیر الفاظ کی کہانیاں (صرف قلمی تصویریں جن کو دیکھ کر بچے خود کہانی بنا سکتے ہیں) کھلونا دہلی کے لیے تشکیل کی ہیں۔ ان میں "نیند" (جولائی ۱۹۸۱ء) "انعام" (اگست ۱۹۸۱ء) "شانی" (دسمبر سنہ ۱۹۸۱ء) خصوصیت کی حامل ہیں۔

شکیل انور کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ صرف بچوں کے مصوّر اور تصویری کہانیوں کے ماہر ہیں۔

ناوک حمزہ پوری:۔

مشہور شاعر ناوک حمزہ پوری نے بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں تخلیق کی ہیں جو بچوں کے معیاری جرائد کی زینت بنیں۔ "میں ایک بدقسمت توتا ہوں" "کھلونا جون سنہ ۱۹۷۷ء" "تتلی" (کھلونا اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء) ان کی قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ "نو اچھی باتیں" میں بچوں کو اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے۔

ناوک کی نمائندہ کہانیوں میں "گل بکاؤلی" "چوہے رام" "گلدستہ" اور "چڑیا خانہ"

کے نام لیے جاسکتے ہیں جو کتابی شکل میں مکتبہ کلیاں لکھنؤ کے توسط سے منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

عطیہ پروین:

خاتون افسانہ نگار عطیہ پروین کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے متعدد کہانیاں قلمبند کی ہیں۔ عطیہ پروین کی اکثر کہانیاں ماہنامہ کلیاں لکھنؤ میں شائع ہوئیں۔ بعد ازاں مکتبہ کلیاں لکھنؤ نے انھیں کتابی شکل میں شائع کیا۔ عطیہ پروین بچوں کی نفسیات سے واقف ہیں اور ان کی نگارشات میں بچے خاصی دلچسپی محسوس کرتے ہیں۔ "شب نور" "فاختہ شہزادی" "جنت کی تلاش" "ننھے میاں نے کھیر کھائی" ان کی قابلِ ذکر کہانیاں ہیں۔

بزمی بھارتی:-

بزمی بھارتی نے بچوں کے لیے کافی تعداد میں پیاری پیاری نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی نظموں پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ادبی روایت اور اخلاقی اقدار کی گہری چھاپ ہے۔ ان نظموں میں حب الوطنی کا جذبہ اور وہ تعمیری ذہن ملتا ہے جس کی آج ہندوستان کو اشد ضرورت ہے۔ ان کی نظموں میں جو رجائیت اور صحت مند فکر رواں دواں ہے وہ نوجوانوں کے لیے تعمیری افادیت بھی رکھتی ہے۔

بزمی بھارتی کا کلام بچوں کے معیاری رسائل میں کافی چھپتا رہتا ہے۔ حکومت جموں و کشمیر کی منظور شدہ اردو ہندی ٹیکسٹ بکس میں ان کی نظمیں "کشمیر کی جھیل" "مور" "ہولی" اور "جیون یاترا" اپنی افادیت کی بنا پر شاملِ نصاب ہے۔ بزمی بھارتی کی نظموں کا مجموعہ "دھنک" مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا ہے۔ بحیثیت شاعر بزمی بھارتی کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کی نظموں کی بحریں مترنم ہیں۔ اور تحریر میں آسان و دلکش زبان اور مانوس مواد سے کام لیا گیا ہے۔ جن کے مطالعہ سے بچّے کی ذہنی تربیت ہوتی ہے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی جلا ملتی ہے۔

گردیال سنگھ والیہ:-

گردیال سنگھ والیہ بھی بچوں کے جانے پہچانے ادیب ہیں جنھوں نے مختلف

دلچسپ موضوعات پر خامہ فرسائی کی اور بچوں میں خاص مقبولیت حاصل کی۔

"جادو کا کتا" (کھلونا فروری سنہ ۱۹۷۵ء) "شیر کا شکار" (کھلونا مارچ ۱۹۷۵ء) "بجھو" (کھلونا اکتوبر سنہ ۱۹۷۵ء) "سونے کی تھالی" (بچوں کا اکتوبر سنہ ۱۹۵۵ء) "پری شہزادی" (پھلواری جنوری سنہ ۱۹۵۶ء) اور "صفت کا خزانہ" (کھلونا مئی سنہ ۱۹۷۵ء) عالیہ کی قابلِ ذکر کہانیاں ہیں جو اپنے رنگا رنگ موضوعات اور زبان کی شگفتگی کے سبب بھلائی نہ جا سکیں گی۔

شوکت پردیسی :-

شوکت پردیسی نے بچوں کے لیے خاص تعداد میں نظمیں اور کچھ کہانیاں تخلیق کیں۔ پردیسی کی تخلیقات کے خاص موضوع اخلاقی تعلیم، حب الوطنی اور قومی یک جہتی سے متعلق ہیں۔

"نئے سال کا چراغ" (کھلونا جنوری سنہ ۱۹۷۵ء) "ہندوستان" (کھلونا جنوری سنہ ۱۹۷۵ء) "چھبیس جنوری" (کھلونا سنہ ۱۹۷۴ء) ان کی ایسی ہی نظمیں ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی اخلاقی اور اصلاحی نظموں میں "وقت کی قدر" (کھلونا اپریل سنہ ۱۹۵۷ء) "دولت اور علم کی تکرار" (کھلونا فروری سنہ ۱۹۷۵ء) "علم کی روح" (نومبر سنہ ۱۹۷۵ء) "خدا کا دین" (کھلونا فروری سنہ ۱۹۷۴ء) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ "بچوں کی غزل" (کھلونا نومبر سنہ ۱۹۵۷ء) "گڑیا کی شادی" (کھلونا اپریل سنہ ۱۹۵۷ء) "پیارا الو" (کھلونا جون سنہ ۱۹۵۷ء) "جاہل طوطا" (کھلونا مئی سنہ ۱۹۷۴ء) "میں فیل ہو گیا" (کھلونا اپریل سنہ ۱۹۷۵ء) مختلف موضوعات پر شوکت پردیسی کی نمائندہ اور دلچسپ نظمیں ہیں۔ شوکت پردیسی نے چند کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ جن میں "چھٹکارا" (پھلواری مئی سنہ ۱۹۵۰ء) اور "پہچان" (آجکل مارچ سنہ ۱۹۸۱ء) خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

مہدی پرتاپ گڑھی :-

جدید [illegible] مہدی پرتاپ گڑھی بچوں کے لیے اپنی تخلیقات کی بنا پر محتاجِ تعارف نہیں۔ مہدی نے بچوں کے لیے مختلف النوع موضوعات پر بڑی شگفتہ نظمیں لکھی ہیں جو

کا موسم" (کھلونا دسمبر سنہ ۱۹۷۵ء) "کردوا پچ" (کھلونا اپریل سنہ ۱۹۷۰ء) "صبح آزادی" (کھلونا اگست سنہ ۱۹۷۹ء) "آؤ ہم اس کے گیت گائیں" (کھلونا اپریل سنہ ۱۹۷۷ء) "مجو اہر پاپڑ سے" (کھلونا دسمبر سنہ ۱۹۷۸ء) "پوسٹ مین" (کھلونا نومبر سنہ ۱۹۸۴ء) اور "علم حاصل کرو" (کھلونا فروری سنہ ۱۹۸۵ء) ان کی نمائندہ نظمیں ہیں۔

کالیکا پرشاد:۔

کالیکا پرشاد کا شمار بچوں کے معروف ادیبوں میں کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں کہانیاں تخلیق کیں۔ اخلاق کی اصلاح، حب الوطنی، اور بچوں کی نفسیاتی پیچیدگیاں ان کی بیشتر کہانیوں کے موضوعات ہیں۔ ماہنامہ کھلونا (نئی دہلی) نے کالیکا پرشاد کی طبع زاد کہانیوں میں "رحم دل بابر" (جولائی سنہ ۱۹۸۱ء) "بڑھیا کا جادو" (ستمبر سنہ ۱۹۸۱ء) "چور کی ایمانداری" (ستمبر سنہ ۱۹۸۲ء) "شیر کی دم" (جولائی سنہ ۱۹۸۳ء) "لالچ کا پھل" (جولائی سنہ ۱۹۸۲ء) "جیسی کرنی ویسی بھرنی" (اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء) "عقل کیا کرتی ہے" (نومبر سنہ ۱۹۸۳ء) "کھچڑی" (نومبر سنہ ۱۹۸۳ء) "رستم اور سہراب" (دسمبر سنہ ۱۹۸۳ء) "دو روٹیاں" (اگست سنہ ۱۹۸۴ء) اور "جانشین کی پرکھ" (اکتوبر سنہ ۱۹۸۵ء) لائق ذکر ہیں۔

کالیکا پرشاد نے دیگر زبانوں کے ادب اطفال سے منتخب کہانیاں بھی اردو میں منتقل کی ہیں۔ "بیربل کی عقلمندی" (تعلیم و تربیت لاہور۔ اکتوبر سنہ ۱۹۷۹ء) "دو جھوٹ کی قیمت" (کھلونا ستمبر سنہ ۱۹۷۸ء) "نیکی کا بدلہ" (نومبر سنہ ۱۹۷۸ء) "بادشاہ کی دانشمندی" (کھلونا ستمبر سنہ ۱۹۸۲ء) "پرانے جوتے" (کھلونا مئی سنہ ۱۹۷۸ء) ان میں سے قابل توجہ ہیں۔

موصوف نے مختصر اور سادہ کئی ڈرامے بھی لکھے ہیں جن میں "راکھی کی قیمت" (کھلونا جون سنہ ۱۹۸۳ء) کا نام خصوصیت کا حامل ہے۔

شمیم انہونہوی:۔

ماہنامہ کلیاں (لکھنؤ) کے مدیر اعلیٰ شمیم انہونہوی نے خود بھی بچوں کے ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی بیشتر کہانیاں "کلیاں" کے مختلف شماروں میں شائع ہوئیں۔ اور بعد ازاں ماہنامہ "کلیاں" لکھنؤ سے کتابی شکل میں بھی آئیں۔ موصوف نے اخلاقی اور اصلاحی موضوعات

بہ نہایت خوش اسلوبی سے لکھا گیا ہے۔ ان کی قابل ذکر کہانیوں میں "لاٹکا پل" "جادو کا بکس" "ایک تھا بادشاہ" "کہانی میں کہانی" "پریوں کی کرامات" "شوبہر کا روگ" "شہزادی نورمحل" شامل ہیں۔ یہ سب کتابی شکل میں دستیاب ہیں۔ شمیم انہونوی نے بزرگان دین کی شخصیتوں پر بھی کچھ اچھی کتابیں تصنیف کیں۔ "پیغمبر اسلام" "شیر خدا حضرت علی" "صدیق اکبر" "فاروق اعظم" "عثمان غنی" اور "خاتون جنت" قابلِ ذکر ہیں۔

ابرار محسن :-

ابرار محسن اردو "ادب اطفال" میں انفرادی مرتبہ کے حامل ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے تقریباً ہر مناسب موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کی تخلیقات سنہ ۱۹۶۲ء کے بعد بچوں کے تمام معیاری جریدوں کی زینت بنتی رہی ہیں۔ ایک عرصہ سے وہ سنٹرل افریقہ میں مقیم ہیں۔ بعض کہانیوں میں افریقی ماحول کی پیش کش نے انھیں منفرد بنا دیا۔

محسن کی کہانیوں میں "ڈاکو کی گرفتاری" (پیام تعلیم اگست سنہ ۱۹۶۵ء) "ایک کہانی" (دلچسپ بریلی مئی سنہ ۱۹۶۶ء) "خزانہ" (پیام تعلیم جنوری سنہ ۱۹۷۰ء) "بچوں کی شرارت" (دلچسپ بریلی اپریل سنہ ۱۹۷۰ء) "جل پری" (کھلونا فروری سنہ ۱۹۷۵ء) "نیا سردار" (کھلونا مارچ ۱۹۷۵ء) "دوسری سزا" (کھلونا فروری سنہ ۱۹۷۶ء) "انصاف" (کھلونا فروری سنہ ۱۹۷۷ء) "بادشاہ" (کھلونا جولائی سنہ ۱۹۷۷ء) "سچا دوست" (کھلونا مارچ سنہ ۱۹۷۸ء) "زندہ مجسمہ" (کھلونا دسمبر سنہ ۱۹۷۸ء) "اندھیرے کا پہاڑ" (کھلونا فروری سنہ ۱۹۸۵ء) قابلِ ذکر ہیں۔

ابرار محسن کی لکھی ہوئی کہانی کی کتابیں "انصاف کا تخت" "بدنصیب شہزادہ" "عقل کا سودا" "جنگل کا راجہ" اور "تیس مار خاں" "مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے اہتمام سے شائع کی ہیں۔

محمد اکرام :-

"ادب اطفال" میں محمد اکرام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ان ادیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے متعدد سائنسی مضامین قلمبند کیے۔ اور مختلف سائنسی موضوعات کو دلکش انداز میں بچوں کے ذہن نشین کرایا ہے۔ موصوف کے بیشتر مضامین پیام تعلیم

دہلی کے مختلف شماروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں کمپیوٹر (اکتوبر سنہ ۱۹۷۲ء) [illegible]
(مئی سنہ ۱۹۷۳ء) "سائنس کی باتیں" (اپریل سنہ ۱۹۷۵ء) "سائنس کی دنیا" [illegible]
مارچ سنہ ۱۹۷۶ء) قابل ذکر ہیں۔

سائنس کے علاوہ انھوں نے دیگر موضوعات پر بچوں کے لیے کتابیں بھی تصنیف کیں۔ جن میں "پھولوں کی کہانی" اور "باپوجی" کو حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا ہے۔ بچوں کے بارے میں بڑوں (خصوصاً اساتذہ) کے لیے بھی اکرام کی تصنیف کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا جن میں "بچوں کے جذباتی مسائل" اور "بچوں کے نفسیاتی مسائل" اہم ہیں۔

شمیم حنفی:۔

شمیم حنفی نے بھی بچوں کے لیے کہانیاں اور دلچسپ معلوماتی مضامین قلمبند کیے ہیں۔ موصوف کو بچوں کے ادب کی ضروریات کا مکمل اندازہ ہے۔ "چکبست کے اشعار" (پیام تعلیم فروری سنہ ۱۹۶۵ء) "شائق استاد کا لائق شاگرد" (پیام تعلیم، مارچ سنہ ۱۹۶۵ء) "بچوں کے اقبال" (پیام تعلیم دہلی سنہ ۱۹۶۵ء) "ماں اور جگنو" (پیام تعلیم جولائی سنہ ۱۹۶۵ء) شمیم حنفی کی قابل ذکر نگارشات ہیں۔ اس ضمن میں ان کی کتاب "بھوتوں کا جہاز" بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جس کی کہانی کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل ماہنامہ "پیام تعلیم" دہلی کے مختلف شماروں میں قسط وار شائع ہوکر خاص مقبول ہوئی تھی۔

شمیم حنفی نے بچوں کو عظیم شخصیتوں سے بھی روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ان کی کتاب "اندرا گاندھی کی کہانی" قابل ذکر ہے۔ جسے مکتبہ جامعہ (نئی دہلی) نے شائع کیا ہے۔

ابو تمیم فرید آبادی:۔

ابوتمیم فرید آبادی نے بھی نونہالوں کی دلچسپی اور تفریح کے لیے کئی کہانیاں تخلیق کیں۔ علاوہ ازیں ان کی کتاب کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی کے توسط سے منظر عام پر آئیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے زیادہ تر مافوق الفطرت واقعات پر مشتمل دلچسپ کہانیاں لکھی ہیں۔

[illegible]
ان کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔

خوشحال زیدی:۔

خوشحال زیدی بچوں کے ان جانے پہچانے ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز دوران طالب علمی میں ہی کیا۔ ۱۹۵۰ء میں ان کی پہلی کتاب "طلسمی کہانیاں" زیور طبع سے آراستہ ہو چکی تھی۔ زیدی کی عمر اس وقت ۱۳ برس تھی۔ نیز وہ درجہ ہفتم کے طالب علم تھے۔ ۱۹۶۰ء میں ہی انھوں نے سنبھل کی سرزمین سے ایک ادبی جریدہ ماہنامہ "منزل" کا اجراء کیا۔ جس میں بچوں کے گوشے کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ بچوں کے مشہور رسالے "انور" (میرٹھ) "درخشاں" (مرادآباد)، "بچوں کا باغ" (لاہور)، "بچپن" (بریلی) "کھلونا" (دہلی)، "پھلواری" (دہلی)، "کلیاں" (لکھنؤ) اور "امنگ" (نئی دہلی)، کے مختلف شماروں میں ان کی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ "جھوٹ کی بو" "کرکٹ میچ" "مٹھائی کا راز" "چھوٹی بھابی" زیدی کی ایسی مقبول عام کہانیاں ہیں جن میں بچوں کے مسائل ان کی دلچسپیوں اور بچوں کی نفسیات کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ خوشحال نے بچوں کے لیے ایک ناول "چور لڑکا" قلم بند کیا جو خود ان کی آپ بیتی ہے۔ بچوں کے لیے دلچسپ کہانیاں لکھنے کے ساتھ ہی بچوں کے ادب کی ضروریات اور مسائل پر خوشحال کی گہری نظر ہے۔ نیز وہ ادیبوں، شاعروں، ناقدین اور مبصرین کی توجہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ادب اطفال کی طرف مبذول کرانے میں کوشاں ہے۔ خوشحال زیدی نے زبان اور ادب کی تعلیم کے پیش نظر درسیات کی طرف توجہ کی۔ ۱۹۵۹ء میں "مشعل اردو" ان کی پہلی کتاب سنبھل سے شائع ہوئی۔ اس نوع کی دوسری کتابوں میں "ادب نما" "صحیح اردو" "شاہکار ادب" "صدف اردو قاعدہ" "خوشحال اردو خوش خطی" اور "رہنمائے اردو" کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

خضر برنی:۔

خضر برنی، کہنہ مشق بچوں کے شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ انھوں نے

بچوں کے لیے بہت سی نظمیں اور کہانیاں تخلیق کیں۔ بچوں کی دلچسپی کے حامل خصوصی نوع [illegible] ان کی تخلیقات میں موجود ہیں۔ نیز ان کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔

خضر برنی کی نظموں میں "بچوں کا ترانہ" (پیام تعلیم ستمبر ۱۹۶۵ء) "پیسہ" (پیام تعلیم نومبر ۱۹۶۵ء) "گرمی آئی" (پیام تعلیم جون ۱۹۶۶ء) "چوہے کا دشمن" (پیام تعلیم جنوری ۱۹۶۷ء) "پکنک کا تہوار" (پیام تعلیم ستمبر ۱۹۶۷ء) "نیا پرانا دکھلونا جنوری ۱۹۶۷ء) "گرمی" دکھلونا اپریل ۱۹۶۵ء) "موقع کی قدر" (پیام تعلیم فروری ۱۹۶۷ء) "نغمۂ وطن" (کھلونا اگست ۱۹۶۷ء) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

خضر برنی کے مضامین اور کہانیوں میں "لنگور کی دم" (پیام تعلیم اکتوبر ۱۹۶۵ء) "بچے کیا نہیں کر سکتے" (پیام تعلیم اگست ۱۹۶۷ء) "اچھے کرم" (پیام تعلیم اگست ۱۹۶۷ء) کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ موصوف کی چند کہانیاں کتابی شکل میں بھی چھپ چکی ہیں جن میں "بندر کا گھر" خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔

انور کمال حسینی:۔

انور کمال حسینی ادبِ اطفال میں منفرد حیثیت کے حامل ہیں انھوں نے بچوں کے لیے طبع زاد کہانیوں کے ساتھ دیگر زبانوں سے منتخب کہانیوں کے اردو ترجمے بھی کیے ہیں۔ ان کی تخلیقات بچوں کے معیاری رسائل میں بھی چھپتی رہی ہیں۔ اسلوب اور زبان بہر اعتبار بچوں کو بہت پسند ہے۔

"بہادر جاوید"، "شہزادی شیریں"، "باز بہادر"، "سونے کا محل" ان کی طبع زاد کہانیاں ہیں جو کتابی شکل میں بچوں تک پہنچیں۔

انور کمال حسینی کی ترجمہ کردہ نگارشات "سب کا ساتھی سب کا دوست" "آزادی کی کہانی" "مرد ہمت ونندیہ"، "سدا بہار کہانیاں"، "سمنا کی سیر"، "مودا"، "پھل اور شہد کی کھی" "ہندوستان نے آزادی کیسے حاصل کی" کتابی شکل میں نہرو بال پستکالیہ سیریز میں نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہیں۔

ایم یوسف انصاری:۔

یوسف انصاری نے بھی بچوں کے لیے بہت سی تاریخی، مہماتی، طلسماتی اور سماجی کہانیاں

[illegible]

[illegible] ترجمہ کیا ہے جو موصوف نے انگریزی سے "ٹارزن" [illegible] سے

[illegible] کے ذریعہ شائع کرایا۔

یوسف ضمیری نے طبع زاد کہانیوں کے علاوہ ماخوذ اور قدیم روایتی کہانیاں کافی تعداد میں لکھی ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں "بچوں کی دنیا" (لاہور) ماہنامہ "کلیاں" (کلکتہ) اور "بچوں کا باغ" (لاہور) میں شائع ہوئی ہیں۔ بعد ازاں انہیں مکتبہ "کلیاں" (کلکتہ) نے کتابی شکل میں شائع کیا۔

موصوف کی "نیلم قلندر"، "الہ دین اور طلسمی چراغ"، "سندباد کے آٹھ سفر"، "تین لمبے بادشاہ"، "نیلی شہزادی"، "ناگن شہزادہ"، "سمندر کی شہزادی"، "دیو کا قاتل"، "بونوں کی بستی"، "چودہ شہزادیاں"، "ہرکولیس اور جن" اور "جادوگر کی بیٹی" اس فہرست میں شامل ہیں۔

ٹارزن سیریز میں ان کی "ٹارزن اور آدم خور"، "ٹارزن اور بچہ بھیڑیا"، "ٹارزن اور چند کی اولاد"، "ٹارزن اور خزانہ" اور "ٹارزن اور شکاری" اردو میں اپنی نوع کی منفرد کتابیں ہیں جیسا کہ ان کتابوں کے نام سے ظاہر ہے ٹارزن جنگلی جانوروں، وحشیوں اور خونخوار درندوں سے نبرد آزما ہونے والا ہیرو ہے۔ جس کی ذات اور کارناموں میں بچوں کو انتہائی جاذبیت اور دل کشی کا احساس ہوتا ہے۔

فرحت قمر:-

فرحت قمر بچوں کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ادب اطفال کی خدمت کر رہے ہیں انہوں نے نظمیں، کہانیاں اور معلوماتی مضامین خاصی تعداد میں قلمبند کیے ہیں۔ جو بچوں کے مشہور جریدوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔

"کیڑے مکوڑوں کا مشاعرہ" (پیام تعلیم اپریل ۱۹۷۱ء) "پپو" (پیام تعلیم ۱۹۷۱ء) "آرام کرو" (پیام تعلیم فروری ۱۹۷۲ء) "گڑیا کی شادی" (کھلونا مارچ ۱۹۷۵ء) "الو کی بستی" (کلیاں مارچ ۱۹۷۹ء) "اگر" (کلیاں اگست ۱۹۷۹ء) "مرزا بھنگو" (کھلونا ستمبر ۱۹۷۹ء) "گاجر اور مولی" (کلیاں مارچ ۱۹۸۱ء) "گاجر بیگم" (کھلونا مئی ۱۹۸۱ء) "میاں مولی" (کھلونا مئی ۱۹۸۳ء) ان کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔

فرحت قمر نے "نیلا آسمان" (پیام تعلیم جنوری ۱۹۸۰ء) کہانی ایک معذور لڑکی "

پیامِ تعلیم مارچ ۱۹۸۲ء) "چار میڈل" (کھلونا مئی ۱۹۸۲ء) "الٹی میٹک بائیسکل" (کھلونا اگست ۱۹۸۲ء) چند دلچسپ کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ سائنسی مضامین۔ خاص دلچسپی اور اہمیت رکھتے ہیں۔

"خلاء کا پھیلاؤ اور ستارے" (پیامِ تعلیم جولائی ۱۹۷۶ء) "سماعت کی تیز رفتار ریلیں" (کھلونا جولائی ۱۹۷۵ء) "کتے اور بلی کی کہانیاں" (کھلونا اکتوبر ۱۹۸۲ء) "پھولوں میں رنگ کہاں سے آتا ہے" (کھلونا دسمبر ۱۹۸۲ء) "متحدہ عرب امارات کے بچے" (کھلونا جون ۱۹۸۳ء) بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

موصوف کی "خزانۂ معلومات" اور "آگ" دو کتابیں نسیم بک ڈپو لکھنؤ کے توسط سے منظرِ عام پر آچکی ہے۔

ایم ندیم:-

اردو ادبِ اطفال میں ایم ندیم کا نام بھی شامل ہے جنھوں نے بچوں کے لیے متعدد کہانیاں اور ڈرامے تخلیق کیے۔ ایم ندیم کی طبع زاد کہانیوں میں "جانوروں کی کہانیاں" (کھلونا مئی ۱۹۷۵ء) "امید کا سورج" (کھلونا دسمبر ۱۹۸۲ء) "کنجوس سوداگر کی کہانی" (کھلونا دسمبر ۱۹۸۳ء) "شیر دل" (کھلونا جولائی ۱۹۸۳ء) قابلِ ذکر ہیں۔

"کھوئی ہوئی غزل" (کھلونا مئی ۱۹۷۵ء) اور "بکری گاؤں کھا گئی" (کھلونا ستمبر ۱۹۷۷ء) بچوں کے مقبول ڈرامے ہیں۔

ان کی تخلیقات کے دلچسپ عنوانات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موصوف بچوں کی نفسیات اور دلچسپیوں سے پوری طرح واقف ہیں۔

سیف الدین عباد:-

ادبِ اطفال کی تخلیق کرنے والی تازہ ترین نسل میں سیف الرحمٰن عباد بھی شامل ہیں۔ انھوں نے متعدد کہانیاں اور نظمیں لکھی ہیں جن میں سے بیشتر ماہنامہ "کھلونا" دہلی کے مختلف شماروں کی زینت بنیں۔

"بیک بنچرز کا گیت" (جون ۱۹۸۲ء) "چاندرات" (جولائی ۱۹۸۲ء) "استغنا" (اپریل ۱۹۸۵ء) "سانس سے لپیٹ" (مارچ ۱۹۸۶ء) ان کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ "بیک بنچرز کا گیت" بچوں کے لیے مزاحیہ اور "استغنا" مذہبی نظم ہے۔

عزیز مراد آبادی :۔

نئی نسل کے ادیبوں میں عزیز مراد آبادی کا نام بھی اس جائزے میں شمولیت کا استحقاق رکھتا ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے دلچسپ موضوعات پر بڑی تعداد میں نظمیں اور کہانیاں تخلیق کیں۔ ان کی تخلیقات میں بچوں کی شوخیاں اور ان کی روزمرہ زندگی کے دلچسپ واقعات خوبصورت پیرایہ میں جگہ پاتے ہیں۔ عزیز کی نمائندہ نظمیں ہیں "برکھا رت" (کھلونا جولائی ۱۹۸۰ء) "اللہ اکبر اللہ اکبر" (کھلونا اگست ۱۹۸۰ء) "ڈیڈی کا ہر گھڑی ہمیں ڈانٹ دکھائی دے" (کھلونا جولائی ۱۹۸۱ء) "عید قرباں" (کھلونا ستمبر ۱۹۸۲ء) "اس برس" (کھلونا نومبر ۱۹۸۱ء) "ہم پاس ہو گئے ہیں" (کھلونا مئی ۱۹۸۲ء) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

موصوف کی "انسانیت زندہ باد" (کھلونا جولائی ۱۹۸۱ء) "بے پروں کی دنیا" (بچوں کا تاج محل، مارچ ۱۹۸۱ء) "عجیب ماجرا" (کھلونا جولائی ۱۹۸۱ء) "ندامت" (کھلونا جون ۱۹۸۲ء) "مثالی دوستی" (کھلونا مئی ۱۹۸۲ء) کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

عزیز مراد آبادی کا تخلیقی سفر جاری ہے اور روشن امکانات کی نشاندہی کرتا ہے۔

مسعودہ حیات :۔

ادبِ اطفال کے ضمن میں حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے جذبے کو بیدار کرنے والی بیشمار نظموں کی خالق مسعودہ حیات کا نام بھی توجہ کا مستحق ہے۔ انھوں نے قومی تہواروں اور قومی شخصیتوں کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔

"گرونانک" (پیامِ تعلیم، جون ۱۹۷۰ء) "جشن بالو" (پیامِ تعلیم دسمبر ۱۹۷۳ء) "آزادی کے پچیس سال" (پیامِ تعلیم جولائی ۱۹۷۳ء) "اجالوں کا سفیر" (پیامِ تعلیم اکتوبر ۱۹۷۶ء) "بھارت کے نشان" (پیامِ تعلیم ستمبر ۱۹۷۵ء) "ایمرجنسی" (کھلونا مارچ ۱۹۷۶ء) "یہ ہے ہندوستان ہمارا" (پیامِ تعلیم اگست ۱۹۷۶ء) "ہمارا جھنڈا" (کھلونا ستمبر ۱۹۷۶ء) "نیتا جی کی۔ وہ کی پکار" (سیکولر ساتھ جنوری ۱۹۷۹ء) "نئی بہار" (پیامِ تعلیم، جنوری ۱۹۸۰ء) "بہادر شاہ ظفر" (پیامِ تعلیم اپریل ۱۹۸۰ء) "پیامِ اخوت" (پیامِ تعلیم، جنوری ۱۹۸۱ء) مختلف جریدوں میں بکھری ان کی نمائندہ نظمیں ہیں۔

بچوں کے لیے لکھنے والی خواتین میں مسعودہ حیات کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ظفر شبلی :-

ادب اطفال کے معروف جدید شاعر ظفر شبلی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر بچوں کے لیے نظمیں تخلیق کی ہیں۔

نظمیں "چوزے" (کھلونا فروری [illegible]) "ممتا" (کھلونا فروری [illegible]) "سبھا" (کھلونا فروری [illegible]) "بادل" (کھلونا مئی [illegible]) اور "تھا فرشتہ" (کھلونا جولائی [illegible]) ان کی چند نمائندہ نظمیں ہیں۔ ظفر شبلی کی نظموں کے دو مجموعے "تارے زمین کے" اور "پھول آنگن کے" کتابی شکل میں منظر عام پر آ چکے ہیں جن پر انھیں مغربی بنگال اردو اکیڈمی سے انعام بھی مل چکا ہے۔

قدیر جاوید پریمی :-

اپنے دور کے بچوں کے مشہور رسالے "بچپن" (بریلی) کے مدیر قدیر جاوید پریمی نے ادارت کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ خود بھی متعدد کہانیاں قلمبند کیں جو "بچپن" کے ساتھ، دیگر رسائل کی زینت بنیں۔

"ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے" (کھلونا، مارچ [illegible]) "خوشی دینے والے" (کھلونا، اپریل [illegible]) "کرنے کی بات" (کھلونا جولائی [illegible]) "اپنا خون" (کھلونا جنوری [illegible]) "سوچو تو ذرا" (کھلونا، مارچ [illegible]) "جینے کے لیے" (کھلونا، اپریل [illegible]) قدیر کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔

محبوب راہی :-

نئی نسل کے جدید شاعر محبوب راہی نے بچوں کے ادب میں بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں کم عمر بچوں کو بہلانے والے موضوعات آسان زبان اور سادہ انداز میں پیش کیے ہیں۔ چونکہ وہ ابتدائی درجات سے منسلک ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں بالواسطہ سبق آموز پیرائے سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔

بچوں کے معیاری رسائل میں "پیام تعلیم" (دہلی) "کھلونا" (دہلی) وغیرہ میں ان کی تخلیقات چھپتی رہتی ہیں۔ محبوب راہی کی نظموں کا شعری مجموعہ "رنگا رنگ" کتابی شکل میں منظر عام پر آ چکا ہے۔ اسے مہاراشٹر اردو اکیڈمی سے انعام بھی مل چکا ہے۔ مجموعے میں شامل درجنوں نظموں

میں سے ... [illegible] ... ہیں کہ ان کی لافانی تخلیقات کا مقام حاصل ہے۔

بدیع الزماں اعظمی:۔

بدیع الزماں اعظمی نے بچوں کے لیے متعدد معلوماتی مضامین قلمبند کیے ہیں۔ یہ مضامین بچوں کو سائنس اور جغرافیائی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ایسے مضامین پر مشتمل چار کتابیں "نظامِ شمسی کی تشکیل"، "فلک کے ستاروں کی انوکھی باتیں"، "پانی کے بچے" اور "ولیس بدرس کے تحفے" منظرِ عام پر آچکی ہیں جن میں "میکسیکو میں صدی کا انوکھا پن"، "آسمانی دنیا"، "انوکھے افسانوی جانور"، "انوکھی تیرنے گاہیں" اور "ہیپنڈ سے اور نظارے" نمائندہ مضامین ہیں۔

دورِ سوم کا یہ جائزہ نامکمل رہے گا اگر فیض احمد فیض، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، شاد عارفی، گوپی ناتھ امن، جوش ملیح آبادی اور خدیجہ مستور جیسے عظیم المرتبت شاعروں اور ادیبوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ ان میں سے ہر ایک نے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ لیکن ایسی نگارشات کی تعداد ان کے یہاں اتنی کم ہے کہ اس جائزے میں ان کے بارے میں تفصیل سے ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ مشق و مزاولت کی بنا پر ان کی تخلیقات تعداد میں بہت کم ہونے کے باوجود بلند معیارات کی حامل ہیں۔ فیض احمد فیض کی نظم "منیزہ کی سالگرہ پر"[1] اور کہانیاں "بیوقوف دوست" (مطبوعہ پیامِ تعلیم نومبر ۱۹۵۳ء) نیز "اسکول کا پہلا دن" (مطبوعہ ماہِ نو، لاہور، نومبر ۱۹۵۹ء) حیات اللہ انصاری کی کتابیں "کالا دیو" اور "میاں خوں خوں"، خواجہ احمد عباس کے مضامین "ساٹھ سال کا بچہ" (مطبوعہ کھلونا نئی دہلی ستمبر ۱۹۵۳ء) "چاچا نہرو" "قلم اشاروں کے اشارے تھے" (کھلونا ستمبر ۱۹۶۵ء) اور "چاچا نہرو کیا تھے؟" (کھلونا فروری ۱۹۷۶ء) شاد عارفی کی نظمیں "جوگی روٹی کھا گرا آزادہ"[2] اور "رخصت ہوئی سبیلا"؛ شان الحق حقی کی نظموں کا مجموعہ "سہانے ترانے" اور پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں پر مشتمل کتاب "نذرِ خسرو"، شمس الرحمٰن فاروقی کی نظمیں "مور نامہ"، "منے کو جب متا کہو"، "کتا بلی دولی دور" (مطبوعہ ماہِ نو، لاہور، نومبر ۱۹۵۹ء) خدیجہ مستور کی نگارشات "بدلہ" (کھلونا دہلی، اکتوبر ۱۹۵۵ء) اور "سعد کا انجام" (مطبوعہ

---

[1] مشمولہ ماہنامہ "افکار" (کراچی) بیادِ فیض، نومبر ۱۹۵۸ء، مدیر صہبا لکھنوی، ص ۸۰

[2] مشمولہ کلیاتِ شاد عارفی۔ مرتبہ ڈاکٹر مظفر حنفی، نیشنل اکیڈمی دہلی ۱۹۷۵ء

حیدر بیابانی، رفیع شبنمی، شمیم حقی، حشمت کمال پاشا، جمیلہ عارف، ندیم خسرو، [illegible]
خلیل حسین، عنوان چشتی، سراج زماں، ساز مہدی عباسی، [illegible]، انشاء اللہ خان [illegible]
عظیم آبادی، اقبال حسن آزاد، تسکین زیدی، امید فاضلی، مبارک [illegible]، لطیف فاروقی، [illegible] سبحانی،
سیف فاروقی، سیف اسلام پوری، نجم یوسف، جاوید [illegible] وغیرہ کی تخلیقات بچوں کے ادب کے رسالوں
میں نظر آتی ہیں اور قوی امکان ہے کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے اگر اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھا تو ادب
اطفال میں نمایاں مقام حاصل کر سکیں گے۔

بچوں کے ادب کا ایک گراں مایہ سرمایہ مختلف درسی کتابوں اور رسالوں کے علاوہ کتابی شکل میں
جن اشاعتی اداروں کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے ان میں مکتبہ پیام تعلیم" نئی دہلی، مکتبہ "کلیاں"
(لکھنؤ) اور کھلونا بکڈپو (نئی دہلی) جیسے اداروں کی کاوشوں کو جتنا سراہا جائے کم ہے۔ جن کے توسط سے
مختلف موضوعات پر بچوں کی معیاری کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔

سرکاری اداروں میں نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) نئی دہلی اور ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی سر فہرست ہیں
نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے مختلف زبانوں کی کہانیوں اور معلوماتی کتب کو نہرو بال پستکالیہ، ذاکر حسین سیریز
اور اسی نوع کے دوسرے پروگراموں کے تحت نیز طبع زاد تخلیقات بھی دلکش گیٹ اپ کے ساتھ
شائع کیں۔ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی نے قدیم کلاسیکی کتابوں کی تلخیص پر مشتمل کتابیں اور بچوں کے لیے
مختلف موضوعات پر غیر افسانوی نیز سائنسی ادب شائع کرنے میں پیش قدمی کی۔

ان بڑے اداروں کے ساتھ دوسرے کم معروف اور دور دراز کے اداروں نے بھی اس کام کو
آگے بڑھایا ہے۔ ادارۂ فکر و فن، لکھنؤ، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی اور شاہد اکیڈمی دہلی، وغیرہ کے نام
قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے مختلف ناشرین نے وقتاً فوقتاً دو دو چار چار کتابیں بچوں کے
لیے شائع کی ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہے۔ ان مطبوعات کی حیثیت عام طور پر مقامی
ہو کر رہ گئی ہے۔ جس کی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ تا حال اردو والے اپنی کتابوں کی باضابطہ خرید
فروخت کے سلسلے میں کوئی مرکزی تنظیم نہیں بنا سکے، اور نتیجے میں چھوٹے اشاعت گھروں سے شائع
ہونے والی کتب خیر دیا تندار کمیلروں کے رحم و کرم پر محصور ہو جاتی ہیں۔

سابقہ تینوں ادوار کا مجموعی مطالعہ ہمیں اردو میں ادب اطفال ابتدا تا حال ارتقائی صورت
حال سے روشناس کراتا ہے اور کئی دلچسپ حقائق کے چہرے سے نقاب اٹھتی نظر آتی ہے مثلاً
یہ کہ اردو ادب کا آغاز ہی ادب اطفال سے ہوا ہے ابتدا امیر خسرو کی "خالق باری" ان دونوں کا

[illegible] ہو گیا ہے۔ اسی طرح [illegible] اطفال کی [illegible] اردو میں کہانیوں [illegible]
افسانہ نگاری کی ابتدا [illegible] اس کہانی سے ہوتی ہے۔ اردو شاعری میں پابند نظموں سے انحراف کا سلسلہ
بعض محققین کے نزدیک اسماعیل میرٹھی کی معریٰ نظم "تاروں بھری رات" سے شروع ہوا

عام طور پر دوسری زبانوں میں یہ شکایت عام ہے کہ عظیم فنکاروں اور بڑے لکھنے والے بچوں کے ادب سے بے اعتنائی برتتے ہیں لیکن اردو ادب اطفال کا یہ جائزہ اس خوشگوار نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ امیر خسرو، میر تقی میر، غالب، اقبال، فراق اور فیض جیسے عظیم و نامور شعرا ہوں یا انشاء اللہ خاں انشا، محمد حسین آزاد، پریم چند، عظیم بیگ چغتائی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، اور قرۃ العین حیدر جیسے عظیم نثر نگار۔ کم و بیش ہر بڑے لکھنے والے نے ادب اطفال میں بھی تھوڑا بہت اضافہ ضرور کیا ہے۔ مشاہیر اہل قلم میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی ادبی زندگی کا آغاز ہی بچوں کی تخلیقات سے ہوا ہے۔ اور پھر عظمت کے مرتبہ پر فائز ہونے کے باوجود اس جانب توجہ مبذول کی۔ اقبال اور کرشن چندر ان دونوں پہلوؤں کی روشن مثال ہیں۔

ان تینوں ادوار میں نظم و نثر کی کم و بیش تمام اصناف پر ادب اطفال میں بھی طبع آزمائی کی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ شاعری، فکشن، ڈراما، درسیات اور معلوماتی مضامین کوئی گوشہ "ادب اطفال" کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔ معیار و مقدار بہر اعتبار اردو کا ادب اطفال دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے انتہائی وسیع دامن اور مالدار ہے۔ اور بچوں تک اس ادب کو پہنچانے میں معیاری رسالوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے البتہ پیشکش کے سلسلے میں غالباً اردو والوں کی تنگ دستی ہر دور میں کاغذ، کتابت، جلد سازی اور تصویر وغیرہ کے ہر میدان میں رکاوٹیں کھڑی کرتی نظر آتی ہے۔

اس مجموعی مطالعہ سے دوسری افسوسناک حقیقت یہ ابھر کر سامنے آتی ہے کہ

— "ادب اطفال" کے تخلیق کاروں کا ایک بڑا قافلہ ہر دور میں ترقی کی جانب گامزن رہا ہے۔ لیکن اردو کے محققین اور ناقدین نے عموماً بچوں کے ادب کو ہمیشہ ثانوی نظر اور تحقیق کا موضوع خال خال ہی بنایا ہے۔

حصہ سوم: اردو ادب اطفال کی تخلیقی اصناف کا تجزیاتی مطالعہ

نواں باب

شاعری

بچوں اور بالغوں کی تخصیص کے بغیر اردو ادب کے مکمل سرمائے کا جائزہ لینے پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کا نصف سے زیادہ حصّہ شعری اصناف پر مشتمل ہے۔ اردو ادب اطفال میں بھی نثری وشعری ادب میں یہی تناسب کارفرما ہے۔ بچوں کے ادب پر شاعری کے اس غلبے کا سبب فطری ہے کیونکہ بچپن میں ننھے ذہنوں کو شاعری اپنے اختصار، غنائیت، اور ترنم ریزی کی بنا پر زیادہ متاثر کرتی ہے اور ایسی چیزوں کو یاد کرنے میں وہ سہولت محسوس کرتے ہیں۔ قدیم وجدید ماہرین تعلیم کم از کم اس نکتہ پر متفق الرائے نظر آتے ہیں کہ بالکل ابتدائی منزل میں بچوں کی تعلیم کا مؤثر اور کارگر وسیلہ شاعری ہی بن سکتی ہے۔ عہدِ قدیم میں خالق باری (امیر خسرو) اور قادر نامہ (غالب) جیسی درسی نوعیت کی کتابیں شاعری پر مشتمل ہیں۔ گنتی، پہاڑے اور ریاضی کے گر بھی بچّوں کی سہولت کے پیش نظر اکثر منظوم کر دیے جاتے ہیں۔ جدید طریقۂ تعلیم میں بھی نرسری کے بچوں کو منظوم کہانیوں اور چھوٹی چھوٹی نظموں (نرسری رائمز) کے ذریعے اسکول کی فضا اور اس سے مانوس نیز تعلیم کی طرف مائل کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ یہ بھی ہے کہ کہانی، ڈرامے اور ناول سے بچہ نسبتاً لڑکپن کی حدود میں داخل ہونے کے بعد رغبت محسوس کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو دو چار صفحات کی کہانی یا ضخیم ناول پڑھنے اور سمجھنے میں فطری طور پر دشواری کا احساس ہوتا ہے اس لیے ان کا دائرہ کار آٹھ، نو سال یا اس سے زیادہ عمر رکھنے والے بچوں تک ہی محدود ہے جبکہ دس بارہ اشعار پر مشتمل نظمیں ہر عمر کے بچے کی دلچسپی کا سامان

[illegible] ذہن سازی کرنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ اس لیے اگر ادب اطفال [illegible]
میں شاعری کا تناسب زیادہ ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ غالباً یہ صورت حال
ہر زبان کے ادب اطفال میں دیکھی جا سکتی ہے۔

بچوں کے لیے لکھے جانے والے شعری ادب کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور گہوارے
سے بلوغت تک ہر مرحلے پر شعری اصناف کسی نہ کسی انداز میں قدم بقدم بچوں کے ہمراہ زندگی
کا سفر طے کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس سفر کا آغاز ماں کی لوری سے ہوتا ہے جو شیر خوار
بچے کو اس وقت بھی متاثر کرتی ہے جب وہ نہ بول سکتا ہے نہ الفاظ کے معنی اور مفاہیم
سے آشنا ہوتا ہے۔ بایں ہمہ ماں کی ممتا سے آمیز ہو کر یہ شیریں اور سبک الفاظ اور لوری
کی غنائیت بچے کو بالکل اوائل عمری میں مسحور اور متاثر کرتی ہے۔ بچہ بولنا سیکھتا ہے گھٹنوں
چلنا سیکھتا ہے کھلونوں سے مانوس ہوتا ہے۔ ان منزلوں میں شاعری اس کے ساتھ گھٹنے
چلتی اور کھلونوں سے دل بہلاتی ہے۔ بچے کو مٹھائیاں پسند ہیں، اس موضوع پر بھی ان
کے لیے بے شمار نظمیں اردو ادب اطفال میں موجود ہیں، پھل اور پھول بھی نونہالوں کو مرغوب
ہوتے ہیں اور ان موضوعات پر بھی نظموں کا وافر ذخیرہ اردو میں موجود ہے۔ فطری طور پر
بچے پرندوں اور جانوروں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ بلاشبہ شاعروں نے بھی ان سے خاصی
دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور تقریباً ہر پرندے اور جانور پر طبع آزمائی کی ہے۔ تین چار سال
کی عمر میں بچہ نرسری پہنچتا ہے اور یہاں بھی نرسری رائمز منظوم گیتوں اور پہاڑے کی شکل میں
شاعری اس کی دلبستگی کے لیے موجود ہوتی ہے۔ عمر میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا ہے بچے کی
دلچسپیوں کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے اور خارجی دنیا سے اس کا لگاؤ بڑھ جاتا ہے۔ منظوم
کہانیاں، چاند، ستارے، آسمان، کھیل، عزیز و اقارب وغیرہ سب ہی اس کی دلچسپی کا
مرکز بنتے ہیں۔ شاعروں نے بھی ان تمام موضوعات پر ان کے لیے نظمیں تخلیق کی ہیں اسکول میں
داخل ہونے پر بچے کو درسی کتابوں، ہم جماعتوں، استادوں اور مدرسے سے متعلق
دیگر امور سے سابقہ پڑتا ہے۔ چنانچہ ان پہلوؤں سے بچے کو روشناس کرانے کے لیے
شاعری کا پورا پورا سہارا لیا گیا ہے اور اسکول کے ہر گوشے پر نظموں کے ذریعے بھرپور
روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس منزل پر بچوں کو اچھا انسان اور محب وطن بننے کی تلقین بھی شاعری
کے وسیلے سے کی جاتی رہی ہے۔ اس میں اوصاف حمیدہ اور نیک صفات پیدا کرنے کے لیے

حمد، نعت، دعا، اخلاقی درسی اور قومی نظموں کو سہارا لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں بچے میں خدا ترسی، شجاعت، بلند حوصلگی، دیانت داری، صداقت شعاری، فرماں برداری، سعادت مندی، اخوت، بھائی چارگی، قومی یک جہتی، غریبوں سے ہمدردی اور ہم جوئی وغیرہ جیسے اوصاف حمیدہ پیدا کرنے کے لیے شاعری کا حربہ استعمال کیا گیا ہے۔

اسکول اور گھر سے باہر کی زندگی اور اس کی گہما گہمی بھی بچوں کی شاعری میں اپنے جلوے دکھاتی ہے۔ چنانچہ میلے، نمائش، چڑیا گھر، سرکس، پکنک، کھیل کا میدان سب ہی موضوعات پر بچوں کے لیے کافی نظمیں اردو میں دستیاب ہیں۔ مناظر قدرت مثلاً صبح شام، رات، آسمان، پہاڑ، ندی، دریا، سمندر، دھنک، پارک وادیاں وغیرہ کی عکاسی کرنے والی خوبصورت نظمیں اردو ادبِ اطفال میں موجود ہیں۔ بچوں کی باہمی چھیڑ چھاڑ دوستی اور شرارتوں کے نہایت دلچسپ مرقعے بھی اردو شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ فرصت کے اوقات میں پہیلیاں بوجھنا بجھانا بچوں کا ایک دلچسپ مشغلہ ہے اور امیر خسرو تا شان الحق حقی از ابتدا تا حال شعرا بچوں کے لیے ایسی پہیلیاں منظوم کرتے آئے ہیں۔ موجودہ سائنسی دور میں جو نئی نئی ایجادات اور انکشافات ہوئے ہیں اور انسان چاند تک جا پہنچا ہے، ان جدید موضوعات سے بچوں کو روشناس کرانے کے لیے متعدد نظمیں لکھی گئی ہیں۔ بیل گاڑی سے لے کر ریل، موٹر، ہوائی جہاز، راکٹ وغیرہ تک سب ہی چیزوں کو بچوں کی نظموں کا موضوع بنایا گیا ہے۔ مختلف پیشوں اور صنعتوں پر بھی کافی تخلیقات اردو ادب اطفال کے شعری سرمائے میں اضافہ کرتی ہیں۔ اسی طرح بچوں کے جذبات اور احساسات کی عکاسی بھی شاعری میں خوب خوب کی گئی ہے نیز طفلانہ مسائل کو بھی مہارت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔ جدید ہندوستان کے مسائل سے روشناس کرانے اور ان سے نبرد آزمائی کا حوصلہ پیدا کرنے والی نظمیں بھی بچوں کے لیے کافی کہی گئی ہیں نیز قومی اور مذہبی رہنماؤں سے بچوں کو متعارف کرانے کی کوشش بھی نظموں کے ذریعے کامیابی سے کی گئی ہے۔

اردو کے شعری ادب اطفال کے تمام پہلوؤں کا جائزہ بے حد تفصیل کا متقاضی ہے آئندہ صفحات پر اختصار اور جامعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس وسیع میدان کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چونکہ اس جائزے میں سیکڑوں منظومات کے اقتباسات بطور مثال پیش کیے جائیں گے۔ اس کے لیے ان سب کے مفصل حوالے درج کرنے میں

[illegible] خصوصیات اور خوبیاں [illegible] ہے۔ چنانچہ [illegible]
[illegible] شاعر کو تمام [illegible] سب سمجھا گیا۔ ان کتابوں کے نام اور دیگر [illegible]
تصنیفات مقالے کے آخر میں شامل کتابیات میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

لوری

ہر چند کہ لوریاں بچوں کے پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ انہیں سنانے کے لیے لکھی جاتی ہیں پھر بھی ہر زبان کے ادب اطفال کا اہم جز و بھی جاتی ہیں۔ اور بچے کی پیدائش سے لے کر چار پانچ برس کی عمر تک مائیں اور خاندان کی دیگر عورتیں بچوں کو ان ہی لوریوں کے ذریعہ بہلاتی اور سلاتی ہیں۔ ان میں سے بعض لوریاں بے حد مقبول ہیں لیکن استداد زمانہ کے ہاتھوں ان کے تخلیق کار پردہ گمنامی میں چلے گئے ہیں مثلاً ہندوستان بھر میں مقبول لوری کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

چندا ماما دور کے پوئے پکائیں دور کے
آپ کھائیں تھالی میں منے کو دیں پیالی میں
پیالی گئی ٹوٹ منا گیا روٹھ
نئی پیالی لائیں گے منے کو منائیں گے
چندا ماما دور کے

ہر چند کہ اس لوری کے تخلیق کار کا نام پردہ خفا میں ہے لیکن اس کی غنائیت صوتی آہنگ اور معنویت لسانی آوازوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر جو طلسمی کیفیت پیدا کرتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوری یقیناً کسی بڑے ذہن کی تخلیق ہے جسے شیر خوار بچوں کی نفسیات سے بھی واقفیت حاصل ہے۔

لوریوں کی اس روایت کو افسر میرٹھی نے بھی نہایت حسن کاری کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔ موصوف کی ایک نہایت دل نشین پر تاثیر خوب صورت لوری کے دو بند۔

سو جا آنکھ کے تارے سو جا سو جا دل کے سہارے سو جا
سو جا راج دلارے سو جا سو جا چاند ہمارے سو جا
سو جا سو جا پیارے سو جا

(لوری افسر میرٹھی)

افسر نے سوچا کی تکرار سے جو خوابناک کیفیت پیدا کی ہے اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ دونوں بند بچے کو چمکارنے اور تسکین پہنچاتے ہوئے اس کے بہتر مستقبل کی بات کرتے ہیں۔ یہاں جذبات اور احساسات کی خوبصورت ترجمانی بھی موجود ہے۔ عبرت گورکھپوری کی لوری میں اس سے مختلف کیفیات پائی جاتی ہیں۔ بطورِ مثال چند شعر ملاحظہ ہوں:

بل بازو کے، زور کمر کے　　ماں کی امید سرورِ پدر کے
سکھ آنکھوں کے، نورِ نظر کے　　چین ہمارے سارے گھر کے
سورہ بھولے بھالے بچے
سورہ بھولے بھالے بچے
دن گزرا، خورشید سدھارا　　کوہ قاف پر آسن مارا
جمع ہوا دل پارہ پارہ　　خواب نے گھر گھر پاؤں پسارا
سورہ بھولے بھالے بچے

(لوری۔ عبرت گورکھپوری)

مندرجہ بالا لوری میں نہ صرف ماں کے جذبات شامل ہیں بلکہ گھر کے دوسرے تمام افراد کی محبت اور شفقت بھی بچے تک منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے البتہ دوسرے بند میں خورشید، کوہ قاف، آسن جیسے الفاظ لوری کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے۔

لوریوں کے ضمن میں عارف بدایونی کا نام بھی لائقِ توجہ ہے۔ جنھوں نے قدرے طویل بحر میں بڑی پر اثر لوری بچوں کے لیے تخلیق کی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

اے مرے نورِ نظر آنکھ کے تارے سو جا
شمعِ امید مرے دل کے سہارے سو جا

تو جو سو جائے گا خوابوں میں پری آئے گی
تری خاطر وہ مدھر گیت کئی گائے گی
صبح ہوتے ہی پرستان چلی جائے گی

ملت زلفوں کو چھوڑ اسے ماں وارے سو جا
اے مرے نورِ نظر آنکھ کے تارے سو جا
شمعِ امید مرے دل کے سہارے سو جا

(لوری ۔ عارف بدایونی)

عارف بدایونی نے عام روایتی لوری میں بیان کردہ چندا ماما کی جگہ بچے کو خواب میں پریوں سے ملایا ہے اور اس کی زبانی دلکش ترانے سنائے ہیں۔ یہی پریاں کیف احمد صدیقی کی لوری میں بھی بچے کو بہلانے کے لیے موجود ہیں۔

سو جا میرے دل کے ٹکڑے سو جا میری جان
تو ہے مجھ کو جان سے پیارا تجھ پہ میں قربان

سپنوں کی نگری میں بلاتے تجھ کو نندیا رانی
چاند دیس میں جاکر تجھ کو کرنی ہے مہمانی
ساری رات تجھے ہونا ہے پریوں کا مہمان
سو جا میرے دل کے ٹکڑے سو جا میری جان

(لوری ۔ کیف احمد صدیقی)

محبوب راہی کی لوری میں سادگی اور خلوص کی کارفرمائی نسبتاً زیادہ ہے اور اس کے ہر مصرعہ میں ماں کی ممتا کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ چند مصرعے اس خوبصورت لوری سے بھی ملاحظہ فرمائیے:

سو جا ننھے دلبر سو جا
خوابوں کے بستر پر سو جا
میٹھی میٹھی لوری گاؤں   لوری گا کر تجھ کو سلاؤں
واری جاؤں تجھ پر سو جا
سو جا ننھے دلبر سو جا

(لوری ۔ محبوب راہی)

مندرجہ بالا پابند لوریوں کے برعکس مشہور ترقی پسند شاعر خاطر غزنوی نے لوری میں بھی آزاد نظم کی ہیئت اختیار کی ہے۔

میرے چاند
منے
میرے دل کے ارمان، آنکھوں کے تارے، نظر کے اجالے
میرے لال
منے
تو جلدی بڑا ہو کے تلوار اٹھا لے
میرے دل کو سنبھالے
اسی دن کی ہوں منتظر
باپ کے خون کا بدلہ حریفوں سے لے
باپ دادا کی قبروں کو روشن کرے
ہائے میرے پیارے
میرے دل کے سہارے
میرے چاند
منے

(لوری - خاطر غزنوی)

آزاد نظم کی ہیئت نے اسی لوری کو انفرادیت تو ضرور عطا کی ہے لیکن مصرعوں
میں پیش کردہ خیالات عجیب سے محسوس ہوتے ہیں۔ شیر خوار بچے کو اس قسم کی تلقینو
اور انتقام پر آمادہ کرنے کی خواہش وحشی قبائلیوں میں تو پائی جا سکتی ہے لیکن موجود
ترقی یافتہ دور اور مہذب سماج میں ایسے تصورات کو لائق تحسین نہیں سمجھا جا سکتا ہے
اردو ادب اطفال میں جو متعدد لوریاں موجود ہیں ان میں خاطر غزنوی کی محولہ بالا لوری ک
چھوڑ کر بقیہ سب ہی تقریباً پابند نظموں کی شکل میں ہیں اور ان میں پیش کردہ جذبات
و خیالات بھی لطیف، سبک اور صالح ہیں۔ ان میں "لوری" (وامق جونپوری) "سو جا
(علامہ شبلی)، "لوری" (عطا شاد) "لوری" (خضر برنی) اور "ہندوستان کی لوری"
(صلاح الدین پرویز) وغیرہ خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔

کھلونے

گڑیاں تو بہر حال بچے کی بالکل ابتدائی عمر کی ساتھی ہیں۔ لیکن "کھلونے" گہوارے سے لڑکپن تک اس کی دلچسپی کا بہترین ذریعہ ہیں۔ کیسے ممکن تھا کہ ادب اطفال سے متعلق جانکاری کی نگاہ اس پہلو پر نہ جاتی۔ بلا مبالغہ کھلونوں سے متعلق اردو میں بچوں کے لیے ہزاروں نظمیں تخلیق کی گئی ہیں۔ بہت چھوٹے بچوں کے لیے غبارے، گڑیا، گیند، لٹو وغیرہ جان سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں اور کھلونے والے کی آواز سن کر بچے کچھ نہ کچھ خریدنے کے لیے بے قرار ہو جاتے ہیں۔ ایسے تمام موضوعات پر اردو میں خاص دلچسپ نظمیں لکھی جا چکی ہیں۔ مثلاً شفیع الدین نیّر کی ایک نظم کے چند شعر دیکھیے۔

اک دن بی بجو کی نانی	لائیں اک گڑیا جاپانی
اس گڑیا کا کیا کہنا تھا	رنگ نیا تھا روپ نیا تھا
چپ تھی اس کی نیاری سب سے	گڑیا تھی یہ پیاری سب سے

(ترجمہ کسی گڑیا۔ شفیع الدین نیّر)

گڑیا کے ساتھ گڈے کی موجودگی لازمی ہے اور جب یہ دونوں یکجا ہوں تو بچے ان کی شادی رچائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بچوں کی اس نفسیات کو ابن انشا نے کس خوبصورتی کے ساتھ اجاگر کیا ہے آپ بھی دیکھیے:

گھر میں ہمارے مہمان آئے	خوب لگا ہے میلا
ہر کوئی بیٹھا بڑھ بڑھ کھائے	سیب پپیتا کیلا
بلو کے گڈے کی براتی	ایک سے ایک عجیب
کوئی بیٹھا ناک چڑھائے	کوئی نکالے جیب
باجے کی آواز جو آئی	اٹھ کے سارے بھاگے
پیچھے بلو اور براتی	گڈا آگے آگے

(بلو کے گڈے کی براتی۔ ابن انشا)

نظم میں بچوں کی دلچسپی کے تقریباً سب ہی سامان موجود ہیں۔ مٹھائیاں،

پھل، باجے، براتیوں کی دلچسپ حرکات! غرضیکہ نظم کا ہر گوشہ دلچسپی سے معمور ہے۔ خصوصاً باجے کی آواز سن کے براتیوں سے پہلے دولہا میاں کا اٹھ کر آگے آ جانا بچوں کی اطفالانہ شوخیوں کی ترجمانی کرتا ہے۔

گڑیا اور گڈے کے سلسلے میں بچوں کے مابین اکثر تنازعہ بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے ایسی دلچسپ تکرار، شوخ و شنگ بچے کی شرارت اور معصوم بچی کا واویلا مظفر حنفی کی نظم "ہائے اللہ" کا موضوع بنے ہیں۔ ایک بند مثال کے طور پر درج ذیل ہے۔

ٹانگیں ٹوٹی ہیں گھوڑے کی
درگت گڑیا کے جوڑے کی
کھول کے میری الماری کو
کس نے اس پر بولا ہلّہ
کوئی دوڑو ہائے اللہ

(ہائے اللہ۔ مظفر حنفی)

نظم کے بقیہ بندوں میں اسی نوع کی پر لطف تنازعے کے متعلق گوشے اجاگر کیے گئے۔ گڑیا گڈے کے ساتھ۔ بچے لٹو نچانے میں بھی بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ شوکت پردیسی نے اس موضوع پر ایک خوبصورت نظم "پیارا لٹو" لکھی ہے جس کا ایک بند پیش خدمت ہے۔

ہلکا پھلکا پیارا لٹو، اس کا ناچ انوکھا
اس کے ناچ کو جس نے دیکھا وہ لڑکا للچایا
پتلی پتلی ڈور جھٹک کر اتنا چکر کھایا
زن زن کی آواز کو سن کر جو بھی تھا چکرایا
ننھے منے سے بڑھ کر ہے اس لٹو سے پیار
یہ لٹو میں ان کو دے دوں بات ہے یہ دشوار

(پیارا لٹو۔ شوکت پردیسی)

کھلونوں سے بھی زیادہ بچے کھلونے والے کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کی دلبستگی کا سامان فراہم کرنے والے کھلونے ان کی گلی بلکہ دروازے تک پہنچا

جو سید بابر کی نظم "کھلونے والا" [illegible] پر روشنی ڈالتی ہے۔ اپنی نظم میں انھوں نے کھلونے بیچنے والے کی ادا اور [illegible] کو نہایت چابکدستی کے ساتھ منظوم کیا ہے۔

کھیل کھلونے والا ہوں، میں کھیل کھلونے والا
لے لو بچو چاند کی کرنیں اور تاروں کی مالا
چوں چوں چوں چوں چڑیا بولے غٹرغوں کبوتر
نئے نئے کرتب دکھلائے بانس پہ چڑھ کر بندر

یہ ہے بھالو یہ ہے مرغا یہ ہے بلی خالہ
کھیل کھلونے والا ہوں میں کھیل کھلونے والا
ہار ہیں پھولوں کے، رنگ برنگے، دھانی سرخ گلابی
تتلی، بلبل، طوطا، مینا، تیتر اور مرغابی

(کھلونے والا۔ سید بابر)

ظاہر ہے ایسی نظموں میں بچوں کو بے حد دلچسپی محسوس ہوگی جس میں بیک وقت چڑیا، کبوتر، طوطا، مینا، بندر، بھالو، مرغا، بلی، پھول، تتلی، بلبل، تیتر اور مرغابی کھلونے ہاتھ لگ جائیں۔ لیکن بعض اوقات مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بچے کو گھر سے صرف دس ہی پیسے ملتے ہیں اور وہ ایک کھلونے والے سے سب ہی کچھ خریدنے کی خواہش رکھتا ہے۔ ایسے مواقع پر بچوں کے احساسات کی ترجمانی بدیع الزماں کی اس نظم میں کتنی چابکدستی سے کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سوچ رہا ہوں آج خریدوں
ایک اچھی سی گیند
اک لٹو
اک اچھا سا باجا
تھوڑی برفی
تھوڑے لڈو
اور تھوڑا سا کھاجا

سوچ رہا ہوں آج خریدوں، آج خریدوں کیسے؟
مگر خریدوں کیسے
امی نے تو
مجھے دیئے ہیں
آج بھی دس ہی پیسے، مگر خریدوں کیسے؟

(بدیع الزماں خاور)

الغرض کھلونوں سے متعلق اردو کے شاعروں نے بچوں کے لیے لاتعداد نظمیں قلم بند کی ہیں۔ اس نوع کی نظموں میں "قریشہ کی گڑیا" (محوی صدیقی) گڑیا میری (فہمیدہ عتیق)" باجی گڑیا بنادو" (محمد ناصر) "کھلونا" (بدر جونپوری) "بابر کا گڈا" (نشاط عباسی) لائقِ توجہ ہیں۔

مٹھائیاں اور پھل وغیرہ:۔

سب ہی جانتے ہیں کہ کھیل کود کے ساتھ ساتھ بچوں کو چاکلیٹ، ٹافی، حلوہ اور پھلوں وغیرہ سے خاص رغبت ہوتی ہے اور ایسی تمام اشیا جو بچوں کو مرغوب ہیں۔ ادب اطفال سے متعلق شعراء کے مرغوب موضوعات رہے ہیں۔ چنانچہ اردو میں بچوں کے لیے ایسی شعری تخلیقات کی کمی نہیں ہے۔ جن میں ان چیزوں پر طبع آزمائی کی گئی ہو۔

قتیل شفائی کی نظم "کھانڈ کی چڑیا" بھی اس ضمن میں لائقِ ذکر ہے۔ اس نظم میں کھانڈ کی مٹھائیاں بیچنے والا صدائیں لگا کر بچوں کو اپنی جانب مائل کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

کھانڈ کی چڑیا لے لو بابو، کھانڈ کی چڑیا لے لو
میری چڑیا کھانے والا، ہاتھی سے ٹکراتا ہے
مچھر بھی اس کو چکھ لے تو وہ رستم بن جاتا ہے
ایک ذرا سی چیونٹی اس کو چھولے تو ڈنڈ پیلے
کھانڈ کی چڑیا لے لو بابو، کھانڈ کی چڑیا لے لو

(کھانڈ کی چڑیا قتیل شفائی)

اس طرح نظم میں مٹھائی فروخت کرنے والے کی زبانی ایسی باتیں کہلائی گئی ہیں جو از خود مٹھائی سے زیادہ شیریں اور پُر لطف ہیں۔ بدیع الزماں خاور نے اس موضوع پر ایک دوسرے انداز سے طبع آزمائی کی ہے۔

تابش میرا چھوٹا بھائی
اس کو بہت بھاتی ہے مٹھائی
نہیں سمجھ میں اس کے آتا
کڑوی کیوں ہوتی ہے دوائی

بڑے شوق سے کھاتا ہے وہ
لڈو، برفی، کیک، ملائی
اکثر جیب میں بھر لیتا ہے
میرے حصے کی بھی مٹھائی

(تابش میرا چھوٹا بھائی بدیع الزماں خاور)

نجم مظفر نگری کی نظم "پیٹو بھائی" اس موضوع پر مزاحیہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس میں "پیٹو بھائی" کے حوالے سے بچوں کی مٹھائی سے رغبت کا ذکر نہایت دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے۔

ایک ہیں اپنے پیٹو بھائی — کھاتے ہیں دن رات ملائی
ننھی سیما کو بہلا کر — لے لیتے ہیں، بسکٹ آ کر
چل جو رہے تھے لُو کے جھونکے — سوئے تھے ہم سب گُدڑی ٹھونکے
پیٹو چپکے چپکے آئے — آخر کنڈی تک جا پہنچے
برفی، لڈو، بالو شاہی — خوب مزے لے لے کے کھائی

پٹتے بھی ہیں کھاتے بھی ہیں　　روتے بھی ہیں گاتے بھی ہیں

(پیٹو بھائی۔ نجم منظر نگری)

نظم میں ملائی، بسکٹ، ثانی، لڈو، بالوشاہی وغیرہ متعدد مٹھائیاں بالحسن کاری کے ساتھ پیش کی گئی ہیں کہ یہ خود مٹھائی کی طرح بچوں کی پسندیدہ تخلیق ہو گئی ہیں۔ اور بالواسطہ طور پر انھیں یہ احساس بھی دلایا گیا ہے۔ اس ضمن میں وفا ملک پوری کی نظم خاص دلچسپ ہے۔ لکھتے ہیں:

کمرے میں جو استاد کے ایک دن گئے ہم لوگ
تھا خوشبو سے حلوہ کی بسا کمرہ وہ سارا
دیکھا ہے رکھی طاق پہ حلوہ کی رکابی!
جھٹ پٹ کیا در بند رکابی کو اتارا
یہ سنتے ہی ہم نے بھرا واں سے چھلاوہ
پکڑا گیا لیکن وہ مرا دوست بچارا
استاد نے حلوہ کا مزہ خوب تھ
مت پوچھیے کس طرح کیا اس نے گوارا

(حلوے کی چوری۔ وفا ملک پوری)

اس نظم میں شوخ وشنگ بچے نہ صرف استاد کا حلوہ چٹ کر جاتے تھے بلکہ اپنی حاضر جوابی، تیزی اور طراری سے استاد کو خوش کر کے سزا سے بھی بچ جاتے ہیں۔ مٹھائی کے ساتھ ساتھ بچوں کی دلچسپی بے پناہ ہوتی ہے پھر یہ تو شاعروں کے قلم کی زد سے کیسے بچ سکتے تھے۔ نثار عباسی کی نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دیکھو بچو! آم گرا　　بٹوہ جیسے مصری بھرا
دیکھو دیکھو سیب گرا　　یعنی کٹوری رس کی بھری
قدرت کی ہے کاریگری　　آموں میں شیرینی بھری
آم کی قسمیں مت پوچھو　　کھاؤ آم نہ پیڑ گنو!
آم ہے کوئی کھٹ مٹھا　　"ثانی" کا کوئی ڈبا!
یہ ہے دسہاری یہ چوسا　　لنگڑا فجری اور کیا کیا

کوئی کھائے پال کے آم — کوئی چاہے ڈال کے آم
کوئی قلمی کا قائل — کوئی تخمی پہ مائل!

راقم ۔ نثار عباسی

اس نظم میں نثار عباسی نے بڑی فنکاری کے ساتھ بچوں کے پسندیدہ موضوع کا ذکر چھیڑ کر اس کی مختلف اقسام اور نوعیتوں سے متعلق معلومات یکجا کر دی ہے جو ننھے قاری کے لیے دلچسپی کے ساتھ ساتھ افادیت کی حامل بھی ہیں۔

بزمی بھارتی کی نظم " پھلوں کا راجا " اس اعتبار سے انفرادی حیثیت کی حامل ہے کہ آم کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے متعدد دوسرے پھلوں کا بیان بھی کیا ہے اور آم کو ان پر فوقیت دی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے ؎

ان کے رسیلے پن میں جو لذتیں بھری ہیں
انگور ، سنترہ کو حاصل وہ کب ہوئی ہیں
آڑو ، انار ، لیچی ، امرود ، سیب ، کیلا
خوبانیاں ، شریفے ، خربوزہ اور سردا
جامن ، لکاٹ ، ککڑی ، ناگ اور ناشپاتی
ذکر ہے کوئی اس کا ، کوئی ہے ذکرانی
مرغوب کیا ہے ، مقبول عام کیا ہے
بچو ! بتاؤ ہم کو اس پھل کا نام کیا ہے

(پھلوں کا راجا ۔ بزمی بھارتی)

پہیلیوں کے پیرائے میں بھی بچوں کو مختلف پھلوں سے متعلق اطلاعات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ امیر خسرو کی مشہور پہیلی ہے۔

ایک زمرد کا تھا گھڑا — نیو زمین میں آپ ادھر
خون کی ندی رس میں جل — گورے گالوں کی فوج تھی ساری

(پہیلی تربوز امیر خسرو)

اس پہیلی کے ذریعے نہ صرف بچوں کی ذہانت کو فروغ دینے کی سعی کی گئی ہے بلکہ

انھیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تربوز سبز رنگ کا پھل ہوتا ہے جو اپنی جڑ سے خاصے فاصلے پہ نمو پاتا ہے۔ اس میں سیاہ اور سفید بیج ہوتے ہیں نیز اس کا رس سرخ ہوتا ہے۔

پھلوں کے دلچسپ بیانات کے پردے میں کچھ فنکاروں نے بچوں کو پر تاثیر انداز میں نصیحتیں بھی کی گئی ہیں مثلاً:

ہم نے پہلے ہی روکا تھا
اور اسی نے بھی ٹوکا تھا
منے اس بھاری پتھر سے

مت توڑو اخروٹ
دیکھا لگ گئی ہاتھ میں چوٹ

(اخروٹ۔ رفیق احمد)

مٹھائیوں اور پھلوں سے متعلق نظموں میں "لڈو کا لڑوا" "آموں کی بہار" (شفیع الدین نیر) "گاجر رانی" (فرحت قمر) "پپیتو بھائی" (نجم الدین مظفر نگری) "آم" (علیم اختر) کو بھی اردو کے شعری ادب اطفال کے ہر اچھے انتخاب میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

پرندے

گھر کی چہار دیواری میں رہتے ہوئے بھی چھوٹے بچے بعض پرندوں کو دیکھتے اور ان سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ چڑیوں کا چہکنا اور پھدکنا، کوئے کی کائیں کائیں، کبوتر کی غٹرغوں، مرغ کا چھاتی پھلا کر بانگ دینا اور ایسی بے شمار باتیں بچوں کو دلچسپ مشغلے کی طرح اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ ان موضوعات پر شاعروں کا نظمیں کہنا فطری بات تھی۔ مشکل سے کوئی ایسا ہندوستانی پرند بچا ہوگا جو کسی نہ کسی نظم کا موضوع نہ بنا ہو۔ گھروں میں گوریا اور دوسری چھوٹی چھوٹی چڑیاں گھونسلے بنا کر رہتی ہیں اور ان کی آمد و رفت سے خاصی چہل پہل کا ساماں رہتا ہے۔ اس ضمن میں روتے بچوں کو بہلانے کے لیے بڑے اکثر انھیں ایسی چڑیوں کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں۔ ایسی ہی ایک نظم کا اقتباس دیکھیے:

آجا ری چڑیا　　آجا ری چڑیا
منڈیر پہ کیوں　　کرتی ہے چوں چوں

آجا تجھے میں دانہ کھلاؤں
روٹی کے بھورے چھت پر بکھیروں
لے اپنی کھا جا کھا جا ری چڑیا
آجا ری چڑیا

(چڑیا۔ حفیظ جالندھری)

اس طرح نظم بچوں کو چڑیا کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنے کا سبق بھی دیتی ہے۔ اور انھیں چڑیوں کے رجھانے کا گر بھی سکھاتی ہے۔ چڑیوں کے بارے میں محوی صدیقی نے بھی خاصی سبق آموز نظم لکھی ہے اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔ چڑیوں کی آمد پر۔

کرے چوں چوں لپکتے ہیں بچے — جب یہ کچھ لے کے گھر میں آتی ہے
نہ ستاؤ تم ان کے بچوں کو — تم کو بچو! یہ کب ستاتی ہے
نہ دکھاؤ دل ان کا ننھا سا — کیا تمھارا یہ دل دکھاتی ہے
جیسے تم سب ہو یہ بھی پیارے ہیں — اپنے ماں باپ کے دلارے ہیں

(چڑیاں۔ محوی صدیقی)

اس طرح بچوں کو مؤثر پیرایہ میں چڑیوں اور ان کے بچوں سے ہمدردی کا رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ وامق جونپوری کی نظم میں چڑیا خود بطور واحد متکلم اپنی پریشانیوں کا اظہار کرتی ہے۔

مجھ کو اڑا دو بچو کہ بے پر نہیں ہوں میں
چڑیا ہوں کوئی دودھ کا ساغر نہیں ہوں میں

کیوں گھونسلے کی دوری سے گھبرا نہ جائے دل
ہوں گھر گرہست قوم کی بندر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھ کو پھنساتا ہے کس لیے
صحنِ چمن میں گاتی ہوں باہر نہیں ہوں میں

(چڑیا کی فریاد۔ وامق جونپوری)

الغرض اس غزل نما نظم میں غالب کی مشہور نظم کی پیروڈی پر لطف انداز میں کی گئی ہے اس ذیل میں اقبال کی مشہور نظم "ایک پرندے کی فریاد" کا تذکرہ ناگزیر ہے

جو اپنے موضوع پر شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔

کیا بد نصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں، میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
اس قید کا الہٰی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے، یہیں قفس میں، میں غم سے مر نہ جاؤں

(ایک پرندے کی فریاد ۔ اقبال)

بے زبان پرندوں کو پنجرے میں قید کر لینا اور اپنی تفریح طبع کا سامان بنانا بڑوں میں عام بات ہے ظاہر ہے بچے اس شغل میں اور زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ انھیں قیدی پرندوں کی احساسات سے بھی روشناس کیا جائے اور یہ فریضہ اقبال نے محولہ بالا نظم کے ذریعے بہ درجہ احسن ادا کیا ہے۔ پالے جانے والے پرندوں میں طوطا سرِ فہرست ہے چونکہ اسے پڑھایا بھی جا سکتا ہے۔ اس لیے بولتے ہوئے طوطے بچوں کو فطری طور پر نہایت عزیز ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر عشرت رحمانی کی ایک دلکش نظم کا یہ اقتباس پیش خدمت ہے۔

میرے پاس اک طوطا آیا ۔۔۔ میں نے اس کو خوب پڑھایا
میٹھی باتیں سن کر اس کی ۔۔۔ سارے لوگوں کو حیرت تھی
نام کبھی وہ رام کا لیتا ۔۔۔ پل پل اللہ اللہ پڑھتا
دل میں یہ سوچو اور سمجھو ۔۔۔ توتا اک چڑیا ہے بچو

(توتا ۔ عشرت رحمانی)

نظم میں بچوں کو اس بہانے خدا کی عبادت پر آمادہ کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے کہ جب پرند بھی اس کی یاد میں مشغول رہتے ہیں تو انسان کو اس کی یاد سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔

کبوتر بھی عام گھروں میں پالا جانے والا ایک خوبصورت اور معصوم پرندہ ہے۔ نثار عباسی نے اپنی نظم میں کہا ہے۔

ایک سے ایک ہیں پیارے کبوتر — بھورے، سفید اور کالے کبوتر
کوئی ہے سبزہ، کوئی شیرازی — اور ہے لوٹن، کوئی کبوتر
کوئی ہے لقا، کوئی ہے دانہ — ان میں جو ہے وہ فرزانہ
یہ ہیں دیکھو گولے کبوتر — لال بسیرے بھولے کبوتر

(کبوتر۔ نثار عباسی)

آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ شاعر نے باتوں باتوں میں کبوتر کی اقسام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بچوں کے ذہن نشین کرادی ہیں۔ گھریلو پرندوں میں مرغی، مرغے سے ہر بچہ اوائل عمر ہی سے آشنا ہوتا ہے۔ پرندوں پر بڑی خوبصورت نظمیں وافر تعداد میں دستیاب ہیں۔ نمونے کے طور پر مرغی سے متعلق ابن انشا کی خوبصورت شاہکار نظم کا یہ ٹکڑا دیکھیے۔

بلو کی مرغی
کھاتی ہے ڈنڈے
دیتی ہے انڈے
سنڈے کے سنڈے
بلو کی مرغی
فاقے کی ماری
کھاتی ہے تڑکے
اٹھ کے نہاری
دل کی عادت اس کی ہے پیاری
پیٹو کہاے
ناحق بے چاری

(بلو کی مرغی۔ ابن انشا)

ابن انشا کی مرغی کے مقابلے: حفیظ جالندھری کا تیز طرار مرغا بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔

بول میرے مرغے
ککڑوں کوں!

خوب اکڑ کر چڑھ کر کھانچے پر
ہاں اب تن جا مرغا بن جا
بول میرے مرغے
ککڑوں کوں
لے اب گردن خوب گئی تن
سر کو جھکا دے دم کو اٹھا دے
اپنے بازو تول میرے مرغے
بول میرے مرغے
ککڑوں کوں

(بول میرے مرغے۔ حفیظ جالندھری)

حفیظ کی یہ نظم اپنی نرالی تکنیک، فنی بندش اور نادر ہیئت کے اعتبار سے تو قابلِ تحسین ہے۔ اس کا مواد بھی بچوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے اور بحیثیت مجموعی اسے بچّوں کی بہترین نظموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

کوا ہر چند کہ گھریلو پرندہ نہیں ہے لیکن بن بلائے مہمان کی طرح ہر گھر میں جھانکتا پھرتا ہے۔ عشرت بدایونی نے اس کی بے ڈھنگی حرکات سے متعلق ایک پر لطف نظم کہی ہے نمونے کے یہ بند ملاحظہ ہوں۔

چھت سے اڑ کر آنگن میں ٹھونگ لگانے برتن میں
کیوں آتا ہے گھڑی گھڑی
اڑ جا کوّے ہڑی ہڑی
لانج میں کچھ نظر نہ آئے کھانے کی ہر شئے کھا جائے
گلی گلی اور سڑی سڑی
اڑ جا کوّے ہڑی ہڑی
پائے جہاں اپنی خوراک دور سے تو اس کو تاک
آنکھیں تیری بڑی بڑی
اڑ جا کوّے ہڑی ہڑی (کوا۔ عشرت بدایونی)

نظم میں کتے کی حرکات وسکنات کی عکاسی ایسی چابکدستی کے ساتھ کی گئی ہے کہ پڑھنے والوں کے سامنے کوا، کود پھاند کرتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے مزید برآں نظم کی دلچسپ ہیئت اور ادبی چاشنی نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

کوئل بھی رنگت اور شباہت میں کوے سے مماثل ہوتی ہے لیکن اس کی کوک دل میں براہ راست پیوست ہو جاتی ہے۔ کتے سے آدمی جتنا بھڑکتا ہے کوئل سے اتنی ہی محبت کرتا ہے۔ شوقی کی نظم میں کوئل کے کوکنے کا یہ سماں دل کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتا ہے۔

تیری رنگت کالی کالی
تیری صورت بھولی بھالی
اڑنے والی ڈالی ڈالی
بن میں شور مچانے والی کوئل تیری کوک نرالی
باغ میں تیری رٹ کوکو کی
دیتی ہے اک لطف عجب ہی
سنتا ہے جب کوک کو تیری
خوش ہوتا ہے باغ کا مالی کوئل تیری کوک نرالی

(کوئل ۔ حفیظ الدین شوقی)

یہ نظم بھی اپنی ہیئت اور چاشنی کی بنا پر بچوں کی شعری تخلیقات میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے

مور ہندوستان کا قومی پرندہ ہے۔ جدید شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے اس موضوع پر نہایت خوبصورت نظم لکھی ہے۔ تین شعر بطور نمونہ پیش خدمت ہے۔

اس جنگل میں مور بہت ہیں
دن بھر موروں کی جھنکار اوپر نیچے چیخ پکار
مور تو کرتے شور بہت ہیں نیلے پیلے مور بہت ہیں

(مورنامہ ۔ شمس الرحمٰن فاروقی)

الغرض تقریباً تمام قابلِ ذکر ہندوستانی پرندوں پر نظمیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں

"ایک پرندہ اور جگنو" اور "پرندے کی فریاد" (اقبال) "چڑیا اور انڈے بچے" "اور مکوڑوں کی بارات" (محوی صدیقی) "مرغی"۔ "طوطا اور کبوتر"۔ "چڑیا" اور "تیتری" (شفیع الدین نیر)۔ "ایک بدقسمت طوطا" (تلوک چند محروم) "طوطا" (زنتار عباسی) "کوے کی چوری" (بدیع الزماں خاور) کا ذکر خاص طور پر اپنی اہمیت کا احساس دلاتی ہے۔

جانور:۔

عالمی ادب اطفال میں "پنچ تنتر" کی اہمیت مسلمہ ہے جس میں جانوروں کے کردار تمثیلی کہانیوں میں پیش کیے گئے ہیں۔ اردو ادب اطفال میں بھی جانوروں کے وسیلے سے شعری تخلیقات کا کچھ بہلانے اور سکھلانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ اور اس میں شعری تخلیقات کا غلبہ ہے۔ جانوروں سے متعلق نظموں میں کچھ کی نوعیت تعارفی اور معلوماتی ہے، کچھ اخلاقی درس دیتی ہیں اور اکثر تفریحی نوعیت کی ہیں۔ جانوروں پر بچوں کے لیے نظمیں لکھنے والوں میں میر تقی میر اور عہد رواں کے شمس الرحمٰن فاروقی جیسے چھوٹے بڑے سیکڑوں شاعروں نے حصہ لیا ہے۔ میر تقی میر کی نظم کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

ایک بلی، موہنی تھا اس کا نام ۔۔۔ ان نے میرے گھر کیا آکر قیام
ایک دو سے ہو گئی الفت بہت ۔۔۔ کم بہت جانے لگی اٹھ کر بنت
ربط پھر پیدا کیا میرے ہی ساتھ ۔۔۔ دیکھتی رہنے لگی میرا ہی ہاتھ
چھیچھڑا انگڑا جو کچھ پایا کرے ۔۔۔ فقر میرا دیکھ کر کھایا کرے

(موہنی بلی۔ میر تقی میر)

بلی پالتو جانوروں یا غالباً انسان کے دل کو جیتنے کا گر سب سے زیادہ جانتی ہے یہی وجہ ہے کہ پالتو بلیوں سے بچے بہت جلد مانوس ہو جاتے ہیں۔ ان ہی اوصاف کے پیش نظر بلی کئی شعرا کی نظموں کا موضوع بھی ہے۔ افسر میرٹھی کی نظم بھی اس ضمن میں خاصی دلچسپ ہے۔ جس میں بلی کی زبانی اس کی من بھاتی چیزوں کا بیان نظم کیا گیا ہے۔ اس کے یہ بند بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

ایک طرف سے جو بیا آئی ۔۔۔ ایک طرف سے دودھ ملائی

یہ بھی کھاؤں وہ بھی کھاؤں
میاؤں میاؤں میاؤں میاؤں

چوں چوں کرتی چڑیا آئی دانے دُنکے کو للچائی
اس کو آخر کیوں ترساؤں
میاؤں میاؤں میاؤں میاؤں

(میاؤں میاؤں۔ حامد اللہ افسر)

اس نظم میں بلّی کی بولی اور اس کی خوراک کے بارے میں ضروری معلومات تفریحی انداز میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کی گئی ہیں اس کے برعکس حفیظ جالندھری نے بلی کو اپنی نظم میں بچوں کی سہیلی بنا کر پیش کیا ہے جو گھر کے دیگر افراد کی بہ نسبت بچے کے ساتھ رہنے میں پیش پیش نظر آتی ہے۔

مانو بلی چھوٹی سی چھوٹی سی اور موٹی سی
بابو کی ہے سہیلی ہے میری بھی تو سہیلی ہے
باجی کرتی ہیں آرام اماں کو ہوتا ہے کام
آکر مجھ سے کھیلے کون گود میں مجھ کو لے کون
مانو ہی سے کھیلوں گا گود میں اس کو لے لوں گا

(مانو بلّی۔ حفیظ جالندھری)

بلی اور کتے کا چولی دامن کا ساتھ ہے گھر میں یہ ایک دوسرے کے دوست اور گھر سے باہر باہم رقیب ہوتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے ان دونوں جانوروں پر مشتمل ایک پُر لطف نظم بچوں کے لیے تخلیق کی۔ نظم بے حد مختصر ہے آپ بھی چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

ایک تھا کتّا ایک تھی بلی بلی تھی وہ بڑی چبلّی
نہ تھا وہ کتا کم چالاک سیدھی دم تھی بھیگی ناک
بلی نے دو چوہے پکڑے کتے نے دو چوزے پکڑے
کتے کے تھے لمبے کان بلی سب کی خالہ جان

(کتّا بلّی، دلّی والد شمس الرحمٰن فاروقی)

کتے کا ذکر چھڑا ہے تو اس موضوع پر اسماعیل میرٹھی کی نظم "ایک کتا" کا تذکرہ ناگزیر ہے جس میں ہڈی سے کتے کی رغبت اور لالچ کے نتیجے میں ہونے والے نقصان کو منظوم کہانی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

منہ میں ٹکڑا لیے ہوئے کتا — ایک دریا کو تیر کر اترا
پانی آئینہ لے رہا تھا چمک — نظر آتی تھی تہ کی مٹی تک
اپنا پرچھائیں پر کیا جو غرور — اس کو سمجھا کہ ہے یہ کتا اور
حرص نے ایسا بے قرار کیا — جھٹ سے غرا کے اس پہ وار کیا
جوں ہی ٹکڑے پہ اس نے منہ ملا — اپنا ٹکڑا بھی کھو دیا سارا

(ایک کتا۔ اسماعیل میرٹھی)

اس نظم میں اسماعیل میرٹھی نے اپنی روایت کے مطابق بچوں کو نصیحت بھی کی ہے کہ لالچ کا انجام برا ہوتا ہے اور یہ نصیحت نہایت پر اثر اور پر لطف انداز میں کی گئی ہے۔

اسی نصیحت آمیز انداز میں نظیر اکبر آبادی نے ہرن اور کتے کی دوستی پر مشتمل ایک نصیحت آموز نظم لکھی ہے جو بچوں کو باہمی یگانگت اور خلوص کا پیغام دیتی ہے۔ نظم مخمس کی ہیئت میں ہے۔ اس کا ابتدائی بند ملاحظہ ہو۔

اک دشت میں سنا ہے کہ اک خوب تھا ہرن
بچہ ہی تھا ابھی نہ ہوا تھا بڑا ہرن
پھرتا تھا چوکڑی کا دکھاتا مزا ہرن
دیکھا جو ایک کوّے نے وہ خوشنما ہرن
دل کو نہایت اس کے وہ اچھا لگا ہرن

(ہرن کا بچہ۔ نظیر اکبر آبادی)

آگے چل کر ہرن کے اس بچے سے کوے کی دوستی ہو جاتی ہے اور یہ کوا ہرن کو شکاری کے جال سے بچاتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی نے "ریچھ کا بچہ" پر بھی پر لطف نظم کہی ہے۔ مداریوں کو ریچھ کی ناک میں نکیل دے کر گلی گلی نچاتے ہوئے دیکھنا بچوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ نظیر کے علاوہ بھی قدیم اور جدید شعرا نے بھالو کو اپنی فکر کا محور بنایا ہے۔ راجہ مہدی علی خاں کے

اس ارمان کو بھالو دیکھ کر بچوں کے انداز میں ظاہر کیا گیا ہے۔

کاش کہ ہم سب بھالو ہوتے

وادی وادی گھومنے جاتے
مٹک مٹک قدم اٹھاتے
جنگل جنگل کے پھل کھاتے
شور وہاں جی بھر کر کرتے
منہ میں ہمارے آلو ہوتے

کاش کہ ہم سب بھالو ہوتے

(کاش کہ ہم سب بھالو ہوتے ۔ راجہ مہدی علی خاں)

ان تمام بھالوؤں کے مقابلے پر ابن انشا کے بھالو کا کھلونا اپنی ہیئت کذائی کے اعتبار سے بالکل الگ اور منفرد نظر آتا ہے موصوف لکھتے ہیں۔

بلو کا بھالو	جنگل کا خالو
قد اس کا چھوٹا	پیٹ اس کا موٹا
دیکھو تو جیسے	مٹی کا لوٹا
لال اس کی ٹوپی	دھانی لنگوٹی
باہر سے ٹن ٹن	اندر سے کھوٹا
راشن میں کھائے	گھر بھر کا کوٹا
منہ اس کا ہر وقت	رہتا ہے چالو

صورت میں بھالو

(بلو کا بھالو ۔ ابن انشا)

مداری کے ہاتھوں میں ڈگی کا ناچ ناچنے والا جانوروں میں بھالو سے بھی زیادہ بندر بچوں کے دل کو بھاتا ہے۔ اس پُر لطف موضوع پر سیفی سیوہاروی کی نظم کا یہ بند پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

زرد شلوکا ، لال گھگریا	گوٹے والی سبز چنریا
روپ کلاہ ، گلفام سندریا	پاؤں اٹھا لچکا دے کمریا

ناچ، چھما چھم ناچ بندریا
ڈگ، ڈگ، ڈگ، ڈگ، ڈگ

(ناچ بندریا۔ سیفی سیوہاروی)

گائے بھی گھریلو جانوروں میں بچوں کا خاص طور پر دیہات اور قصبات کے بچوں کی رفیق و ہمدم ہے۔ بچوں میں بہت کم ایسے ہوں گے، جنھوں نے اپنی اوائل عمر میں ہی اسماعیل میرٹھی کی نظم "رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی،" نہ پڑھی ہو۔ اس موضوع پر تلوک چند محروم کی نظم بھی خاصی مقبول رہی ہے۔

محشر بدایونی نے گائے کے بارے میں خاص دلچسپ نظم تخلیق کی ہے۔ اس کا مختصر سا اقتباس پیشِ خدمت ہے۔

ایک تھی گائے بھولی بھالی	سر سے لے کر دم تک کالی
سیروں دودھ مزے سے بکتا	گھر بھر کی تھی شان نرالی
کھا کھا دودھ دہی گھی مکھن	پل پل صحت اور بحالی
گائے کیا تھی اک مایا تھی	گھر میں تھی اس سے خوشحالی

(لالچ کی سزا۔ محشر بدایونی)

علامہ اقبال کی نظم "ایک گائے اور بکری" بھی اس ذیل میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں بکری اور گائے دونوں پالتو جانوروں کی فطرت کی عکاسی اور اس کے وسیلے سے بچوں کو احسان شناسی کی تلقین کی گئی ہے۔ بطور نمونہ چند شعر دیکھیے۔

یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں	لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
اس کے دم سے ہے اپنی آبادی	قید ہم کو بھلی کہ آزادی
قدر آدم کی تم اگر سمجھو	آدمی کا کبھی گلہ نہ کرو
گائے یہ بات سن کے شرمائی	آدمی کے گلے سے پچھتائی
دل میں پرکھا، بھلا برا اس نے	اور کچھ سوچ کر کہا اس نے

یوں تو چھوٹی ہے بات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

الغرض جانوروں کے بارے میں اردو کے شعری سرمائے میں بچوں کے لیے نظمیں

کہ پھولوں کی نہیں ہے اور ایسی نظموں میں "ریچھ کا بچہ" (نظیر اکبرآبادی)، "شیر، لومڑی، گدھے" (اسماعیل میرٹھی)، "گائے" (تلوک چند محروم)، "سوال" (رئیس احمد جعفری)، "جانور" (غلام مصطفےٰ تبسم)، "بیمار بلی" (میرزا غالب)، "ہاتھی اور گھوڑا" (شمس الدین نیر)، "بلی کا خواب" (شان الحق حقی)، "بچی کی بلی" (رز لیش کمار شاد)، "چوہے دادا" (رنا وک عزیز پوری)، "جعفر کا گھوڑا" (بدیع الزماں خاور)، "شامی میرا نام" (محبوب راہی)، "منو اور مانو" (فضل الٰہی)

جگنو، پھول، تتلی:

دنیا بھر کی شاعری خواہ وہ بچوں کے لیے ہو یا بالغوں کے لیے پھول، تتلی، جگنو، اور اسی نوع کے دیگر عناصر کی مدد سے شعرا اپنے کلام کو خوبصورت بناتے آئے ہیں۔ اردو میں بھی بچوں کے لیے قلم اٹھاتے وقت شعرا نے ان چیزوں پر مناسب توجہ صرف کی ہے۔ رنگ برنگے پھول، اندھیری رات میں جھلملاتے ہوئے جگنو اور فضا میں رنگوں کی پھوار اڑاتی ہوئی تتلی بچے کو انتہائی خوشگوار حیرت سے دوچار کرتی ہے اور ان چیزوں سے متعلق نظموں میں بھی وہ ویسی ہی دلکشی محسوس کرتا ہے۔ بڑی تعداد ادب اطفال کے شعری سرمائے میں موجود ہے کہ نگاہ انتخاب کا کن ہی چند مقامات پر ٹھہرنا دشوار ہو جاتا ہے اس کے بارے میں محمد صدیقی کی نظم کے چند اشعار دیکھیے۔

کیا شوخ اور پیارا، اے گل ہے رنگ تیرا
رہتا ہے تیرے دم سے، دل کتنا شاد میرا
رنگت ہے کتنی پیاری، خوشبو ہے کیسی اچھی
بلبل غریب جب تو، شیدا ہوئی ہے تیری
باغوں میں تیری رنگت کیا رنگ لا رہی ہے
ہر وقت تیری خوشبو، دل کو لبھا رہی ہے

(گلاب کا پھول۔ محمد صدیقی)

جگنو سے متعلق اقبال کی نظم اپنے دور میں بے حد مقبول ہوئی تھی۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارا
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا، گمنام تھا وطن میں

(جگنو۔ اقبال)

اقبال کی اس نظم سے متاثر ہو کر متعدد شاعروں نے جگنو کو بچوں کی نظموں کا موضوع بنایا مثلاً سکندر علی وجد کی اس موضوع پر قلمبند کردہ نظم کا یہ اقتباس۔

ہونے لگی جگنوؤں کی بارش فطرت کے جمال کی تراوش
روشن تھا اس قدر اندھیرا گویا ہونے کو تھا سویرا
جگنو اس طرح اڑ رہے تھے ہیروں میں پر لگے ہوئے تھے

(جگنو۔ سکندر علی وجد)

اقبال اور وجد دونوں کی نظمیں فنی پختگی اور ادبی محاسن سے مملو ہونے کے باوجود بہت چھوٹے بچوں کے کام کی چیزیں نہیں ہیں اور موجودہ دور کے غالباً ساتویں آٹھویں اور اس سے بالاتر جماعتوں کے طلبا ہی ان نظموں سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ وفا فرخ آبادی نے اس موضوع پر مختصر بحر اور نہایت آسان زبان میں بہت چھوٹے بچوں کے لیے جگنو پر نظم کہی ہے۔ جس کے چند شعر پیش خدمت ہیں۔

ننھا جگنو پیارا پیارا رات میں چمکے جیسے تارا
اونچا نیچا اڑتا جائے جگ مگ جگ مگ کرتا جائے
آگ لگا دی باغ میں جاکر نور کی افشاں چھیڑی گھر گھر
تالی کی آواز پہ آیا پکڑا پھر ٹوپی میں چھپایا

(وفا۔ فرخ آبادی)

اس نظم میں اندھیری رات میں باغ اور گھروں میں جگ مگاتے ہوئے جگنو کا سماں ایسے فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ پورا منظر پڑھنے والے کی نگاہ کے سامنے کھنچ جاتا ہے اور بچوں کی جگنو پکڑ کر ٹوپی میں چھپانے کی فطرت کی عکاسی بھی خوب کی گئی ہے۔

تتلی، جگنو سے کم خوبصورت اور دل آویز نہیں ہے۔ اس کے بارے میں بھی اردو کے شعراء نے خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔ یہاں صرف شوق قدوائی کی نظم کا ایک ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے۔

پر کھول کے تتلیوں کی پرواز	پر جوڑ کے بیٹھنے کا انداز
اس پھول سے اڑ کر اس پر بیٹھیں	رس لے کے اڑیں، جس پہ بیٹھیں
نازک نازک وہ خوشنما پر	اڑتی ہوئی پتیاں ہوا پر
رنگ ان میں بہت سے لگ رہے تھے	پر کیا ہیں چمن کھلے ہوئے ہیں

(رنگ برنگی تتلی۔ شوق قدوائی)

اس طرح نظم نہ صرف بچوں کو خوبصورت تتلیوں کی رنگینی سے روشناس کرتی ہے بلکہ انھیں یہ اطلاع بھی باہم پہنچاتی ہے کہ یہ تتلیاں پھولوں سے رس چوس کر اپنی غذا حاصل کرتے ہیں، یہی عمل شہد کی مکھی بھی کرتی ہے۔ چنانچہ شان الحق حقی نے اسے بھی اپنی ایک نظم میں پیش کر کے بچوں کی تفریح طبع اور آگاہی کا سامان فراہم کیا ہے۔ اس نظم میں شہد کی مکھی بچوں سے مخاطب ہے۔

پھولوں پر ہوں جاتی	رس ہوں چوس کے لاتی
شہد ہوں اس سے بناتی	اور ہوں تم کو کھلاتی
میں نہیں صرف مکھی	میں ہوں شہد کی مکھی

(شہد کی مکھی۔ شان الحق حقی)

اس طرح بچے اس حقیقت سے آشنا ہونے کے ساتھ کہ شہد کیسے بنتا ہے یہ سبق بھی حاصل کرتے ہیں کہ نکما پن کیڑے مکوڑے تک کو ناپسند ہے۔

مندرجہ بالا موضوعات پر جو بے شمار نظمیں اردو میں دستیاب ہیں ان میں سے "دو مکھیاں" (اسماعیل میرٹھی) "تتلی" (صفی لکھنوی)، "دل ربا تتلی" (محوی صدیقی) (عرش ملسیانی) "بھنورا" (سید حیدر الحسن) "تتلی" (ناوک حمزہ پوری) کی اہمیت کا بہر حال اعتراف کرنا ہوگا۔

نرسری رائمز، منظوم گنتی وغیرہ

تین چار برس کی عمر میں بچے نرسری یا پرائمری کے اسکولوں میں داخل کر دیے جاتے

ہیں جہاں بالکل ابتدائی مرحلے پر انھیں بہت چھوٹی چھوٹی نظمیں گا کر سنائی جاتی ہیں اور پھر بچوں
سے انھیں دہرانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس طرح کم سن بچوں میں اسکول سے رغبت اور
گھر سے باہر کی دنیا سے بے جھجک انداز میں گھلنے ملنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ ایسی نرسری
رائمز اکثر اسکولوں کے استاد اور استانیاں خود بھی گڑھ لیتی ہیں پھر بھی کچھ نرسری رائمز
مطبوعہ شکل میں دستیاب ہیں۔ ان میں بزمی بھارتی کی تخلیق انگریزی کی مشہور نرسری رائمز
"ٹونکل ٹونکل لٹل اسٹار" کے طرز پر قابلِ توجہ ہے۔ اس کے چند شعر بطور نمونہ پیش
خدمت ہیں۔

ٹونکل ٹونکل لٹل اسٹار ننھے منے، راج کمار
تیری باتوں کی جھنکار! میری خوشیوں کا سنسار
چندا کھیلے میرے دوار جگ مگ جگ مگ در و دیوار
یوں مہکا ہے سب گھر بار جیسے پھولوں کا بازار

(سبق۔ بزمی بھارتی)

اس نظم میں بچے سے میٹھی میٹھی باتیں کرکے اس کے ساتھ نیک خواہشات
کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس "پاپولیشن ایجوکیشن" کے تحت تخلیق کردہ مظفر حنفی کی
نرسری رائمز میں مقصدیت اور معلومات کی شمولیت نے اسے منفرد بنا دیا ہے۔

میں ہوں شمی میری امی
پیارے ابو چھوٹا ڈبو
ہم سب مل کر چار ہوئے
امی کا نی ابو ٹا فی!
ڈبو پپی! کہہ دے اپی
پھول ملے تو ہار ہوئے
میں ہوں شمی . . . . .

(میں ہوں شمی۔ مظفر حنفی)

نرسری سے مانوس ہو جانے کے بعد بچہ میں رفتہ رفتہ پڑھنے اور یاد کرنے کا
مادہ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہاں بھی شاعری ان کے ساتھ قدم بقدم

اس سلسلے میں متعدد نظمیں لکھی گئی ہیں جن میں بچوں کی سہولت کے لیے گنتی کو منظوم کر دیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ حاصل مصرعوں میں نصیحت آمیز باتیں یا نصیحت شامل کر دی گئی ہیں۔ نمونے کے طور پر قدوس منشی کی نظم کے تین شعر پیش ہیں۔

ایک اور ایک ہوتے دو ــــ آم ہیں میٹھے چکھ کر دو
دو اور ایک ہوتے ہیں تین ــــ کسی کی چیز کبھی مت چھین
تین اور ایک ہوتے ہیں چار ــــ چھوٹے بچوں کو مت مار

(منظوم گنتی ۔ قدوس منشی)

محبوب راہی کا گنتی کا گیت بھی اس ضمن میں قابلِ ذکر ہے۔ اس نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں۔

چار پانچ چھے ــــ بن جاؤ اچھے!
پانچ چھ سات ــــ آگئی برسات
چھ سات آٹھ ــــ ٹھاٹ کرو ٹھاٹ
سات آٹھ نو! ــــ گن لو پورے سو
آٹھ نو دس ــــ بس کرو بس

(گنتی کا گیت ۔ محبوب راہی)

گنتی سے واقف ہو جانے کے بعد اگلی منزل پہاڑے یاد کرنے کی ہے۔ یہاں اردو کے شاعروں نے بچوں کے لیے نظموں کے ذریعے خاصی سہولت فراہم کی ہیں اور نہ صرف پہاڑے بلکہ ریاضی کے موٹے موٹے گر بھی ان کے لیے منظوم کر دیے ہیں ایسا ہی ایک منظوم پہاڑہ ذہین امروہوی نے لکھا ہے۔

تین ایک تین ــــ بچے بجائیں بین
تین دونی چھ ــــ سدا سچ کہہ
تین تیا نو ــــ اچھی غذا جو
تین چوک بارہ ــــ یاد کرو پارہ

(تین کا پہاڑہ ۔ علی ذہین امروہوی)

ایسی نظموں میں "نرالی گنتی" (نور الحسن ہاشمی) "پہاڑے" (انجم عرفانی) وغیرہ بھی

شامل ہیں۔

بادل، چاند، ستارے وغیرہ

عمر کی اس منزل تک پہنچتے پہنچتے، بچے بظاہر فطرت میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ تجسس اور زیادہ سے زیادہ چیزوں کے بارے میں جاننے کی خواہش بچوں کی فطرت میں داخل ہے خارجی ماحول میں بادل، چاند، ستارے، تاروں بھری رات، دھنک اور اسی نوع کے دوسرے مناظر انھیں اپنی طرف بے اختیار متوجہ کرتے ہیں اور بچے اپنی اپنی ذہنی استعداد کے مطابق ان کے بارے میں خیال کے تانے بانے بنتے رہتے ہیں۔ نونہالوں کے ایسے احساسات کی ترجمانی کرنے والی نظمیں اردو میں بکثرت لکھی گئی ہیں۔

اس سلسلے کی نظموں میں سرفہرست اسماعیل میرٹھی کی تاروں بھری رات آتی ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک معصوم بچے کی زبان اس کے استعجاب اور تحیّر کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم اس اعتبار سے بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہے کہ اردو کے اکثر محققین اسے نظم کا پہلا نمونہ قرار دیتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اے چھوٹے چھوٹے تارو — کہ چمک دمک رہے ہو
تمھیں دیکھ کر نہ ہووے — مجھے کس طرح تحیّر
کہ تم اونچے آسماں پر — جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے — کہ کسی نے جڑ دیے ہیں
گہر اور لعل گویا

(تاروں بھری رات۔ اسمٰعیل میرٹھی)

تاروں کو وسیلہ بنا کر کچھ شعرا نے بچوں کو نصیحتیں بھی کی ہیں۔ مثلاً شان الحق حقی انھیں ٹوٹتے تاروں کی تمثیل کے ذریعہ بے احتیاطی کے ساتھ اچھل کود کرنے سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

دیکھو تارے اب مت گرنا — اچھا نہیں جھولوں پر پھرنا
اب کے گیا گر جنگلا چھوٹ — تو تم جاؤ گے بالکل ٹوٹ

(ٹوٹا تارہ۔ شان الحق حقی)

چاند اور ستاروں کو اپنی نظم میں تمثیلی کرداروں کی حیثیت سے پیش کر کے اقبال

نے بچوں کو مسلسل جدوجہد اور عمل پیہم کا سبق دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ڈرتے ڈرتے دم سحر سے ۔۔۔ تارے کہنے لگے قمر سے

نظارے رہے وہی فلک پر ۔۔۔ ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر

کام اپنا ہے صبح شام چلنا ۔۔۔ چلنا چلنا مدام چلنا!

بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے ۔۔۔ کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے

("چاند اور تارے"۔ اقبال)

یہی تارے تلوک چند محروم کی نظم میں بادلوں کے درمیان آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے ہیں۔ سورج ڈوبتے ہی آسمان پر تارے جھلملا رہے ہیں کہ اچانک ـــ

دور کہیں سے ٹھنڈے ٹھنڈے ۔۔۔ تیز ہوا کے جھونکے آئے

کاندھوں پر اپنے وہ اٹھا کر ۔۔۔ چھوٹے چھوٹے بادل لائے

ان کو دیکھ کے اور بھی برسا ۔۔۔ نور مسرت کا تاروں سے

کوئی چھپا اور کوئی نکلا ۔۔۔ بادل کے انباروں سے

کھیل رہے ہوں جیسے بچے ۔۔۔ آنکھ مچولی گلی گلی!

یا شبنم کے قطرے چمکیں ۔۔۔ اوجھل ہو کر کلی کلی میں

(بادل اور تارے۔ تلوک چند محروم)

تاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے والے یہ بادل بچوں کی شاعری کے مطلع پر اکثر بھی نمودار ہوتے ہیں مثلاً جگن ناتھ آزاد کی نظم کے یہ منہ بولتے اشعار ملاحظہ ہوں۔

زور کی جب گرمی پڑتی ہے ہم بارش لے آتے ہیں

گھر سے ساگر سے اٹھتے ہیں دنیا پر چھا جاتے ہیں

تیز چلا کر اپنے پنکھے گرمی دور بھگاتے ہیں

ساری رات بدلاتے ہیں

ٹھنڈی ٹھنڈی مست ہوائیں دامن میں بھر لاتے ہیں

ہم بادل کہلاتے ہیں

(ہم بادل کہلاتے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد)

اس طرح بادلوں کی زبانی ان کی دلچسپ کہانی بیان کرتے ہوئے بچوں کو باتوں

میں یہ بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ بادل کیسے بنتے ہیں اور ان کی افادیت کیا ہے۔ یہ بھی بادل تاروں کی طرح چاند سے بھی آنکھ مچولی کرتے ہیں۔

چاند تو بچوں کا ان کی شیر خواری کے زمانے سے ہی ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ جیسا کہ لوریوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ مثالوں کے ذریعے واضح کیا جا چکا ہے یہی چل کر چاند کو کبھی بڑے بچوں کی نظموں کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ذیل میں منظومات کی اتنی کثرت ہے کہ انتخاب کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

افسر میرٹھی نے چاند اور بادلوں کی اس کھلواڑ کا نہایت خوبصورت مرقع اپنی نظم میں پیش کیا ہے۔ چھوٹی بحر پر مشتمل اس نظم کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔ یہاں بچہ بادلوں میں ابھرتے ڈوبتے چاند سے مخاطب ہے۔

برکھا میں جاتا ہے کہاں تو	لے کر شال دو شالے چاند
تارے ہیں یہ آس لگائے	منہ پردے سے نکالے چاند
بادل کا اک ہلکا ہلکا!	منہ پر آنچل ڈالے چاند
لے آیا ہے کہاں سے یہ تو	روئی کے اتنے گالے چاند

(بادل اور چاند۔ افسر میرٹھی)

یہی چاند اندرجیت شرما کی نظم کچھ اور ہی بہار دکھا رہا ہے۔ یہاں بھی بچہ ہی چاند کے بارے میں ماں سے بھولے بھالے انداز میں گفت و شنید کر رہا ہے۔

اماں جب نکلے گا چاند	چپکے چپکے آئے گا
میری چھوٹی کھڑکی میں	آکے مجھے جگائے گا
بن بن کر پھر بازی گر	کیا کیا کھیل دکھائے گا
میں جو پکڑنا چاہوں گا	بادل میں چھپ جائے گا

(چاند۔ اندرجیت شرما)

یہ گفتگو نامکمل رہ جائے گی اگر یہاں سورج کا ذکر نہ کیا جائے۔ بزمی بھارتی نے اس کے طلوع اور غروب کی منظر کشی بچوں کے لیے اپنی نظم میں اس طرح کی ہے۔

پورب کا وہ راج دلارا	شام کو پچھم میں سویا تھا
صبح کو پورب سے یوں اٹھا	جیسے ابھر کے آگ کا گولا

کھلا جو تیری اس کے آگی — ساتھ ہزاروں نعمتیں لائی
جتنا اوپر کو وہ ابھرا — پھیلایا اتنا ہی اجالا

(سورج ۔ بزمی بہارتی)

الغرض ان موضوعات پر بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھی گئی ہیں جن میں "آسمان اور تارے" (اسماعیل میرٹھی) "چاند کا بچہ" (رعنا ملائشہ افسر؟) "بادل اور تارے" (تلوک چند محروم) "ماں کا چاند" (محوی صدیقی) "چاند" (نور الحسن ہاشمی) "کرن سے" (مسعود حسین خاں) "چاند" (سلام مچھلی شہری) "بادل" (خلیل الرحمن اعظمی) "سورج" (شفیع الدین نیر) "چاند" (حلیم اختر) وغیرہ اپنی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔

کھیل :-

بچپن میں کھانا پینا اور کھیلنا کودنا ہی نونہالوں کی زندگی کے محور ہوتے ہیں۔ جہاں تک کھیل کود کا تعلق ہے ان کی نوعیت عمر کے مختلف مدارج کے ساتھ تبدیل آشنا ہوتی رہتی ہے۔ گہوارے میں بچہ جھنجھنے اور چوسنی سے دل بہلاتا ہے۔ کھڑے ہونے کی سکت پیدا ہوتے ہی ہاتھ گاڑی، کھیل کھیل میں چلنے کی تربیت بھی دیتی ہے پھر وہ لکڑی کے گھوڑے پر سواری کا شوقین ہے اور رفتہ رفتہ غبارے گولیاں گیند، فٹ بال وغیرہ اس کی دلچسپی کا مرکز بنتے ہیں۔ اسکول میں پہنچ کر اسے ڈرل، قواعد، فٹ بال، والی بال، ہاکی کرکٹ وغیرہ کھیلنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی سیکڑوں قسم کے کھیل ہیں۔ کبڈی کھوکھو، گلی ڈنڈا، پتنگ بازی، جھولا جھولنا، تیراکی، گھوڑ سواری، سائیکل اور نہ جانے کیا کیا۔ اردو شاعری نے نونہالوں کے ساتھ یہ تمام کھیل کھیلے ہیں۔ اور ان کھیلوں میں سیکڑوں چھوٹے اور بڑے ادیب اور شاعر بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔

آئیے ان کھیلوں میں چھوٹے بچوں اور تخلیق کاروں کی شمولیت کے چند مناظر دیکھیں۔ بزرگ شاعر محوی صدیقی "گلی ڈنڈے" میں اپنی دلچسپی کا مظاہرہ اس طرح کرتے ہیں۔

لو آ پہنچے اور بھی لڑکے — لو وہ بند حساب کھیل کا تانتا
کیشو دوڑے اکرم بھپٹے — وہ گوپال نے ڈنڈا ملایا

دُور گری وہ گلّی جاکر لینا لینا جانے نہ دینا
جھیلو بڑھ کر گلّی کو تم کیشو گرے وہ دم سے آہا
(گلّی ڈنڈا کا کھیل۔ مجوی صدیقی)

آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ بچے کھیل میں مذہب وملّت اور اونچ نیچ کی تفریق بھی گوارا نہیں رکھتے۔ نظم میں بھی یہی رواداری موجود ہے اور اس کے ساتھ کھیل کا دلچسپ منظر بھی لائق دید ہے بے نام کھیلوں میں سے ایک نام اس نظم کا ہر کرہے۔

آؤ گھیرا ایک بنالیں اپنے اپنے ہاتھ ملالیں
سینہ تان کھڑے ہوجائیں اوپر کو گردن بھی اٹھائیں
ایڑی سے ایڑی کو ملاکر پیر کے پنجوں کو پھیلا کر
اپنے اپنے ہاتھ اٹھائیں چلتے جائیں چکر کھائیں
(کھیل کا گیت۔ شفیع الدین نیر)

عام طور پر ہندوستان کے قصبات و دیہات میں کھیل کے دوران بچے اکثر مہمل یا نیم مہمل گیت گاتے ہیں مثلاً۔

اکڑ بکڑ بمبے بو ، اسی نوے پورے سو

یا

آلتی کی پالتی جے کنہیالال کی

ظاہر ہے موجودہ ترقی یافتہ دور اور معاشرے میں ان کی جگہ منظم اور باقاعدہ کھیل کے گیتوں کو لینی چاہیے۔ شفیع الدین نیر کی نظم اس ضمن میں ایک کامیاب کوشش ہے۔ حامد حسن قادری چھٹی کے دن کھیلوں میں بسر کرنے کی ترکیب بنا کر بچوں میں خاصے مقبول ہوئے۔

تیز ہوجاتے ہیں بچے کھیل سے جس طرح گاڑی کے پہیے تیل سے
ہے ضروری کھیل پڑھنے کے لیے جیسے پانی پیڑ بڑھنے کے لیے
کھیل سے بڑھتی ہے صحت اسطرح بھاپ سے چلتا ہے انجن جسطرح
کھیل سے رہتے ہیں بچے تندرست ذہن ہوجاتا ہے تیز اور جسم چست
(چھٹی کا دن۔ حامد حسن قادری)

یعنی کھیل تو بچوں کے لیے ضروری ہے لیکن نظم تعلیم کی اہمیت کی بہر حال فراموش نہیں کرتی۔ جدید شاعر شمس نوید کی نظم میں اس کے برعکس جو بس گھنٹے کتابوں کے کیڑے بنے رہتے ہیں ان بچوں کو باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ یہ ان کی صحت کے لیے مضر بن سکتے ہیں۔

یہ دیکھو کھیلوں کی دنیا　　کھیل، ہنسی، چیخیں، جیکارے

تم کو فیل اور پاس کا ڈر ہے　　ہم زندہ کھیلوں کے سہارے

تم تو کتابوں کے کیڑے ہو　　ہم کھیلوں کے راج دلارے

(کھیل اور تعلیم۔ شمس نوید)

لیکن ایسا بھی نہیں کہ بچوں کو محض کھلاڑی بننے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا ہو۔ کھیل کی باتوں میں اکثر شاعروں نے انھیں پر اثر انداز میں کام کی باتیں بھی بتائی ہیں۔ مثلاً مظفر حنفی فٹ بال میں رقمطراز ہیں۔

اور نہ مانو بڑوں کا کہنا　　کچھ ہی میں لیٹے رہنا

ہم نے منع کیا تھا تم نے　　مت کھیلو فٹ بال

کیسا چھل گیا سارا گال

اس میں ہے اپنی ہی بھلائی　　کہنا بڑوں کا مانو بھائی

مرہم لگوالو اور جا کر　　لیٹو اوڑھ کے شال

کیسا چھل گیا سارا گال

(فٹ بال۔ مظفر حنفی)

اس طرح اس نظم میں مناسب مواقع دیکھ کر احتیاط کے ساتھ کھیلنے کی تلقین بھی کی گئی ہے اور بڑوں کا کہنا ماننے کی نصیحت بھی دہرائی گئی ہے۔

پتنگ بازی سے متعلق بھی بڑی خوب صورت نظمیں کہی گئی ہیں اور پتنگ کے داؤ پیچ کے ساتھ ساتھ بچوں کے درمیان اس ضمن میں ہونے والے تنازعات کو بھی ایسی نظموں کا موضوع بنایا گیا ہے۔

ایسی ایک نظم کا خوبصورت اقتباس پیشِ خدمت ہے۔

پیاری پتنگ میری　　من کی امنگ میری

تتلی سی اڑ رہی ہے　　ہر سمت مڑ رہی ہے

جیسے ہوا میں بادل جیسے دھنک کا آنچل
لڑتی ہے آفتوں سے لاکھوں مصیبتوں سے
خود کو سنبھال لے گی رستہ نکال لے گی
(پتنگ۔ انجم جاہ بابر)

اس نظم میں بھی کھیل کی آڑ میں بچوں کو نہایت چابکدستی کے ساتھ مصیبتوں اور پریشانیوں سے ہمت کے ساتھ نبرد آزما ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔

بچوں کے ساتھ بچیوں کی دلچسپی اور ان کے کھیلوں کی اہمیت کو بھی اردو شاعری میں فراموش نہیں کیا گیا۔ اس موضوع پر امیر خسرو کے جھولے سے لے کر عہد جدید تک بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں بلکہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی پوری کتاب "جھولنے" اسی موضوع پر مشتمل ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہاں محض شان الحق حقی کی ایک نظم کا اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

یہی پہلا قدم انسان کا تھا اڑنے کی طرف
یوں تو رکھتا ہے نہ شہپر نہ کوئی کل جھولا
دیکھتے ہی اسے لیتی ہے طبیعت جھونٹے
ایسی سینوں میں مچا دیتا ہے ہلچل جھولا
امی کہتی ہیں کہ آجائیں گے چکر اترو
اس طرح جھولو گے پہروں جو مسلسل جھولا
(جھولا۔ شان الحق حقی)

طوالت کے خیال سے ان موضوعات پر لکھی جانے والی اہم نظموں کا تذکرہ دینا کافی ہے۔ ان میں "گلی ڈنڈے کا کھیل" (محوی صدیقی) "سیلا پیلا رنگ" (شان الحق حقی) "کھیل" (خلیل الرحمن اعظمی)، "پتنگ کا مرثیہ" (مظفر حنفی) "پتنگ" (سیف سہسرامی) "کنکوے" (دوارکا پرشاد راز) "ہماری پتنگ" (نشاط عباسی) شامل ہیں۔

تماشے، چڑیا گھر، سرکس وغیرہ:-

گھر سے باہر کی دلچسپی کا سب سے زیادہ سامان میلے، تماشے، چڑیا گھر، سرکس،

اور سینما وغیرہ فراہم کرتے ہیں جن میں بچے دوسروں کو کرتب کرتے دیکھتے ہیں۔ ناچتے گاتے جانوروں کو نچاتے دیکھ کر بے انتہا محظوظ ہوتے ہیں۔ یہ تمام موضوعات اردو شاعروں کو دلچسپ نظموں کا مواد فراہم کرتے ہیں نیز ان رنگ رنگ مظاہر کو فنی و ادبی چاشنی سے آمیز کر کے شعراء نے بہت پر لطف تخلیقات پیش کیں۔

میلے پر محشر بدایونی کی نظم اردو ادب اطفال میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے جس سے نظم کے حسن کا ہلکا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

رستے میں ایک میلا دیکھا، کھیل تماشے رنگ
کوئی ہرا بیلون لیے تھا، کوئی لال پتنگ
کوئی لیے مٹی کے بنائے سچ مچ کے سے آم

ناٹک گھر کے دروازے پر، روپ بھرے انسان
ناچ انوکھے گیت نرالے، ہر گھنگرو پر تان
ہنسنے والے ہنستے جائیں کام سے ان کو کام

جادو کرتب، سرکس، تھیٹر، ریس، دنگل گیم
کودیں بندر، اچھلیں طبلچی، ناچے بوڑھی میم
ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ، ڈھپ ڈھپ ڈھپ ڈھپ چھم چھم چھم چھم

(میلے کی سیر۔ محشر بدایونی)

چھوٹی سی نظم میں میلے کی تمام گہما گہمی کوزے میں دریا کی طرح سمو دی گئی ہے۔ کہیں بچے، پتنگ، غبارہ، مٹی کے آم لیے مگن ہیں تو کہیں ناٹک میں بہروپیے سوانگ دکھا رہے ہیں۔ کہیں انوکھے گیت اور ناچ دیکھنے والے قہقہے لگا رہے ہیں۔ کہیں بچے جادو کے کرتب، سرکس، تھیٹر، دنگل، کھیل اور ریس دیکھنے میں محو ہیں۔ کہیں بندروں کا تماشہ طبلچیوں کی اچھل کود اور بوڑھی میم کا رقص دکھا رہے ہیں الغرض نظم کیا ہے ایک بھرے پرے میلے کی ناچتی گاتی تصویر ہے۔

سید بابر نے گلی گلی پھیرا لگا کر بائیسکوپ دکھانے والے کی کسمپرسی کتنے دلکش انداز میں منظوم کی ہے۔ مندرجہ ذیل نظم ملاحظہ ہو۔

چھنا چھن چھن چھنا چھن چھن
بجی گھنٹی
ٹنا ٹن ٹن، ٹنا ٹن ٹن

دیکھو بچو نیا تماشا اور نرالا کھیل
قطب صاحب کی لاٹ پہ، چڑھ گئی بے پہیوں کی ریل
چھکا چھک، چل دیا انجن
اونٹ میاں کرسی پر بیٹھے، سوہن حلوا کھائیں
چوہے پیٹیں طبلہ ڈھولک، خالہ بلی گائیں
دھپا دھپ دھپ، دھما دھن دھن
بجی گھنٹی
ٹنا ٹن ٹن، ٹنا ٹن ٹن

(نیا تماشہ۔ سید بابر)

ظاہر ہے بچے ایسی نظم میں بائیسکوپ سے کم دلچسپی نہیں رکھتے۔ جادوگر کے ہاتھ کی مٹھائیاں بھی اردو کے شاعروں کی نگاہ میں ہیں۔ ساحر لدھیانوی کی نظم "للا لو بات" اس گوشے پر بڑے انوکھے زاویے سے روشنی ڈالتی ہے۔

جوں ہی بول دوں ایک دو تین — پھر سے بھیجوں تم کو چین
جو بجاؤں میں اپنی بین کو — چاکلیٹ کر دوں زمیں کو
آؤ بچو اسن لو بات

(للا لو بات۔ ساحر لدھیانوی)

اس دلچسپ تکنیک میں بچوں کو نظم میں جادوگر کے مختلف شعبدے دکھائے گئے۔
جادوگر اور سرکس دکھانے والوں کے تذکرے کو اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ بچوں کا محبوب کردار مداری بھی سامنے نہ لایا جائے۔ چنانچہ مظفر حنفی کی نظم میں 'مداری' کے کارنامے بھی ملاحظہ ہوں۔ یہاں بندر نچایا جا رہا ہے۔

پہن کے نیکر
لاٹھی لے کر

کاندھے پہ رکھ
دِلّی جا کر

اپنے واسطے
ایک چاند سی بیوی لا
تاک دھنا دھن، دھنک دھنا
ناچ میرے بندر ناچ دکھا
(تاک دھنا دھن۔ مظفر حنفی)

مداریوں کے بارے میں کئی اور دلچسپ نظمیں بھی اردو ادبِ اطفال میں دستیاب ہیں جن میں نظیر اکبر آبادی کی نظم "ریچھ کا بچہ" سرِ فہرست ہے۔ ریچھ اور مداری کی کشتی کا ایک پر لطف منظر ان کی نظم کے آئینے میں دیکھیے۔

جب کشتی کی ٹھہری تو وہیں سر کو جو جھاڑا — للکارتے ہی اس نے ہمیں آن لتاڑا
گہہ ہم نے پچھاڑا اسے گہہ اس نے پچھاڑا — اک ڈیڑ سا پہر ہو گیا کشتی کا اکھاڑا
گو ہم بھی نہ ہارے نہ ہٹا ریچھ کا بچہ
(ریچھ کا بچہ۔ نظیر اکبر آبادی)

چڑیا گھروں میں دنیا بھر کے جانور اور پرندے بیک وقت بچوں کو بھانے کے لیے یکجا ہوتے ہیں۔ شاعری کی دنیا میں بھی بچوں کے لیے چڑیا گھر آراستہ کیے گئے ہیں۔ مشہور ترقی پسند شاعر نیاز حیدر کا چڑیا گھر بچے کی نگاہ سے دیکھیے۔

ایک بڑے میدان میں لوہے کے تاروں کا منڈپ تھا
کبھی نہ میں نے اس سے بڑا دنیا میں کوئی پنجرا دیکھا
طوطے، مور، کبوتر، سارس، بلبل، تیتر، لال بٹیر
ہد ہد، باز، بیا کی بانی، غوغائی کا غل اندھیر
آیا میرے پاس اک سارس لمبے پاؤں اٹھاتا
کپاس جیسے اجلے اجلے جوڑے پر پھیلاتا
(سارس ماموں۔ نیاز حیدر)
مندرجہ بالا چند ہی مصرعوں پر شاعر نے طوطے، مور، کبوتر، سارس، لال بٹیر،

بلبل، باز، تیتر، ہدہد وغیرہ سے بچوں کا تعارف کرادیا۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پوری نظم میں چڑیا گھر کس طرح جلوہ گر ہوگا۔

ان موضوعات پر جو دیگر نظمیں لائقِ ذکر ہیں ان میں "بچوں کا میلہ" اور "آئیے میلہ ہمارا دیکھئے" (شفیع الدین نیر) "بانو کا خواب" (فضل الرحمٰن عارف) "چڑیا خانہ" (ناوک حمزہ پوری) "پکنک کا تہوار" (خضر برنی) "پکنک" (م۔ لقا ملک) سرِ فہرست ہیں۔

حمد، نعت، مناجات

اسکولوں میں بچے اپنے تعلیمی دن کا آغاز خدا کی حمد یا مناجات سے کرتے ہیں اور دیگر مضامین کے علاوہ ان کے نصاب میں بھی مناجاتیں اور حمدیں وغیرہ شامل ہوتی ہیں۔ ایسی تخلیقات میں حالی کی نظم "ساری دنیا کے مالک" اردو جاننے والے تقریباً ہر بچے نے پڑھی ہوگی۔ اس کے چند شعر۔

اے ساری دنیا کے مالک راجا اور پرجا کے مالک

سب سے انوکھے سب سے نرالے آنکھ سے اوجھل دل کے اجالے

ہر دل میں ہے تیرا بسیرا تو پاس اور گھر دور ہے تیرا

بے آسوں کی آس تو ہی ہے جاگتے سوتے پاس تو ہی ہے

(ساری دنیا کے مالک۔ حالی)

بچے کی جذبات اور خدا کے تعین اس کی عقیدت کا اظہار انتہائی سادہ زبان اور معصوم انداز میں اس طرح نظم کر دینا کچھ حالی کا ہی حصہ تھا۔ جوش ملسیانی کی جدید نظم "یارب" بھی کچھ کم دلکش اور پرتاثیر نہیں ہے۔ اس کا ایک مختصر سا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

دل میں سرور تیرا آنکھوں میں نور تیرا

ہم دیکھتے ہیں جلوہ نزدیک و دور تیرا

ہر سو ظہور تیرا

گورا ہو یا ہو کالا تو ہی نے سب کو پالا

روزی رساں تو سب کا تو سب کو دینے والا

تیرا کرم نرالا

(یارب۔ جوش ملسیانی)

بچوں کے لیے مناجاتیں بھی اردو کے شعرا نے بکثرت تخلیق کی ہیں۔ جن میں بچوں کی خواہشات اور بزرگوں کے جذبات دونوں کو فنکاری کے ساتھ آمیز کیا گیا ہے۔ اقبال کی مشہور نظم "بچے کی دعا" نسل در نسل بچوں کو یاد کرائی جاتی رہی ہے اور ابتدائی عمر میں اوصاف حمیدہ اختیار کرنے کی جتنی پر تاثیر تلقین اس نظم میں کی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ چند شعر درج ذیل ہیں ۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

مرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس راہ پہ چلانا مجھ کو

(بچے کی دعا۔ اقبال)

اس شاہکار نظم میں بچے کی علم دوستی، غربا پروری، وطن پرستی اور ایسے ہی متعدد نیک اوصاف کی اہمیت سے بھی روشناس کرا دیا گیا ہے اور انھیں حاصل کرنے کے لیے خدا سے التجا کرلی گئی ہے۔ اس نوع کی نظموں میں افسر میرٹھی کی نظم کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس میں انھوں نے بچے کی طرف سے خواہش ظاہر کی ہے۔

درد جس دل میں ہو اس دل کی دعا بن جاؤں
کوئی بیمار اگر ہو تو شفا بن جاؤں
دکھ میں جلتے ہوئے لب کی میں دعا بن جاؤں
اف وہ آنکھیں کہ ہیں بینائی سے محروم کہیں
روشنی جن میں نہیں نور جن آنکھوں میں نہیں
میں ان آنکھوں کے لیے نور ضیا بن جاؤں
خضر کا کام کروں راہ نما بن جاؤں

(افسر میرٹھی)

اختر شیرانی نے بچوں کے لیے بھی خاص طور پر ایک دعا منظوم کی ہے جو خصوصیات اور ادبی محاسن کے باعث منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ بطور مثال کچھ اشعار پیش خدمت ہیں۔

یارب یہی دعا ہے تجھ سے سدا ہماری | ہمت بڑھا ہماری، قسمت بنا ہماری
تعلیم میں کچھ ایسی ہم سب کریں ترقی | غیروں کی انتہا بھی، ہو ابتدا ہماری
نفرت برائی سے ہو، الفت بھلائی سے ہو | رغبت صفائی سے ہو، سن لے دعا ہماری

(مدرسہ کی لڑکیوں کی دعا۔ اختر شیرانی)

نعتیں بھی شعر و ادب اطفال میں کافی مل جاتی ہیں۔ غلام مصطفےٰ تبسم نے ایسی ہی دلکش نعت میں پیغمبر اسلام سے بچوں کے عقیدت مندانہ احساس کی ترجمانی اس طرح کی ہے۔

دل آرا محمد، ہمارا محمد
ہے ہم سب کی آنکھوں کا تارا محمد
ہمارا محمد، تمہارا محمد
جہاں میں ہر اک کا سہارا محمد
فقط ہم کو ہی سب سے پیارا نہیں ہے
خدا کو بھی ہے سب سے پیارا محمد
اِدھر آؤ بچو! کہیں مل کے سارے
ہمارا محمد ہمارا محمد

("نعت"۔ صوفی تبسم)

محوی صدیقی نے محض کوری عقیدت کا اظہار کرنے کی جگہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت نگاری پہ زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ بچوں کے لیے اپنی نعت میں لکھتے ہیں۔

انھیں نے بتائی ہمیں راہ سیدھی | انھیں کی بدولت بنے کام سارے
بُرے راستے سے بچاتے ہیں سب کو | وہی رہنما ہیں ہمارے تمھارے

درود و سلام اس رسولِ خدا پر
خدا کو جو تھے سارے نبیوں میں پیارے

("ہمارے نبی"۔ محوی صدیقی)

مندرجہ بالا نظموں سے بالکل جداگانہ انداز میں لکھی گئی حفیظ جالندھری کی نظم اس اعتبار سے منفرد ہے کہ یہاں بچے آپس میں خدا سے متعلق گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نظم کے یہ بند ملاحظہ ہوں۔

بہن چاہے کتنا ہی چھپ چھپ کے بیٹھیں کسی بات کو چاہے دل میں چھپائیں
مگر پھر بھی سب کچھ خدا جانتا ہے

اگر اوڑھ لیں کوئی موٹی سی چادر رہیں گود میں اپنی امی کے چھپ کر
مگر پھر بھی سب کچھ خدا جانتا ہے

کوئی وقت ہو، شام ہو یا سحر ہو ہو دن کا اجالا کہ شب کا اندھیرا
مگر پھر بھی سب کچھ خدا جانتا ہے

(سب کچھ خدا جانتا ہے: حفیظ جالندھری)

بچوں کے لیے لکھی جانے والی اچھی حمدوں اور نعتوں میں "خدا کا جلوہ" (نظیر اکبر آبادی) (حمد" (ریاض خیرآبادی) "خدا کی قدرت" اور "خدا میرے ساتھ ہے" (اسماعیل میرٹھی) "صبح کی دعا" (حامداللہ افسر) "بچے کی دعا" "خدا کی مہربانی" اور "ہمارے نبی کے کلام" (محوی صدیقی) "خدا کی نعمتیں" اور "خدا سے دعا" (شفیع الدین نیر) "حمد" (صوفی تبسم) "حمد خدا" (روش صدیقی) "میری دعا" (خلیل الرحمٰن اعظمی) "قل ھواللہ" اور "قدرت کے تماشے" (شان الحق حقی) "پانچ سال کے بچے کی دعا" (کیفا امروہوی) "خدا کی دین" (شوکت پردیسی) "دعا" (خضر برنی) "اے خدا" (محبوب راہی) "حمد" (راجا رشید) "دعا" (مقصود فاروقی) اور "نعت" (ظفر انجم) وغیرہ کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔

والدین، استاد اور بزرگ:۔

گھر میں بچہ آنکھ کھولتے ہی ان کو دیکھتا ہے جو دن رات اس کی نگہداشت میں اپنا سکھ چین حرام کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے اسے ایسی ہستی سے گہری محبت ہو گی۔ ماں کے ساتھ ہی گھر کے دیگر افراد، نانا، نانی، باپ، بہن، بھائی وغیرہ اسے لاڈ پیار کرتے ہیں ان سے بھی بچہ بہت مانوس اور قریب ہو جاتا ہے۔ کچھ بڑا ہونے پر اسکول پہنچتا ہے تو اسے اپنے استاد کی شفقت، نصیحت ملتی ہے۔ یہاں بچہ محبت کے ساتھ ساتھ احترام اور عقیدت کے جذبات سے آشنا ہوتا ہے۔ ایسی محبت کرنے والی ہستیوں کے بارے میں اس کے جذبات، احساسات کی ترجمانی کرنے والی نظمیں بھی لازمی تھیں۔

اردو ادب اطفال سے متعلق بھی شاعروں نے اس پہلو پر پوری توجہ صرف کی جس کا

ایک روشن ثبوت یہ ہے کہ دکنی دور میں شاہ حسین ذوقی کی مثنوی "ماں باپ نامہ" وجود میں آچکی تھی۔ ذوقی تا حال ایسی لاتعداد نظمیں خاندانی بزرگوں اور استادوں کے بارے میں لکھی گئیں۔ ان میں سے نمایاں نمایاں تخلیقات کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

"ماں کا پیار" اس سلسلے کی ایک خوب صورت تخلیق ہے جس میں حامد اللہ افسر نے بھولے بھالے بچوں کے جذبات کی نہایت واضح عکاسی کی ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

اماں مجھ کو پیار کریں پیاروں کی بھرمار کریں
جب اسکول سے آؤں میں تب بھی مجھ کو پیار کریں
جلدی جلدی نہاؤں میں تب بھی مجھ کو پیار کریں
اور پھر کھیلنے جاؤں میں تب بھی مجھ کو پیار کریں
پیاروں کی بھرمار کریں امی مجھ کو پیار کریں

(اماں کا پیار۔ حامد اللہ افسر)

محوی صدیقی بچے کو ماں کے ساتھ ساتھ باپ کی شفقت بھی یاد دلاتے ہیں۔ اور ان دونوں کے تئیں بچوں میں اطاعت اور فرمانبرداری کا جذبہ پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں لکھتے ہیں ؎

ماں باپ ہی نے ہم کو کیسی خوشی سے پالا
دن اور رات ہم کو ہر طرح سے سنبھالا
پائی جو ان سے قوت
ملتی ہے کب جہاں میں

علم و ہنر سلیقہ سب کچھ ہمیں سکھایا
اک ایک زندگی کا گر پیار سے بتایا
اس طرح کی عنایت
ملتی ہے کب جہاں میں

(ماں باپ کے احسان۔ محوی صدیقی)

خواجہ الطاف حسین حالی نے بچوں کو اس حیثیت سے آشنا کرنے کی سعی فرمائی کہ استاد کا درجہ والدین سے کسی طرح فروتر نہیں ہے۔ ان لوگوں کی تلخ و ترش باتوں میں جو پند و نصائح پوشیدہ ہوتے ہیں دراصل وہ بھی ان کی رحمت کا ایک رخ ہے۔ چنانچہ اپنی نظم میں رقمطراز ہیں۔

ماں باپ اور استاد سب ہیں خدا کی رحمت
ہے روک ٹوک ان کی حق میں تمھارے نعمت
کڑوی نصیحتوں میں ان کی بھرا ہے امرت
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو

دنیا میں کی جنھوں نے ماں باپ کی اطاعت
دنیا میں پائی عزت عقبیٰ میں پائی راحت
ماں باپ کی اطاعت دونوں جہاں کی دولت
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو

(کہنا بڑوں کا مانو۔ حالی)

ماں تو پیار ہی میں صحیح کبھی کبھار بچے کی ضد سے عاجز ہو کر اسے جھڑک بھی دیتی ہے لیکن اگر گھر میں اس کی دادی یا نانی موجود ہے تو وہ فوراً بچے کی حمایت پر کمر بستہ ہو جاتی ہے۔ کہانیاں بھی بچوں کو ماں سے زیادہ نانیاں اور دادیاں سناتی ہیں۔ ان عمر رسیدہ بچوں سے بچہ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو جاتا ہے اور ان کے ساتھ شوخیاں بھی کرتا ہے ستار عباسی کی نظم میں اس پہلو کی عکاسی دیکھیے۔

دادی اماں آخرش ہے بات کیا — کیوں ہلا کرتا ہے یہ سر آپ کا
کیسے یہ تکلیف ہم دیکھا کریں — کچھ تو کہیے آخرش ہم کیا کریں
ہو اجازت تو یہ ڈیڈی سے کہیں — کچھ مداوا، دادی اماں کا کریں

(دادی اماں۔ ستار عباسی)

بڑی بہن کی حیثیت بھی بچوں کے لیے رحمت کا درجہ رکھتی ہے ہر گھڑی ان کا لحاظ رکھنا اور ضرورت پر ان کی مدد کے لیے آمادہ رہنا بڑی بہنوں کی فطرت میں داخل ہے۔ اردو شاعری ایسی شفیق اور غمگسار ہستی کو کیسے فراموش کر سکتی تھی۔ اس ضمن میں

لطفی رضوانی کی نظم کے چند اشعار پیش خدمت ہیں سہ

کتنی اچھی کتنی پیاری ہے آپا جان ہماری
ہم روئیں تو ہمیں ہنسائیں ہم کھیلیں تو ہمیں ستائے
یاد ہیں لاکھوں کرتب اسکے ہم کرتے ہیں پیار سب اسکو
ہم سب بھی ہیں اسکو پیارے دل کی راحت آنکھ کے تارے
کتنی اچھی کتنی پیاری یہ ہے آپا جان ہماری
ہائے مگر یہ جس دم بگڑے
کان ہمارے سچ مچ پکڑے

(آپا جان۔ لطفی رضوانی)

لیکن خواہ آپا جان کان پکڑے یا کھیل میں ستائے بہر حال اس سے ناز نخرہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ ان کی فطرت ہے کہ خاص طور پر جب اسکول سے گھر آتے ہیں تو بہنوں سے الٹی سیدھی فرمائشیں، ایسے پیارے انداز میں کرتے ہیں کہ انھیں پورا کرتے ہی بن پڑتی ہے۔ مظفر حنفی کی نظم میں بڑی بہن سے چھوٹے بچوں کی پُر لطف فرمائش کا یہ منظر قابل دید ہے۔

چھ گھنٹے اسکول میں پڑھ کر آتے ہیں رکشا پر چڑھ کے
اب زوروں کی بھوک لگی ہے آتے ہیں چکرّ پر چکر
آپا لے آؤ گھی شکر
آپا لے آؤ گھی شکر

(گھی شکر۔ مظفر حنفی)

استاد کی عقیدت اور احترام اپنی جگہ لیکن آپا کی مانند بچے علاحدگی میں ہی صحیح، ان کے بارے میں خاص شوخ و شنگ باتیں کرتے ہیں اور سوچتے رہتے ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں نے اس گوشے پر اپنی ایک رباعی میں روشنی ڈالی ہے۔

او لاکھوں کا امتحان لینے والے بچوں کے دلوں کی ناؤ کھینے والے
انڈے کے بجائے مجھ کو نمبر دینا نمبروں کی بجائے انڈے دینے والے

(رباعیات عمر قیام۔ راجہ مہدی علی خاں)

اس ذیل کی ممتاز نظموں میں "ماں باپ کی محبت" (محوی صدیقی)، "ہماری نانی" (غلام مصطفےٰ

تبسم) "میری امی" (مقبول احمد سیوہاروی) "میری امی" (رشیدہ فرحت) "ماں باپ کی محبت" (محوی صدیقی) "ہمارے استاد" (محبوب راہی) "ہماری نانی جان" (ربیع الزماں شاد) "ماں باپ" (کیف احمد صدیقی) "اماں" (کیف احمد صدیقی) بھی شامل ہیں۔

اخلاقیات اور پند و نصیحت:۔

کمسنی میں گھر ہو یا باہر بچے کو موقعہ بموقعہ اخلاق درس اور پند و نصیحت کے گھونٹ قدم قدم پر پینے پڑتے ہیں۔ بلا مبالغہ ایسی ہزاروں نظمیں بچوں کے لیے لکھی گئیں جن میں انھیں کارآمد باتیں اور نصیحتیں کی گئی ہیں۔ مثلاً حالی کی ایک نظم کا عنوان ہی نصیحت ہے جس میں موصوف نے بچوں کو بڑی کام کی باتیں بتائی ہیں۔

کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت ۔۔۔ جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ
فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو ۔۔۔ اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ
جہاں، رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے ۔۔۔ نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ
مصیبت کا ایک اک سے احوال کہنا ۔۔۔ مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

(نصیحت ۔ الطاف حسین حالی)

ان تمام باتوں کی تلقین کرتے ہوئے بچوں کو یہ بتلانے کی بھی ضرورت تھی کہ وقت انمول ہے اسے فضول باتوں میں ضائع نہیں کرنا چاہیے ۔ یہ فریضہ شہریار پروانہ نے انجام دیا ہے جس کی یہ بندش پیش خدمت ہے۔

وقت بڑا انمول ہے بچو
پل پل اس کا ہیرا سمجھو
وقت کی عزت کرنا سیکھو
اس دنیا میں جینا سیکھو
پل پل کے یہ ہیرے موتی پلکوں سے تو رول
وقت بڑا انمول ہے بچو، وقت بڑا انمول

(وقت بڑا انمول ۔ شہریار پروانہ)

لیکن مقصدیت اور افادیت ہی کسی اچھے فن پارے کو جنم نہیں دے سکتی تاوقتیکہ یہ

درس و پند ادبی چاشنی میں پلیٹ کر نہ پیش کیے جائیں۔ براہ راست نصیحت بچے کو اس حد تک ہرگز متاثر نہیں کرسکتی جتنی بالواسطہ طور پر فنی خوبیوں سے آراستہ تقلیں اور تمثیلی پیرایہ میں بیان کی جانے والی منظوم کہانیاں اسے متاثر کرسکتی ہیں ایسی تخلیقات کی بھی اردو ادب اطفال میں بہتات ہے۔ جن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اخلاقیات کا درس دینے والی اسماعیل میرٹھی کی ایک پرتاثیر نظم کا بند ملاحظہ فرمائیں ؎

جو تم شیر دل ہو تو مارو شکار　　کہ خالی نہ جائے مردوں کا وار

مشقت میں باقی نہ رکھنا ادھار　　جو ہمت کروگے تو بیڑا ہے پار

کیے جاؤ کوشش میرے دوستو

(کوشش کیے جاؤ۔ اسماعیل میرٹھی)

اس طرح اوائل عمر سے بچے کو محنت اور مشقت کی طرف مائل کرنے کی جو کامیاب سعی نظم میں کی گئی ہے اس کی افادیت اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

سیماب اکبرآبادی اپنی نظم میں بچے کی زبان ہی سے اس کے عزائم کی بلندی کا اور خدمت ملک و قوم کی باتیں کہلوا کر اس میں صالح اقدار کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں موصوف کی نظم کا ایک بند درج ذیل ہے۔

میں ملک کی خدمت صبح و شام کرونگا　　کاہل نہ بنوں گا، نہ میں آرام کرونگا

جس کام میں بہبود ہو وہ کام کرونگا　　ہر کام غرض قابلِ انعام کرونگا

میں ملک میں پڑھ لکھ کے بہت نام کرونگا

(میں ملک میں پڑھ لکھ کے بہت نام کرونگا۔ سیماب اکبرآبادی)

ملک کی خدمت کا یہی جذبہ شاد عارفی کی نظم "پیارے بچو!" میں کروٹیں لیتا ہے۔ اور اسی جذبہ کے تحت وہ بچوں کو علم کی شمع ہاتھ میں لیے کر جہد پیہم کے ساتھ آگے بڑھنے کی تلقین فرماتے ہیں ؎

وطن گلشن ہے رنگین پھول تم ہو

سفینہ ہے وطن مستول تم ہو!

امین خدمتِ مقبول تم ہو!

تمہیں سے رونقِ قوم و وطن ہے

کماؤ علم کی دولت کماؤ
دکھاؤ جرأتیں، ہمت جگاؤ
بڑھو آگے عمل سے لو لگاؤ

ارادوں میں تمھارے بانکپن ہے

(پیارے بچو۔ شاد عارفی)

حصولِ علم اور بہادری کی تلقین کرتے ہوئے سورج نرائن مہر نے ایک نظم نہایت دلچسپ پیرایہ میں قلمبند کی ہے۔ جس کا ایک بند پیش کیا جاتا ہے ؎

سبق یاد کرنا نہ سمجھو مصیبت مصیبت کہاں یہ تو ہے عین راحت
نہیں علم سے بڑھ کے دنیا میں ثروت کرو خوب محنت کرو خوب محنت

ارے پیارے لڑکو بہادر بنو تم

(بہادر بنو۔ سورج نرائن مہر)

ان نظموں کے علاوہ بھی بہت سی قابلِ ذکر نظمیں ان موضوعات پر رسائل اور کتب میں بکھری ہوئی ہیں جن میں "مٹی کا دیا" اور "دکھ سکھ" (حالی)، "بارش کا پہلا قطرہ" (اسماعیل میرٹھی)، "سونے والے جاگو" (حفیظ جالندھری)، "وقت کی پابندی" (جگن ناتھ آزاد) "چھوٹے بڑے" (نجم آفندی)، "اچھا لڑکا" "اور تن صاف اور من صاف رہے" (شفیع الدین نیر) "پیارے بچو" (مہدی پرتاب گڑھی)، "لو اچھی باتیں" (ناوک حمزہ پوری)، "پیارے بچو" (نذیر بنارسی)، "نیک ارادے" (محبوب راہی)، "بزدل" (نشاد عباسی)، "وقت کی قدر" (خضر برنی)، "اچھا لڑکا" (ابر نوری) کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔

وطنی اور قومی ترانے

بچے قوم کے معمار ہوتے ہیں اور انھیں اچھا شہری نیز محبِ وطن بنانے کے لیے ضروری ہے کہ بالکل اوائلِ عمر سے ہی ان میں وطن کی محبت اور قوموں کی ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا جائے۔ حب الوطنی کے جذبات کو پروان چڑھانے میں قومی ترانے بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں اور تقریباً ہر زبان اور ہر ملک کے لکھنے والوں نے اس پہلو پر پوری توجہ صرف کی ہے۔ اردو میں بھی بچوں کے لیے نہایت جوشیلے اور ولولہ انگیز قومی ترانے تخلیق کیے

گئے۔ ان ترانوں میں بہت چھوٹے بچوں سے لے کر چودہ سال کے طلبا تک کی ذہنی استعداد کے مطابق تخلیقات شامل ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے لکھے جانے والے قومی ترانوں میں سرفہرست برج نرائن چکبست کا "ہمارا وطن" ہے۔ اس کا ایک رواں دواں اقتباس ملاحظہ ہو ۔

یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن　　محبت کی آنکھوں کا تارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن
اسی سے ہے اس زندگی کی بہار　　وطن کی محبت ہو یا ماں کا پیار
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

(ہمارا وطن۔ چکبست لکھنوی)

علامہ اقبال کا شہرہ آفاق "ترانہ ہندی" کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ ایک بچہ خواہ وہ ہندوستان کے کسی علاقے اور کسی فرقے سے بھی تعلق رکھتا ہو اس ترانے سے بخوبی واقف ہے حتیٰ کہ وہ بچے بھی جنھیں اردو نہیں آتی یہ ترانہ گاتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ ظلموں سے لے کر فوج تک ہر جگہ اس ترانہ کی گونج سنائی دیتی ہے۔ تبرکاً "ترانہ ہندی" کے چند شعر درج ذیل ہیں ۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا ، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں جس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں، ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

(ترانہ ہندی ۔ اقبال)

افسر میرٹھی کا نغمہ بھی چھوٹے چھوٹے بچوں کی نفسیات اور مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ جس میں سہل اور سبک الفاظ کی ترنم ریزی اپنی مثال آپ ہے، فرماتے ہیں ۔

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے
ہر رت ہر موسم اُس کا کیسا پیارا پیارا ہے
کیسا سہانا، کیسا سندر، پیارا دیش ہمارا ہے!
دکھ میں، سکھ میں، ہر حالت میں بھارت دل کا سہارا ہے
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے پیارا ہے

(وطن کا راگ۔ افسر میرٹھی)

سیماب اکبر آبادی نے بھی چھوٹے بچوں کے لیے بہت آسان اور رواں دواں انداز میں ایک نظم "میرا پیارا وطن" لکھی ہے۔ دو بند بطور نمونہ پیش خدمت ہیں ؎

میری عزت ہے یہ   میری دولت ہے یہ
میری عظمت ہے یہ   میری جنت ہے یہ
میرا پیارا وطن
اس کے چشمے جواں   اس میں نہریں رواں
جنگل اور وادیاں   اس سے اچھی کہاں
میرا پیارا وطن

(میرا پیارا وطن۔ سیماب اکبر آبادی)

جوش ملیح آبادی بھی اس میدان میں اپنے مخصوص طمطراق کے ساتھ موجود ہیں۔ انھوں نے نظم میں مترنم الفاظ اور بے ساختہ انداز بیان کا مظاہرہ نہایت چابکدستی کے ساتھ کیا ہے لکھتے ہیں۔

در در نے چھیڑی شہنائی
جنگل جنگل کوئل گائی
پربت پربت لالی چھائی
بکھرا، پھیلا نور کا دھارا
جاگا ہندوستان ہمارا
سب سے سندر سب سے پیارا

اوڑھی جیون نے ہریالی
خوشبو جھولی ڈالی ڈالی
چمکا جھومر دمکا تارا
جاگا ہندوستان ہمارا
سب سے سندر سب سے پیارا

(جاگا ہندوستان ہمارا۔ جوش ملیح آبادی)

اس موضوع پر طبع آزمائی کرنے والوں میں متقدمین، متوسطین اور عہد حاضر کے سب ہی نامور فنکار شامل ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے علمبردار علی سردار جعفری کی وطنی نظم کا اقتباس میرے اس خیال کی تائید کرے گا۔

یہ ہندوستاں رشکِ خلد بریں
اگلتی ہے سونا وطن کی زمیں
کہیں کوئلے اور لوہے کی کان
کہیں سرخ پتھر کی اونچی چٹان
ہماری گھٹائیں گہر بار ہیں
ہمارے بیاباں بھی گلزار ہیں
یہ گنگا کا آنچل، یہ جمنا کی ریت
یہ دھان اور گیہوں کے سادہ سے کھیت

(ہمارا وطن۔ علی سردار جعفری)

ہر پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ سردار نے ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ مظاہر کو نظم میں پرونے کی کامیاب سعی کی ہے اور ساتھ ہی ترقی پسندانہ انداز کو بھی برقرار رکھا ہے عہد حاضر کے جدید شعرا بھی قومی نظمیں لکھنے والے اس قافلے کے دوش بدوش ہیں۔ اور نئے انداز کی بہت سی نظمیں لکھی جا رہی ہیں ایسی ہی تخلیقات میں شامل مظفر حنفی کی نظم کا اقتباس دیکھیے:

حقیقتاً بہشت سے کئی گنا حسیں ہے
جواب اس کا روس ہے نہ مصر ہے نہ چین ہے

یہی ہمارا دھرم ہے، یہی ہمارا دین ہے
کہ دو جہاں میں، سرزمین ہند بہترین ہے

قدم قدم پہ اس کے بے شمار پاسباں ہیں
امیر ہیں، غریب ہیں، جواں ہیں کساں ہیں
ہزار ان میں فرق ہے مگر انہیں یقیں ہے

کہ دو جہاں میں سرزمین ہند بہترین ہے
(سرزمین ہند ۔ مظفر حنفی)

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ قومی اور وطنی نظموں کی فہرست خاصی طویل ہے ان میں ’’حب وطن‘‘ اور ’’یاد وطن‘‘ (حالی) ’’وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک‘‘ (چکبست لکھنوی) ’’قومی گیت‘‘ (آرزو لکھنوی) ’’ہمارا چمن‘‘ (حامد اللہ افسر) ’’قومی ترانہ‘‘ (جمیل الرحمٰن عظمی) ’’جھنڈا اونچا رہے ہمارا‘‘ (شفیع الدین نیر) ’’اے کشور ہندوستاں‘‘ (جگن ناتھ آزاد) ’’بچوں کا گیت‘‘ (منظر کاکوروی) ’’میرا بھارت‘‘ (محبوب راہی) ’’وطن‘‘ (رضوان بریلوی) غمگسار قوم‘‘ (گلزار دہلوی) ’’ننھی گڑیا‘‘ (زبیدہ شاہد) بہر صورت ہر اچھے انتخاب میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔

اولوالعزمی اور شجاعت:۔

قومی ترانوں کے ساتھ ہی جوشیلے جذبات کو انگیخت کرنے والے جوشیلے نغموں اور نظموں کی بھی اہمیت کم نہیں ہے۔ کیونکہ حب الوطنی کے جذبے کو مستحکم کرنے کے لیے اولوالعزمی اور عالی ہمتی جیسے اوصاف اشد ضروری ہیں۔ اس موضوع پر محمد حسین آزاد کی نظم ’’ہمت مرداں‘‘ سب سے پہلے جگہ پانے کی تلقین فرماتی ہے ؂

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو
باغ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں، کہ بیاباں چلے چلو
ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے میری جاں چلے چلو
(ہمت مرداں ۔ محمد حسین آزاد)

اسماعیل میرٹھی عالی ہمتی کے ساتھ بچوں کو مستقل مزاجی اور عمل پیہم کا سبق دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

جو تم تیر دل ہو تو مار و شکار | کہ خالی نہ جائے گا مردوں کا وار
مشقت میں باقی نہ رکھنا ادھار | جو ہمت کروگے تو بیڑا ہے پار

کیے جاؤ کوشش میرے دوستو

(کیے جاؤ کوشش۔ اسماعیل میرٹھی)

ساغر نظامی کا انداز ہی کچھ اور ہے جنگی ترانے کے پر آہنگ انداز میں فرماتے ہیں ؎

سپاہیوں کے درمیاں بڑھے چلو بڑھے چلو
سپوت ہو جو ملک کے تو بے گماں بڑھے چلو

امید کی کرن ہو تم
ہرے بھرے چمن ہو تم
مہک اٹھے ہیں جس سے بن
چمن کے وہ سمن ہو تم
نئی بہار کے ہو تم مزاج داں بڑھے چلو
سپوت جو ہو ملک کے تو بے گماں بڑھے چلو

(بڑھے چلو۔ ساغر نظامی)

ترقی پسند شاعر علی جواد زیدی کا انداز بھی کچھ کم جوشیلا نہیں ہے۔ ساغر نظامی کی طرح وہ بھی جنگ آزادی میں شریک رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بچے اپنے وطن کی آزادی کو برقرار رکھنے میں ہمیشہ سربکف رہیں۔ ان کی نظم کا یہ بند میرے اس خیال کی تصدیق کے لیے درج کیا جاتا ہے ؎

گولی کی زد پہ جم گئے سینوں کو تان کر
توپوں کے منہ پہ ڈٹ گئے انجام جان کے
کیا ویر تھے سپوت یہ ہندوستان کے
کیسے یہ مست لوگ ہیں کیا نوجوان تھے

(آزادی کے سپاہی۔ علی جواد زیدی)

موجودہ دور کے شعراء نے بھی اس نوع کی نظمیں بکثرت کہی ہیں۔ ان کی نمائندگی بزمی بھارتی کی نظم کا مندرجہ ذیل اقتباس کرے گا۔

کلی کی جاں اسی میں ہے　　　گلوں کی جاں اسی میں ہے
روش روش سجائیں ہم　　　ہماری جاں اسی میں ہے
قدم ملا کے ساتھیو
بڑھے چلو بڑھے چلو

(سپاہی۔ بزمی بھارتی)

اس نوع کی جوشیلی نظموں اور جنگی ترانوں میں "بچوں کا ترانہ" (شفیع الدین نیر) "ننھے سپاہی" (حرمت الاکرام) "چلے چلو" (امیر مینائی) "ہمارا جھنڈا" (مسعود حیات) "بچوں کا ترانہ" (خضر برنی) "ننھے ویر" (محبوب راہی) "ہندوستانی بچوں کا ترانہ" (سیدہ فرحت) وغیرہ بھی نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔

قومی رہنما:۔

قومی رہنماؤں کو متعارف کرانا بھی ادب کا فریضہ ہے۔ بال کرشن گوکھلے گنگادھر تلک محمد علی جوہر، سبھاش چندر بوس، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ وغیرہ جیسے عظیم رہنماؤں کی شان میں لاتعداد نظمیں اردو ادب اطفال کے شعری ذخیرہ میں اضافہ کرتی ہیں۔ ایسی چند نظموں کا تذکرہ گفتگو کو مکمل کرنے کے لیے لازمی ہے۔ عمر انصاری کی گاندھی جی سے متعلق نظم کا ایک بند بطور مثال ملاحظہ ہو۔

ہے بادل اس کی اہنسا کا، برسا ہے جو ساری دنیا پر
ایک ہاتھ میں اس کے قرآں تھا، ایک ہاتھ تھا اس کا گیتا پر
کچھ رام و رحیم کے ناموں میں، تھا فرق نہ اس کی مالا پر
سب دن تھے عید ملن کے، وہ سب راتیں تھی دیوالی کی
ہر بات ہے اب تک یاد ہمیں، اس باغ کے بوڑھے مالی کی

(بوڑھا مالی۔ عمر انصاری)

مولانا ابوالکلام آزاد کی حیثیت بھی ہندوستان کے مجاہدین آزادی میں سپہ سالار جیسی

تھی۔ محبوب راہی بچوں کی جانب سے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

تھے سیاست میں اور قیادت میں سب سے بہتر ابوالکلام آزاد

علم گر، علم دوست، علم نواز علم پرور ابوالکلام آزاد

تھے شریکِ جہادِ آزادی زندگی بھر ابوالکلام آزاد

رہبرانِ وطن میں تھے بے شک سب کے رہبر ابوالکلام آزاد

(مولانا ابوالکلام آزاد۔ محبوب راہی)

پنڈت نہرو کو بچے پیار سے چاچا کہتے تھے۔ بچوں کے ساتھ ان کی انسیت اور محبت کے ہزاروں افسانے زبان زد ہیں۔ کیف احمد صدیقی نے ان کے اوصاف کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ایک فرشتہ صفت انسان تھے چاچا نہرو

عظمتِ ہند کی پہچان تھے چاچا نہرو

سارے بچوں کے دلوں میں جو بسا کرتے تھے

ساری دنیا کی نگاہوں میں بسا کرتے تھے

وہ مچلتے ہوئے ارمان تھے چاچا نہرو

عظمت ہند کی پہچان تھے چاچا نہرو

(چاچا نہرو۔ کیف احمد صدیقی)

ماضی قریب میں اندرا گاندھی ہندوستان کی محبوب رہنما رہی ہیں۔ ان کی وفات پر بلا مبالغہ ہزاروں نظمیں کہی گئیں اور اس سلسلے میں یہ نعرہ بے حد مشہور ہوا "جب تک سورج چاند رہے گا۔ اندرا تیرا نام رہے گا" مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کسی اور جگہ سے اقتباس لینے کے بجائے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہائر سکنڈری اسکول کے ایک طالب علم کی نظم سے مثال پیش کی جائے جو اسی ادارے کے رسالے "امنگ" کے اندرا گاندھی نمبر میں شامل ہے۔ نظم مذکورہ بالا نعرے کے پس منظر میں زیادہ پرتاثیر معلوم ہوتی ہے۔

شمعِ وطن تھیں اندرا گاندھی

روحِ چمن تھیں اندرا گاندھی

ایک رتن تھیں اندرا گاندھی

بے شک ان کی قربانی ہے ، بحالت خوش انجام ، ہے گا
اندرا جی کا نام رہے گا

(اندرا جی کا نام رہے گا۔ فضیل مظفر)

قومی رہنماؤں کے بارے میں لکھی جانے والی تخلیقات میں "اندرا گاندھی" (ر بزمی بھارتی) "بچوں کے چاچا" (سطوت رسول) "سچائی کا پجاری" اور "بال گنگا دھر تلک" (محبوب بدایونی) "ایک حق پرست" (مسعود حیات) کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے۔

مساوات، مذہبی رواداری:۔

ہم ایک جمہوری ملک کے باشندے ہیں جس میں مختلف علاقوں کی مختلف تہذیبیں ہیں اور الگ الگ زبانیں بولنے والے لوگ رہتے ہیں۔ ان کے مذہبی عقائد بھی مختلف ہیں اور سیاسی نظریات میں بھی خاصے اختلافات پائے جاتے ہیں باایں ہمہ ہم سب ہندوستانی ہیں اور ملک کی سالمیت و آزادی کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ مذہبی، لسانی، اور تہذیبی اختلافات کے درمیان کوئی ایسا مضبوط رشتہ قائم کیا جائے کہ سب لوگ اپنے اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے۔ آپس میں متحد اور متفق ہوں۔ یہ مقصد عوام میں مساوات اور مذہبی رواداری کا مادہ پیدا کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آج کے بچے کل کے مستقبل کے معمار ہوں گے۔ اس لیے تازہ دم نسل کو بھی مساوات اور رواداری کا سبق اچھی طرح ذہن نشین کرا دینا ضروری ہے۔ اس میدان میں بھی بچوں کے شعرا نے اپنی ذمہ داری پوری طرح نبھائی ہے۔
افسر میرٹھی فرماتے ہیں ؎

مذہب کچھ ہو، ہندی ہم ہیں، سارے بھائی بھائی ہیں
ہندو ہیں، یا مسلم ہیں، یا سکھ ہیں یا عیسائی ہیں
پریم نے سب کو ایک کیا ہے، پریم کے ہم شیدائی ہیں
بھارت نام کے عاشق ہیں، بھارت کے سودائی ہیں
بھارت پیارا دیش ہمارا، سب دیشوں سے نیارا ہے

(وطن کا راگ، افسر میرٹھی)

مذہبی رواداری کی تلقین کیسے پر تاثیر انداز میں کی گئی ہے۔ نظم کو پڑھنے والا ہر فرد

محسوس کرسکتا ہے۔ تلوک چند محروم نے بھی تلقین اپنے انداز میں بچوں کو کرنی چاہی ہے۔ ان کی نظم کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

ہندو مسلماں، ہیں بھائی بھائی
تفریق کیسی، کیسی لڑائی
ہندو ہو کوئی یا ہو مسلماں
عزت کے قابل ہے بس وہ انساں
نیکی ہو جس کا کار نمایاں
اوروں کی مشکل ہو جس سے آساں
ہر اک سے نیکی سب سے بھلائی
ہندو مسلماں ہیں بھائی بھائی

(ہندو مسلماں۔ تلوک چند محروم)

جدید شاعر شاذ تمکنت بھی اس معاملے میں اپنے پیش رووں کے ہمنوا ہیں۔ ان کی نظم کا عنوان بھی "ایکتا" ہے۔ ایک بند آپ بھی دیکھیں۔

سب ایک گگن کے متوالے سب ایک زمیں کے پالے ہیں
سب ایک ہی سورج کی کرنیں سب ایک ہی چاند کے ہالے ہیں
وہ اتر ہو یا دکھن ہو ست رنگ دھنک تو ایک ہی ہے
وہ پورب ہو یا پچھم ہو پھولوں کی مہک تو ایک ہی ہے

(ایکتا۔ شاذ تمکنت)

مساوات کا یہ درس مظفر حنفی کی نظم "سب انسان برابر ہیں" میں بڑے برجستہ اور بے ساختہ انداز میں دیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کے سب ہی فرقوں، زبانوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی برابر حیثیت کا تعین کردیا جائے۔ نظم کا ایک اقتباس میرے اس خیال کی تائید میں پیش ہے۔

کشمیری ہو یا سندھی اردو بولے یا ہندی
دھوتی پہنے یا شلوار مسلم ہو یا ہندو ہو

سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے

سکھ ہو یا ہندو ہو　　احمد ہو یا بندو ہو
وہ سکھ ہو یا عیسائی　　مسلم ہو یا ہندو ہو

سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے

(سب انسان برابر ہیں۔ مظفر حنفی)

اس موضوع پر نجم آفندی کی نظم کا یہ بند بھی ملاحظہ فرمایئے۔

بھارت سب کی آنکھ کا تارا　　گنگا جمنی دیش ہمارا
ہندو ہو یا مسلم کوئی!　　اپنا گھر ہے سب کو پیارا
سب نے کی ہے سیوا جس کی　　سب نے مل کر جس کو سنوارا

(ہمارا دیش۔ نجم آفندی)

مختلف مذاہب کے بزرگوں، سنتوں، اور دیوں کا احترام ہر ہندوستانی پر واجب ہے، ورنہ نفاق کی دیواریں کھڑی ہو سکتی ہیں۔ فیض لدھیانوی نے وسیع المشربی کا یہ سبق بچوں کو اس طرح دیا ہے۔

اپنے دھرم کو مانو　　ہر دم اچھے کام کی ٹھانو
ان کو سچے رہبر جانو　　ان سب کی عظمت کو پہچانو

سب نے بگڑی قوم سنواری
سب نے ڈوبی ناو ابھاری

(پریم کے چشمے۔ فیض لدھیانوی)

"خدا سے دعا" (شفیع الدین نیّر) وغیرہ اس موضوع پر پُر تاثیر نظمیں ہیں۔

علم، کتاب:۔

جیسا کہ اخلاقیات اور حب الوطنی سے معمور درس سے متعلق گفتگو کے دوران عرض کیا جا چکا ہے۔ ان موضوعات پر بالواسطہ نظموں کے علاوہ براہ راست قسم کی منظومات کا وافر

ذخیرہ بھی شعری ادب اطفال میں موجود ہے۔ ان میں سے چند اس لائق ہیں کہ ان کا بطور خاص ذکر کیا جائے۔ ایسی تخلیقات میں محوی صدیقی کی نظم "علم کی برکتیں" کا ایک مختصر سا اقتباس درج کیا جاتا ہے جس میں بچوں کو سیدھے سادے انداز میں کسی ہیر پھیر کے بغیر تعلیم کی اہمیت اور علم کی افادیت کا احساس دلایا گیا ہے۔

اگر آپ نے علم حاصل کیا — تو سارے عزیزوں کو خوش کر دیا
یہ عزت، مسرت ہے سب علم کی — یہ الفت، محبت، ہے سب علم کی
جو حاصل کیا تم نے علم و ہنر — تو خوش ہو گیا گھر کا گھر کس قدر

(علم کی برکتیں۔ محوی صدیقی)

شفیع الدین نیّر بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اپنی تقریباً سب ہی نظموں میں انھوں نے صاف اور واشگاف طریقے سے بچوں کو پند و نصیحت کی ہے۔ مندرجہ ذیل بند ان کی نظم "علم کا ترانا" سے لیا گیا ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس ترانے میں علم کی عظمت کو موضوع نگارش بنایا گیا ہے ؎

ہے علم ہی سے آبرو، ہے علم ہی سے دل قوی
یہی ہے دل کی روشنی، یہی ہے دل کا چین بھی
ہے علم ہی میں زندگی، ہے علم ہی سے روشنی
یہ علم ہی کا فیض ہے، کہ آدمی ہے آدمی

بلندیوں پہ علم کی چڑھے چلو چڑھے چلو
بڑھے چلو بڑھے چلو، چلے چلو بڑھے چلو

(علم کا ترانہ۔ شفیع الدین نیّر)

عہد جدید کے بیشتر شعراء نے بھی اس طرز کی بہت سی تخلیقات بچوں کے لیے قلمبند کی ہیں۔ مثال کے طور پر کیف احمد صدیقی کی نظم کا یہ اقتباس دیکھیے ؎

علم سے ہر آدمی انسان ہے
اور جو بے علم ہے حیوان ہے

جس سے دل میں علم تابندہ نہیں
چلتی پھرتی لاش ہے زندہ نہیں

سانس لیتا ہے مگر بے جان ہے
علم سے ہر آدمی انسان ہے۔

(علم۔ کیف احمد صدیقی)

علم موٹے طور پر دو ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک علم منقول ہوتا ہے، دوسرا ایک وہ جو انسان اپنے تجربات کے ذریعے حاصل کرتا ہے یا اس کو اپنے بزرگوں سے منتقل ہوتا ہے۔ منقول علم کتابوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے بچوں کو کتاب کی افادیت اور عظمت سے روشناس کرانا از بس ضروری ہے۔ نثار عباسی نے اپنی ایک نظم کے ذریعے ایسی ہی کاوش کی ہے نظم کا مختصر سا اقتباس ہے

جو بھی کتابیں میں نے پڑھی ہیں	ایک زبان ہو کر بول رہی ہیں
ہم سب اچھے دوست تمہارے	ہم سب سچے دوست تمہارے
قصے کہانی تمھیں سناتے	باتیں کرتے دل بہلاتے
آسماں کی سیر کراتے	چندا ماما سے ملواتے
لعل و گہر لفظوں میں چھپے ہیں	ہیرے جواہر بکھرے پڑے ہیں

(ہماری کتاب۔ نثار عباسی)

ان نظموں کے علاوہ بھی "علم کی مایا" (حامد اللہ افسر) "علم کی برکتیں" (محوی صدیقی) "دولت اور علم کی تکرار" اور "علم کی روح" (شوکت پردیسی) "علم حاصل کرو" (مہدی پرتاب گڑھی) "کتابیں" (کیف احمد صدیقی) "کر و علم حاصل" (امیر احمد خسرو) "زندگی کا زینہ" (حلیم اختر) "تکمیل اور تعلیم" (شمس نوید) اس موضوع پر قابلِ ذکر تخلیقات ہیں۔

باغ، باغیچہ، اسکول:۔

اسکول اور مدرسہ بچے کے لیے عبادت گاہ کی طرح مقدس ہوتا ہے اور ان مقامات سے اس کی جذباتی وابستگی ہوا کرتی ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں میں بھی یہ رجحان پایا جاتا ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل خود کو آکسن لکھتے ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے تعلیم پانے والے علیگ کہلا کر خوش ہوتے ہیں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبا فخر کے ساتھ اپنے آپ کو جامعی کہتے ہیں۔ یہ ساری باتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مادر درس گاہ بھی بچے کے تئیں ماں جیسی حیثیت رکھتی ہے۔

کیسے ممکن تھا کہ یہ موضوع اردو کے شاعروں کی نگاہ سے چوک جاتے۔ تقریباً بچوں کے لیے لکھنے والے ہر شاعر نے درسگاہوں اور ان سے متعلق مقامات مثلاً کھیل کے میدان، باغ، باغیچے وغیرہ کو اپنی تخلیقات کا محور بنایا۔ ایسی نظموں میں وفاملک پوری کی "اسکول کا زمانہ" ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں شاعر نے اپنے بچپن کے دور میں اسکول کی زندگی اور اس کے تلازمات کو لفظوں کے وسیلے سے مصوّر کیا ہے۔ نظم کا ایک دلچسپ اقتباس دیکھیے ؎

آتا ہے یاد مجھ کو اسکول کا زمانہ — بچپن کی وہ کہانی طفلی کا وہ زمانا
جانے کو دل نہ چاہے اسکول گر کسی دن — ابا کے ڈر سے جانا اور جا کے بھاگ آنا
جس میں نہ تھا غم دل جس میں نہ فکر دوراں — کیا خوب تھا وفا وہ اسکول کا زمانا

(اسکول کا زمانہ۔ وفاملک پوری)

محبوب راہی شاعر کے ساتھ مُعلّم بھی ہیں چنانچہ اس کی نظم "عظمت مدرسہ" اسکول کی اہمیت اور عظمت کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ لکھتے ہیں ؎

اس کا رتبہ بڑا اس کی عظمت بڑی — ہو جس مندروں میں ہے اسکی چاہت بڑی
دین و دنیا سنورتے ہیں آکر یہاں — سب کے جوہر نکھرتے ہیں آکر یہاں
آدمی اس جگہ بنتا ہے آدمی — زندگی کو یہاں ملتی ہے زندگی

(عظمت مدرسہ۔ محبوب راہی)

راجہ مہدی علی خاں نے اسکول کو ظریفانہ انداز میں دیکھا ہے اور اسے اپنی کچھ رباعیات میں دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ موصوف کی دو رباعیاں درج کی جاتی ہیں کہ اسکول کا یہ رخ بھی لائقِ دید ہے ؎

بکواس ہے دوستو ہمارا اسکول — دنیا سے نہیں یہ کوئی نیارا اسکول
ہفتے ہیں جو سات دن تک رہے بند — ایسا اسکول ہو، ہمارا اسکول
مکتب میں کبھی سبق سنایا نہ گیا — یہ زہر تو ہم سے کبھی کھایا نہ گیا
پڑھنے سے تو ہم نے جی چرایا اکثر — پر کھیل سے جی کبھی چرایا نہ گیا

(رباعیات عمر حجام۔ راجہ مہدی علی خاں)

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا رباعیات میں تعلیم سے جی چرانے والے بچوں کا مضحکہ اڑانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور یہ ذہین طلبا کی نمایندگی نہیں کرتیں۔ اسکول میں کھیل کود کے

یہاں اور باغ باغیچے بچوں کی محبوب ترین تفریح گاہیں ہوتی ہیں اور انھیں بھی اردو شاعر نے اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ اکثر اسکولوں میں باغبانی کی تربیت دینے کے لیے باغات میں مختلف کیاریاں، بچوں کے سپرد کر دی جاتی ہیں تاکہ ان میں احساسِ ذمہ داری بیدار ہو گوہر امروہوی کی نظم اس پہلو کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

آؤ بچو باغ لگائیں اس میں سندر پھول کھلائیں
بیلا، گیندا اور چنبیلی نرگس، جوہی، رات کی رانی
سوسن، سرسوں، گلاب، دوپہریا جیسے اپنی اپنی کیاری

(بچوں کا باغ۔ گوہر امروہوی)

اس ضمن میں نثار عباسی کی نظم "میری کیاری" بھی توجہ کی مستحق ہے۔ نظم کے چند شعر دیکھیے۔

دلکش رنگیں چھوٹی کیاری ہری بھری اور پیاری پیاری
پھول کھلے ہیں ان میں ہرسو نکل رہی ہے جن سے خوشبو
پھولوں کی بھی عجب پھبن ہے کیاری کا کیا ہے نئی دلہن ہے

(میری کیاری۔ نثار عباسی)

بیکل اتساہی نے بچوں کے لیے آزادانہ ایک پھلواری سجائی ہے جس میں پھول پودوں کے علاوہ ان کی دلچسپی کے دیگر لوازمات بھی فراہم کیے گئے ہیں۔ گیت کا ایک بند۔

یہ منے کی پھلواری ہے
رنگ برنگے پھول ہیں، اس کی پتی پتی نیاری ہے
اس کے کونے میں اک گڑیا سندر روپ سجائے
پیارا البیلا اک گڈا، کھیر جلیبی کھائے
ڈھول، بانسری، بین، پھیری، باجا بینڈ بجائے
پھولوں کے سب بچے براتی شادی کی تیاری ہے
یہ منے کی پھلواری ہے

(منے کی پھلواری۔ بیکل اتساہی)

علاوہ ازیں "فوارہ" (حامد حسن قادری)، "ہمارا چمن" (حامد اللہ افسر)، "بچوں کی باغبانی"

(شفیع الدین نیرّ) وغیرہ بھی قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔

امتحان :۔

سال بھر اسکول میں محنت و جانفشانی کا ثمرہ بچوں کو امتحان میں کامیابی کی شکل میں نصیب ہوتا ہے لیکن پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ اسکولی بچوں میں تیز، ذہین اور طرار طلبا بھی ہوتے ہیں اور اوسط استعداد کے حامل بچے بھی اور غبی الذہن بچے بھی۔ ان میں ہر درجہ کے طلبہ میں سنجیدہ اور شوخ و شنگ بچے دیکھے جاسکتے ہیں۔ امتحان کے سلسلے میں اسکولی بچوں کے نفسیات کا مطالعہ نہایت دلچسپ نتائج تک پہنچاتا ہے۔ کچھ بچے خود اعتمادی کے ساتھ امتحان کو خوش آمدید کہتے ہیں، کچھ سال بھر بے چینی کے ساتھ اس کا انتظار کرتے ہیں اور کچھ بچوں کو امتحان کے نام سے وحشت ہوتی ہے۔ اردو کے شاعروں نے بچوں کی نفسیات کے ہر پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ امتحان کے بارے میں بھی بہت سی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ان ہی تخلیقات میں مہدی پرتاپ گڑھی کی نظم "کڑوا سچ" قابلِ ذکر ہے جس کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

آگیا امتحان پھر سر پر — فیل ہونے کا ہر گھڑی ڈر ہے
سال بھر کھیل میں گنوایا ہے — علم کا ذہن میں ہو کیسے گزر
کب ملی اس کو علم کی دولت — جی لگا کر نہ جس نے کی محنت
وقت کی قدر جس سے ہو نہ سکی — ہے وہ انسان کتنا بد قسمت

(کڑوا سچ۔ مہدی پرتاپ گڑھی)

اس طرح بچوں کو سال بھر مسلسل محنت کرنے کی تلقین جس پر اثر انداز میں کی گئی ہے اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ امتحان کو موضوع بنا کر ذہین اور محنتی بچوں کی کامیابی کو بزمی بھارتی نے بچوں کی عید سے تعبیر کیا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

دیئے جلاؤ کہ ہم امتحاں میں پاس ہوئے
خوشی مناؤ کہ ہم امتحاں میں پاس ہوئے
بہن کو، امی کو، ابو کو، دولہا بھائی کو
خبر سناؤ کہ ہم امتحاں میں پاس ہوئے

یہ بات ماننے والی نہیں ہے بھائی جان
مٹھائی لاؤ کہ ہم امتحان میں پاس ہو گئے

(طالبِ علم کی عید۔ بزمی بہارتی)

اس سلسلے میں دو نظموں کا بطورِ خاص ذکر کرنا چاہوں گا۔ ایک میں کامیاب ہونے والے بچوں کی خوشیوں کا اظہار ہوا ہے اور دوسرے میں فیل ہونے والے بچوں کے احساسات کی عکاسی کی گئی ہے۔ عزیز مرادآبادی امتحان میں کامیاب ہونے والے بچوں کی زبان میں کہتے ہیں ؎

محنت کا پھل خدایا   تو نے ہمیں دلایا
مسرور و شاد ہیں ہم   تو نے یہ دن دکھایا
ہم پاس ہو گئے ہیں
خوشیوں میں کھو گئے ہیں

(ہم پاس ہو گئے ہیں۔ عزیز مرادآبادی)

اس کے برعکس امتحان میں ناکامی سے دوچار ہونے والے بچوں کو اپنی نظم کے ذریعے رحیم آفاقی نے یہ احساس دلانا چاہا ہے کہ دراصل ان کی لاپرواہی، تساہل اور فضول باتوں میں وقت برباد کرنے کی روش نے ہی انھیں یہ دن دکھایا ہے اور ان خامیوں سے نجات پاکر وہ بھی کامیابی سے آشنا ہو سکتے ہیں اس نظم کا ایک بند بطورِ نمونہ پیش ہے۔

ہوئے فیل اپنے تساہل پہ روئے   بڑی چوٹ کھائی تغافل پہ روئے
نہ غفلت برتتے، نہ شرمندہ ہوتے   اگر پاس ہوتے تو فرخندہ ہوتے
ہم اب اپنی طرزِ تجاہل پہ روئے

(فیل ہونے پر۔ رحیم آفاقی)

امتحان کے سلسلے میں بچے دن رات محنت کرنے اور پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں اور انھیں ہمیشہ بیم و رجا کی کیفیت سے گزرنا پڑتا ہے۔ مظفر حنفی کی قوالی اپنی ہیئت اور موضوع دونوں اعتبار سے دلچسپی کی حامل ہے۔ قوالی کا اقتباس ؎

امتحان کی گر نہیں ہے، یہ کرامت پھر ہے کیا
ساری دنیا سو رہی ہے اور ہم بیدار ہیں

ماسٹر صاحب تمہیں کیا، تم تو کرتے ہو مزے
اک ذرا پوچھو کہ کس حالت میں ہم سرکار ہیں

امتحاں کا ڈر الگ، ریکارڈ کی جھنجٹ الگ
گویا دو جانب سے ہم پر محنتوں کے وار ہیں

(قوالی۔ مظفر حنفی)

"ہے امتحان سر پہ کھڑا" (محمد حسین آزاد) "امتحان کی تیاری" (فضل الرحمٰن عارف) "امتحان" (امیر احمد خسرو) "امتحان حال میں" (مظفر حنفی) "بچوں کی غزل" (مظہر عابدی) "فیل ہونے کے بعد" اور "امتحان صاحب" (کیف احمد صدیقی) وغیرہ بھی اس موضوع پر اچھی نظموں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔

چھٹیاں :۔

سالانہ امتحان کے پل صراط سے گذرنے کے بعد بچوں کو ڈیڑھ دو ماہ کی چھٹیاں ملتی ہیں اور یہ چھٹیاں وہ مختلف مقامات کے سفر، دلچسپ پروگراموں اور تفریحات میں گزارتے ہیں۔ چھٹیاں گزارنے کی نئی نئی ترکیبیں اکثر بچوں کو اردو کے شعرا بھی بتاتے آئے ہیں۔ ایسی نظمیں چونکہ بیشتر تفریحی پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں اس لیے فطری طور پر بچے کو زیادہ عزیز اور پسند ہوتی ہیں۔ علیم اختر طویل چھٹیوں کے موقعہ پر نونہالوں کی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

چھٹیوں کی بہار آئی ہے — ایک خوشی کا پیام لائی ہے
مل گیا شوق کا صلہ ہم کو — محنتوں کا ثمر ملا ہم کو!
پرچے اچھے جو امتحاں میں کیے — کامیابی نے پاؤں چوم لیے
ہو گئے ہیں فیل کچھ ساتھی — ہے ہمیں ان کے ساتھ ہمدردی

(زندگی کا زینہ۔ علیم اختر)

عطاء الرحمٰن طارق کے اشعار بالکل بچوں کی طرح چھٹی ہونے کی خوشی میں اچھلتے کودتے نظر آتے ہیں آپ بھی دیکھیں ؎

مزے کرو اب کیا ہے برادر چھٹی ہے
چھوڑو بھی اسکول کے چکر چھٹی ہے

یارو جشن منایا جائے چھٹی کا
چلو بیٹھیں، مل کر پکنک پر چھٹی ہے
کھانا، پینا، موج اڑانا، سوجانا
جیسے کوئی مست قلندر چھٹی ہے

(چھٹی ہے۔ عطاء الرحمن طارق)

بدیع الزماں خاور نے بھی چھٹیاں منانے کی نئی نئی ترکیبیں بچوں کو سمجھائی ہیں۔ اپنی نظم "سب مل کے چھٹی منائیں" میں لکھتے ہیں ۔

تندکا میں نہائیں
پتنگیں اڑائیں
کسی باغ میں چل کے امرود کھائیں
کسی باغ سے
کیریاں توڑ ڈالیں
کہیں تتلیوں کے تعاقب میں دوڑیں
کہیں شہد کی مکھیوں کو ستائیں
جہانگیر
ابرار
جاوید
اسلم
چلو آج سب مل کے چھٹی منائیں (سب مل کے چھٹی منائیں، بدیع الزماں خاور)

اسی طرح "چھٹیاں ہوگئیں" کے یہ چند شعر اس ضمن میں لائق ذکر ہیں۔

سال کے ہیں دو مہینے ہی یہ منظور نظر
اب تو پانچوں انگلیاں گھی میں کڑھائی میں ہے سر
اپنے استادوں کا اب ہم کو نہیں کوئی خطر
کھیلتے ہیں ہم کبڈی، شام ہو یا دوپہر

جانتے ہیں کہ سب کہ ہم ہر کھیل میں استاد ہیں
چھٹیاں اسکول میں ہو لی گئیں ہم شاد ہیں
دو مہینے کے لیے اب قید سے آزاد ہیں

(چھٹیاں ہو لی گئیں۔ سید نسیم زیدی۔ ترشول)

چھٹیوں کی دلچسپیاں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے۔ "اسکول کی چھٹی" (محوی صدیقی) "آ ہا ہا ہا چھٹی آئی" (شفیع الدین نیّر) "چھٹیوں کا موسم" (کیف احمد صدیقی) "چھٹی کا وقت اور شرارتیں" (محوی صدیقی) اردو ادب اطفال کی شاہکار نظمیں ہیں۔

شرارتیں:۔

بچہ ہی کیا جو شوخ و شنگ اور شریر نہ ہو۔ البتہ اسے بے تہذیب اور بدتمیز نہیں ہونا چاہیے۔ بچوں کی بے ضرر شوخیوں اور معصوم شرارتوں پر اردو شاعری کو غصے کے بجائے پیار آتا ہے اور اس نے اپنے حافظے میں نونہالوں کی ایسی پُرلطف حرکتوں کو ابتدا ہی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ تقریباً ہر علاقے ہر فرقے اور ہر عمر کے بچے کی تیزی، طراری اور شرارتوں کے نہایت تابناک مرقعے اردو ادب اطفال کے شعری سرمایے میں دستیاب ہیں۔ سیدہ فرحت نے اپنی نظم "کتے کی دم" میں بچوں کی فطرت کے اس پہلو کی دلچسپ تصویر پیش کی ہے۔ ایک بند بطور نمونہ پیش ہے۔

استاد نے اپنے ہاتھوں میں موٹا سا جو ڈنڈا تھام لیا
ہم کان دبا کر بیٹھ گئے اور دل میں خدا کا نام لیا

دم کاٹ کے چھوڑی کتے کی	ہمت کی کسی نے داد نہ دی
بیتوں سے مرمت اپنی ہوئی	استاد نے یہ انعام دیا
چھٹی کی خبر جو ہم کو ملی	یوں ہم نے منایا جشن خوشی
ہر میز سے ہم نے طبلہ کا	اسکول میں کل تو کام لیا

(کتے کی دم۔ سیدہ فرحت)

یوں اسکول کی میزوں پر طبلے بجانا اور کتے کی دم پر ہاتھ صاف کرنا بچوں کی دنیا میں روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔ اسی طرح سیفی سیوہاروی نے بچوں کی شرارتوں کے

بچے میں ماں باپ کے درمیان تکرار اور گھر میں ہمت پہنچنے والے لڑکے کا دلچسپ منظر مندرجہ ذیل بند نظم میں بڑی مہارت کے ساتھ مصور کیا ہے

جھنگ میں تھا بھڑوں کا چھتا
چھنے نے جا توڑا
پاپا کو اک بھڑ نے کاٹا
ہو گئی ناک پکوڑ
پاپا نے بھنا کر فوراً!
اس کو چپت لگائی
چھنا روتا یوں گھر پہنچا
گویا آفت آئی
اور اسی دم چنی نے بھی
کیلا چھیل کے کھایا
انگنائی میں چھلکا پھینکا
ماں کو دھم سے گرایا
لنگڑاتی ہوئی ماں نے اٹھ کر
غصہ خوب اتارا!
چنی بولی باپ سے جا کر
ہائے ماں نے مارا!
اور ادھر چھنا بھی آکر
بولا دیکھو آپا
ہائے مرا میں، اک دن مجھ کو
مار دھریں گے پاپا
اسی جانب سے اماں بولی
اس جانب سے باوا

پھوٹا گھر میں جوالا مکھی سا
دن بھر برسا لاوا

(جوالا مکھی سیفی سیوہاروی)

مشہور ترقی پسند شاعر وامق جونپوری کی نظم بچوں کی تیزی اور طراری کے ایک پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ اکثر ذہین اور شوخ بچے کلاس روم میں الٹے سیدھے سوالات کر کے استادوں کو تنگ اور لاجواب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک موقعے کی منہ بولتی لفظی تصویر دیکھیے۔

بتلاؤ ماسٹر جی

کیلا ہے کیوں اکیلا
کڑوا ہے کیوں کریلا
پیسے نہ پاس ہوں تو
میلا ہے کیوں جھمیلا

بتلاؤ ماسٹر جی

ہیں پتیاں ہری کیوں
پھولوں میں ہے تری کیوں
چھونے سے لاجونتی
کمھلا کے رہ گئی کیوں

بتلاؤ ماسٹر جی

(ڈھکوسلا۔ وامق جونپوری)

کھیل کھیل میں یہ شوخ و شنگ خطرات کبھی کبھی انھیں کو آپس میں بھی ٹکرا دیتی ہے۔ مظفر حنفی کی نظم "پتنگ کا مرثیہ" میں نونہالوں کی باہمی تکرار کا یہ موقع بھی کم پُر لطف نہیں۔

بلو تو ہے کام کا چور — لایا ہو گا کچی ڈور
عرفی ذرا تھما تو چرخی — میں کرتا ہوں اس سے جنگ
ہے ہے دوڑ کے پکڑے کوئی — کٹ گئی میری لال پتنگ

(پتنگ کا مرثیہ۔ مظفر حنفی)

محبوب راہی ایک شرارت کے پتلے کی ہیئت کذائی مندرجہ ذیل اشعار میں کرتے ہیں۔

چنچل بھی ہے نٹ کھٹ بھی ہے — باتونی ہے منہ پھٹ بھی ہے
باہر والے دنگ ہیں اس سے — گھر والے بھی تنگ ہیں اس سے
ابھی یہاں ہے ابھی وہاں ہے — بس سمجھو پورا شیطاں ہے
کھینچا تانی دھینگا مشتی! — مارا پیٹی چھینا جھپٹی!

بچوں کی شرارتوں کے ان گنت بے شمار پہلو ہیں اور ان تمام پہلوؤں پر اردو کے شعرا نے اتنی بہت سی نظمیں لکھی ہیں کہ ان سب سے مثالیں پیش کرنا مقالے کو غیر ضروری طول دینے کی مترادف ہوگا۔ اس لیے محض "شرارت" (احمد ندیم قاسمی) "مزاحیہ غزل" (میرزا ادیب) "آتو جاتو" (راجہ مہدی علی خاں) "شریر ہمیں" "پھر دیکھو مزا" "بھولا رام گئے بازار"۔ "گیند کھو گئی نالی میں" "اور جی حامد نے" (مظفر حنفی) "شرارت کا پتلا" (شفیع الدین نیر) "شرارت" (نشاط عباسی) کی اہمیت اور افادیت کے اعتراف پر اکتفا کرلینا ہی مناسب ہے۔

طنز وظرافت :-

ہنسنے ہنسانے کی باتیں کرنا بچوں کا دلچسپ ترین مشغلہ ہے۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ کسی بے حد معمولی واقعہ پر بھی بچے بے تحاشا قہقہے لگاتے ہیں جبکہ بڑوں کو اس میں کوئی مضحکہ خیز بات نظر نہیں آتی۔ نونہالوں کی نفسیات کے اس رخ سے واقف ہو کر تخلیق کاروں نے ظریفانہ شاعری کے ذریعے عجیب عجیب گل کھلائے ہیں۔ اس نوع کی تخلیقات پیش کرنے والوں میں ظریف اور سنجیدہ سبھی فنکار حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً وفا ملکپوری فرماتے ہیں۔

ہر روز مجھے پڑھنے کے لیے جو بات سنایا کرتے ہیں
ابا کو مرے ایک عادت ہے، یوں وقت گنوایا کرتے ہیں
ہر کھیل میں اول آتے ہیں، انعام بھی پایا کرتے ہیں
اس واسطے پڑھنے لکھنے سے ہم جان چرایا کرتے ہیں
پڑھنے کے بہانے آتے ہیں، اسکول میں سب لڑکے لیکن
کچھ شور مچایا کرتے ہیں، کچھ بات بنایا کرتے ہیں

(قوالی۔ وفا ملکپوری)

راجہ مہدی علی خاں بڑوں میں بھی اپنی ظریفانہ شاعری کے لیے بے حد مشہور ہیں۔ ان کے ظریفانہ مزاج سے طفلانہ حرکات کی ہم آہنگی نے ادب اطفال کو مزاحیہ نظموں کی صورت میں بہت مالا مال کیا ہے۔ موصوف کی بچوں کے لیے ایک پیروڈی کا اقتباس درج ذیل ہے ؎

میں نے گیند اور غبار وں کی تمنا کی تھی
مجھے استاد کی ڈانٹوں کے سوا کچھ نہ ملا

میں وہ بچہ ہوں جسے پیار کی ثانی نہ ملی
جب بھی کی کوئی شرارت، تو معافی نہ ملی
میں نے اماں کے اشاروں کی تمنا کی تھی
پر مجھے باپ کے چانٹوں کے سوا کچھ نہ ملا

(تمنا۔ راجہ مہدی علی خاں)

بچوں کے منفرد شاعر یکتا امروہوی نے اپنی مزاحیہ غزل میں استاد کو نشانہ تمسخر بنایا ہے کہتے ہیں ؎

مجھ سے گھر کا گھر پریشاں ہے قسم استاد کی
خود ہر اک استاد نالاں ہے قسم استاد کی
کیا ہے یہ اسکول زنداں ہے قسم استاد کی
کھیل کا میداں گلستاں ہے قسم استاد کی
گیند اور بلے زیادہ دیکھ کر ہنستے ہو کیوں
یہ ہی تو جینے کا سامان ہے قسم استاد کی

(قسم استاد کی۔ یکتا امروہوی)

لطفی رضوانی نے غالب کی مشہور غزل کی پیروڈی مندرجہ ذیل انداز میں کی ہے۔

ہم پڑھائی سے دور وہ نزدیک
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
جب کہ بچے ہیں پیار کے قابل
پھر یہ بیداد اے خدا کیا ہے

ہم کو مل جائے مدرسے سے نجات
اور درویش کی صدا کیا ہے
آج پکنک پہ جا کے کیا دیکھیں!
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے!
مار لو پیٹ لو ستا لو ہمیں!
مفت آئے ہمیں بُرا کیا ہے

(ماسٹر جی اور ہم۔ لطفی رضوانی)

اس میدان میں سراج انور بھی پہلی بار شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں حالانکہ وہ بچوں کے کہانی کار اور ناول نویس ہیں۔ غالباً یہ ان کی پہلی اور آخری کاوش ہے۔ اپنی طفلانہ قوالی میں انھوں نے بھی اس میں مزاحیہ لطف کا مظاہرہ کیا ہے۔ قوالی کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

احمقوں کا نام دنیا میں بڑھاتے جایئے
آپ ہنستے جایئے بدھو بناتے جایئے
بچتے رہیے عقل مندوں سے جہاں تک ہو سکے
بدھو بنتے جایئے بدھو بناتے جایئے!
چیر کر مچھر کی ٹانگیں نام روشن کیجیے
ایک مکھی کے لیے جاں تک لڑاتے جایئے!

(احمقوں کی قوالی۔ سراج انور)

بدیع الزماں کی دلچسپ نظم "دادا جی کے خراٹے" بھی اس تذکرے میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔ اپنی گفتگو کو میں ان کے چند مصرعوں پر ختم کرنا چاہوں گا۔

ٹھہر ٹھہر، سیٹی کی سی
موٹی ناک بجاتے ہیں
بھک بھک بھک بھک، بھک بھک بھک بھک
منہ سے دھواں اڑاتے ہیں
انجن جیسا کھڑ کھڑ، کھڑ کھڑ، کھڑ کھڑ

شور مچاتے ہیں
آدھی رات کو
سارے ہمسایوں کی نیند اڑاتے ہیں
سب کو لگتا ہے
ہوں گے یہ کسی ریل کے فراٹے
سنتے ہیں جب لوگ ہمارے دادا جی کے خراٹے

(دادا جی کے خراٹے۔ بدیع الزماں خاور)

"استاد آگئے" (حفیظ جالندھری) "چوہوں کی بارات" (احمد ندیم قاسمی) "چار بجے" (راجہ مہدی علی خاں) "پانچ ڈھینچک شعرا" (فرحت قمر) "کون دیکھے گا" (ظفر اسرائیلی) "ننھا منا سے بچے اچھے" (مزنشار عباسی) "بھائی مو ٹو رام" (بدیع الزماں خاور) "بیک بنچرز کا گیت" (سیف الرحمن عباد) "کون دیکھے گا" (ظفر اسرائیلی) "ڈیڈی کا ہر گھڑی ہمیں ڈنڈا دکھائی دے" (عزیز مرادآبادی) "جیسے میں نے بٹن دبا دیا" (محمد یوسف پاپا) ظریفانہ شاعری کی عمدہ مثالیں ہیں۔

پہیلیاں:۔

چھوٹی سی عمر سے ہی نونہالوں میں پہیلی بوجھنے اور بجھانے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ امیر خسرو جیسے عظیم تخلیق کار نے اس رمز کو اردو زبان کی شیر خوارگی کے عہد میں ہی سمجھ لیا تھا اور اردو ادب اطفال کا آغاز ہی امیر خسرو کی خالق باری سے اور پہیلیوں سے ہوا ہے۔ ان کی اکثر پہیلیاں صرف بچوں کے لیے ہیں۔ مثلاً۔

ایک تھال موتیوں سے بھرا   سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھالی پھرے   موتی اس سے ایک نہ گرے

(آسمان ۔ امیر خسرو)

دھوپوں سے وہ پیدا ہووے چھاؤں دیکھ مرجاوے
اے ری سا کھی میں تجھ سے پوچھوں، ہوا لگے مرجاوے

(پسینہ امیر خسرو)

پہیلیوں کی اس روایت کو جس کی داغ بیل امیر خسرو کے ہاتھوں پڑی تھی ہر دور میں اردو کے شاعروں نے آگے بڑھانے کی سعی کی ہے خاطر غزنوی کی دو پہیلیاں دیکھیے۔

ایک ننھا سا ساتھی ایسا ہاتھ پکڑ کر ساتھ ہی جائے
بولے جیسے دل کی دھڑکن پل پل کا احساس دلائے
(ہاتھ کی گھڑی۔ خاطر غزنوی)

سینے میں ہیں سب الفاظ منہ پر ٹک ٹک کی آواز
انگلیوں کو پہچان کے یہ کاغذ پر پھیلا دے راز
(ٹائپ رائٹر۔ خاطر غزنوی)

قتیل شفائی نے بھی بچوں کے لیے بہت سی دلچسپ پہیلیاں منظوم کی ہیں۔ بطور مثال پہیلیاں درج کی جاتی ہیں۔

تیل بنا اک دیا جلے جو کہ سب کو راہ دکھائے
شام پڑے تو گل ہو جائے صبح کو پھر جل جائے
(سورج۔ قتیل شفائی)

ایسا کون سا پربت ہے جو سب کو دکھائے چل کے
گرمی سردی کی رت کاٹے دو دو پنکھے جھل کے!
(ہاتھی۔ قتیل شفائی)

جنگل میں ناگن لہرائے ڈستی نہیں سوچا کھائے
چلتے چلتے جب بھی ٹھہرے کچھ کو اگلے کچھ کو نگلے
(ریل شان الحق حقی)

سیکھنے والا بولتا جائے سکھانے والا چپ
اس سے میرا دھیان لگا ہے شور نہ کرنا چپ
(کتاب۔ شان الحق حقی)

شفیع الدین نیر کی اٹھائیس پہیلیاں "گھی اور شکر" کے عنوان سے منظر عام پر آچکی ہیں جس کی ہر پہیلی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

میں کیا ہوں یہ بتلاؤ تم پھر گھی اور شکر کھاؤ تم

قیصر صاحب کی صرف ایک پہیلی مثال کے طور پر پیش خدمت ہے۔

میں کیا ہوں یہ بتلاؤ تم — پھر گھی اور شکر کھاؤ تم
میں چھک چھک چھک چھک کرتی ہوں — میں بھک بھک بھک بھک کرتی ہوں
ناگن کی طرح لہراتی ہوں — اتراتی ہوں بل کھاتی ہوں
جو دیو مجھے چلاتا ہے — وہ آگ اور پانی کھاتا ہے
یہ خوں خاں کرتا رہتا ہے — یہ شوشاں کرتا رہتا ہے

(ریل۔ شفیع الدین نیر)

عہد جدید کے شعرا میں سے اکثر نے پہیلیوں کے میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً کیف احمد صدیقی کی یہ پہیلی ے

دوستو میں اک ایسی دولت ہوں — جو کسی چور کے نہ ہاتھ آئے
جس کو دنیا نہ کبھی چھین سکے — خرچ کرنے سے اور بڑھ جائے

(علم۔ کیف احمد صدیقی)

حافظ باقوی "پوچھو تو جانیں" کے عنوان سے بہت سی پہیلیاں بچوں کے لیے منظوم کر چکے ہیں موصوف کی ایک پہیلی ملاحظہ ہو۔

پتی پتی اس کی ہری ہے — پس جائے تو لال پری ہے
ہوتے ہیں پھول اس کے اجلے — بھینی بھینی خوشبو والے
پیلی پیاری اس کی لالی — اس سے خوش ہر لڑکی بالی

(مہندی۔ حافظ باقوی)

الغرض بچوں کے ذہن کو جلا بخشنے، ان کی فہم و فراست میں اضافہ کرنے اور ان میں چیزوں کی ماہیتوں پر غور وفکر کا مادہ پیدا کرنے کے لیے اردو کے شعری ادب اطفال میں پہیلیوں کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔

منظوم کہانیاں:۔

قدرے بڑی عمر کے بچوں کے لیے اکثر شاعروں نے چھوٹی چھوٹی حکایتوں اور قصوں کو آسان اور عام فہم زبان میں منظوم کر دیا ہے۔ ایسے تخلیق کاروں میں بطور خاص اسماعیل

میرٹھی اور دہلوی کے نام امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولوی اسماعیل میرٹھی کی مرتب کردہ اردو کی پہلی سے چوتھی جماعت تک درسی کتابوں میں موصوف کی متعدد منظوم کہانیاں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک نظم "کچھوا اور خرگوش" کا مندرجہ ذیل اقتباس بطور مثال پیش خدمت ہے ۔

بسکہ زوروں پہ تھا چڑھا خرگوش — تیزی سے پھرتی سے بڑھا خرگوش
جس طرح جائے توپ کا گولہ — یا گرے آسمان سے اولہ
ایک دو کھیت چوکڑی بھر کے — اپنی چستی پہ آفریں کر کے
کسی گوشے میں سو گیا جا کر — فکر کیا ہے، چلیں گے ستا کر
اور کچھوا غریب آہستہ — چلا بیٹنے کی خاک پر گھستا
کام کرتا رہا جو پے در پے — کر گیا رفتہ رفتہ منزل طے

(کچھوا اور خرگوش ۔ اسماعیل میرٹھی)

اس طرح اسماعیل میرٹھی نے مندرجہ بالا نظم میں "کچھوے اور خرگوش" کی اس حکایت کے ذریعے تلقین کی ہے صبر اور محنت اور استقلال سے کام لینے والے کو ہمیشہ کامیابی ملتی ہے۔ سستی اور غفلت و غرور کرنے والا اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود زندگی کی دوڑ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ خرگوش کو اپنی رفتار پر غرور تھا لیکن سستی اور غفلت نے اس کا سر نیچا کر دیا۔

اس ضمن میں رنگین دہلوی کی نظم بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے۔ اس نظم میں خرگوش اور لومڑی کے ایک دلچسپ واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔ خرگوش اور لومڑی میں دشمنی تھی ۔ ایک بھیڑیے کی مدد سے وہ لومڑی کو زک پہنچانا چاہتا ہے لیکن لومڑی کی چالاکی کو خرگوش نہیں پاتا اور بھیڑیے کے ساتھ ساتھ وہ بھی کیفر کردار کو پہنچتا ہے۔ نظم کا پر لطف اختتام ملاحظہ کیجیے۔

تھی عداوت کی جو آتی اس سے بو — جانتی تھی اس کو وہ اپنا عدو
بولی، اس رستے سے اس کو لائیو — آگے آگے اس کے پر تو آئیو
تھا بنایا اس نے جو اس راہ کو — واں کیا خس پوش، تھا اک چاہ کو
جو ہیں پہنچے آکے اس رستے سے واں — گر پڑے اس میں وہ دونوں ناگہاں

آپ سے دونوں اسیر چہ ہوئے   بچ رہی وہ، اور وہ دونوں موئے

(حکایت روباہ۔ رنگین دہلوی)

یکتا امروہوی بچوں کے لیے کہانیاں منظوم کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں اور موصوف کی درجنوں پُر لطف منظوم کہانیاں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں ان میں امتحانستان اپنی ندرت کے باعث بچوں کی توجہ اپنی جانب فی الفور مبذول کرتی ہے۔ نظم میں ایک ایسے طالب علم کے دلچسپ خواب کی رنگین داستان بیان کی گئی ہے جسے امتحان کا پرچہ حل کرنے میں پریاں مدد کرتی ہیں۔ نظم کی پُر لطف ابتدا مندرجہ ذیل اشعار سے کی گئی ہے۔

آرہا تھا کیوں کہ سر پر امتحان   جس سے مل سکتی نہ تھی بالکل اماں

اس کے باعث دیر تک تھا جاگتا   پڑھنے لکھنے سے میں کب تھا بھاگتا

(امتحانستان۔ یکتا امروہوی)

کمسن بچوں کے لیے وفا فرخ آبادی کی نظم "مزیدار کہانی" بھی خصوصیت کی حامل ہے جس میں چڑیا چڑے کی لوک کہانی کو ایک نئے انداز میں پیش کر کے بچوں کو صاف ستھرا رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس نظم کے چار اشعار بطور نمونہ درج کیے جا رہے ہیں۔

چڑیا نے سارے برتن دھوئے   چڑیا نے پھر کھیر پکائی

دم بھر میں تیار ہوئے وہ   دونوں نے جب چھٹی پائی

چڑا نہایا نہر پہ جا کر   چڑیا گھر میں خوب نہائی

چڑا چڑی تم سے اچھے

بچو دیکھو ان کی صفائی

(مزیدار کہانی۔ وفا فرخ آبادی)

بچوں کی ایسی کہانیاں (خواہ وہ نثر میں ہوں یا منظوم) بے حد پسند آتی ہیں جن میں ان کو ہنسنے ہنسانے کا موقع ملتا ہے۔ دیہات کے بعض سیدھے سادے لوگوں سے بڑی بڑی بیوقوفیاں سرزد ہو جاتی ہیں اور ایسی غلطی بچوں کے لیے تفریح کا وافر سامان فراہم کرتی ہیں۔ عنبر چغتائی کی ایک نظم کا مرکزی کردار ایک سادہ لوح دہقان ہے۔ اس کا ٹائم پیس خراب ہو جاتا ہے اور جب دہقان اس کو کھول کر دیکھتا ہے تو اس میں سے ایک مری ہوئی مکھی برآمد ہوتی ہے مکھی کو اس کا ڈرائیور تصور کر کے کسان ایک دوسری زندہ مکھی پکڑ کر

اس نے ماتم میں بند کر دیا ہے۔ اس پر لطف واقعہ کو شاعر نے بڑی چابکدستی کے ساتھ اشعار کا ملبوس عطا کیا ہے۔ نظم کے آخری تین اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ایک گھنٹہ الٹ پلٹ جب کی ۔۔۔ اس میں نکلی مری ہوئی مکھی
سخت افسوس کر کے کہنے لگا ۔۔۔ مر گیا ہے ڈرائیور اس کا
اس نے زندہ پکڑ کے اک مکھی ۔۔۔ اس میں پھر احتیاط سے رکھ دی

(دہقان۔ عنبر چغتائی)

جانوروں اور پرندوں کو کردار بنا کر "اردو ادب اطفال" میں لاتعداد تمثیلی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ "بچھوا اور خرگوش" (اسماعیل میرٹھی) "حکایت روباہ مرزا نیگین دہلوی) کا ذکر قبل ازیں کیا جا چکا ہے۔ اس نوع کی اکثر کہانیاں بچوں کو اخلاقیات کا براہ راست درس دیتی ہیں۔ یہاں پند و نصائح کے دفتر نہیں کھولے گئے بلکہ واقعات کی دلچسپی اور ندرت پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔

کہانی "جنگل کا مشاعرہ" بچوں کی تفریح طبع کا وافر سامان فراہم کرتی ہے۔ اس نظم میں ایک جنگل میں پرندوں کے ایک مشاعرے کو تمثیل میں پیش کیا ہے۔

جنگل میں کچھ پرندوں نے اونچے درخت پر
مل جل کے شاندار کیا ایک مشاعرہ
بیٹھے تھے سب کلام سنانے کے موڈ میں
چوں چوں کا شور تھا تو کہیں ٹائیں ٹائیں کا
مرغابی، کوا، طوطا، بٹیر، الو، مور، چیل
تیتر، کلنگ، مینا، عقاب اور فاختہ
سر ڈالے ایک ڈالی پہ بیٹھا تھا گدھ الگ
سمجھا گیا اسی کو صدارت کے کام کا

(جنگل میں مشاعرہ۔ محشر بدایونی)

محولہ بالا اقتباس میں تفریح کے ساتھ ساتھ بچوں کو جس خوش اسلوبی سے جنگل کے مختلف جانوروں سے متعارف کرایا گیا لائق داد ہے۔ اس ضمن میں مظفر حنفی کی نیم شعری نیم نثری، منظوم کہانی "بندروں کا مشاعرہ" بھی قابل ذکر ہے جس میں بندر ایک باغ میں

مشاعرہ منعقد کرتے ہیں اور مشاعرے کے دوران خاصی اچھل کود مچاتے ہیں۔

منظوم کہانیوں کے ذیل میں "ایک پودا اور گھاس" اسماعیل میرٹھی "حکایت مرد کور بینا" اور "حکایت ماہی عقلمند" "کم عقل و بے عقل" (رنگین دہلوی) "طوطے کا خواب" اور "ڈرپوک بجلا" (راجہ مہدی علی خاں) "کسوٹی" (پریم وار برٹنی) "بزدل شہزادہ" راشد الخیری نیر) "ہر جرن ہرن کو پھانسی" اور "خالد پیارہ" (ڈیکیا امروہوی) پانی کی کہانی (شفیع الدین نیر) "تین فقتے" (آل احمد سرور) "احساس" (علقمہ شبلی) "آندھی" (احسن عثمانی) "نافرمانی کا انجام" (محبوب راہی) "احسان کا بدلہ" (عثمان نثار) کی اہمیت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مناظرِ فطرت:-

بچے ہوں یا بڑے مناظرِ فطرت کی سحر انگیزی سب ہی کو متاثر کرتی ہے اور یہ تاثر نہ صرف حقیقی مناظر کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے بلکہ ان کی لفظی تصویریں بھی انسان کو متاثر کرتی ہیں۔ بچوں اور بڑوں کی نظریہ شاعری کا نمایاں امتیاز یہ ہے کہ بڑوں کے لیے مناظرِ فطرت کی عکاسی کرتے وقت شعراء ان کے پس منظر میں انسانی جذبات اور احساسات اور اپنے نظریہ حیات کو بھی شامل کر دیتے ہیں جبکہ بچوں کے لیے عام طور پر فطری مناظر کی سادہ، واضح اور اصلی تصویر پیش کی جاتی ہے جس میں کوئی نفسیاتی پیچیدگی شامل نہیں ہوتی بلکہ ان نظموں کا مقصد بچے کو محظوظ کرنا اور تفریح کے پردے میں ان کی معلومات میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ ہندوستان ایک بے حد وسیع ملک ہے اور یہاں پائے جانے والے مناظرِ فطرت میں بے پناہ تنوع ہے۔ اسی مناسبت سے اس موضوع پر نظموں کی کثرت بھی پائی جاتی ہے۔ پہاڑ، دریا، ہرے بھرے میدان، کھیت، باغات، پھولوں سے لدی وادیاں، ریت اڑاتے ریگستان، بیکراں سمندر، گھنے جنگلات وغیرہ تمام مناظر اردو شاعری کے پردے پر منعکس ہوئے ہیں ایسی نظموں میں سردی، گرمی، برسات، بہار، بسنت وغیرہ جیسے موسموں اور رات، صبح، شام دوپہر وغیرہ کے مناظر کی تصویر کشی کرنے والی تخلیقات شامل ہیں۔ مناظرِ فطرت سے تعلق رکھنے والی نظموں میں اسماعیل میرٹھی کی "کوہ ہمالیہ" سرفہرست ہے فرماتے ہیں ؎

اے ہمالہ پہاڑ تیری شان — دنگ رہ جائے دیکھ کر انسان

ساری دنیا میں تو ہی ہے بالا — پہنچے جب پاس دیکھنے والا

ہے مرے دل میں یہ خیال آتا   کاش چوٹی پہ تیری چڑھ جاتا
واں سے نیچے کا دیکھتا میداں   جس میں گنگ و جمن ہے تیز رواں
شام کو دیکھتا بہار بڑی   گویا سونے کی ہے فصیل کھڑی

(کوہ ہمالہ ۔ احمد ضیا میرٹھی)

اس طرح شاعر نے بچوں کو ہمالہ کی بلندی اور رفعت کے ساتھ ساتھ اس کی افادیت سے بھی روشناس کیا ہے۔ شفیع سیوہاروی اپنی نظم میں بچوں کو گاؤں کی چاندنی رات کا منظر دکھاتے ہیں ؎

چاندنی سے چمک اٹھا جنگل
کھیت چاندی کا بن گیا جنگل
گاؤں کے پھوس والے کچے گھر
مثل قندیل آرہے ہیں منظر
چاندنی ہر جگہ رہی ہے چھٹک
دودھ کی نہر بن رہی ہے سڑک

("گاؤں میں چاندنی رات" شفیع سیوہاروی)

اور رئیس امروہوی انھیں برسات کی سہانی شام کی تصویر دکھا کر محظوظ کرتے ہیں

برسات کی شام ہے سہانی   رہ رہ کے برس رہا ہے پانی
دھرتی کا لباس سبز گہرا   آکاش کا رنگ دھانی دھانی
پیڑوں پہ ہے کیا عجب جوبن   پتوں پہ ہے کیا نئی جوانی
ساون کا ہرا بھرا مہینہ   برکھا کی ہری بھری جوانی

(برسات کی شام ۔ رئیس امروہوی)

اختر شیرانی نے برسات کی گھنگھور گھٹاؤں کا مرقع نہایت دلکش اسلوب میں پیش کیا ہے۔ موصوف کی نظم کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
برکھا کی ہوائیں آرہی ہیں!

پودوں کو صبا ہلا رہی ہے
پھولوں پہ بہار آ رہی ہے
باغوں کی بہار کوئی دیکھے
پھولوں کا نکھار کوئی دیکھے

(باغوں کی بہاریں۔ اختر شیرانی)

اس کے برعکس مظہر امام نے نونہالوں کو صبح کا تابناک چہرہ دکھایا ہے ؎

صبح ہوئی وہ چڑیاں چہکیں ۔۔۔ سبزہ لہکا، کلیاں مہکیں
گائیں گائیں ہم بھی گائیں ۔۔۔ آؤ خوش خوش گیت سنائیں
پو پھٹتے ہی دل کے اندر! ۔۔۔ رونق ہے آکاش کے منہ پر
روشنی کا دربار ہو جیسے ۔۔۔ آج کوئی تہوار ہو جیسے

(صبح کا تہوار۔ مظہر امام)

ہمالیہ کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ تلوک چند محروم کی نظم میں صبح کے وقت جمنا کا یہ خوبصورت منظر بھی دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے ؎

جمنا ابھی خواب سے اٹھی ہے ۔۔۔ پیدا بشرے سے تازگی ہے
کرنیں جمنا سے کھیلتی ہیں! ۔۔۔ ظلمت کو پرے دھکیلتی ہیں
جمنا کا لباس مخملی ہے! ۔۔۔ اور موتیوں سے لدی کھڑی ہے

(بندرا بن کی صبح۔ تلوک چند محروم)

اس ضمن میں اکبر الہ آبادی کی انگریزی سے ماخوذ نظم "دریا کی روانی" کا یہ اقتباس بھی کم قابل توجہ نہیں ہے ؎

پھرتا ہوا جوش کھاتا ہوا ۔۔۔ بگولا کروہ کف منہ میں لاتا ہوا
بلندی سے گرتا گراتا ہوا ۔۔۔ نشیبوں میں پھرتا پھراتا ہوا
چمکتا ہوا اور جھلکتا ہوا ۔۔۔ سنبھلتا ہوا بھلکتا ہوا

(دریا کی روانی۔ اکبر الہ آبادی)

موسموں کے ذکر میں برسات کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ گرمی کے موسم کی پرتاثیر تصویر حالی نے چابکدستی کے ساتھ لفظوں میں مصور کی ہے ؎

ذرے تھے بدن پہ لو کے چلتے ۔۔۔ شعلے تھے زمین سے نکلتے!
تھی سب کی نگاہ سوئے افلاک ۔۔۔ پانی کی جگہ برستی تھی خاک
پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی ۔۔۔ وہ باد سموم سے سوا تھی
ٹٹی میں تمام دن گنواتا کوئی ۔۔۔ تہہ خانے میں منہ چھپاتا کوئی

(گرمی کا موسم۔ حالیؔ)

جاڑے کی منظر کشی کرنے والی ایک خوبصورت نظم مولانا محمد حسین آزادؔ کے قلم سے نکلی ہے جس کا عنوان "جاڑا آیا جاڑا آیا" ہے۔ نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

گیا ستمبر آیا جاڑا ۔۔۔ سردی نے اب جھنڈا گاڑا
پھینکی سب نے دور رضائی ۔۔۔ نکلی توشک اور رضائی
دھوپ نے دن بھر دکھ سے بچایا ۔۔۔ شام ہوئی تو کہرا آیا
بدن جو کانپے سب کے تھر تھر ۔۔۔ ہوئی انگیٹھی گھر گھر روشن

(جاڑا۔ محمد حسین آزادؔ)

اس گفتگو کو بہار کے ذکر پر ختم کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ حامد اللہ افسرؔ کے قلمبند کردہ بچوں کے گیت کا یہ بہاریہ منظر کتنا خوبصورت ہے ؎

پھول کھلاتی
ہنستی ہنساتی
دل کو لبھاتی

آئی بہار، اٹھلاتی بہار
سارے جہاں میں چھائی بہار

پھول کٹیلے
رنگ رنگیلے
پیلے پیلے

لائی بہار
آئی بہار، اٹھلاتی بہار
سارے جہاں پہ چھائی بہار (حامد اللہ افسرؔ)

پیر و جواں کو
خورد و کلاں کو
بھائی بہار
آئی بہار اِٹھلائی بہار
سارے جہاں پہ چھائی بہار

(سارے جہاں پر چھائی بہار، حامد اللہ افسر)

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس موضوع پر بلا مبالغہ سینکڑوں نظمیں لکھی گئی ہیں "برسات کی بہاریں" اور "بسنت" (نظیر اکبر آبادی) "برسات" اور "گرمی کا سماں" "شفق" "گرمی کا موسم" (اسماعیل میرٹھی) "برسات" (حالی) "دھنک" "بہار کے پھول" اور "کشمیر" (حفیظ جالندھری) "برسات ہے برسات" (افسر میرٹھی) "بہار کا موسم" "سردی کا موسم" "بسنت کی بہار" "باغ سیر" اور "جاڑے کا زمانہ" (شفیع الدین نیر) برسات کی آمد" (بشیشر پرشاد منور لکھنوی) "فطرت" (معین جذبی) "جاڑے کی بہار" (حامد حسن قادری) "گرمی" (نریش کمار شاد) "گرمی کے دن" "گرمی کی راتیں" "گرمی اور جنگل" "برسات کا سماں" "ساون کی بہار" اور "برسات کی بہاریں" (محوی صدیقی) "سردی" اور "برسات کی بہاریں" (مظفر حنفی) "دریا کی شام" "جاڑوں کی دھوپ" "چودھویں رات" "گرمی کا سورج" اور "برسات آ گئی" (حرمت الاکرام) "سردی کی گرما گرمی" (مجتبیٰ حسین) "برکھا رت" (ستیدہ فرحت) "گرمی" (رعنا جگی) "موسم کا حال" (رئیس فروغی) "جھم جھم کرتی برکھا آئی" (اظہار ملیح آبادی) اور "بارش رحمت ہے" (محبوب راہی) وغیرہ امتیازی شان کی حامل ہیں۔

ہم اسّی کروڑ کی آبادی والے ایک بیحد وسیع اور عریض ملک کے باشندے ہیں اور ہمارے درمیان چھوٹے بڑے ہزاروں پیشے اختیار کر کے لوگ نہ صرف اپنی معاشی ضروریات پوری کرتے ہیں بلکہ ساتھ ہی دوسروں کی ضروریات بھی پوری کرتے ہیں۔ تقریباً ہر قابلِ ذکر پیشے اور اسے اختیار کرنے والوں پر اردو کے شعری ادب اطفال نے روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً کسان کے بارے میں نرمی بھارتی کی "ان داتا" اس انداز میں اظہار خیال کرتی ہے۔

لے کے ہل بیل اور کسّی سنبھالا
راگ کچھ اپنی دھن میں گاتا ہوا
کھیت کی سمت ہر کسان چلا
ساری دنیا کا میزبان چلا
دھوپ کا خوف ہے نہ لو کا ڈر
تن بدن کی نہیں ہے کچھ بھی خبر
کام میں یوں جٹا ہوا ہے کسان
خاک میں جیسے مل گیا ہے کسان

(ان داتا۔ بزمی بھارتی)

اس نظم میں کسان کی محنت، جانفشانی اور ہر موسم کے گرم و سرد سے بے نیاز رہ کر جہد جیسے کرتے رہنے کا ذکر نہایت موثر انداز میں کیا گیا ہے۔ اور بچوں کو اس پیشے کی اہمیت اور افادیت کا احساس دلایا گیا ہے۔ مظفر حنفی کی نظم "مزدور کی عظمت" جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، مزدوروں کی ایثار پسندی اور بنی نوع انسان کے تئیں خدمت گزاری کے پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے اور بچوں میں مزدوروں سے محبت، انسیت بلکہ عقیدت کا جذبہ بیدار کرنے کی سعی کرتی ہے۔ اس طویل نظم کے دو بند بطورِ نمونہ درج کیے جاتے ہیں ؎

یہ ہنگامہ شہروں کا　　پانی ان سے نہروں کا
ان کے دم سے زندہ ہیں　　دل طوفانی لہروں کا
بیشک دنیا قائم ہے
مزدوروں کی محنت پر

اس طویل نظم کا اختتام مندرجہ ذیل پرتاثیر بند پر کیا گیا ہے۔

جب تک پہیے گھومیں گے　　جب تک پودے جھومیں گے
ان کے زخمی ہاتھوں کو　　دنیا والے چومیں گے
بیشک دنیا قائم ہے
مزدوروں کی محنت پر

کیف احمد صدیقی نے مختلف پیشہ وروں کو الگ الگ اپنی منظومات کا موضوع بنایا ہے جن کی تفصیل اس گفتگو کے اختتام پر درج کی جائے گی۔ فی الحال موصوف کی نظم "موچی" کے کچھ اشعار درج کیے جاتے ہیں، جن میں ایک معمولی کام کرنے والے کی اہمیت کے بارے میں بچوں کو واقف کرانے کی کوشش کی گئی ہے ؎

آپ سب کے پھٹے ہوئے جوتے ٹانک دیتے ہیں کس نفاست سے
آپ کے پاس ایک سوجا ہے اور تھوڑا سفید دھاگا ہے
آپ کے پاس ایک برش بھی ہے اور پالش ہر ایک رنگ کی ہے
لائق عزت و احترام ہیں آپ
دست کاروں میں محترم ہیں آپ

(موچی۔ کیف احمد صدیقی)

مہدی پرتاپ گڑھی نے ڈاکیے کو اپنی نظم میں جگہ دینا زیادہ مناسب سمجھا کہ ہماری روزمرّہ کی زندگی میں یہ بھی بے حد اہم کردار ادا کرتا ہے لکھتے ہیں ؎

خاکی وردی میں جب وہ آتا ہے بھر کے تھیلا خطوں کا لاتا ہے
منتظر سب ہی رہتے ہیں اس کے تاکہ بچھڑوں کی کچھ خبر لائے
غرضیکہ ڈاکیہ جب آتا ہے تازہ خبریں بھی ساتھ لاتا ہے

(پوسٹ مین۔ مہدی پرتاپ گڑھی)

الغرض نظیر اکبرآبادی تا حال ہندوستان کے مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لاتعداد کرداروں کو شاعری کے پردے پر مصوّر کیا جا چکا ہے۔ پیشہ وروں سے متعلق بے شمار نظمیں ملتی ہیں۔

تہوار:۔

مثل مشہور ہے کہ عید تو بچوں کی ہوتی ہے، بات صرف عید کی نہیں تقریباً ہر تہوار بچوں کے لیے خوشی اور مسرتوں کا پیغام لے کر آتا ہے اور بچے خواہ وہ شہری ہوں یا دیہاتی مدتوں کسی خاص تہوار کی آمد کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور اس تہوار پر ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ نظیر اکبرآبادی نے ہندو اور مسلمانوں کے تقریباً

ہر تہوار کو اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ ان میں کچھ نظمیں بچوں کے لیے بھی ہیں۔ مثلاً ان کی نظم "دیوالی" کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دیوالی کا ہر اک طرف کو اجالا ہوا دیوالی کا
سبھی کے جی کو سماں بھا گیا دیوالی کا کسی کے دل کو مزا خوش لگا دیوالی کا
عجب بہار کا ہے دن بنا دوالی کا

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تہوار ہر اک دکان میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
کھلونوں کھیلوں بتاشوں کا گرم ہے بازار کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے ادھار
سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دوالی کا

(دیوالی۔ نظیر اکبرآبادی)

دیوالی کی چہل پہل، گھروں، بازاروں میں چراغاں کا سامان، خرید و فروخت کی ہما ہمی الغرض تہوار کے تمام پہلو نظم میں جلوہ گر ہیں۔

پھر ایسی ہی گہما گہمی اور رونق کا سامان عرش ملسیانی کی نظم "ہولی" میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اڑاتے ہیں عبیر گلال یہاں چہرے ہیں سبھوں کے لال یہاں
کوئی حال مست کوئی مال مست لٹتا ہے نشے کا مال یہاں
پھر دفتر رقص و رنگ کھلا پھر دھوم مچائی ہولی نے
پھر ڈھول بجا، پھر رنگ اڑا پھر دھوم مچائی ہولی نے

(پھر دھوم مچائی ہولی نے۔ عرش ملسیانی)

ہولی میں اڑتے ہوئے عبیر، گلال، سوانگ رچا کر رقص و سرور میں مگن مستوں کی ٹولیاں اور رنگوں کی پچکاریاں مارتے ہوئے بچے الغرض ہولی کی تمام دھوم دھام فنکاری کے ساتھ نظم میں سمو دی گئی ہے۔

عید کا تہوار بھی ہندوستان میں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ بچے اس دن نئے نئے کپڑے پہن کر بازاروں میں خرید و فروخت کرتے ہیں۔ نیز ایک دوسرے کے گھر جاکر گلے ملتے ہیں۔ سویاں کھاتے ہیں اور مبارکباد دیتے ہیں۔ محوی صدیقی نے بچوں کے لیے عید کے تمام لوازمات اپنی نظم میں سجا کر پیش کر دیئے ہیں، ملاحظہ ہو ایک اقتباس ؎

ننھے منے کھلونے آئے جن کو دیکھ کے جی للچائے
گڑیاں جس دم مل جائیں گی باچھیں ہی بس کھل جائیں گی
آج ہی زیور بن جائے گا پوشاکیں بھی سل جائیں گی
آج تو خوش خوش بہت سویرے حامد اور محمود بھی اٹھے
اپنی اماں سے یہ تقاضا کپڑے لاؤ اچھے اچھے
ابا کو اب ساتھ وہ لیں گے
چلیے بازار ان سے کہیں گے

(عید۔ محوی صدیقی)

بقر عید ایک اہم تہوار ہے کیف احمد صدیقی نے اس کی بڑی واضح تصویر اپنی نظم عید قرباں میں پیش کی ہے۔ دو بند دیکھیے۔

ایک ابراہیم تھے پیغامبر ان کے اسماعیل تھے لخت جگر
وہ کہانی آج پھر یاد آگئی آگئی پھر عید قرباں آگئی
وہ بھی تھے اللہ کے پیارے نبی مرضی حق کے لیے جن کی چھری
حلق اسماعیل پر بل کھا گئی
آگئی پھر عید قرباں آگئی

(عید قرباں۔ کیف احمد صدیقی)

نظم میں عید قرباں کے پس منظر کو واضح کرنے اور اس کی روایت سے بچوں کو متعارف کرانے کے لیے حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کا واقعہ بھی خوش اسلوبی کے ساتھ منظوم کر دیا گیا ہے۔

قومی تہواروں کو بھی اردو شعرا نے بڑی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ "یوم آزادی" اور "۲۶ جنوری" کے سلسلے میں متعدد نظمیں کہی گئی ہیں۔ جن میں "پندرہ اگست" (محبوب راہی) کا یہ بند بطور نمونہ پیش خدمت ہے۔

قوم کی قربانیوں کی داستاں پندرہ اگست
صفحۂ تاریخ پر ہے ضوفشاں پندرہ اگست

نت جمہور کا ہے ترجماں پندرہ اگست
اہل بھارت کے عزائم کا نشاں پندرہ اگست
عیش و راحت کا ہے بحر بیکراں پندرہ اگست
منزل آزادیٔ ہندوستاں پندرہ اگست

(پندرہ اگست۔ محبوب راہی)

اسی طرح یوم جمہوریت کے موقع پر کہی جانے والی نظموں میں "یوم جمہور ہے آج" (مہدی پرتاب گڑھی) اپنی انفرادیت کی حامل ہے۔

گیت یک جہتی کے گاتے جاؤ ملک کی شان بڑھاتے جاؤ
پیار کی فصل اگاتے جاؤ جام خوشیوں کے لنڈھاتے جاؤ
یوم جمہور ہے آج
بات بن جائے جو مل جل کے رہو سب کے جذبات کا سمّان کرو
خود جیو اوروں کو بھی جینے دو رہ تخریب پہ ہرگز نہ چلو
یوم جمہور ہے آج

(یوم جمہور ہے آج۔ مہدی پرتاپ گڑھی)

نئے سال کی آمد بھی کسی تہوار سے کم مسرت بخش نہیں ہوتی۔ سلام مچھلی شہری نے "سال نو" کا استقبال اپنی نظم میں اس طرح کیا ہے ؎

آؤ مچاؤ دھوم کہ آیا اور اک روشن سال
جائیں خوشی سے جھوم کہ آیا اور اک روشن سال
کہ بھونہ خود تاروں کی چال
کہ چمکا ملت کا اقبال
کہ ہوں گے سارے غم پامال
لو ہر غم کو ٹال کر آیا اک اور روشن سال

(نیا سال۔ شان الحق حقی)

یہ تو وہ تہوار تھے جو تمام بچوں کے لیے یکساں طور پر مسرور کن ہوتے ہیں اور متعینہ تاریخوں میں منائے جاتے ہیں لیکن سالگرہ ایک ایسا تہوار ہے جو ہر بچے کے لیے

ایک تاریخ میں آتا ہے اور صرف متعلقہ نونہالوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ ظاہر ہے سالگرہ کے دن متعلقہ بچہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ اور دوشعرا ایسے موقعہ پر مبارکباد دینے والوں میں پیش پیش رہے ہیں۔ اپنی بچی "منیزہ کی سالگرہ پر" فیض احمد فیض اسے اس طرح مبارکباد دیتے ہیں۔

آج سب اس کو پیار کہتے ہیں　　مل کے سب بار بار کہتے ہیں
آئے سو بار تیری سالگرہ　　پھر یوں ہی شور ہو مبارک کا
سو تو کیا، سو ہزار بار آئے　　یوں کہو بے شمار بار آئے
لائے ہر بار اپنے ساتھ خوشی　　اور ہم سب کہا کریں یوں ہی
یہ منیزہ ہماری بیٹی ہے　　یہ بہت ہی پیاری بیٹی ہے

(منیزہ کی سال گرہ۔ فیض احمد فیض)

الغرض ان موضوعات پر بے شمار نظمیں اردو کے شعری سرمائے میں دیکھی جا سکتی ہیں جن میں "سال نو" اور "عید" (اختر شیرانی) "بسنت" (شاد عارفی) "نیا سال" (اسلام مچھلی شہری) "دیس ہوا آزاد" اور "دسہرہ" (جگن ناتھ آزاد) "نیا سال مبارک" (شفیع الدین نیر) "دیوالی" (بینی سیوہاروی) "چھبیس جنوری" (شوکت پردیسی) "نئے سال کا پیغام" (شوکت پردیسی) "صبح آزادی" (مہدی پرتاپ گڑھی) "جشن آزادی" (مسعودہ حیات) "ترانۂ وطن" (خضر برنی) "عید قرباں" (عزیز مراد آبادی) کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔

گھڑی، موٹر، ریل، جہاز وغیرہ:

روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والی مشینیں اور مشینی سواریاں بچوں کو اپنی جانب انوکھے زاویے سے متوجہ کرتی ہیں۔ گھڑی کی ٹک ٹک، موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ کرتے ہوئے تیز رفتاری سے بھاگنا، ریل کا چھک چھک کرتے ہوئے، موٹر کا سڑکوں پر سبک رفتاری سے گزر جانا اور ہوائی جہاز کا ہوا میں اڑنا نہ صرف بچوں کی حیرت واستعجاب میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ انھیں ان چیزوں کی ماہیت پر غور وفکر کے لیے آمادہ بھی کرتے ان چیزوں کو نظم کا موضوع بنا کر باتوں باتوں میں نونہالوں کو مناسب معلومات فراہم کرنے کی روش اردو کے شعرا میں عام رہی ہے۔ مثال کے طور پر "پن چکی" کے سلسلے میں

اسماعیل میرٹھی کی بے حد مشہور نظم کا اقتباس درج کیا جاتا ہے ؎

نہر پر چل رہی ہے پن چکی ! دھن کی پوری ہے کام کی پکی
بیٹھتی تو نہیں کبھی تھک کر تیرے پہیے کو ہے سدا چکر
پیسنے میں لگی نہیں کچھ دیر تو نے چٹ پٹ لگا دیا اک ڈھیر
لوگ لے جائیں گے سمیٹ سمیٹ تیرا آٹا بھرے گا کتنے پیٹ
دل سے محنت کرو جو خوش ہو کر نہ کر اکتا کے خامشی کے ساتھ

دیکھ لو چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی

(پن چکی ۔ اسماعیل میرٹھی)

اسی طرح وجاہت حسین "جیب گھڑی" کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں ؎

ہے بہت اچھی میری چھوٹی گھڑی
چلتی رہتی ہے یہ ٹک ٹک ہر گھڑی
گھومتی رہتی ہیں دونوں سوئیاں
ایک چھوٹی ہے تو ایک اس سے بڑی
اس کے پرزے چلتے رہتے ہیں سدا
بس اسی سے نام ہے اس کا گھڑی

(جیب گھڑی ۔ وجاہت حسین)

آج کی زندگی میں ریڈیو اور ٹرانسسٹر کی اہمیت اور عمومیت محتاج تعارف نہیں رہی۔ بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے گاؤں تک، بڑے اور بچے ان سے یکساں طور پر محظوظ ہوتے ہیں۔ شفیع الدین نیر نے اپنی ایک بے حد آسان نظم میں ریڈیو کو موضوع بنایا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

شہروں، قصبوں میں، گاؤں میں سب بیٹھے ہیں دھوپ میں چھاؤں میں
خبریں دنیا کی سنتے ہیں دانش کے موتی چنتے ہیں
قصے بھی سناتا رہتا ہوں بس دل بہلاتا رہتا ہوں
سائنس کی باتیں ہوتی ہیں تعلیمی باتیں ہوتی ہیں

میں سب کھیلوں کا باوا ہوں ——— بچوں کا دل بہلاتا چلتا
(ریڈیو۔ شفیع الدین نیر)

وفا فرخ آبادی نے موٹر سائیکل کا پر لطف مرقع اپنی نظم میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

پھٹ پھٹ پھٹ پھٹ کرنے والی
میلوں کا دم بھرنے والی
جنگل بستی شور مچاتی
سڑکوں پر ہے دوڑ لگاتی:
سرپٹ دوڑ کے جانے والی
جھٹ پٹ کام بنانے والی
(موٹر سائیکل۔ وفا فرخ آبادی)

نظم نے تین ہی اشعار سے پھٹ پھٹ کرتے ہوئے موٹر سائیکل کا میلوں سفر کرنا جنگلوں بستیوں اور سڑکوں پر دوڑ لگانا اور سرعت رفتار کے ساتھ منزل مقصود پہ پہنچنے کی جستجو کرنا صرف ایک مشینی سواری کی لفظی تصویر نہیں ہے بلکہ اس کے پردے میں بچوں کو اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے وقت ضائع کیے بغیر مسلسل کوشاں رہنے کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔

نثار عباسی نے موٹر سائیکل سے ایک قدم آگے بڑھ کر بچوں کو موٹر کی تصویر دکھائی ہے۔ اپنی نظم "ہماری موٹر" میں لکھتے ہیں۔

ننھی منی پیاری پیاری ——— چابی سے ہے چلنے والی
یہ ہے میری ثمین کی موٹر ——— نام ہے اس کا امبیسیڈر
اس کے پہیے پیارے پیارے ——— تیزی سے ہیں چلنے والے
فرش پہ گھر کے جب چلتی ہے ——— کیسے فراٹے بھرتی ہے

ریل پر بچوں اور بڑوں کے لیے اردو میں متعدد نظمیں تخلیق کی گئی ہیں۔ ہر چند کہ مجاز کی "ریل" بچوں اور بالغوں کی تخصیص کے بغیر قلمبند کی گئی ہے لیکن اس کا عام فہم انداز اپنے موضوع کے ساتھ مل کے دلچسپی کا وافر سامان مہیا کرتا ہے۔ اس شاہکار نظم کے کچھ

شعر ملاحظہ ہوں۔

ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی کھیلتی
وادی کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی

ٹھوکریں کھا کر لچکتی، گنگناتی جھومتی
سرخوشی میں گھنگھروں کی تال پر گاتی ہوئی

رینگتی، مڑتی، مچلتی، تلملاتی، ہانپتی
اپنے دل کی آتش پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی

پیش کرتی، بیچ ندی میں چراغاں کا سماں
ساحلوں پر ریت کے ذروں کو چمکاتی ہوئی

الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف خطر
شاعر آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

(رات اور ریل ۔ مجاز)

ہوائی جہاز کو قتیل شفائی نے بچوں سے متعارف کرانے کے لیے اسے ہوائی پرندے کا نام دیا اور نہایت پرکشش اور دلکش انداز میں آسمان پر ہوائی جہاز کی اڑان کا مرقع اس طرح کھینچا ہے ۔

پھیلائے پروں کو دھرتی سے اڑا ہے
کچھ دور پہنچ کر دھیرے سے اڑا ہے
لوہے کا پرندہ

طے کرتا ہے پل میں پہروں کے سفر کو
چھوڑ آتا ہے پیچھے ایک ایک نگر کو
لوہے کا پرندہ

چمکیلے پروں سے جب تیرے ہوا میں
اک راگ سا چھیڑے خاموش فضا میں
لوہے کا پرندہ

(لوہے کا پرندہ قتیل شفائی)

اس طرح پر پھیلا کر آسمان میں اڑتے ہوئے جہاز کے مڑنے کا منظر بچوں کو کتنا محظوظ کرتا ہے۔ سب بچے جانتے ہیں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ قلیل ترین وقت میں ہزاروں میل کا سفر طے کرنے اور سینکڑوں شہروں میں گھومتے پھرنا ہوائی جہاز کی ایسی صفات ہیں جن کا بیان بچے خوشگوار حیرت کے ساتھ سنتے اور پسند کرتے ہیں۔

ادھر سائنسی دنیا میں چاند اور دیگر سیاروں تک پہنچنے کی مہمات تقریباً ہر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملک میں زور و شور کے ساتھ جاری ہیں۔ ہندوستان بھی مصنوعی سیارے خلا میں بھیج رہا ہے۔ ضرورت تھی کہ بچوں کو سائنسی دور کے اس پہلو سے بھی روشناس کرایا جائے۔ چنانچہ عبدالغنی شمس لکھتے ہیں۔

چل رے راکٹ چاند نگر چل

چاند کے اندر جب جائیں گے
کچھ تحفہ واں سے لائیں گے
خوش ہو کر مل جل گائیں گے
چل رے راکٹ چاند نگر چل

آج انساں مجبور نہیں ہے
یہ راز اب مستور نہیں ہے
چاند نگر اب دور نہیں ہے
چل رے راکٹ چاند نگر چل

(چاند نگر۔ عبدالغنی شمس)

سائنسی ترقی کے اس دور میں خلائی جنگ، کا خطرہ بھی دنیا پر منڈلا تا رہا ہے اس لیے لازمی تھا کہ بچوں میں راکٹ کے ذریعے چاند تک پہنچنے کی خواہش بھی پیدا کی جائے اور اس کے ساتھ انھیں اس امر کا احساس بھی دلایا جائے کہ سائنسی ایجادات اور انکشافات کو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے وقف ہونا چاہیے نہ کہ انھیں انسان کی تباہی اور غارتگری کے لیے استعمال کیا جائے۔ شمس کی محولہ بالا نظم سائنسی ترقی کے اس صحت مند رجحان کی نمایندگی بھی کرتی ہے۔ امن و دوستی کے راہ ہموار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے پریم پال اشک لکھتے ہیں۔

آؤ ننھے بچے آؤ ! — امن کی ننھی گڑیا لاؤ
امن کی گڑیا پیاری پیاری — ننھی منی راج دلاری
اس ننھی گڑیا کو لے کے — آؤ کل سنسار کے بچے
کھیلیں کو دیں ناچیں گائیں — پیار کا میٹھا ساز بجائیں

(امن کی گڑیا۔ پریم وار برٹنی)

ایسے موضوعات پر روشنی ڈالنے والی نظموں میں "دیوار گھڑی" (محوی صدیقی) "بجلی" (شفیع الدین نیر) "اسکول کی گھڑی" (حامد اللہ افسر) "ریل گاڑی" (شفیع الدین نیر) "ہوائی جہاز" (شفیع الدین نیر) "گھڑی کی کہانی" (محوی صدیقی) اس تجزیاتی مطالعہ میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔

جدید ہندوستان کے مسائل:۔

آزادی کے بعد ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں سے تو رہائی مل گئی لیکن اس کے سامنے ابھی ایک بہت بڑی جنگ باقی تھیں۔ یہ جنگ جہالت، غریبی، توہم پرستی، آپسی نفاق، اونچ نیچ، بڑھتی ہوئی آبادی، حفظانِ صحت کی طرف سے بے توجہی اور ایسے ہی دوسرے منفی رویوں کے خلاف لڑی جانے والی تھی جن میں صدہا سال کی غلامی میں مبتلا رہنے والے عوام بری طرح غرق ہو چکے تھے۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے جہاں حکومت کی جانب سے بڑے پیمانے پر مختلف منصوبے تیار کیے گئے ہیں، اردو کے شعرا اپنی نظموں کے ذریعے ان برائیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ ظاہر ہے ایسی سب ہی نظمیں اردو ادب اطفال کے شعری ذخیرے میں شامل نہیں کی جا سکتیں لیکن مستقبل کے ہندوستان کی تعمیر بہرحال بچوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ کئی شعرا نے آسان زبان میں ان خشک موضوعات کو دلچسپ بنا کر بچوں کے لیے اس طرح نظم کیا ہے کہ انھیں اپنے ملک کو درپیش ایسے مسائل کا احساس ہو جائے اور وہ بڑے ہو کر اپنے طور پر بھی ہندوستان سے ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ باہمی نفاق، منافرت اور اونچ نیچ کی تفریق کا انجام شاد عارفی نے نظم میں اس طرح پیش کیا ہے۔

جہاں گنگا سے کٹ جاتی ہیں شاخیں　　جہاں شاخوں میں پٹ جاتی ہیں شاخیں
جہاں رستے سے ہٹ جاتی ہیں شاخیں　　جہاں ریتی سے پٹ جاتی ہیں شاخیں
وہاں رہتی نہیں گنگا کی دھاریں
یہی ہے شادِ عالم سے ہمارا

(اختلافات ۔ شاد عارفی)

الغرض علامتی پیرایہ اختیار کے پرتاثیر انداز میں بچوں کو اس رمز سے آگاہ کیا گیا ہے کہ باہمی منافرت اور فرقہ پرستی ملک کی سالمیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

وامق جونپوری اپنی نظم "دمدار ستارہ" میں توہم پرستی کے مضحکہ خیز پہلو پیش کرکے اس کے خلاف بچوں کو بڑی کامیابی کے ساتھ آمادہ کرتے ہیں۔ دمدار ستارے کے طلوع ہونے پر عوام کے ذہنوں میں جو پریشان کن اندیشے سر ابھارتے ہیں ان کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ نظم حقیقی صورت حال پر بھی اس طرح روشنی ڈالتی ہے۔

کہتا ہے کوئی امن وسکوں ہوگیا نایاب　　پھیلے گی وبا، آئیگا دریاؤں میں سیلاب
جائے تو کہاں جائے یہ انسان بچارہ
آیا جو نظر چرخ پہ دمدار ستارہ
ناگاہ ادھر لال بجھکڑ نکل آئے　　اب ان کے سوا راز فلک کون بتائے
کہنے لگا چلتا ہے مری روح پہ آرہ
آیا جو نظر چرخ پہ دمدار ستارہ

("دمدار ستارہ" وامق جون پوری)

چاند کے بارے میں عوام میں کچھ کم غلط فہمیاں رائج نہیں تھیں۔ بچے چاند کو "ماما" کہتے آئے ہیں۔ انھیں بتایا جاتا ہے کہ چاند کا داغ دراصل اس میں بیٹھی ہوئی سوت کاتنے والی بڑھیا کا عکس ہے اور ایسی بہت سی پرلطف افواہیں چاند کے بارے میں بچوں کے کانوں میں شیر خوارگی کے زمانے سے ہی انڈیلی جاتی ہیں۔ ابصار عبد العلی نے انھیں صحیح صورت حال سے واقف کرانا مناسب سمجھا ہے۔ اپنی نظم میں رقمطراز ہیں ؎

پھر ہمت کی انسانوں نے
چندا ماما کی طرف چلے
تھا نام اپولو آٹھ اس کا
جس میں چندا تک جا پہنچے
ہم سب نے اتنا جان لیا، گو زیادہ دن ٹھہرے تو نہیں
چندا پہ کوئی رہتا ہی نہیں خالی ہی پڑی ہے اس کی زمیں
بڑھیا اور چرخا دھوکا ہے
واں ایسی کوئی بات نہیں
بس دور تک چٹیل میدان ہے
اونچی نیچی ہے جس کی زمیں
چندا کی زمیں بھی چھوٹی ہے
وہ لمحہ آخر آ ہی گیا!
صدیوں سے سفر یہ جاری تھا
منزل پہ آخر آ ہی گیا

(چندا ماما، پیارے ماما۔ ابصار عبدالعلی)

منظر حنفی نے اپنی نظم "ذمہ دار بنوں گا" کے ذریعے نونہالوں میں آزادی کے بعد کے ہندوستان میں جاری و ساری خام کاریوں کو دور کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

آمدنی کم کنبہ بھاری
بچے بھوکے ماں دکھیاری
لاحق روز نئی بیماری
سب کا باعث ہے بیکاری میری بھی ہے ذمہ داری
ہر شعبہ میں رشوت خوری
بازاروں میں سینہ زوری
دن میں جھگڑے رات میں چوری

سب کا باعث ہے بیکاری میری بھی ہے ذمہ داری
(میں ذمہ دار بنوں گا۔ مظفر حنفی)

اس طرح بندوں میں اس مختصر سی نظم میں سادہ اور سلیس زبان میں فنی محاسن کے ساتھ بچوں کو ملک میں رائج رشوت خوری، بیروزگاری، بدنظمی، مفاد پرستی، اور بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل کا احساس دلا کر انھیں دور کرنے کے لیے کمربستہ ہو جانے کی تلقین کی گئی ہے۔

ایسے موضوعات پر "تن صاف رہے من صاف رہے" (شفیع الدین نیر) "چاند پہ جا پہنچا انسان" (جگن ناتھ آزاد) "یہ قول بہت سچا ہے" (مظفر حنفی) "چاند پہ پہنچا ہے انسان" (نثار عباسی) "اچھے شہری" (شفیع الدین نیر) "میں اکثر سوچا کرتا ہوں" (مظفر حنفی) کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بچوں کے لیے اردو میں لوری، کھلونے، مٹھائی، پھل پھول، پرند، جانور، گنتی، نرسری رائمز، منظوم کہانیاں، چاند، بادل، ستارے، حمد، نعت، کھیل، اخلاق، درس، گھریلو کردار، استاد، علم، کتاب، پہیلیاں، طنز و ظرافت، بچوں کی شرارتیں، مختلف ملکی مسائل، نمائش، میلے، چڑیا گھر، سرکس، پکنک، قومی ترانے، حب الوطنی، قومی یکجہتی، مساوات، اسکول یا باغیچہ، مذہبی رواداری، مناظر فطرت، صبح، شام، رات، پہاڑ، ندیاں، تہوار، امتحان، چھٹیاں، ریل، موٹر، قومی اور ادبی رہنما، پیشے، سائنسی موضوعات، وغیرہ کے تحت لکھی جانے والی ہزارہا نظموں میں سے سب ہی کے اقتباسات پیش کرنا مقالہ نگار کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لیے ہر موضوع کی نمائندگی کرنے والی خاص الخاص تخلیقات کے اقتباسات ہی مقالے میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے ہی ان کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انسانی زندگی، جدید معاشرے اور نئے ہندوستان کو درپیش مسائل کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کا احاطہ اردو شعری ادب اطفال نے نہ کیا ہو۔ ان میں اکثر موضوعات تو اپنے مزاج کے اعتبار سے بچوں کی فطرت سے ہم آہنگ ہیں۔ اس لیے ان میں ان کی دلچسپی قدرتی بات ہے لیکن لطف یہ ہے کہ انتہائی پیچیدہ اور خشک موضوعات کو بھی اردو کے شاعروں نے اپنی خلاقی، اپج اور ندرت ادا سے اتنا دلچسپ بنا دیا ہے کہ وہ بچوں ہی کے محسوس ہونے لگتے ہیں مجموعی اعتبار سے ادب اطفال کا یہ گوشہ تابناک، وسیع اور عمیق ہے اور اسے ہم عالمی ادب کے مقابلے پر پوری اعتمادی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔

دسواں باب

کہانی

"اردو ادب اطفال" کی نثری اصناف میں کہانی فنی خوبیوں، متنوع موضوعات اور نوع بہ نوع تکنیکوں کے پیش نظر غالباً اہم ترین صنف ہے۔ بہ اعتبار مقدار بھی گزشتہ سو سوا سو برس میں بچوں کے لیے جتنا نثری ادب پیش کیا گیا ہے اس کا بڑا حصہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔

انشاء اللہ خاں انشا نے رانی کیتکی کی بنیاد ایسی نیک ساعت میں رکھی تھی کہ یہ روایت آگے چل کر کہانی کے ایک قصر بلند کی صورت اختیار کر گئی۔ اس وقت انشا نہ اردو کے بچوں کے لیے شعوری طور پر کوئی کہانی لکھنے بیٹھے تھے۔ نہ ہندی کہانی کی داغ بیل ڈال رہے تھے۔ انھیں تو اپنے ادبی معاصرین کے سامنے خالص اردو کا ایک ایسا نثری پارہ پیش کرنا مقصود تھا جو فارسی عربی الفاظ کی آمیزش سے پاک ہو۔ "اردو ادب اطفال" کی خوش بختی کہ اسے "رانی کیتکی" کی شکل میں کہانی کی عظیم الشان روایت کا سہرا ہاتھ آگیا۔ تفریحی نوعیت کی یہ پُرلطف کہانی اخلاقی یا درسی تقاضوں سے آزاد رہ کر لکھی گئی تھی۔ جس میں ہندی الفاظ کی پٹ اور خالص اردو کے استعمال نے نہ صرف زبان کو شیریں، اجلی اور سبک بنائے رکھا بلکہ اسے اتنا عام فہم بھی کر دیا کہ بچے بھی پڑھ کر محظوظ ہو سکیں۔ کہانی کا موضوع روایتی ہونے کے باوصف انشا کی خلاقی نے اس میں ندرت اور تازگی پیدا کر دی ہے۔ ذرا یہ چند سطریں ملاحظہ فرمائیں۔

"ایک رات رانی کیتکی نے ماں (پنچ رانی کام لتا) کو بھلاوے میں ڈال کے یہ پوچھا۔ "گرو جی گسائیں جہندر گیر نے جو بھبوت میرے باپ کو دیا تھا وہ کہاں رکھا ہوا ہے اور اس سے کیا ہوتا ہے؟ اوس کی ماں نے کہا۔ "میں تیرے واری! تو کیوں پوچھتی ہے؟ رانی کیتکی کہنے لگی۔ "آنکھ مچول کھیلنے کے لیے چاہتی ہوں۔ جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلوں اور چور بنوں تو کوئی مجھکو پکڑ نہ سکے۔"

رانی کام لتا نے کہا۔ "وہ کھیلنے کے لیے نہیں ہے۔ ایسے لٹکے کسی برے دن کے سنبھال کر ڈال رکھتے ہیں کیا جانے کوئی گھڑی کیسی ہے نہیں" رانی کیتکی اپنی ماں کی اس بات سے اپنا مونہہ تھتھا کے روٹھ گئی اور دن بھر کھانا نہیں کھایا۔"[1]

مقصدیت کی آرائش سے پاک انشا کی اس شاہکار کہانی سے جس صحت مند روایت کا آغاز ہوا تھا حالات کی ستم ظریفی سے بہت جلد مقصدیت اور اصلاح پسندی کا شکار ہو گئی۔

انیسویں صدی عیسوی میں کہانیاں خاص مقصد کے پیش نظر لکھی جانے لگیں۔ محمد حسین آزاد ڈپٹی نذیر احمد اور۔ اسماعیل میرٹھی وغیرہ ایسے ہی مصنفین ہیں۔ جنھوں نے بچوں کی درسی ضروریات کے تحت کہانیاں لکھی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی اکثر تخلیقات میں پند و نصیحت پر زیادہ توجہ کی گئی۔ ان لکھنے والوں کے سامنے بے شمار قومی مسائل تھے اور سنہ ۱۸۵۷ء کے ہولناک ردعمل سے ملک و قوم کو نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ان کا مطمح نظر تھا۔ نونہالان ملک و قوم کی ذہنی پرورش اور تعلیم و تربیت پر بھی ان کی دور رس نگاہیں پڑیں اس مقصد کے حصول کے لیے ان لوگوں نے جو کہانیاں لکھی ہیں وہ کسی نہ کسی پیرایہ میں عمل پیہم اور اخلاقیات کا درس دیتی ہیں۔

محمد حسین آزاد کی کہانی "نصیحت کا کرن پھول" سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

---

[1] انشاء اللہ خاں انشا۔ "رانی کیتکی کی کہانی" (مرتبہ عبدالستار دلوی) مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر بمبئی سنہ ۱۹۷۴ء ص ۱۲۱/۱۲۰

آدمی اشراف نیک نیت بھلامانس تھا۔ بی بی بھی ایسی نیک چلن نیک بخت ملی کہ خدا کی بندگی کے ساتھ خاوند کی تابعداری بجالاتی اور جب عبادت الہی سے فرصت پاتی گھر بنانے سنوارنے میں معروف ہوتی۔ کھانے پکانے کی خبر لیتی۔ نوکروں چاکروں کے کام کاج کو دیکھتی بھالتی ماں باپ نے سینا سیو انا، گو کھر و ٹھپہ بنت کلابتو سب کام سکھلا کر پانچوں انگلیاں چراغ بنادیے تھے۔[1]

اس اقتباس میں سلیقہ شعار عورت کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں جو امور خانہ داری میں ماہر تھی۔

انیسویں صدی کے کہانی لکھنے والوں میں اس درسی اور اخلاقی رجحان کی نمائندگی میں ڈپٹی نذیر احمد کی خدمات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ ان کی کہانی مشقت کی زندگی سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

ہمسائے کی یہ بات سن کر مجھ کو ایسی ندامت ہوئی کی پسینے پسینے ہو گئے اور جی میں سوچے کہ الہی کیا بات ہے۔ ان لوگوں کو پیٹ بھر کھانا تو نصیب نہیں ہوتا پھر اتنے قوی اور مضبوط کیوں ہیں؟ ایک دن میں نے استانی جی سے پوچھا تو انہوں نے کہا، یہ سب زور اور سب بوتا اور سارا اہل محنت کا ہے۔ ہم لوگ اہدیوں کی طرح نکمے پڑے رہتے ہیں۔ کھانا جیسا پکایا ویسا ہی پیٹ میں دکھ دیا۔ ہاضمہ درست ہے نہ ہی کھل کر بھوک لگتی ہے سدا روگی ہمیشہ کے دکھیا۔[2]

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ پند و نصیحت کے ساتھ نذیر احمد کی مخصوص محاورہ بندی کی ادا ان کی کہانی کو کیسا انفرادی رنگ عطا کرتی ہے۔

اس دور میں بچوں کے پیے لکھنے والے ان وسائل اور جدید نظریات سے بھی بہرہ مند نہ تھے جن سے موجودہ ترقی یافتہ دور کے مصنفین مستفیض ہو سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے بطور نمونہ عربی اور فارسی کی چند درسی اور غیر درسی نوعیت کی کتب تھیں۔ جن کی پیروی وہ اردو میں۔

---

[1] انشاء اللہ خاں انشاؔ۔ "رانی کیتکی کی کہانی" (مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی)، مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر بمبئی ۱۹۷۵ء ص ۱۲۰-۱۲۱۔ [2] "نصیحت کا کرن پھول" آزاد بک ڈپو، دہلی، ص ۱

میں بھی اخلاقی اور اصلاحی کہانیاں کافی تعداد میں لکھی گئیں جن کی کثیر مثالیں اسماعیل میرٹھی کی درسی کتب میں دیکھی جا سکتی ہیں ایک کہانی ''ہمت'' کا یہ مختصر حصہ بطور نمونہ درج ہے

"ایک جوان تھا صاحب ثروت مفت خوارا اور بدرویہ دوستوں اور نالائق ہم نشینوں کی صحبت نے اس کو ایسا خراب و خستہ کر دیا کہ تھوڑے ہی عرصے کے اندر بہت سی جائداد عیاشی فضول خرچی اور سیر تماشے میں اڑا دی رہنے کو مکان نہ رہا نہ چڑھنے کو سواری قدیم الخدمت ملازموں نے چندے مفارقت کی مگر جب دیکھا کہ ولی نعمت آپ ہی نان شبینہ کو محتاج ہیں تو وہ بھی ایک ایک کر کے چل دیے دغا بازوں اور کمینہ خصلت مصاحبوں نے تو پہلے ہی جب صاحبی بگڑتی دیکھی ۔آمد و رفت میں کمی کر دی یہاں تک کہ اس کی صورت سے نفرت کرنے لگے"[1]

اخلاقی تعلیم و تربیت کا یہ سلسلہ پوری انیسویں صدی کے اختتام تک جاری رہا اوائل بیسویں صدی کے مشاہیر میں منشی پریم چند ۔خواجہ حسن نظامی لیلیٰ خواجہ بانو حامد اللہ افسر میرٹھی وغیرہ کے یہاں بچوں کی ذہنی پرورش اور ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں پر بھی توجہ کی گئی ۔ہر چند کہ ان لوگوں نے بھی کہانیوں میں درس و تدریس اور اخلاقی تعلیم کو یکسر نظر انداز نہیں کیا لیکن اس کے ساتھ ہی تخلیقات میں تنوع اور دلچسپیوں کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے ۔اس ضمن میں منشی پریم چند پیشرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ ان میں کردار ہندوستانی بچے ہیں ۔نیز واقعات کو ہندوستان کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے انھوں نے بچوں کے لیے جو درجنوں کہانیاں لکھیں ان کا ذکر مفصل ایک اور باب میں شامل ہے ۔ان کی یہاں دو ایک نمائندہ کہانیوں کا حوالہ ہی بحث کو مکمل کرنے کے لیے کافی ہوگا۔

پریم چند کی کہانی ''نادان دوست'' چھوٹے بچوں کی دلچسپیوں کا وافر سامان فراہم کرتی ہے ۔ اس کہانی کے کردار دو معصوم بچے ہیں جنہیں چڑیا چڑے اور ان کے گھونسلوں سے بہت محبت تھی کمسن بہن بھائی نے چڑیا کے بچوں سے محبت کے باوجود نادانی میں اس کے انڈوں کو برباد کر دیا۔ کہانی کی زبان بہت آسان اور عام فہم ہے پریم چند کے اسلوب اور سادگی کی مثال ''نادان دوست'' کے اس اقتباس سے نمایاں ہے :۔

---

[1] شفقت کی زندگی ۔مشمولہ بہاری کتاب نثر مولف :خلیل الرب، سری رام مہرہ اینڈ کمپنی آگرہ ۱۹۶۰ء ص ۸۰

[2] اسماعیل میرٹھی ۔اردو زبان کی پانچویں کتاب مرکزی بکڈپو دہلی ص ۲۵-۲۶

مکیشو کے گھر میں ایک کارنس کے اوپر ایک چڑیا نے انڈے دیئے تھے
کیشو اور اس کی بہن شیاما دونوں بہت غور سے چڑیوں کو وہاں
آتے جاتے دیکھا کرتے۔ سویرے دونوں آنکھ ملتے کارنس کے پاس پہنچ جاتے
اور چڑا اور چڑیا دونوں کو وہاں بیٹھا پاتے۔ ان کو دیکھنے میں دونوں بچوں
کو نہ جانے کیا مزا ملتا ہے۔ دودھ اور جلیبی کی بھی سدھ نہیں رہتی
تھی۔ دونوں کے دل میں طرح طرح کے سوالات اٹھتے، انڈے کس رنگ
کے ہوں گے؟ کیا کھاتے ہوں گے؟ ان میں سے بچے کس طرح نکل آئیں
گے؟ بچوں کے پر کیسے نکلیں گے؟ گھونسلا کیسا ہے؟ لیکن ان باتوں کا جواب
دینے والا کوئی نہ تھا۔[1]

کتنی آسانی سے پریم چند نے ابتدائی کچھ سطروں میں اپنے کم سن قارئین کی توجہ کہانی پر
مرکوز کی ہے۔ اہل نظر صاف محسوس کر سکتے ہیں۔ پریم چند کی ایک اور کہانی "سچائی کا انعام"
نسبتاً کچھ بڑے اور سمجھدار بچوں کی شرارتوں اور شوخیوں کے واقعات پر مشتمل ہے۔

ایک مدرس نے کیاریوں میں رنگ برنگ کے پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے۔ بچے
ان کی دیکھ بھال کرتے لیکن کچھ زمینداروں کے شرارتی بچے اس باغبانی کو پامال کرنا چاہتے
تھے اور ایک دن اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے لیکن کہانی کے ہیرو بچے باز بہادر کی
حق گوئی نے سارے راز کو فاش کر دیا۔ کہانی کا انجام بچوں کے دلوں پر گہرا تاثر مرتسم کرتا ہے۔
کہانی کے درج ذیل پر تاثیر اختتام سے پریم چند کی فنی مہارت اور نفسیاتی درک کا بخوبی اندازہ
ہوتا ہے۔

"جب مدرسہ بند ہوا تو جماعت کے قریب قریب سب طلبہ باز بہادر
کے پاس گئے۔ جگت سنگھ ان کا وکیل بن کر بولا۔
بھائی صاحب ہم سب کے سب تمہارے خطاوار ہیں، تمہارے ہم سے
جو بدسلوکی ہوئی اس پر ہم لوگ دل سے شرمندہ ہیں۔ ہماری خطا معاف کرو۔ تم

---

[1] "نادان دوست" مشمولہ "ہماری زبان حصہ سوم" تیار کردہ سر رشتہ تعلیم اتر پردیش
لکھنؤ سنہ ۱۹۸۶ء۔ ص ۷۰۔

شرافت کے پتلے ہو، ہم لوگ سنگدل، اجڈ گنوار ہیں اب ہمیں معاف کردو۔"
باز بہادر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے بولا۔ میں تمہیں پہلے بھی اپنا
بھائی سمجھتا تھا اور اب بھی وہی سمجھتا ہوں، بھائیوں کے جھگڑے میں سالی کیسی"[1]

عام طور پر پریم چند کی کہانیوں میں نفسیاتی پیچیدگیوں اور چھوٹے چھوٹے دکھ سکھ کی عکاسی نہایت چابکدستی کے ساتھ کی گئی ہے اور یہ کہانیاں نثری ادب اطفال کی ترقی کی اگلی منزلوں سے آشنا کرتی ہے۔

چڑیا چڑے کی کہانیوں کو مختلف پیرایوں میں مائیں عہد قدیم سے چھوٹے بچوں کو سناتی آئی ہیں۔ اگرچہ یہ کہانیاں بھی پند و نصیحت پر مبنی ہوتی ہیں لیکن سیدھے سادے موضوع میں بچوں کی دلچسپیوں کے لیے پُر لطف واقعات موجود ہوتے ہیں ایسی کہانیاں تین سے پانچ برس تک کے بچوں کو بہلانے اور ان کے تخیلات کو مہمیز کرنے کا بہترین وسیلہ رہی ہیں۔ ادب اطفال کے کئی مصنفین نے ایسی کہانیوں پر توجہ صرف کی ہے۔ اس ضمن میں خواجہ حسن نظامی کا نام سرفہرست آتا ہے۔ حسن نظامی نے اس نوع کی کئی کہانیاں قلبند کیں جو اخبار "ہمدم" (لکھنؤ) کے سنہ ۱۹۱۹ کی اشاعتوں میں بکھری ہوئی ہیں۔[2]

خواجہ صاحب کی اہلیہ خواجہ بانو نے غالباً "ہمدم" (لکھنؤ) میں مطبوعہ ان ہی کہانیوں کی مقبولیت سے متاثر ہو کر معاشرے میں مروج سولہ روایتی کہانیوں کو اپنے الفاظ میں قلبند کیا ہے۔ جو باتصویر کتاب کی شکل میں منظر عام پر لائی گئی ہیں۔ "چڑیا چڑیا پٹ کھول دے" مقبول ترین کہانی ہے۔ ایک مثال اس کہانی سے پیش کرتا ہوں۔

"ایک چڑا تھا، ایک چڑیا تھی، چڑا لایا دال کا دانا، چڑیا لائی
چاول کا دانہ، دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی، گھر میں نمک نہ تھا۔
چڑیا نے چڑے کو بازار نمک لینے کو بھیجا، جب چڑا چلا گیا تو چڑیا نے
کھچڑی کھا پی کر جھوٹے برتنوں میں گندا پانی بھر چھینکے پر رکھ دیا اور

---

[1] منشی پریم چند "سچائی کا انعام" مشمولہ دبستانِ سوم۔ مرتبہ رفیق حسین۔ پریمیئر پبلشنگ ہاؤس۔ بنارس۔ سنہ ۱۹۰۷ء۔ ص ۵۳

[2] خواجہ حسن نظامی "بچوں کی کہانیاں" پہلی خواجہ بانو۔ دفتر خواجہ حسن نظامی نئی دہلی سنہ ۱۹۵۵ء ص ۲

اپ آنکھوں پر پٹی باندھ چکی کے نیچے لیٹ گئی۔ چڑا بازار سے نون لے کر آیا تو دیکھا گھر کے کواڑ بند ہیں۔ اس نے پکارا۔

چڑیا چڑیا پٹ کھول دے ۔لہ

ماں کے آغوش میں پرورش پانے والے تین سال سے پانچ سال تک کے نونہالوں کی ذہنی استعداد اور دلچسپیوں سے مصنفہ کو کتنی بھرپور واقفیت تھی۔ درج بالا اقتباس اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

یہی وہ دور ہے جب کہانی کو معلومات فراہم کرنے کا وسیلہ بنانے کی روش عام ہو گئی۔ جس کی مثالیں حامد اللہ افسر کی نگارشات "جانوروں کی کہانی" "مکانوں کی کہانی" اور "جانوروں کی عقلمندی" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جیسا کہ عنوانات سے ہی واضح ہے کہ افسر نے ان تخلیقات کے وسیلے سے بچوں کو مختلف جانوروں کے بارے میں کارآمد باتیں بتلانے کی کوشش کی ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ایسی مقصدی کہانیوں میں بھی بچے کہیں بے کیفی کا احساس نہیں کرتے۔

"جانوروں کی عقلمندی" سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ایک صاحب کے ہاں ایک طوطا پلا ہوا تھا۔ اس طوطے کے پنجرے میں چند زندہ گھونگھے ڈال دیے گئے۔ پہلے تو طوطے نے کوئی توجہ ہی نہ کی لیکن جب وہ گھونگھے رینگنے لگے تو طوطے کو ان میں بہت دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے ایک گھونگھے کو اٹھا کر اس کا معائنہ کیا اور اس کے منہ کی طرف سے کیڑے کو پکڑنے کی کوشش کی مگر جب کیڑا گھونگھے کے اندر چلا گیا تو طوطے کا شوق ختم ہو گیا اسی طرح روزانہ اسے گھونگھے دیے جاتے اور وہ انھیں اٹھا کر دیکھتا اور نیچے ڈال دیتا۔ ایک روز اس نے اسی طرح کے گھونگھے کو اٹھا کر دیکھا اور جھنجھلا کر نیچے پٹک دیا۔ دوسرے روز گھونگھا دینے سے پہلے طوطے کے پنجرے میں ایک پتھر کا ٹکڑا ڈال دیا گیا۔ اس کے بعد جو اسے گھونگھا دیا گیا تو اس نے اسے اٹھا کر پتھر سے

لہ لیلیٰ خواجہ بانو "بچوں کی کہانیاں" دفتر خواجہ حسن نظامی۔ نئی دہلی سنہ ۱۹۵۱ء ۔ ص ۲

دے پٹکا۔ خول ٹوٹ گیا جب اس میں سے کیڑا نکل پڑا تو طوطا اسے کھا گیا
اس کے بعد سے وہ روز اسی طرح گھونگھے کھانے لگا[1]

یہ کہانی بچوں میں حیرت و استعجاب کا مادہ پیدا کرتی ہے اور طوطے کی طرح چیزوں کی ماہیت اور نوعیت جاننے کا جذبہ ابھارتی ہے۔ البتہ اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ حامد اللہ افسر جیسے کہنہ مشق مصنف کی نگاہ سے یہ نکتہ اوجھل رہا کہ طوطا گوشت خور نہیں سبزی خور پرندہ ہے۔

اس دور میں جب عموماً بچوں کے لیے اصلاحی، نصیحت آموز اور معلوماتی کہانیاں لکھی جارہی تھیں اس زمانے میں ممتاز علی نے بچوں کی تعلیم و تربیت کی جانب ایک خاص انداز میں توجہ کی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے موصوف نے لاہور سے بچوں کا مقبول اور معروف رسالہ "پھول" جاری کیا۔ جس کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ بچوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے عام فہم زبان میں انتہائی دلچسپ تفریحی نوعیت کی کہانیاں اس خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کی جائیں کہ بچے بے اختیار انھیں پڑھنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور ان میں کمسنی ہی سے مطالعہ کی عادت پختہ ہو جائے تاکہ آگے چل کر وہ درسی معلوماتی اور اخلاقی طرز کی کتب اور کہانیاں پڑھنے کے لیے ذہن کو تیار کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ممتاز علی نے تجربے اور دانشمندی سے کام لے کر "پھول" کی ادارت کے لیے وقتاً فوقتاً امتیاز علی تاج، حفیظ جالندھری، احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب اور غلام عباس جیسے تخلیق کاروں کا ہی انتخاب کیا ہے۔ پھول سے متعلق کہانی لکھنے والوں میں امتیاز علی تاج، حفیظ جالندھری، حجاب امتیاز علی، ایم اسلم، احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب اور چراغ حسن حسرت وغیرہ کے نام بھی اس رجحان کا پتہ دیتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ نہ تھا۔ ان سب کا بنیادی مقصد تفریح کے پردے میں بچے کو آزادانہ مطالعہ کی جانب مائل کرنا تھا۔

ایم اسلم کی کہانیوں میں سے "چالاک سلیم" اس رجحان کی بہترین مثال ہے۔ سلیم بہت عقلمند اور چالاک لڑکا ہے، ماں اس کے مستقبل کی طرف سے غیر مطمئن ہے سلیم ایک جگہ سے پانچ سو روپیہ لے کر آتا ہے۔ کہانی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

---

[1] حامد اللہ افسر ۔ جالندھر کی عقلمندی سنگم کتاب گھر۔ نئی دہلی ۔ جنوری سنہ ۱۹۹۰ ۔ ص ۸

"ہاں ماں۔ پورے پانچ سو روپے ہیں" سلیم نے کہا۔ "لیکن تو اتنے روپے کہاں سے ملے؟" ماں نے پوچھا۔

"خدا نے مجھے عقل دی ہے۔ میں نے عقل سے حاصل کیے ہیں۔ سلیم نے جواب دیا۔ اب کل سے میں کاروبار شروع کر دوں گا اور خدا نے چاہا تو کسی روز مالدار بن جاؤں گا"

سلیم نے کچھ کاروبار شروع کر دیا چونکہ ہوشیار اور محنتی تھا تھوڑے عرصے میں کایا پلٹ ہو گئی"۔[1]

ایم اسلم کی کہانی بچوں کی دلچسپی اور ان کی نفسیات سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے بھی بچوں کے لیے جو کہانیاں قلمبند کی ہیں وہ بچے کی تفریح طبع کا بھرپور سامان فراہم کرتی ہیں۔ ان کی کہانی "جلیبیاں"[2] اس کی عمدہ مثال ہے جس میں بچوں کی فطرت کا دلچسپ مرقع پیش کیا گیا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو۔

"گلی میں محلے بھر کے لڑکے جمع ہو گئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔ ہم سیر تو ہو ہی چکے تھے اس لیے موج میں آگئے اور ایک ایک جلیبی ان کو بھی تھما دی وہ خوش ہو کر کودتے اور چیختے ہوئے ادھر ادھر گلیوں میں بھاگ گئے مگر شاید ان ہی سے یہ خوش خبری سن کر نئے بچے آنکلے ہم نے لپک کر حلوائی کی دکان سے ایک اور روپے کی جلیبیاں خریدیں اور واپس آکر ایک مکان کے چبوترے پر کھڑے ہو کر بچوں میں یوں بانٹ دیں جیسے یوم آزادی پر گورنر صاحب غریبوں، مسکینوں میں چاول بانٹا کرتے تھے"۔[2]

اس طرح جلیبی جیسے شیریں موضوع کے اردگرد پُرلطف واقعات کا ایسا تانا بانا تیار کیا گیا ہے کہ عمر قاری اس کی گرفت سے آزاد نہیں رہ سکتا۔

"پھول" گروپ کے ایک اور اہم ترین رکن میرزا ادیب کی کہانیاں بھی بچے کی تفریح

---

[1] "چالاک سلیم" مشمولہ ماہنامہ کھلونا۔ نئی دہلی۔ سنہ ۱۹۵۸ء ص ۱۴۔ مدیر ان یونس دہلوی وغیرہ۔

[2] احمد ندیم قاسمی "جلیبیاں" مشمولہ "ماہ نو" لاہور نومبر سنہ ۱۹۷۷ء ص ۱۵۔ چیف ایڈیٹر کشور ناہید۔

پر زور دیتی ہیں۔ وہ کہانی کی تکنیک اور ادبی تقاضوں کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ قصہ بیان کرنے کے لیے موصوف نے نئے نئے اسالیب وضع کیے اور نوع بہ نوع تکنیکوں سے کام لیا۔ ان کی کہانی تنوع کے اعتبار سے بھی ارتقا کی جانب گامزن نظر آتی ہے۔ ایک مختصر سا اقتباس ان کی کہانی "ایک خرگوش اور غار" سے نمونے کے طور پر درج کیا جارہا ہے۔

"ایک دن اسے ملی ایک بکری سفید رنگ کی پیچھے میدان میں گھاس چررہی تھی۔ خرگوش اس کے پاس پہنچا اور ادب سے بولا "بہن بکری سلام" بکری نے جو خرگوش کو اپنے سامنے دیکھا تو ہنس کر کہنے لگی۔
"ارے، تو کب سے میرا بھائی بن گیا، میں بکری تو ذرا سا خرگوش۔ میرا تجھ سے کیا واسطہ؟
خرگوش کو اس کی یہ بات اچھی نہیں لگی تاہم اس نے تو سوچ رکھا تھا کہ کسی کو اپنے گھر میں لاکر ہر وقت کی تنہائی دور کردے گا۔ دوبارہ بکری سے مخاطب ہوا۔
"بکری بہن! میں نے کوئی بری بات نہیں کی۔ سلام کیا ہے۔"
"اچھا سلام کیا ہے، وعلیکم السلام۔ مزاج کیسے ہیں حضور کے، کہاں رہتے ہیں؟ بکری نے ذرا محبت سے پوچھا۔
خرگوش خوش ہوگیا کہ بکری نرم پڑ گئی ہے۔ بولا
وہ سامنے میرا گھر ہے اپسند فرمائیں تو تشریف لے چلیں۔"[1]

"پھلواری گروپ" کے کچھ مصنفین نے بچوں کے لیے طبع زاد کہانیوں کے ساتھ ساتھ "پنچ تنتر" "داستان امیر حمزہ" "طلسم ہوشربا" "آرائش محفل" اور قصہ چہار درویش "سنسکرت عربی، فارسی زبانوں کی کلاسیکی داستانوں سے ماخوذ کہانیاں بچوں کے لیے بھی قلمبند کی ہیں۔ مثلاً "عمر عیار کے کارنامے" (حفیظ جالندھری)، "ابوالحسن" (امتیاز علی تاج) "الہ دین کا چراغ" حجاب امتیاز علی) وغیرہ اس روش کی غماز ہیں۔

---

[1] "ایک خرگوش اور غار" مشمولہ ماہنامہ کھلونا نئی دہلی۔ جولائی سنہ ۱۹۸۳ء ص ۳۹ (مدیران یونس دہلوی اور الیاس دہلوی)

"پھول مگر دوپ سے متوازی جامعہ کے مصنفین کا حلقہ تھا۔ اس حلقہ کی انفرادیت یہ ہے کہ اس نے تعلیم و تدریس اور اخلاقی تربیت کی قدیم روش کو یکسر معدوم ہونے سے بچائے رکھا ہے اپنے طریقہ کار میں جدید تقاضوں سے مطابقت بھی پیدا کی۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے "پیام تعلیم" کا اجرا عمل میں آیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں بہت سے دانشور، شعرا، اور ادبا، نونہالوں کی تربیت کے لیے خاص طرز کی کہانیاں لکھنے پر مائل ہوئے۔ اس جماعت کے لکھنے والوں نے تدریسی نوعیت کی کہانی کو عروج پر پہنچایا اور تقریباً تمام دلچسپ موضوعات کو بچوں کی کہانیوں کے دائرے میں لے آئے۔ یہ لوگ اہل قلم بھی تھے اور ابتدائی درجات کے استاد بھی۔ اس لیے ان کی کہانیوں نے دو آتشہ کا کام دیا۔ یعنی ان کی نگارشات میں دلچسپی اور اخلاقی درس دونوں رنگوں کی آمیزش ہے۔ مصنفین جامعہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی حیثیت اس اعتبار سے منفرد ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے حلقے کے لکھنے والوں کو اس خاص طرز کی چیزیں لکھنے کی تربیت و ترغیب دی بلکہ خود بھی اسی انداز کی تخلیقات پیش کیں۔ ابو خاں کی بکری جیسی ان کی متعدد کہانیاں ہیں۔ "ابو خاں کی بکری" کی ابتدائی عبارت ملاحظہ ہو۔

> "الموڑہ میں ایک بڑے میاں رہتے تھے۔ ان کا نام تھا ابو خان انھیں بکریاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ اکیلے آدمی تھے۔ بس ایک دو بکریاں رکھتے تھے۔ دن بھر انھیں چراتے پھرتے۔ ان کے عجیب عجیب نام رکھتے۔ کسی کا کلوا، کسی کا مونگیا، کسی کا کلا۔ ان سے نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہتے اور شام کے وقت بکریوں کو لے کر گھر میں باندھ دیتے۔ الموڑہ پہاڑی جگہ ہے اس لیے ابو خاں کی بکریاں بھی پہاڑی نسل کی ہوتی تھیں۔"[۱]

اس انتہائی سادہ لیکن پُر لطف اور استعجاب انگیز ابتدا کے بعد کہانی میں ابو خاں کی بکری کی نافرمانی، حوصلہ مندی اور دیگر دلچسپ واقعات کے وسیلے سے ننھے قاریوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ بڑوں کا کہنا نہ ماننے کا انجام المناک ہوتا ہے۔

---

[۱] ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ "ابو خاں کی بکری" مشمولہ "ہماری زبان" حصہ اول۔ سررشتہ تعلیم اتر پردیش سنہ ۱۹۶۷ء۔ ص ۵۱

جامعہ کے مصنفین کی ایک خوبی یہ بھی رہی ہے کہ انھوں نے بچوں کی عمروں کے مختلف ادوار اور ان کی نفسیاتی استعداد کے اعتبار سے کہانیاں قلمبند کیں۔ یہ اعتبار مدارج تین سے پانچ برس، چھ سے آٹھ برس اور نو سے بارہ برس تک کے بچوں کے لیے زبان و بیان کا خیال رکھا۔ اور کوشش کی کہ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کے ذخیرۂ الفاظ اور معلومات میں بھی مناسب اضافہ ہوتا رہے۔ بچہ کو کہانی کے وسیلے سے مطالعہ کی عادت پڑے۔ اس وجہ سے ایسی کہانیوں کے موضوعات خواہ کچھ ہوں لیکن ان کے عنوانات اتنے دلچسپ ہوتے ہیں اور انھیں ایسی فنکارانہ مہارت سے پیش کیا جاتا ہے کہ چھوٹے بچے بے ساختہ ان کتابوں پر لپکتے ہیں۔ اس فن میں شفیع الدین نیر اور عبدالواحد سندھی کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ شفیع الدین نیر کی کہانی "شیر خاں کے معرکے" کا یہ اقتباس دیکھیے۔

> "کرتے بھی کیا، چند روز رو دھو کر بیٹھ رہے۔ باپ کے بعد بھی پڑھنے میں دل سے لگے رہے۔ ماں سے پہلے ہی محبت تھی، اب وہ اور بھی بڑھ گئی۔ ان کی خوشی اور آسائش اب ماں ہی کے دم سے تھی۔ ہر وقت پروانے کی طرح اپنی ماں پر فدا رہتے تھے۔ ماں کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہا دینے کو معمولی بات سمجھتے۔ میاں کی جدائی کا صدمہ ان کی ماں کو اندر ہی اندر گھلا رہا تھا۔ مگر وہ باہمت بی بی اپنے صدمے کو چھپائے رکھتی۔ بچوں کے کڑھنے اور غمگین ہونے کے خیال سے کبھی ظاہر نہ ہونے دیتی۔ اس صدمے نے آہستہ آہستہ ایک مہلک بیماری کی شکل اختیار کرلی۔"[1]

درج بالا عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ نیر صاحب بچوں کو بہلانے میں ماہر تھے۔ اور بچوں میں بچوں کی طرح گھل مل جانے کا گُر انھیں خوب یاد تھا۔ محولہ بالا اقتباس میں ماں بیٹے کی محبت اور ایک دوسرے کی غمگساری کے جذبات کو عام فہم اور آسان زبان میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔

عبدالواحد سندھی کی کہانی "پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا" بھی قابل ذکر ہے۔ کہانی کا نام ہی ایسا ہے کہ نگاہ پڑتے ہی بچہ بے اختیار اسے پڑھنا چاہے گا۔ اس کہانی کی

---

[1] محمد شفیع الدین نیر، شیر خاں کے معرکے، مینر کتاب گھر نئی دہلی سنہ ۱۹۷۹ء ص ۸/۹

ابتدائی سطور ملاحظہ ہوں۔

"ایک نائی تھا
اس کا لڑکا تھا
وہ بڑا شریر تھا
اس کا نام رام تھا
رام ایک دن سیر کو نکلا
اسے ایک بڑھیا ملی
بڑھیا نے اسے دو کوڑیاں دیں
ایک کوڑی بڑی تھی دوسری کوڑی چھوٹی تھی" لہ

اس اقتباس سے کہانی کی زبان اور اسلوب کی سادگی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے پوری کہانی اس طرح بہت چھوٹے چھوٹے جملوں کے وسیلے سے مرتب کی گئی ہے۔ اور الفاظ کے انتخاب میں بھی نہایت احتیاط سے کام لیا گیا ہے تاکہ کوئی لفظ چھوٹے بچوں کے لیے نامانوس یا ثقیل نہ ثابت ہو۔ بڑی بات یہ ہے کہ کہانی کے اس سفر میں تنھا قاری، طبلے والے، پنواڑی، بنی، بھڑ بھونجے، گھسیارے، گوالے، حلوائی، راجہ، گھوڑے اور ایسے ہی دیگر کئی کرداروں سے نہ صرف متعارف ہوتا ہے بلکہ ان کی اہم خصوصیات بھی سامنے آجاتی ہیں۔

حسین حسان کی کہانی نہ صرف معلوماتی ہوتی ہے بلکہ بچے کی دلچسپی کو بھی اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ اپنے معاصرین کی طرح ان کی بھی ہر کہانی نصیحت آموز ہوتی ہے۔ "بندر والا" کا درج ذیل اقتباس بطور نمونہ درج ہے۔

"مداری بولا۔ دیکھو بچو یہ کچھ اشارے کر رہا ہے، کہہ رہا ہے کہ کوئی بچہ میری طرح اس صفائی سے ناخن نہیں کتر سکتا۔" اس پر ابا بولے۔
وہ بالکل ٹھیک کہتا ہے بہت تیز ہے۔ بچوں کو ان میں سے اکثر باتوں کی عادت نہیں جو یہ صبح کرتا ہے اور ناخن کترنے کا خیال تو شاید ہی کسی کو آتا ہوگا۔ ابا کے آس پاس کئی بچے کھڑے تھے۔ انھوں نے ان

لہ عبدالواحد سندھی۔ پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا، مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی، سنہ ۱۹۸۰، ص ۲-۳

سب کے بال اور ناخن دیکھے بس دو ہی چار کی حالت ذرا ٹھیک تھی بہت تو شرما کے بھاگ گئے۔[1]

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ بچوں کو مداری کا کھیل دکھلا کر تخلیق کار نے ان کی توجہ اس نکتہ پر مبذول کر دی کہ بالوں اور ناخنوں کی صفائی ضروری ہے۔

ان مصنفین کی کہانیاں پند و نصیحت سے اس طرح لبریز ہیں البتہ نصیحت کے پیرائے نئے نئے اختیار کیے گئے ہیں۔

بیرون جامعہ لکھنے والوں کا ایک بڑا گروہ ایسا بھی تھا جس نے بڑوں کے ساتھ بچوں کے لیے بھی تخلیقی نوعیت کی تفریحی کہانیاں لکھیں۔ اس جماعت میں رشید احمد صدیقی کی "طوطا کہانی" قابل ذکر ہے۔ جس کی چند سطریں درج ذیل ہیں۔

"بچو تم جانتے ہو یہ ہرے بھرے طوطے باغ کے پھلوں کو کتنا نقصان پہنچاتے ہیں۔ باغ کے رکھوالے دن رات ان کو اڑاتے پھرتے ہیں لیکن یہ نہیں مانتے، جہاں رکھوالے کا ہو ہو، اس کے کوٹھے کا کڑا کا اور ڈھیلے پھینکنا بند ہوا یہ باغ پر بچھے اور پھلوں کو کترنا گرانا شروع کر دیا۔ رکھوالے نے اپنا دھندا شروع کیا تو ٹیں ٹیں کرتے اڑ گئے۔ جیسے رکھوالے کا منہ چڑاتے اور اپنی جیت کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہوں"[2]

اس طرح پوری کہانی طوطوں کی شرارت اور باغبان کی پریشانی کے پر لطف بیان پر مشتمل ہے۔ جسے شوخ و شنگ بچے سانس روک کر پڑھتے جاتے ہیں۔ کہیں بھی کہانی کو پند و نصیحت کی آمیزش سے بوجھل نہیں کیا گیا۔

کوثر چاند پوری کی کہانیاں بھی اس دور کے ارتقائی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں یہ کہانیاں بھی سبق آموزی کے پھیر میں پڑے بغیر بچوں کی دلچسپی پر اپنی تمام تر قوت صرف کرتی ہیں۔ اور ان کی رنگا رنگی بھی خاصی دل آویز ہے "چالاک مرغا" اس کی دلچسپ مثال ہے۔

"بلی خوب جانتی تھی کہ بڑھیا اتنی بیوقوف نہیں ہے کہ بے وجہ مرغ کو اکیلے

---

[1] حسین حسان، "بندر والا" سنگم کتاب گھر دہلی ۱۹۵۸ء ص ۵

[2] رشید احمد صدیقی، "شیخ نیازی" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ ص ۹۱

کرنے پر چھوڑ دے۔ وہ تو بڑی احتیاط سے ٹاپے میں بند کیا کرتی تھی۔
ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ جب ہی تو بڑھیا بی تانے پڑی خاسے اور
مرغا یہاں کھڑا اونگھ رہا ہے۔ مرغا اتنا بیوقوف نہیں ہے کہ خوشی سے
یوں کھڑا رہتا۔ اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ اس کی ٹانگ جال میں
الجھی نہ ہوتی تو کبھی کا وہ یہاں سے اڑ گیا ہوتا۔ مگر غریب کر کیا سکتا ہے
زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ بلی نے کہا مرغے، تو بڑا چالاک ہے
اپنی جان بچانے کے لیے باتیں بنا رہا ہے"[۱]

آپ نے دیکھا کہ کوثر چاند پوری کی کہانی کہنے کا ڈھنگ اپنے پیشروؤں سے مختلف ہے۔
وہ عام بیانیہ طرز اختیار کرنے کے بجائے افعال میں حال کا صیغہ استعمال کر کے پڑھنے والے
کو کہانی کے واقعات سنانے کی جگہ دکھانا پسند کرتے ہیں اور بچے خود کو ان واقعات کا
تماشائی محسوس کرنے لگتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس دور کی تخلیقات میں "کھٹی میٹھی جیباں" (شجاع احمد عائد) "بولتی
کیتلی" (مسلم ضیائی) "شاعر اور بادشاہ" (رئیس احمد جعفری) اور "پردہ" (مسعود حسین خاں)
جیسی کہانیاں تکنیکی اعتبار سے ارتقا کی جانب قدم بڑھاتی نظر آتی ہیں۔

آزادی ہند کے بعد بچوں کی کہانی نے بھی شش جہت ترقی کی۔ سائنس ٹکنالوجی
معاشیات، زراعت، اخلاقیات، حب الوطنی اور قومی یک جہتی جیسے موضوعات نئے نئے
انداز میں بچوں کی کہانیوں میں جگہ پانے لگے۔ اردو ادیبوں نے ملک کے مختلف مسائل
اور جدید تقاضوں کا احساس کیا نیز نئے ہندوستان کی تعمیر کے لیے بچوں کی ذہنی نشوونما
کی ضرورت محسوس کی اور جدید ذہنیت کے حامل دور کی بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کے پرخلوص
کوششیں کی گئیں۔

جدید عہد کے مذکورہ بالا مطالبات سے عہدہ برآ ہونے اور کہانی لکھنے والوں
میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، عادل رشید، کنہیا لال کپور، اور شوکت
تھانوی جیسے مشاہیر ادب بھی شامل ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بچوں کی کہانیوں کا سنہرا

---

[۱] کوثر چاند پوری "چالاک مرغا" عبدالحق اکیڈمی۔ حیدرآباد۔ سنہ ۱۹۴۲ء۔ ص ۱۱

دور ہے۔

بچوں کی کہانیوں کے اس عہد زریں میں مہماتی اور سائنسی کہانیوں کا بول بالا رہا لیکن تخیلاتی کہانیوں نیز دیو پری کے واقعات پر مشتمل کہانیوں کی ضرورت کو بھی یکسر نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اس کی بہترین مثال "چڑیوں کی الف لیلیٰ" ہے یہ ایک راجکمار کی دلچسپ کہانی ہے جس کی حکومت پر ظالم چچا نے زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ اور راجکمار کو جنگل میں پناہ لینی پڑی۔ جہاں اس کو بھیڑنی نے دودھ پلایا۔ شیر، ہاتھی، گینڈے، چیتے اور دوسرے جنگلی جانوروں نے مل کر اس کی پرورش کی۔ جنگل میں پلے ہوئے راجکمار نے سن بلوغ کو پہنچ کر اپنی دانشمندی سے بڑے بڑے خوفناک جانوروں سے نبرد آزمائی کی اور انھیں مسخر کر لیا۔ جنگلی جانوروں اور پرندوں کی فوج تیار کر کے ظالم راجا کو شکست دی۔ ساتھی ساتھ ہی نو پھول راج کماری کو بھی حاصل کیا۔

کہانی مہمات سے لبریز ہے جس میں سنسنی خیز واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ کرشن چندر کی یہ دنیا ہماری اس دنیا سے بڑی حد تک مختلف ہے اور ماورق الفطرت پریوں دیوؤں کی دنیا، کوہ قاف اور پرستان، جیسی قدیم داستانی دنیاؤں سے بھی مختلف ہے۔ کیوں کہ یہاں تخیل کے ساتھ ساتھ سائنسی امکانات بھی کارفرما ہیں جس کی وجہ سے نامانوس ہونے کے باوجود یہ ماحول قرین قیاس محسوس ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ "سونے کی بکری"، "سونے کی صندوقچی" اور "سونے کا سیب" جیسی تخلیقات میں کرشن چندر روایتی طرز کی طلسماتی کہانیاں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔

سائنسی کہانیوں میں "چاند کی چوری" (پرکاش پنڈت) کو اردو ادب اطفال میں سائنس فکشن کی نمائندہ تخلیق کہہ سکتے ہیں۔ جس میں بے مہار سائنسی ترقیات کے منفی اثرات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ "چاند کی چوری" میں چند شر انگیز کردار ایٹم بم جیسے تباہ کن اسلحہ سے ساری دنیا کی تمام آبادی کو یکسر ختم کر دینے کی سازش کرتے ہیں اور چاند پر پہنچ کر اس کو چرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سائنسی اور مہماتی کہانیاں تو پہلے بھی لکھی جاتی تھی۔ لیکن اب سراغ رسانی کے واقعات کو بھی اردو کہانیوں میں اہمیت دی جانے لگی۔ "بھورا بال" اور "ایک گلاس پانی" مظہر اثر کی لکھی کہانیاں سائنس، سراغ رسانی، اور مہمات کی آمیزش سے نیا رنگ پیدا کرنے

والی کہانیاں ہیں۔ "سونے کا بت" (افتخار احمد اقبال) مہمات اور تحیر و استعجاب کے واقعات میں اسرار و جاسوسی کا عنصر شامل کرکے ایک نئے افق کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس کہانی میں منیر، کریم اور مسعود جنگل میں شکار کے دوران ایک قدیم دیوتا کا "سونے کا بت" پالیتے ہیں بت پاکر یہ لوگ بہت خوش ہوتے ہیں۔ رات جنگل میں ہی بسر کرنی پڑتی ہے۔ لیکن تینوں میں سے ایک ایک باری باری جاگتا رہتا ہے تاکہ اس بت کو کوئی چرا نہ لے۔ اتنی احتیاط اور پہرے کے باوجود وہ سونے کا بت تھیلے سے غائب ہوجاتا ہے۔ آگے اصلی کہانی کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

"ہم نے خیمے کا کونا کونا چھان مارا۔ تین چمڑے کے تھیلے تھے ان کو بیسوں بار کھول کھول کر جھانک جھانک کر دیکھا۔ لیکن وہ بھی کیا سوئی تھی جو نظر نہ آتا۔ گڑبڑ کی آواز پر کریم جاگ پڑا اور ہماری طرح حیران و پریشان ہوکر سونے کے اس عجیب و غریب بت کو ڈھونڈنے لگا جو ہمارے ہاتھ آکر اتنی سی مدت میں نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا۔

"بت کے پاؤں تو تھے نہیں جو وہ خود چلا جاتا"

منیر نے تھک ہار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ ضرور تھا" میں نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔"[1]

پوری کہانی میں سسپنس ہے، "سونے کا بت" دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش میں بچوں کو جن مہمات سے گزرنا پڑتا ہے، پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور کہانی ختم کیے بغیر بچے چین سے سو نہیں سکتے۔

"پراسرار انسان" اور "موت کے شعلے" بھی افتخار احمد اقبال کی اس نوع کی کہانیاں ہیں۔

آزادی ہند سے قبل عموماً کہانی کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ بچوں کو بڑوں کی مرضی کے مطابق ڈھالنے میں معاون ثابت ہوں اور کردار بھی ایسے

---

[1] افتخار احمد اقبال "سونے کا بت"۔ مشمولہ ماہنامہ کھلونا۔ نئی دہلی مارچ سنہ ۱۹۵۷ء۔
ص ۲۲،۲۳ ـ [illegible]

پیش کیے جاتے تھے جو بچوں کے لیے مثالی نمونے کا کام دے سکیں۔ عہد جدید میں اس بندھی ٹکی روش سے ہٹ کر بہت سی ایسی کہانیاں سامنے آتی ہیں جن میں بچے فطری انداز میں شوخیوں اور شرارتوں سے بھرپور روزمرہ کی جیتی جاگتی زندگی کے تناظر میں کھیلتے کودتے نظر آتے ہیں اگر کہیں اخلاقیات کا درس بھی دیا گیا ہے تو اسے فنی پیرائے میں سات پردوں کے پیچھے رکھا گیا ہے تاکہ ننھے قاریوں میں از خود مطالعہ کی رغبت پیدا ہو اور وہ کہانی کی نصیحت آموزی سے بیزاری محسوس نہ کریں۔

کہانی "سفید جھوٹ" (عصمت چغتائی) اس طرز کی نمائندہ مثال ہے۔ اس کہانی میں مصنفہ کے بچپن کا ایک واقعہ بہت ہی دلچسپ اور فطری پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے جنھیں ماموں جان نے ٹرین میں بیٹھنے سے قبل سفر سے متعلق ہزاروں نصیحتیں کی تھیں اور حفاظت کی غرض سے کمپارٹمنٹ کو بھی مقفل رکھنے کی سخت ہدایات بھی فرمائیں تھیں۔ اگلا بیان خود کہانی کی زبانی سنئے۔

> "مگر جوں ہی ہم نے دوسرے اسٹیشن پر اترنے کی کوشش کی، گارڈ صاحب نے ڈانٹ بتائی۔ دل بجھ کر رہ گیا۔ اچھی اللہ! ان بزرگوں سے کہیں پیچھا ہی نہیں چھوٹتا۔ جل کر ہم نے ریل کے ڈبے ہی میں اودھم مچانی شروع کی۔ خوب کھڑکی سے لٹکے ریل کی زنجیر کھینچنا چاہا۔ مگر بہت ڈر لگا۔ چندوسی کے اسٹیشن پر ایک بہت موٹی سی صاحبہ ہانپتی کانپتی سوار ہوئیں تو ہماری رہی سہی آزادی بھی ختم ہو گئی۔
>
> اے ہے، موئنڈی کا ٹو، بھلے بیر کی بلی کی طرح کاٹنے کو کودی جاتی ہو۔ سیدھی طرح بیٹھو"[1]

اس طرح پوری کہانی شوخ و شنگ بچیوں کی چہل بازیوں کا منہ بولتا مرقع ہے جس میں نسائی لہجے، برجستہ مکالمے اور لطیف طنز نے جان ڈال دی ہے۔

اس ضمن میں کہانی "انصاف کہاں ہے" (کنہیا لال کپور) کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "اگر احمد ان دنوں یہ مصرعہ بار بار دہراتا ہے۔

---

[1] عصمت چغتائی۔ "سفید جھوٹ" مشمولہ ماہنامہ کھلونا۔ ستمبر سنہ ۱۹۵۶ء۔ ص ۱۰۰۔ دریا گنج۔ یونس۔ دہلوی وغیرہ۔

ج۔ "انصاف کر آواز دو انصاف کہاں ہے؟"

تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ اس کی امی نے حلوہ تقسیم کرتے وقت اس کے ساتھ نا انصافی کی تھی یا بھائی صاحب نے بلا وجہ تھپڑ مار دیا تھا۔ بلکہ ششماہی امتحان میں اسے فیل کر دیا گیا تھا۔ جہاں تک اس معاملے میں امجد کی رائے کا تعلق ہے اس نے ہر سوال کا جواب سوچ سمجھ کر دیا تھا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ممتحن کو اس کے جوابات پسند نہیں آئے۔[۱]

اس نوع کی ایک اور کہانی "ننھے نونہال کانفرنس" (عادل رشید) کا یہ اقتباس بھی دیکھیے۔

"رات کے پچھلے پہر گپو میاں کی آنکھ کھلی تو ان کے دل میں یہ آئی کہ کیوں نہ بچوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔ لہذا وہ رینگ کر اپنے بستر سے نیچے گر پڑے اور روئے بالکل نہیں گھٹنوں کے بل چل کر اور دوسرے بچوں کے بستروں پر پہنچے اور سب کو اٹھا اٹھا کر لائے اور کوٹھی کے بڑے ہال میں انھوں نے سب کو ایک جگہ جمع کر دیا"[۲]

بعد ازاں کہانی میں بہت کمسن بچوں کے اجلاس میں ان کی معصوم حرکتوں اور شوخیوں کا پر لطف تذکرہ ہے۔ یہ کہانی اپنے موضوع کی ندرت کے باعث عام کہانی کی بھیڑ میں صاف پہچانی جا سکتی ہے۔

بچوں کے بھی اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ ہم اپنی مرضی سے بچوں سے ہر کام کرانا چاہتے ہیں۔ ہمیں کبھی یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ بچے ہمارے اس رویے سے کیا محسوس کرتے ہیں۔ اس قسم کے نفسیاتی مسائل "چھوٹا بھائی" (شوکت تھانوی) جیسی دلچسپ کہانیوں میں موجود ہیں۔

"چھوٹا بھائی" کی یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

"۔۔۔ کتا بن جاؤ مگر چھوٹے بھائی نہ بنو اور بھی اگر تم اپنے چھوٹے بھائی

---

[۱] کنہیا لال کپور۔ "انصاف کہاں ہے" مشمولہ "ہماری زبان" (حصہ دوم) تیار کردہ سررشتہ تعلیم اتر پردیش لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۷۵ء ص ۲۰

[۲] عادل رشید "ننھے نونہال کانفرنس" مشمولہ ماہنامہ کھلونا۔ نئی دہلی۔ اکتوبر سنہ ۱۹۵۷ء۔ ص ۸۶ مدیران۔ یونس دہلوی وغیرہ)

پر تو تم کو پتہ ہے کہ میں نے کتنی غربت اور دلار سے بھوندو، بلی بی کی پرورش کی ہے اور کیا نام اس کی اذیا دو کو جان تن سے رکھا ہے مگر تمھارے بڈھے نانا کو ذرا بھی خیال نہیں کہ میری بلی اور اس کے بچے آخر ان کے بھی کوئی ہوتے ہیں۔ پھوٹی آنکھ نہ بھوندو کو دیکھیں نہ اس کے ساتوں بچوں والے بچوں کو من من میں کوکڑاتے ہیں گالیاں بکتے ہیں۔ اور موقعہ آپڑا تو جو چیز ہاتھ میں آتی ہے ان جانہاروں پر پھینک مارتے ہیں۔ میں آگ باگ ہو جاتی ہوں"[1]

اس نوع کی سیریل کہانیوں میں "چچا مرغی کی کہانیاں" (مظہر الحق علوی) بھی اپنی اہمیت کا احساس دلاتی ہیں۔ تین کہانیوں (چچا مرغی نے سیٹی بجائی"، "چچا مرغی سسرال گئے"، "چچا مرغی نے سرکس دیکھا") کی اس سیریز کے ہیرو چچا مرغی ہیں جو غالباً امتیاز علی تاج کے ناقابل فراموش مزاحیہ کردار "چچا چھکن" کا پاکٹ ایڈیشن ہے۔ جن کی بوکھلاہٹ بدحواسی اور پُرلطف حرکات وسکنات ننھے قاریوں کو بے ساختہ قہقہے لگانے پر مجبور کرتی ہیں۔ اسی طرح ایم یوسف انصاری نے ٹارزن سیریز کی کہانیاں لکھ کر اردو ادب اطفال کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا۔ اس ضمن میں ان کی کہانیوں کی کتابیں "ٹارزن اور آدم خور" "ٹارزن اور چچا بھتیجا" وغیرہ بطور خاص اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

پھر آگے چل کر بچوں کی کہانیوں میں ارواح کے تذکرے سے بھی تحیر و استعجاب اور خوف کے جذبات ابھارنے کا کام کیا جانے لگا۔ "انتقام" (سراج انور) اس کی عمدہ مثال ہے۔

فیروز نے بہت بڑی دولت حاصل کرنے کے لیے رعنا سے شادی کی اور اس کو چھپکلی کا زہر دے کر مار دیا۔ بعد ازاں رعنا چھپکلی بن کر فیروز سے انتقام لیتی ہے۔ کہانی کا یہ ہولناک انجام ملاحظہ کیجیے۔

"۔۔۔ میں تمھیں رات ورات اٹھا کر یہاں لائی اور اپنے ہاتھوں سے میں نے تمھیں اس چہار دیواری میں قید کیا ہے ۔۔۔ ہا ہا ہا ۔۔۔

---

[1] عفت موہانی – نانی ماں اور نانا کی جنگ، نسیم بکڈپو، لکھنؤ ص ۳

بس یہیں یہاں چلاتے رہو۔ تمھارے مرنے کے بعد اب تمھاری روح سے ملوں گا
ہاہاہا"

فیروز چلاتا رہ گیا مگر رضا نے ایک نہ سنی یکایک وہ پھر ایک چھوٹی سے چھپکلی بن گئی اور بار بار فیروز کو مڑ مڑ کر دیکھتی رہی اور اپنی پتلی سی زبان باہر نکالتی ۔ دم ادھر ادھر پٹختی، وہ اسی سوراخ کے راستے باہر چلی جاتی ہے"۔[1]

"بندروں کا مشاعرہ" مظفر حنفی (نظم و نثر کے امتزاج سے ایک اچھا فنطاسیہ ہے۔ جس میں بندر شریر بچوں کی طرح ہی شوخیاں کرتے نظر آتے ہیں، باغوں میں کودتے ہیں۔ اور دلچسپ ہنگامے کرتے ہیں۔ بچوں کے مشاعروں اور بیت بازیوں کے موقعہ پر بندروں کے اس مشاعرے کا سماں آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتا ہے۔ اس فنطاسیے کا یہ دلچسپ اقتباس نمونے کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔

"میاں دم کٹے کے مداری کے چنگل سے چھوٹ آنے کی خبر نے سارے جنگل کے بندروں کے دلوں کو خوشی سے بھر دیا۔ بندر مشاعروں کی انجمن نے برادری کے مشہور اور پیارے شاعر دم کٹے صاحب کو قید انسانی سے چھٹکارا پاجانے پر مبارک باد پیش کرنے کے لیے ایک مشاعرے کا انتظام بھی کر ڈالا اور اسی دن شام کو ایک بندر بڑا سا ڈھول گلے میں لٹکا کر دھم دھم بجاتا ہوا سارے جنگل میں دم ہلا ہلا کر اعلان کر آیا"۔[2]

بندروں کے اس مشاعرے میں بندروں کی اچھل کود، داد تحسین کا انداز، ان کی خوشیاں، ان کی شوخیاں اور اسی قسم کی پر لطف باتوں کا بیان اتنی خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے کہ معصوم سے معصوم ذہن بھی اس کے تخیل سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

"حلوہ چور" "پر اسرار قیدی" "سائیکل ریس" اور "نیلا ہیرا" مظفر حنفی کی

---

[1] سراج انور، "انتقام" مشمولہ کھلونا، نئی دہلی ستمبر ۱۹۵۷ء ص ۲۲ (ذمہ داران کلاسیکی و جھلکا وغیرہ)
[2] مظفر حنفی، "بندروں کا مشاعرہ" مکتبہ کلیاں (لکھنؤ) ص ۳

ایسی کہانیاں ہیں جن میں تحیر و استعجاب آخری وقت تک برقرار رہتا ہے اور بالکل آخر میں غیر متوقع انجام کے ذریعے ننھے قاری کے ذہن کو خوشگوار حیرت سے محظوظ کیا جاتا ہے۔ یہ طرز آگے چل کر خاصا مقبول ہوا۔

"مشینی گھوڑا" (اطہر پرویز) بھی بچوں کی کہانی کے سلسلے کی ایک ارتقائی کڑی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ایک ترقی یافتہ تخیلاتی کہانی ہے۔ جس کا خمیر قدیم ایرانی قصّے سے اٹھایا گیا ہے۔ کہانی ایک کاریگر کے بنائے ہوئے مشینی گھوڑے سے شروع ہوتی ہے جس کو شہزادہ غلطی سے لے اڑتا ہے لیکن اسے اتارنے کا گر نہیں آتا آگے کہانی اقتباس کے اس وسیلے سے ملاحظہ ہو۔

"... اس نے گھبرا کر گھوڑے پر ہاتھ چلانا شروع کر دیا اچانک اس کا ہاتھ گھوڑے کے کان کے نیچے ایک بٹن پر پڑا۔ شہزادے نے جو اس بٹن کو گھمایا تو گھوڑا پہلے تو آہستہ ہوا پھر ایک بار رکا اور نیچے کی طرف آنے لگا، اب وہ اور نیچے اور نیچے آتا جا رہا تھا۔ دیکھنے کے لیے وہ اس گھوڑے کو صحیح طور پر چلا سکتا ہے اس نے پہلے والا بٹن دبایا اب یہ گھوڑا آہستہ ہونا شروع ہوا یہاں تک کہ ایک بار رک کر پھر اوپر چلنے لگا۔ اب تو شہزادے کی سمجھ میں آگیا کہ کس طرح اس کو چلایا جائے۔"[1]

بقیہ کہانی میں ایک دوسرے ملک کی شہزادی سے عشق، اس کے ساتھ شہزادے کی واپسی اور شادی وغیرہ کی پر لطف حکایات بیان کی گئی ہیں۔ اس قسم کی کہانیاں پڑھ کر بچے بہت کم سنی ہی میں سائنسی ترقیوں کے امکانات سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔

اردو ادب اطفال سے متعلق کہانیوں نے مختلف ممالک کی لوک کتھاؤں اور دیگر زبانوں کی مقبول عام کہانیوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح متنوع فن پاروں سے کہانی کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے۔

"جیسے کو تیسا" (یونانی کہانی)، "پہلے کون بولا" (چیکوسلواکیا کی کہانی)، "پتھر کا سوپ" (آئرلینڈ کی کہانی)، "مفت کی روٹی" (روسی کہانی)، "آئینہ کی کہانی" (جاپانی کہانی) اور

---

[1] اطہر پرویز "مشینی گھوڑا" ترقی اردو بورڈ نئی دہلی سنہ ۱۹۷۰ء، ص ۶

"تیمور کھسے" مرزا تاتاری کہانی ہے کہ دیکھنے میں طور پر دیر ہونے پچوں کو مختلف ممالک کی تہذیب و تمدن اور معاشرت سے روشناس کیا۔

اس طرز کی تخلیقات میں "چین کی بہترین کہانیاں" مرزا انصاری ابھی امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ضمن میں کہانی "جادوگر کا تحفہ" از احمد جمال پاشا خصوصیت کی حامل ہے۔ یہ چین کی جادوئی کہانی ہے۔ نئی سرزمین اور کرداروں کی پیش کش سے اردو کے بچوں کو کتنا محظوظ کیا ہوگا اس کا ہلکا سا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے کیا جاسکتا ہے۔

"یانگ چو نے اسے ایک زمرد کی انگوٹھی پہنادی۔ وینگ نے اپنے آپ کو ہوا سے بھی ہلکا محسوس کیا، وہ اڑ رہا تھا۔ پہاڑیاں بڑھتے بڑھتے سر بفلک پہاڑوں میں تبدیل ہوگئیں۔ جب وہ اڑتا ہوا پہاڑ کے درے کے پاس پہنچا تو اس کے سامنے ایک عالی شان محل تھا جس کے چاروں طرف ایک خوبصورت باغ میں رنگ برنگی چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ سونے چاندی اور جواہرات سے سجی ہوئی بارہ دریاں بنی ہوئی تھیں کہ ان میں بیٹھ کر باغ کی بہاروں کا لطف اٹھایا جائے"[1]

"پرانے جوتے"[2] دکا ایک کا پرشاد اعراق کی بہت دلچسپ اور اپنے انداز کی انوکھی کہانی ہے۔ جس میں نہ تو مافوق الفطرت واقعات ہیں اور نہ ہی بادشاہ اور شہزادے کا ذکر ہے یہ ایک لالچی اور کنجوس مگر امیر سوداگر ابوالقاسم کے جوتوں کی کہانی ہے جو بہت ہی پرانے خستہ حال اور جگہ جگہ سے پیوند زدہ تھے۔ ان جوتوں کے سبب اس کو بہت مالی نقصان بھی ہوا۔ کئی بار اس نے جوتوں کو پھینکا لیکن کسی نہ کسی طرح وہ اس کے پاس ایک نئی آفت کے ساتھ نازل ہوجاتے تھے۔

کہانی کی یہ سطور ملاحظہ ہوں۔

"ایک پڑوس کا کتا چھت پر چڑھ آیا اور ان میں سے ایک جوتی کو منہ میں دبا کر لے بھاگا۔ اور وہیں چھت کی منڈیر پر اس سے کھیلنے

---

[1] احمد جمال پاشا "جادوگر کا تحفہ" مشمولہ کھلونا۔ نئی دہلی اپریل سنہ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۵۔
[2] (مدیر الیاس دہلوی)

لگا۔ بدقسمتی سے وہ جوتا اس کھیل میں منڈیر سے نیچے سڑک پر ایک رئیس خاتون کے سر پر جا گرا جو ادھر سے گزر رہی تھی جوتا گرنے سے اس خاتون کے سخت چوٹ لگی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ اس کا شوہر قاضی کے پاس شکایت لے گیا اور قاسم کو پھر گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ہرجانے میں جس قدر رقم اس عورت کے شوہر نے مانگی، وہ دینے پر ہی قاسم چھوٹا۔ یہ رقم پچھلی تین رقموں سے بہت زیادہ تھی۔"[1]

مختلف بیرونی زبانوں اور ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں سے ماخوذ کہانیوں نے بھی اردو ادب اطفال کو بہت مالا مال کیا ہے۔

"مفت کا خزانہ" (گوردیال سنگھ والیہ) ہندی سے ماخوذ کہانی ہے۔ یہ دولت رام نام کے ایک کنجوس رئیس کی دلچسپ روایت ہے جو ڈاکوؤں کے خوف سے خود کو بہت غریب ظاہر کرتا ہے اور مرگھٹ میں دولت چھپانے جاتا ہے۔ جس کے ذریعے بچوں کو دولت سے بے جا محبت کرنے والوں کے عبرت ناک انجام کی جھلک دکھائی گئی ہے۔

دولت رام کو اس کے بیٹے کے ساتھ دولت چھپاتے ہوئے ایک شخص دیکھ لیتا ہے ان دونوں کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ شخص مردہ بن کر لیٹ جاتا ہے۔ یہ تصدیق کرنے کے لیے کہ یہ مردہ ہے وہ لوگ اس کی ناک کان کاٹ لیتے ہیں لیکن وہ سب کچھ برداشت کر لیتا ہے، ان دونوں کے جانے کے بعد وہ ساری دولت لے جا کر عیش کرتا ہے۔ جب ڈاکوؤں کا خوف کم ہوتا ہے اور دولت رام کو اپنی دولت کی ضرورت ہوتی ہے تو دولت نہیں نہیں ملتی انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی مردہ نہیں تھا بلکہ ان کی دولت لینے کے لیے اس نے ایسا کیا تھا۔ نئے رئیس کی تلاش کر کے وہ لوگ اس شخص کو پا لیتے ہیں لیکن دولت پھر بھی نہیں ملتی۔ معاملہ راجہ کے پاس پہنچتا ہے۔ کہانی کا انجام ملاحظہ ہو۔

"حضور میں نے چوری نہیں کی تھی، یہ سچ ہے کہ میں نے ان کی دولت پر قبضہ کر لیا تھا لیکن اس دولت کے بدلے انھوں نے میری

---

[1] کالیکا پرشاد "پرانے جوتے" مشمولہ ماہنامہ کھلونا اپریل سنہ ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۳ (مدیران۔ الیاس دہلوی وغیرہ)

ناک اور کان کاٹ لیے تھے۔ اگر وہ میری ناک اور کان واپس دے دیں تو میں بھی ان کا پیسہ واپس کر دوں۔ مجرم نے اپنی ناک اور کان دکھاتے ہوئے کہا۔

راجہ نے سب کچھ سن کر فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

مجرم کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے اس کی ناک اور کان واپس دے کر اپنا پیسہ اس سے وصول کر لیا جائے، نہیں تو وہ سارا پیسہ اسی کا ہوگا اس نے اس کے لیے وہ دام دیا ہے جو کوئی نہیں دے سکتا"۔[1]

اس نوع کی تخلیقات میں "سچا دوست" (ابرار محسن) بھی لائقِ ذکر ہے۔ یہ ایک خوشامد پسند جھوٹی تعریف میں مست رہنے والے بادشاہ کی کہانی ہے۔ بادشاہ ان ہی لوگوں کی قدر کرتا ہے جو اس کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔ جو لوگ اس کی برائی کرتے ہیں یا اس کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ بادشاہ کو بہت برے لگتے ہیں۔ بادشاہ کا وزیر دانا ہے، وہ بادشاہ کو دلچسپ تجربات سے گزار کر ثابت کرتا ہے کہ جھوٹی خوشامد اور بے بنیاد تعریفوں سے بھی انسان کبھی بڑا نہیں ہو سکتا۔ کہانی کا دلچسپ اختتام درج ذیل ہے۔

"اگلے دن بھرے دربار میں شاعر نے بادشاہ کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیے۔ قصہ کہنے والوں نے اسے سکندر سے بھی بلند کر دیا گویے نے اسے فرشتہ ثابت کر دیا۔

"تمھارا بادشاہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" بادشاہ نے ایک بوڑھے کی جانب دیکھ کر سوال کیا۔

بوڑھے نے جھٹ کہہ دیا۔ "بادشاہ احمق ہے" دربار میں شور ہونے لگا۔ یہ بدتمیز ہے، گستاخ ہے، جھوٹا ہے۔"

"صرف یہی سچا ہے" بادشاہ کی آواز شور پر چھا گئی چلی گئی۔ "باقی سب جھوٹے اور دھوکے باز ہیں تم سب یہاں سے نکل جاؤ۔ صرف یہ بوڑھا میرا سچا دوست ہے۔ ایک سچے آئینہ کی طرح میرے پاس رہ کر مجھے میری

---

[1] گوردیال سنگھ والیہ "مفت کا خزانہ" مشمولہ ماہنامہ "کھلونا" نئی دہلی۔ مئی ۱۹۶۰ء ص ۳۳۔ مدیر: یونس دہلوی (مرحوم)

اصل شکل دکھاتا ہے گا۔[1]

"ببر شہزادہ" (رضیہ سجاد ظہیر) "بغاوت" (عزیز مرادآبادی) "ایک تھا بادشاہ" (شمیم انہونوی) "بچوں کی لوک کہانیاں" (سعادت علی صدیقی) "شیطان کا پل" (خلیق انجم تشنی) "فقیر شہزادہ" (اسرار ندوی) "سندباد کے سات سفر" (ایم یوسف انصاری) جیسی بے شمار کہانیاں اردو ادب اطفال کے دامن میں محفوظ ہیں۔

قدیم کلاسیکی داستانوں سے ماخوذ ایسے واقعات جو بچوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کر سکتے ہیں، کہانیوں کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔ "سندباد جہازی" (اطہر پرویز) "سانپوں کی ملکہ" (محمود نیازی) "قصہ چہار درویش" (انیس مرزا) "حاتم طائی کا قصہ" (نورالحق نوری) "بصرہ کا سوداگر" (انور شریف) "ہیرا من طوطا" (اشرف سبحانی) "جان عالم" (ابوالحسن نغمی) "الف لیلیٰ" (ابو تمیم فرید آبادی) "تائی اور رنگ ساز" (اطہر پرویز) "نورتن کی کہانیاں" (شمیم احمد) وغیرہ اسی نوع کی تخلیقات ہیں۔

دیگر زبانوں سے اردو میں منتقل کی جانے والی کہانیوں کے اس بیش قیمت سرمائے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو ترجمے کی شکل میں اردو ادب اطفال کا جزو بن چکا ہے۔ مثلاً "لومڑی کے بچے" ادیپیر ونسکایا کی کہانی "فرانشک" کا ترجمہ ہے جسے قرۃ العین حیدر نے اردو کے قالب میں اس خوش اسلوبی سے ڈھالا ہے کہ کہانی پر طبع زاد ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ کہانی کی یہ سطور ملاحظہ ہوں۔

> "ٹھہرو۔ سونیا نے لومڑی کے بچے کو اداس غصیلی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
>
> "اپنی ٹرٹر سے پریشان کرنے کے بجائے اس کو کھانا کیوں نہیں کھلاتیں۔"
>
> "لومڑی کا بچہ پلنگ کے پیچھے ایک کونے میں ہماری طرف پشت کیے بیٹھا تھا اس کی آنکھیں اس طرح جھلملا رہی تھیں جیسے رو رہا ہو، وہ بہت منا سا تھا، ایک بھربھری سی دم اور دو نکیلے ننھے منے کانوں

---

[1] ابرار محسن۔ "سچا دوست" مشمولہ کھلونا۔ نئی دہلی اپریل سنہ ۱۹۸۵ء۔ ص ۲۱۔ مدیر۔ الیاس دہلوی

کا مجموعہ معلوم ہوتا تھا۔[1]

قرۃ العین حیدر کی کہانیاں "ڈھینچو کے بچے" "بھیڑیے کے بچے" اور "ہرن کے بچے" بھی اس تذکرے میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

"الوما اور کالا کوا" (صالحہ عابد حسین) فلپائن کی کہانی کا ترجمہ ہے۔ جس میں صالحہ عابد حسین کا طرزِ نگارش نے ایک سادہ موضوع کو دلنشین بنا دیا ہے۔ کہانی ایک غریب بچے الوما کی ہے اور ایک رحم دل راجہ کا کوا اس بچے کا معاون و مددگار ہے۔ چھوٹے چھوٹے مکالموں اور بچوں کی باہمی چھیڑ چھاڑ نے کہانی کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے چند سطریں دیکھیے۔

"امی کہانی۔ کہانی سنائیے نا"

"خالہ اماں آج ایک نئی کہانی سنائیے۔

"ہاں ہاں کہانی۔ کہانی"

"کہانی؟ کون سی کہانی۔؟ پریوں کی یا۔ ۔ ۔"

"پری کی کہانی سبھی کو بہت پسند تھی۔ ۔ ۔ نہیں بادشاہ اور سات شہزادیوں کی کہانی۔ ۔ ۔"

احمد کو بادشاہ سے زیادہ ساتویں شہزادی سے دلچسپی تھی۔

"نہیں اماں۔ آج کوئی سچی کہانی سنائیے"

بنی سب سے بڑا تھا بولا۔[2]

اسی طرز کی تخلیقات میں "مورا" اور "سونا کی سیر" (انور کمال حسینی) "جنت کی سیر" (رضیہ سجاد ظہیر) "سلیمان کا خزانہ" (محمود نیازی) "دمدار کہانی" (انیس مرزا) "جنگل میں تالاب" (عابدہ بیگم) "مہابھارت" (تنظیم احمد) "تین رانیاں" (الکا شکل) "اونٹ راجہ" (رپریما مارکرشنن) "چڑیا اور راجا" (مدھو شنکر) "قومی جھنڈے کی کہانی" (سوامی ابراہیم لکڑی والا) وغیرہ نمائندہ کہانیوں کے لائقِ ذکر تراجم ہیں۔

---

۱ قرۃ العین حیدر "لومڑی کے بچے" مکتبہ پیامِ تعلیم۔ نئی دہلی سنہ ۱۹۸۲ء ص ۳

۲ صالحہ عابد حسین۔ "الوما اور کالا کوا" ترقی اردو بورڈ نئی دہلی۔ ص ۷

اس طرح کہانی کے اس ارتقائی سفر کا مجموعی جائزہ لیجیے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ابتدا تا حال نئی نئی منزلوں کی سیر کی ہے اور نئی دنیاؤں کی خبر لائی ہے۔ نیز نوع بنوع جہاں خود بھی تخلیق کیے ہیں سارے اردو ادب اطفال کے کہانیوں سے متعلق ذخیرے میں جانوروں پرندوں، مختلف ملکوں، ستاروں، عجیب وغریب تہذیبوں، سمندروں، پہاڑوں اور جنگلوں سے متعلق دلچسپ قصے بھی موجود ہیں۔ زمین اور آسمان کے ارتقا کی داستانیں بھی نیز جانبازی اور سرفروشی کی حکایات بھی، پتھر کے زمانے کے آدمی سے لے کر موجودہ ترقی یافتہ سائنسی ذہن کی منہ بولتی تصویریں بھی اور تخیلاتی اور طلسماتی واقعات پر مشتمل پُر لطف تخلیقات بھی، الغرض نئی اور پرانی دنیا کا کوئی موضوع اس کی دسترس سے باہر نہیں رہا۔ بچوں کی کہانی ایک ایسا نگارخانہ ہے جس میں طرح طرح کے کردار جلوہ افروز ہیں اس محفل میں دیو، پریاں ہیں، جنات اور جادوگر بھی ہیں۔ بادشاہ، وزیر، شہزادے، سپہ سالار اور درباری بھی ہیں۔ کہیں سوداگر اور ان کے قافلے ہیں تو کہیں غریب لکڑہارے اور سماج کے نچلے طبقے کے لوگ جانباز اور سرفروش بھی ہیں اور شاگرد اور استاد بھی۔ مختصر یہ کہ اردو ادب اطفال کا یہ گوشہ اتنا بھرا پرا با رونق اور آباد ہے کہ موضوعات، کردار سازی، فضا بندی جس زاویے سے نگاہ ڈالی جائے، رنگا رنگی اور تنوع کا احساس ہوتا ہے۔

بچوں کے کہانی کاروں نے تکنیک اور انداز نگارش میں بھی نئے نئے طریقے اور اسالیب اختیار کیے ہیں ان لکھنے والوں میں ایسے بھی ہیں جو محض بچوں کے لیے لکھتے رہے۔ اور محمد حسین آزاد سے لے کر قرۃ العین حیدر تک ایسے عظیم المرتبت فنکار بھی اس قافلے میں شامل ہیں جو بڑوں کے ادب میں بھی دیو قامت تسلیم کیے جاتے ہیں۔

طبع زاد کہانیوں کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں کی لوک کہانیاں اور قدیم کلاسیکی ادب سے ماخوذ کہانیاں نیز دیگر زبانوں کی منتخب کہانیوں کے تراجم سے بھی اردو ادب اطفال مالا مال ہے۔ اور اس ذخیرے میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ جدید ماحول کے تقاضے اور نئی تعلیمی نفسیات کو بھی بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے والوں میں سے اکثر نے ملحوظ رکھا ہے۔ موجودہ صنعتی دور میں چونکہ طویل اور ضخیم کتابوں کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے اس لیے ان حقائق کی روشنی میں مختصر کہانی روز افزوں مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ اردو میں بچوں کی کہانیوں کا مستقبل نہایت تابناک ہوگا۔

بارھواں باب

ڈراما

اردو ادب میں دستیاب بچّوں کے چھوٹے بڑے ڈراموں کا جائزہ لیں تو اس خوشگوار حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ایسے ڈراموں کی ایک کثیر تعداد ادب اطفال میں موجود ہے۔ چھوٹے اور بڑے قارئین کی تخصیص کے بغیر عام طور پر اُردو ڈرامے کے سرمائے پر نگاہ ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوسری اصناف ادب کی بہ نسبت بحیثیت مجموعی ہمارے یہاں ڈراما بہت کم لکھا گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں کم و بیش ہر اہم نقاد نے اُردو ادب میں ڈرامے کی قلّت کا شکوہ کیا ہے۔ اس اعتبار سے بچّوں کے ڈراموں کی اتنی تعداد میں موجودگی لائق اطمینان ہے۔ البتہ ہمیں اس کا اعتراف بھی کرنا ہوگا کہ بچّوں کے یہ ڈرامے چھوٹے چھوٹے فن پارے ہیں جن میں کسی قصّے یا کہانی کو مکالموں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اور بیچ بیچ میں دو ایک فقروں کے ذریعے منظر کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باقاعدہ اسٹیج کیے جانے کے لائق ڈرامے اور طویل ڈرامے ادب اطفال میں بھی کم ہی نظر آتے ہیں۔ اس پہلو پر مزید غور و فکر سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ بچّوں کے لیے ڈراما لکھنے والوں کے پاس اس اختصار کا جواز بھی تھا۔ اسٹیج کے وسائل ظاہر ہے کہ بچّوں کو محدود پیمانے پر دستیاب ہوتے ہیں نیز طول طویل پلاٹ پر مشتمل ڈراموں کی ریہرسل وغیرہ میں بھی انھیں دشواریاں پیش آسکتی ہیں۔ کسی لمبی اور پیچیدہ داستان کو ڈرامے کی شکل میں پیش کرنے کے لیے جس بڑے پیمانے پر ریہرسل وغیرہ کی ضرورت پیش

آتی ہے اور لمبے چوڑے مکالموں کو یاد کرنے کے لیے جتنا زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ وہ بھی بچوں کے لیے ایک مسئلہ ہے۔ کیونکہ اس طرح ان کی تعلیم میں حارج واقع ہو سکتی ہے۔ ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بچوں کے لیے مختصر اور آسان پلاٹ پر مبنی چھوٹے موٹے قصوں کو ڈراموں کی شکل میں پیش کرنا ہی زیادہ قرینِ مصلحت نظر آتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ زیادہ دیر تک کھیلے جانے والے ڈراموں کو دیکھنے والے بچے بھی اکتا سکتے ہیں نیز اس طرح ڈرامے کی دلچسپی اور تاثیر میں کمی ہو سکتی ہے۔ اس لیے موجودہ ڈراموں کے اختصار اور سیدھے سادے انداز سے بے اطمینانی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

یوں تو اِکا دُکا ڈرامے مثلاً "نوجوان ڈاکٹر" (عظیم بیگ چغتائی)، ان سے پہلے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن بچوں کے لیے سب سے پہلا باقاعدہ اور قابلِ ذکر ڈراما ڈاکٹر ذاکر حسین کے "امانت" کو قرار دیا جا سکتا ہے جو ۱۹۳۱ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یومِ تاسیس کے موقعہ پر کھیلا گیا تھا[۱] اور پھر کتابی صورت میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی کے وسیلے سے منظرِ عام پر آیا۔ یہ اخلاقی نوعیت کا ڈرامہ ہے اور بچوں کو دیانت داری کا درس دیتا ہے لیکن مصنف نے خود کتاب کے سرورق پر اعتراف کیا ہے کہ یہ ڈراما ان کی طبع زاد تصنیف نہیں ہے بلکہ ماخوذ ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا سب سے اچھا ڈراما "کھوٹا سونا" ہے۔

ڈراما "کھوٹا سونا" کے توسط سے موصوف نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بچوں کو ایمان داری کا درس دیا ہے نیز انہیں تلقین کی ہے کہ لالچ بُری بلا ہے اور انسان اس کے ہاتھوں بڑے نقصان اٹھاتا ہے۔

موضوع کے ساتھ اس ڈرامے کی زبان، مکالمے، منظر کشی اور کردار بچوں کی نفسیات اور ان کی ذہنی استعداد سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس ڈرامے کے پلاٹ کو نہایت فطری انداز اور خوش سلیقگی کے ساتھ پھیلایا ہے۔ واقعات اور مناظر کی پیشکش نے ڈرامے کی دلچسپی اور مقصدیت دونوں کو دوبالا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے قلمبند کردہ بیشتر ڈرامے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بچے مختلف مواقع پر اسٹیج کرتے رہے ہیں۔

---

[۱] ڈاکٹر ذاکر حسین۔ "امانت" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ص ۱

یہی سبب ہے کہ اس میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ بچے مکالموں کی ادائیگی اور واقعات کو پیش کش میں کسی قسم کی دشواری محسوس نہ کریں نیز ان ڈراموں کے ذریعے کسی نہ کسی اخلاقی پہلو کو بچوں کے ذہن نشین کرایا جا سکے۔ یہ مختصر ڈراما تین منظروں کو مشتمل ہے۔ پہلا سین بمبئی شہر کی ایک سڑک ہے جہاں سریندر اور بمل چند آپس میں کھوٹا سونا بیچنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

دوسرا سین لالہ ہزاری مل کی دکان کا ہے، جہاں لوگ فریب دہی سے چندر کانت کے ہاتھوں "کھوٹا سونا" بیچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تیسرے سین میں جعل ساز سریندر اور بمل چندر کیفرکردار کو پہنچتے ہیں اور گرفتار کر لیے جاتے ہیں۔ ڈرامے کا ایک سین ملاحظہ ہو:۔

(لالہ ہزاری مل کی دُکان، لڑکا چندرکانت) کچھ زیور تجوری میں رکھ رہا ہے
اتنے میں بمل چندر ہاتھ میں انگوٹھی لیے دکان میں داخل ہوتا ہے۔)

بمل چندر۔ لالہ جی! میں یہ انگوٹھی بیچنا چاہتا ہوں، آپ خریدیں گے۔

چندرکانت۔ سونے کی ہے؟

بمل چندر۔ خالص سونا۔

چندرکانت۔ لائیے۔

بمل چندر۔ بیچنے کو جی تو نہیں چاہتا، جب میں چھوٹا سا تھا۔ اس وقت میرے باپ نے مجھے دی تھی، مگر۔

چندرکانت۔ تو پھر کیوں بیچتے ہو؟

بمل چندر۔ کیا کروں۔ آجکل کام دھندا کچھ نہیں ہے۔ چند بچے ہیں۔ بیوی ہے، پیسہ پاس نہیں۔

چندرکانت۔ افسوس

(بمل چندر سے چندرکانت انگوٹھی لے کر دیکھتا ہے)[1]

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین "کھوٹا سونا"، مشمولہ ہماری زبان حصہ دوم، سررشتہ تعلیم، اترپردیش، لکھنؤ ص ۴۳

درج بالا اقتباس سے جہاں واقعہ کی پیشکش کا فطری انداز سامنے آتا ہے وہیں زبان کی دلکشی اور مکالموں کی سادگی بھی قابلِ داد ہے۔ جملے مختصر اور برمحل ہیں۔ زبان سہل لیکن شگفتہ اور رواں ہے نیز اس ڈرامے کو بچے آسانی سے اسٹیج کر سکتے ہیں، ڈرامے میں جو فطری مناظر پیش کیے گئے ہیں، ان کی پیشکش میں بھی مصنف کی مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً تیسرے سین کا یہ مختصر منظر ملاحظہ ہو۔

"باغ اور حوض، گھاس پر بچھی ہوئی بنچیں، بہت سے آدمی اِدھر اُدھر گھاس اور بنچوں پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں"[1] ڈراما "کھوٹا سونا" کے مرکزی کرداروں میں سریندر، بمل چندر اور چندر کانت شامل ہیں۔ چندر کانت کم عمر لڑکا ہے۔ جو لالچ کے سبب ان لوگوں سے دھوکا کھا جاتا ہے اور سونا خرید لیتا ہے۔ ڈرامے کے اختتام پر پولیس کانسٹیبل، چندر کانت کو بھی تنبیہ کرتا ہے۔

"کانسٹیبل۔ تم ابھی بچے ہو۔ اس لیے چھوڑے دیتا ہوں، اب کبھی کسی کے ساتھ بے ایمانی نہ کرنا۔ دیکھا ذرا سی بے ایمانی کی کیا سزا ملی، چور نے اُلٹا تمھیں چور بنا دیا"[2]

مجموعی طور پر یہ بچوں کے لیے ایک بہترین ڈراما ہے اگرچہ اس میں ایمان داری کی تلقین کی گئی ہے لیکن ڈرامے کی زبان، اسلوب، منظر کشی اور مکالموں کی برجستگی لائقِ داد ہے اور مقصدیت پلاٹ کی دلچسپی اور واقعات کی فطری پیشکش کو کہیں بھی مجروح نہیں کرتی۔

چور لڑکا (عبدالغفار مدھولی)

ڈاکٹر ذاکر حسین نے نہ صرف خود اخلاقی نوعیت کے ڈرامے تصنیف کیے بلکہ جامعہ ملیہ اور اس کے باہر کے کئی مصنفین کو بھی اس طرف مائل کیا۔ چنانچہ جامعہ

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین "کھوٹا سونا" مشمولہ "ہماری زبان" حصہ دوم سررشتۂ تعلیم، اترپردیش لکھنؤ، ص ۷۰

[2] ڈاکٹر ذاکر حسین "کھوٹا سونا" مشمولہ "ہماری زبان" حصہ دوم سررشتۂ تعلیم اترپردیش لکھنؤ، ص ۷۱

کے ایک استاد اور بچوں کے ادیب عبدالغفار مدھولی نے بھی کئی ڈرامے قلمبند کیے جن میں "بچوں کا انصاف" "کایا پلٹ" "محنت" "اسکول کی زندگی" اور "چور لڑکا" "بچوں کی عدالت میں" وغیرہ خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ یہ تمام ڈرامے اخلاقی اور درسی ہیں۔ جن میں "چور لڑکا" "بچوں کی عدالت میں" شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ڈرامانسبتاً طویل ہے اور اس میں پانچ سین پیش کیے گئے ہیں۔ عبدالغفار مدھولی نے بھی ڈراموں کی پیش کش میں ہر جگہ اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ زبان بچوں کے لیے قابل فہم ہو مکالمے مختصر اور برجستہ ہوں نیز بچے ان ڈراموں کو بآسانی اسٹیج کر سکیں۔

اس ڈرامے کا مرکزی کردار ایک طالب علم سعید ہے جس میں بہت سی خوبیوں کے ساتھ ایک زبردست خامی یہ ہے کہ وہ دوسروں کے پیسے چرانے کا عادی ہے۔ سعید ایک بار دس روپے کی چوری کے الزام میں پکڑا جاتا ہے لیکن اس کے استاد اسے کسی قسم کی سزا دینے کے بجائے نفسیاتی حربوں سے یہ بُری عادت چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ سعید کو بچوں کے اتحادی بینک کا انچارج بنا دیتے ہیں، جہاں بہت سا پیسہ ہے۔ اس طرح سعید میں ذمہ داری کا احساس بیدار ہو جاتا ہے۔

چند شریر لڑکے سعید کی بدنامی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر روپے کی چوری کا الزام لگاتے ہیں۔ معاملہ بچوں کی عدالت میں پہنچتا ہے۔ اتحادی بینک کا ایک ماہ کا ریکارڈ نگراں کی رپورٹ، اور سعید کا بدلہ ہوا دیانت دارانہ رویہ دیکھ کر عدالت اسے بے گناہ قرار دیتی ہے نیز ان بچوں کو سزا ملتی ہے جنھوں نے سعید پر چوری کا الزام لگایا تھا۔

ڈرامے کا پلاٹ بہت عمدگی سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس کی پیشکش میں کہیں بھی بچوں کو بے کیفی کا احساس نہیں ہوتا اور ڈراما پڑھتے ہوئے قاری خود بھی اس ڈرامے کا کردار تصور کرنے لگتے ہیں۔ یہ ڈرامہ صرف بچوں کی اصلاح کے لیے نہیں لکھا گیا بلکہ اس میں اس نکتہ کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اچھے استاد چاہیں تو بچوں کو بُری عادتوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ایسا ہی ایک انداز اختیار کرتے ہوئے ڈرامے کے استاد کا رویہ ملاحظہ ہو۔

"استاد: سعید تم مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتے چاہے اعتبار کرو یا نہ کرو میں تم پر اعتبار کروں گا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ لو بنک کی چابیاں (جیب سے نکال پھینکتا ہے) میں آج سے تمھیں بنک کا محاسب بناتا ہوں۔ چاہے جتنی چوری کرو۔ آزمالو میں کسی سے نہیں کہوں گا کہ ایک پیسہ چرا لیا ہے۔"

افتخار:۔ اس سے بڑھ کر اور کیا اعتبار ہو گا۔

استاد:۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ پیسے کی ضرورت سب کو پڑتی ہے۔
اگر تمھیں ضرورت ہوا کرے تو دو آنے چار آنے مجھ سے مانگ کر لے جایا کرو۔"[1]

ڈرامے میں بچوں کے استعجاب اور تجسس کی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے دلچسپ عناصر شامل کیے گئے ہیں۔ مثلاً سعید کی بدنامی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے جبار اس پر اپنے روپیہ گم ہونے کا الزام لگا دیتا ہے لیکن عدالت میں ایک دوسرا لڑکا اصل حقیقت سے اس طرح پردہ اٹھاتا ہے۔

لڑکا۔ صاحب، جبار نوری سے کہہ رہا تھا کہ تم عدالت میں یہ کہہ دینا کہ میں نے سعید کو جبار کے کمرے میں دیکھا ہے۔ نوری نے کہا۔ ارے مجھ سے جھوٹ کیوں کہلواتے ہو جبار نے کہا، بھائی یہ لڑکا بدنام ہے سب کو یقین آجائے گا۔ اس کے حساب سے کچھ روپیہ مل جائیں گے۔

(سعید رو پڑتا ہے)

سعید۔ (روتے ہوئے) میرے خلاف ایسے ہی الزام لگائے جاتے ہیں۔ کہ میں چور کہلاتا ہوں۔"[2]

غفار مدھولی نے سعید کے کردار کی پیشکش میں نفسیاتی پیچیدگیوں سے اپنی مکمل واقفیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ سعید کے کردار کی کچھ خوبیاں استاد کی زبانی سنیے۔

---

[1] عبدالغفار مدھولی "چور لڑکا" بچوں کی عدالت میں "سنگم کتاب گھر، نئی دہلی، ص ۳۱

[2] عبدالغفار مدھولی "چور لڑکا" بچوں کی عدالت میں "سنگم کتاب گھر، نئی دہلی، ص ۳۲

"استاد:۔ سعید۔۔۔ تم تندرست ہو، کھلاڑی ہو، پڑھنے لکھنے میں تیز ہو۔
۔۔۔۔ پرنسپل صاحب کہتے ہیں۔ لڑکا تیز معلوم ہوتا ہے، میں نے کہا ارے
صاحب اس کی ایک خوبی ہے، صاف ستھرا بھی رہتا ہے، کمزور لڑکوں کی مدد کرتا ہے،
مشکل کام سے بھی گھبراتا نہیں، ہمیشہ خوش رہتا ہے ـــ لیکن میرا خیال جب تمہارے اس
عیب کی طرف جاتا ہے تو کہتا ہوں ـــ کاش اس ہرے بھرے پودے میں کیڑا نہ لگتا۔ تم
میں ایک بیماری ہے۔ کیا تم اسے نکال باہر نہیں کروگے؟" [1]

اس ڈرامے کے مکالمے نہایت فطری ہیں اور ان میں بچوں کی شوخ و شنگ
طبیعت اور چلبلے پن کی جھلکیاں عمدگی سے پیش کی گئی ہیں۔ جملے حسبِ ضرورت مختصر اور
طویل ہیں لیکن برجستگی اور روانی کا ہر مقام پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ سعید کی چوری پکڑے
جانے پر دو بچوں کی آپسی گفتگو ملاحظہ ہو۔

پہلا:۔ خوب پکڑی گئی چوری!

دوسرا:۔ (ہمدردی کے انداز میں) ارے بہت دنوں میں یہ چوری کی ہے۔

پہلا:۔ جی۔ شاید بیچ میں پتہ ہی نہ چلا ہو۔

دوسرا:۔ (تردید کرتے ہوئے) کبھی کسی چوری کا اعلان بھی ہوا ہے۔

پہلا:۔ خیر اب مزہ آئے گا، وہ رہے اتالیق صاحب" [2]

مجموعی اعتبار سے ڈرامے "چور لڑکا" "بچوں کی عدالت میں" کو اردو ادب اطفال
میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

آؤ ڈراما کریں (پروفیسر محمد مجیب)

جامعہ گروپ کے ڈراما نگاروں کا تذکرہ پروفیسر محمد مجیب کے ذکر کے بغیر نامکمل

---

[1] عبدالغفار مدھولی "چور لڑکا" "بچوں کی عدالت میں" سنگم کتاب گھر، نئی دہلی۔ ص ۱۸، ۱۹

[2] عبدالغفار مدھولی "چور لڑکا" "بچوں کی عدالت میں" سنگم کتاب گھر، نئی دہلی۔ ص ۸، ۹

رہے گا۔ موصوف نے بڑوں کے لیے جو ڈرامے لکھے ہیں ان کی حیثیت اور اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ بچوں کے لیے ان کی کتاب "آؤ ڈراما کریں" اُردو کے ادب اطفال میں اس اعتبار سے امتیازی اور منفرد مقام رکھتی ہے کہ اس میں بچوں کو ایک چھوٹے سے ڈرامے کی مثال سامنے رکھ کر اسے اسٹیج پر پیش کرنے کے طریقۂ کار سے واقف کرایا گیا ہے اور بیان میں پیچیدہ موضوع کو اتنی خوش اسلوبی سے واضح کیا گیا ہے کہ اوسط استعداد رکھنے والے بچّے از خود ڈراما اسٹیج کر سکتے ہیں۔

کتاب "آؤ ڈراما کریں" پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ "آؤ ڈراما کریں" اس کتاب کا پہلا باب ہے۔ جس میں محمود، خالد، ارشد، حفیظ اور سلامت ڈراما کرتے ہیں۔ اس ڈرامے کے لیے ڈرائنگ روم کے ایک حصہ کو ہی اسٹیج بنایا گیا ہے۔ اور گھر کے افراد نیز مہمان اس ڈرامے کے ناظرین ہیں۔ اس میں کسی قسم کے ساز و سامان اور میک اپ وغیرہ کی بھی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ درج ذیل اقتباس میں بچّے خود کو ڈراما کرنے کے لیے تیار کر رہے ہیں۔

"تھوڑی دیر میں خورشید صاحب ایک میلی سی لُنگی اور اتنا ہی میلا کُرتا اور ٹوپی لے کر آئے۔ محمود نے اپنے اچھے اچھے کپڑے اُتار کر لُنگی باندھی۔ اور کُرتا پہنا، ٹوپی سر پر رکھی۔ اتنے میں ایک نوکر چھوٹی سی ٹوکری لے کر آیا۔ جس میں بسکٹ بھی رکھے تھے، ماجد صاحب نے کہا ___ لو بھئی بسکٹ والے اپنی ٹوکری سنبھالو۔"[1]

اس مختصر سے ڈرامے میں کردار نگاری اور واقعہ نگاری دونوں قابل داد ہیں، بسکٹ والے کا یہ حلیہ ملاحظہ ہو۔

"بسکٹ والا لنگڑا کر چلتا تھا، کمر ٹیڑھی تھی، گردن ٹیڑھی، ٹوپی ٹیڑھی۔ اب بسکٹ کے دام بتاتے ہوئے اس نے تماشائیوں کی طرف منہ

---

[1] پروفیسر محمد مجیب "آؤ ڈراما کریں" مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی ۱۹۸۳ء ص ۵

پھیرا تو معلوم ہوا کہ وہ کاتا بھی ہے اور بات کہنے کے بعد ایک طرف کو زباں بھی نکال دیتا ہے۔" [1]

یہ ڈراما بچوں کی شوخ و شنگ حرکتوں اور شرارتوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے دوسرے باب میں بچوں کو بتایا گیا ہے کہ ڈراما کیا ہے؟ اسٹیج کسے کہتے ہیں۔؟ جذبات نگاری کیا ہے؟ ڈرامے میں قصہ کی کیا اہمیت ہے؟ بچوں کو ڈرامے کے قصے کے بارے میں بتاتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے:۔

"قصہ۔۔۔۔ میں بہت سے ایسے موقعے اور ان کے ساتھ ایسی کیفیتیں دکھائی جاسکتی ہیں جن کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔ ڈرامے کی جان موقعہ اور کیفیت ہے اور تمھارے قصوں میں جتنے اچھے موقعے اور کیفیتیں ہوں گی جن کی نقل کی جاسکتی ہے۔ اتنا ہی اچھا ڈراما ہوگا۔" [2]

تیسرے حصے میں ڈرامے کے قصے سے متعلق واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے اور بطور نمونہ ڈاکوؤں کے ایک ہولناک واقعہ پر مشتمل پلاٹ بچوں کو سنایا جاتا ہے اور اس وسیلے سے انھیں قصے اور ڈرامے کا فرق سمجھایا گیا ہے۔ اگلے ابواب میں ڈرامے کا خاکہ مکمل ہوجاتا ہے اور بچے اس ڈرامے کی تیاری میں مصروف نظر آتے ہیں۔

اسی طرح "آؤ ڈراما کریں" میں بچوں کے لیے ایک مختصر ڈراما بھی بطور نمونہ شامل کیا گیا ہے لیکن اصلاً یہ کتاب طلبہ کو ڈرامے کے فن اور اس کی عملی پیشکش کے رموز و نکات کی آگہی فراہم کرتی ہے۔

---

[1] پروفیسر محمد مجیب "آؤ ڈراما کریں" مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی ۱۹۸۳ء ص ۸

[2] پروفیسر محمد مجیب "آؤ ڈراما کریں" مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی ۱۹۸۳ء ص ۱۵

نیکی اور بدی کا مباحثہ (آغا حشر کاشمیری)

آغا حشر کاشمیری اردو کے سب سے بڑے ڈرامہ نویس تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کی نمایاں خوبی، مکالموں کا انداز اور ڈرامے میں جذبات کی فراوانی، جوش اور ولولے کی زیادتی ہے۔

"خوب صورت بلا" موصوف کا بہت مشہور ڈراما ہے۔ جس کے ایک سین کو 'نیکی اور بدی کا مباحثہ' کے عنوان سے بچوں کے لیے ڈرامے کی شکل میں درسی کتابوں میں شامل کیا گیا ہے تاکہ وہ خیر و شر میں امتیاز کر سکیں اور ترقی یافتہ سماج کی تشکیل نو میں حصہ لے سکیں۔

'نیکی اور بدی کا مباحثہ' میں مقصدیت کارفرما ہے۔ لیکن آغا حشر کا دلکش اسلوب نگارش ابتدا ہی سے قاری کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ یہ مقصدیت محسوس نہیں ہو پاتی۔ نیکی، بدی، توفیق، شمسہ اس ڈرامے کے تمثیلی اور اسم باسمیٰ کردار ہیں۔ مصنف نے ان کرداروں کی فطری خوبیوں کو بڑی چابکدستی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ ڈرامے کی ابتداء نیکی کی آمد سے ہوتی ہے۔ نیکی بچوں کو سچائی کی راہ پر چلنے کی تلقین کرتی ہے۔

> "خداوند کا جلال ہی مقدس ہے وہ خدا جو آدم کے سرکش اور باغی بیٹوں کو ماں باپ کی طرح پیار کرتا ہے۔ مبارک ہے وہ انسان جو سچے دل سے اور پوری سچائی کے ساتھ اس کی اطاعت اختیار کرتا ہے۔
> اے گمراہ ہستی! جو اندھی اور دیوانی بنی ہوئی تباہی کے غار کی طرف دوڑی جا رہی ہے۔ آ روشنی کی طرف آ۔ خدائے رحیم تیری پکار پر کان لگائے ہے، اس کی رحمت تجھے گود میں لینے کے لیے محبت کے بازو پھیلائے ہے۔"[1]

---

[1] آغا حشر کاشمیری "نیکی اور بدی کا مباحثہ" مشمولہ شاہکار، مولفہ مولوی محمد ابراہیم ۱۹۷۵ء، ص ۲۰۱

ڈرامے نیکی اور بدی کے درمیان مباحثہ پیش کیا گیا ہے۔ اور بچوں کو بتایا گیا ہے کہ نیکی، دنیا اور عاقبت دونوں کے لیے بہت ضروری ہے۔ دنیا میں جتنے دغا اور فریب کے کارنامے ہیں، ان میں بدی کا ہاتھ شامل ہوتا ہے۔

بدی کہتی ہے۔

"دنیا کی قسمت میرے داہنے ہاتھ میں ہے اور اس کی کنجی میرے بائیں ہاتھ میں ہے۔ تم جو بہشت کی امید میں دنیا کو دوزخ بنائے ہوئے ہو، میری طرف آؤ اور میرا دروازہ کھٹکھٹاؤ، میری سخاوت کے بادل موتی برسائیں گے اور تمھارے دامن کو بھی مالا مال کر دیں گے"[1]

اور نیکی جواب دیتی ہے۔

"تو جھوٹی ہے، تو آدمی کو ذلت، مصیبت، اور خوفناک موت کے سوا کچھ نہیں دے سکتی"[2]

ڈرامے کی سب سے بڑی خوبی اسکی زبان اور مکالمے ہیں۔ زبان نہایت شگفتہ مگر عام فہم، مکالموں میں برجستگی اور رنگینی شامل ہے۔ نیز مکالمات کے دوران برمحل اشعار سے خوب خوب کام لیا گیا ہے۔ مثلاً تمسہ، توفیق سے کہتی ہے۔

سانس سے آگ جو برساؤں وہ اژدر ہوں میں
ضد میں طوفان تو غصے میں سمندر ہوں میں
پیس ڈالوں گی مٹا دوں گی فنا کر دوں گی
یاد رکھنا تری تقدیر کا چکر ہوں میں[3]

اور توفیق جواب دیتی ہے۔

---

[1] آغا حشر کاشمیری "نیکی اور بدی کا مباحثہ" مشمولہ شاہکار نثر، مولفہ مولوی محمد ابراہیم ۱۹۶۶ء ص ۲۰۲
[2] آغا حشر کاشمیری "نیکی اور بدی کا مباحثہ" مشمولہ شاہکار نثر، مولفہ مولوی محمد ابراہیم ۱۹۶۶ء ص ۲۰۲
[3] آغا حشر کاشمیری "نیکی اور بدی کا مباحثہ" مشمولہ شاہکار نثر، مولفہ مولوی محمد ابراہیم ۱۹۶۶ء ص ۲۰۳

دل کا جوش ایسے ڈراوے سے کہیں گھٹتا ہے
موم سے پنجۂ فولاد کہیں دبتا ہے
مت سمجھ دل سے مرے زہر دعا نکلے گا
چیر کر دیکھ شرافت سے بھرا نکلے گا
روئیں روئیں کی زبان پہ یہ سخن جاری ہے
جان پیاری نہیں دنیا کو وفا پیاری ہے[1]

ڈرامے میں بچوں کے لیے یہ منظوم مکالمے بہت دلچسپ نظر آتے ہیں۔ الغرض اس ڈرامے میں بچوں کو نیکی کی راہ پر چلنے کی متاثر کن پیرایے میں ترغیب دی گئی ہے۔

قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے ڈرامے "کھوٹا سونا" سے پیشتر بھی مختلف اہلِ قلم کی ڈرامے کے پیرائے میں دو چار کاوشیں نظر آتی ہیں۔ ان کا مجموعی رجحان ظریفانہ تھا۔ ایسے ڈراموں میں عظیم بیگ چغتائی کا "نوجوان ڈاکٹر" علی عباس حسینی کا "دل بہلاوا" شوکت تھانوی کا "لاٹری کا ٹکٹ" اور نئی نسل کی تخلیق کار نجمہ یوسف کا ڈرامہ "نئے جوتے" لائق توجہ ہیں۔

نوجوان ڈاکٹر:-

عظیم بیگ چغتائی کا "نوجوان ڈاکٹر" یک بابی ڈرامے کے ضمن میں آتا ہے۔ اس ڈرامے کا موضوع ہلکا پھلکا اور تفریحی نوعیت کا ہے جس میں ایک نوجوان ڈاکٹر (جس کی پریکٹس اچھی نہیں چلتی) کا ٹیلیفون خراب ہو جاتا ہے۔ ڈرامے میں اس معمولی واقعہ کو مضحکہ خیز صورت حال میں پیش کیا ہے۔ عظیم بیگ چغتائی کے قلم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی تحریکوں میں عموماً واقعات اور لفظی الٹ پھیر کی آمیزش سے مزاح پیدا ہوتا ہے۔ لفظی پینترے بازی اور واقعات سے مزاحیہ پہلو نمودار کرنے کا ایک نمونہ

---

[1] آغا حشر کاشمیری کا "نیکی اور بدی کا مباحثہ" مشمولہ شاہکار نثر مولفہ مولوی محمد ابراہیم ۱۹۵۸ء ص ۲۰۳

ملاحظہ ہو:۔

ڈاکٹر مگر سُنو تو۔ کیا ضرورت ہے ٹیلیفون کی، مفت میں ہر مہینے مُٹھی بھر روپے جاتے ہیں۔ آج تک ایک مریض بھی ٹیلیفون کے ذریعہ نہیں آیا۔

کمپونڈر مگر نہیں جناب کوئی ٹیلیفون پر پوچھے یا نہ پوچھے کم از کم بیمار آکر بیٹھتے ہیں اور آپ ٹیلیفون پر زبردستی کی گفتگو کرتے ہیں تو مریضوں پر رُعب توچھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر بیشک، یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ کیوں بھئی معنوعی ٹیلیفون کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ کرایہ بھی بچ جائے اور کام بھی چلتا رہے۔

کمپونڈر یہ بھی ٹھیک ہے، ٹیلیفون آفس کو آج ہی خبر کردی جائے کہ وہ ٹیلیفون ہٹالیں۔" [1]

اس مختصر ڈرامے میں تمام واقعات فطری انداز میں پیش آتے ہیں۔ زبان کی دلکشی نے واقعات کی سچی منظر کشی کی ہے۔ مریض بیٹھے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر مریض کی آنکھ بچا کر ہوشیاری سے میز پر رکھے ہوئے ٹیلیفون کی گھنٹی بجاتا ہے اور پھر ریسور اٹھا لیتا ہے۔ لیجئے یہ گفتگو ملاحظہ ہو:۔

ڈاکٹر ہیلو۔ . . . جی ہاں . . . . جی جی آداب۔ بے ہوش ہیں . . . . . مگر نہیں صاحب، میں اس وقت مریضوں کو چھوڑ کر کیسے آسکتا ہوں . . . . لاحول ولا قوۃ . . . . ڈبل فیس کیا بلا ہوتی ہے . . . معاف کیجئے! . . . میں سب کا ادنیٰ غلام خادم ہوں۔ جی اصول ہے یہ میرا . . . . بس آدھ گھنٹہ یا گھنٹہ . . . بشرطیکہ مریض کوئی نہ رہے۔ . . . . بس . . . . میں خود۔

(مریضوں سے مخاطب ہوکر)

---

[1] عظیم بیگ چغتائی "نوجوان ڈاکٹر" مشمولہ ہماری زبان حصہ اوّل سررشتہ تعلیم اترپردیش لکھنؤ ص ۱۔

بھلا بتائیے آپ لوگوں کو بغیر دیکھے کیسے چل دوں، کیسے آدمی ہیں! ڈبل فیس لے لو مگر فوراً آجاؤ۔[1]

ڈرامے کا اختتام نہایت دلچسپ ہے۔ ڈاکٹر صاحب ٹیلی فون پر بار بار یہ حرکت کرتے ہیں لیکن پہلے مریض کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس دلچسپ حقیقت کا انکشاف ہوتا کہ وہ مریض نہیں بلکہ ٹیلیفون مکینک ہے جو اپنے علاج کے لیے نہیں بلکہ ٹیلیفون کا علاج کرنے آیا ہے۔

ڈرامے میں صرف تین کرداروں کی مدد سے کام چلایا گیا ہے۔ منظر میں ڈاکٹر کا مطب پیش کیا گیا ہے۔ ڈرامے کی زبان سہل اور عام فہم ہے۔ البتہ مکالمے ضرورت سے زیادہ طویل ہیں۔

بحیثیت مجموعی نوجوان ڈاکٹر بچوں کا ایک تفریحی ڈرامہ ہے اور اس ڈرامے میں بھی عظیم بیگ چغتائی نے فن مزاح نگاری پر اپنی ماہرانہ گرفت کا مظاہرہ کیا ہے۔

دل بہلاوا (علی عباس حسینی)

"دل بہلاوا" علی عباس حسینی کا دلچسپ مزاحیہ ڈراما ہے۔ اس ڈرامے کو بھی یک بابی ڈرامے کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ علی عباس حسینی نے اس ڈرامے میں ذہانت آمیز فقروں، ضلع جگت اور بذلہ سنجی کے ذریعے مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں سلمیٰ وقت گزاری کے لیے کپڑا خریدنے کے بہانے ایک پارچہ فروش کو پریشان کرتی ہے۔ گلی کوچوں میں پھیری والوں اور گھریلو عورتوں کے درمیان خرید و فروخت کے معاملات کی دلکش تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس ڈرامے میں صرف تین کردار ہیں۔ سلمیٰ (ایک پردہ نشین باتونی خاتون) رحمن (اس کی ماما)، اور بزاز۔ پلاٹ ہلکا پھلکا ہے۔ حسینی صاحب کی اسلوب نگاری نے ڈرامے کی دلکشی کو دوبالا کر دیا۔ مصنف

---

[1] عظیم بیگ چغتائی "نوجوان ڈاکٹر" مشمولہ ہماری زبان حصہ اول سررشتہ تعلیم اتر پردیش لکھنؤ ص ۱۳۳

عورتوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہے۔ ان میں سے بیشتر گھریلو خواتین اپنے فاضل وقت کو فضول باتوں میں صرف کرنے کی عادی ہوتی ہیں۔ درج ذیل اقتباسات سے عورتوں کی اس فطرت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

"کس جگہ لا کے بند کیا انھوں نے۔ نہ تو کسی سودا بیچنے والے کی آواز آتی ہے نہ پھیری والے کی نہ کہیں سڑک دکھائی دیتی ہے اور نہ کوئی برات آتی جاتی دیکھ سکتی ہوں اور نہ کوئی جنازہ ۔۔ واہ کیا مکان ہے، ایک کمرہ چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں، صحن ندارد، بس میں پنجڑے کی چڑیا کی طرح بند پڑی پھڑپھڑاؤں۔ اللہ میاں نے ہم لوگوں کو عورت کا جنم دیا۔"[1]

ڈرامے میں جزئیات نگاری کے عمدہ نمونے شامل ہیں۔ مثال کے طور پر کمرے کا منظر پیش کرتے ہوئے علی عباس حسینی کی نگاہ چھوٹی چھوٹی حقیر چیزوں تک بھی پہنچتی ہے۔ درج ذیل اقتباس اس امر کا شاہد ہے۔

"ایک کمرہ جس کی دیواریں زیادہ تر دھوئیں سے کالی ہیں، کونوں میں جالے لٹک رہے ہیں، تخت پر چاندنی کا فرش ہے، گاؤ تکیہ سے لگی ہوئی سلمیٰ بیٹھی ڈلی کاٹ رہی ہے، سامنے ایک بڑا سا پاندان ہے اور تخت کے نیچے اگالدان رکھا ہے۔ تخت کے تھوڑے فاصلے پر دو پلنگ بچھے ہیں جس میں سے ایک پر میلی دری پڑی ہے، دوسرے پر بستر سرہانے طے کیا ہوا رکھا ہے، رحیمن ایک پیڑھی پر بیٹھی ہے۔"[2]

اس اقتباس میں جزئیات کے وسیلے سے مصنف نے ایسا جیتا جاگتا منظر پیش کیا ہے کہ قاری کے ذہن میں پوری طرح تصویر واضح ہو جاتی ہے۔ ڈرامے کی زبان شگفتہ اور رواں دواں ہے۔ نیز مکالمات میں لکھنؤ کی بیگماتی زبان کے استعمال نے

---

[1] علی عباس حسینی "دل بہلاوا" مشمولہ "بہارستان اردو" حصہ سوم، علی گڑھ ص ۱۸۹

[2] علی عباس حسینی "دل بہلاوا" مشمولہ "بہارستان اردو" حصہ سوم، علی گڑھ ص ۱۸۸۔۱۸۹

ایک انفرادی شان پیدا کر دی ہے۔ ایک نمونہ پیش خدمت ہے۔

سلمیٰ:۔ "تجھے ہے رحیمن تم تو اس سے لڑنے لگیں، ذرا ان کپڑوں کو دیکھو، کچھ رائے صلاح کرو، کچھ مشورہ دو بی بی تم تو اس طرح سے منہ میں گھنگنیاں بھر کے بیٹھی ہو جیسے تمھیں سانپ سونگھ گیا ہے۔ واہ بوا واہ، تم تو بازار میں نکلتی ہو، اپنی آنکھوں سے سینکڑوں ہزاروں تھان تم نے دیکھے ہوں گے۔"

رحیمن:۔ اللہ بنائے رکھے بی بی آپ سی سرکاروں کو سینکڑوں ہجاروں دیکھے بھی اور کھریدے بھی۔"[1]

منہ میں گھنگنیاں بھرنا اور سانپ سونگھ جانا جیسے محاوروں کے استعمال سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو عام بول چال کی زبان پر عبور حاصل ہے۔ اس طرح علی عباس حسینی مختلف طبقوں اور حیثیتوں کے افراد کے لب و لہجے سے بھی بخوبی آشنا ہیں۔ اس ڈرامے میں سلمیٰ اور رحیمن مغلوں کے لب و لہجہ میں مالکن اور ماما کا امتیاز نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ کہیں کہیں مکالمے طویل ہو گئے ہیں لیکن پڑھنے والوں پر طرز ادا کی ندرت کے باعث یہ طوالت گراں نہیں گزرتی۔ ایسی ہی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

رحیمن: یہ بی بی آپ نے بالکل ٹھیک بات کہی، ہم گریبوں کا دل دکھاتے ہیں جب ہی کھدا بھی ان سے ناکھش رہتا ہے۔

سلمیٰ: ارے تو اور کیا وہ تھا نہ بنیا جو ہمارے یہاں لگا ہوا تھا۔ ارے بھلا سا نام تھا اس کا۔ بُلاؤ نہیں نہیں بُلاؤ، ارے پیٹ میں ہے مُنہ میں نہیں آتا۔ ارے یہاں یاد آگیا۔ کھلاؤ میں کہتی ہوں ان موؤں کو نام بھی رکھنا نہیں آتا۔ عجیب عجیب طرح کے نام رکھتے ہیں۔ گھورو، گھسیٹے.....

---

[1] علی عباس حسینی۔ دل بہلاوا مشمولہ بہارستان اردو حصہ سوم علی گڑھ ص ۱۹۴

رہیں۔ عام ڈوبی بی میں نے پنجاب میں سُنے ہیں۔ ایسے سکنت سکنت کہ جیان ٹوٹ جائے اور نام نہ نکلے۔[1]

موضوع اور پیشکش کے اعتبار سے "دل بہلاوا" قدرے بڑی عمر کے بچوں اور بچیوں کے لیے ایک اچھا ڈراما ہے۔

لاٹری کا ٹکٹ (شوکت تھانوی)

دورِ جدید کے ممتاز مزاح نگاروں میں شوکت تھانوی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ جنھوں نے ہلکے پھلکے اور عام فہم موضوعات کو اپنی نثری نگارشات کا محور بنایا ہے۔ موصوف نے مزاحیہ ناولوں اور مضامین کے ساتھ ڈرامے بھی تخلیق کیے۔ ان ڈراموں میں ریڈیو پاکستان سے قسط وار نشر ہونے والا مشہور ڈراما "منشی جی" ممتاز اہمیت کا حامل ہے۔ "لاٹری کا ٹکٹ" اسی ڈرامے کی ایک قسط ہے۔ جو دلچسپ اور پُرلطف ہے اس کو بچوں کے ڈرامے کے طور پر نصابی کتب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں لکھنؤ کے لطیف ادبی مذاق کا نمایاں اثر پایا جاتا ہے۔ بیگماتی زبان اور لکھنؤ کا روزمرہ بھی نہایت سلیقے سے استعمال کرتے ہیں۔ ان تمام فنی خوبیوں کا حامل ان کا ڈراما "لاٹری کا ٹکٹ" بچوں کو تفریح کا وافر سامان فراہم کرتا ہے جس میں واقعات اور الفاظ دونوں سے مزاحیہ صورتِ حال پیدا کی گئی ہے۔ اس ڈرامے کے کردار صرف تین ہیں۔ منشی جی، ان کی بیوی اور سلیم۔ منشی جی نے ایک لاٹری کا ٹکٹ خریدا ہے۔ انھیں یقینِ کامل ہے کہ انعام ضرور نکلے گا۔ اس امید پر وہ بڑے بڑے ہوائی قلعے بناتے ہیں اور اس دن کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں جس دن نتیجہ کا اعلان ہوگا اور تار کے ذریعے انھیں انعام کی خوشخبری ملے گی۔ اتفاق سے عین نتیجے کے دن منشی جی کو ایک تار بھی ملتا ہے لیکن اس میں انعام کی خوشخبری نہیں تھی بلکہ معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ ڈرامے کا اختتام

---

[1] علی عباس حسینی "دل بہلاوا" مشمولہ "بہارستان اردو" حصہ سوم، علی گڑھ، ص ۱۹۰

خاصا پرلطف ہے :-

"منشی جی: نہیں بھئی تمھارے ہاتھ مبارک ہیں تم ہی کھولو میرے تو ہاتھ اس وقت
کانپ رہے ہیں۔ دستخط کرنے کی جگہ لکھ گیا تھا گھبرا کر لکھ بیٹی۔

بیوی۔ اے لو، خود ہی کیوں نہیں کھولتے۔

منشی جی۔ نہیں تم کھولو بسم اللہ کرکے، مجھے تو اس وقت کچھ اختلاج سا ہو رہا ہے۔

بیوی :۔ لو پڑھو۔

منشی جی: لینا میاں، دیکھو رقم کتنی ہے، کدھر گیا میرا چشمہ۔

سلیم :۔ ارے !

منشی جی: کیوں کیوں کیا بات ہے؟

سلیم محمود بھائی کا تار ہے، کل شام بھائی جان نے انتقال فرمایا۔

منشی جی۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) مرنے کا تار ہے

بیوی۔ ہائے یہ میری رضو کے مرنے کا تار ہے۔

(روتی ہے)" [1]

محولہ بالا اقتباس میں اس ڈرامے کا دلچسپ اختتام سامنے آتا ہے۔ اس کے ساتھ مکالموں کی بیساختگی اور برجستگی نیز جذبات کی عکاسی میں شوکت تھانوی کی مہارت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

اس ڈرامے کے مکالمے کہیں کہیں طویل ہو گئے ہیں لیکن ضرورت کا تقاضہ ہے دراصل ان طویل مکالمات کے ذریعے مزاحیہ فضا کو زیادہ پُر اثر بنانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ قارئین کہیں بھی بے کیفی محسوس نہیں کرتے۔ مثلاً سلیم اور منشی جی کی یہ گفتگو ملاحظہ ہو :۔

---

[1] شوکت تھانوی "لاٹری کا ٹکٹ" مشمولہ ہماری کتاب نثر۔ مولفہ : خلیل الرب ، سری رام مہرہ اینڈ سنس۔ آگرہ ، ص ۱۹۳

تسلیم بھائی صاحب خدا کرے اب کے آپ ہی کو انعام مل جائے مگر لاٹری کے انعام کی امید پر اس طرح انتقام کرتے ہوئے میں نے آپ ہی کو دیکھا؟

منشی جی انتظام! تو میں نے آخر کون سا انتظام کیا ہے! یہی نا کہ کوٹھی اپنی نظر میں ہے اور موٹر کے لیے فیصلہ کر لیا ہے، آپ ہیں صاحبزادے اس کو انتظام نہیں دُور اندیشی کہتے ہیں، میرے ذہن میں انعام پانے کے بعد کی تمام اسکیم موجود ہے . . . ."[1]

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ڈرامے میں نسائی لب و لہجہ اور لکھنؤ کا روز مرہ بھی پُر لطف انداز میں پیش کیا گیا ہے مثلاً آغاز میں منشی جی اور ان کی بیگم کے درمیان ہونے والی گفتگو ملاحظہ ہو:۔

"(منشی جی کی بیوی چولہا پھونک رہی ہیں، منشی جی آتے ہیں۔)

بیوی موئی گیلی لکڑیاں اٹھا کر دے دیں، جیسے خیرات ہی میں تو دی ہیں۔

(بیوی چولہا پھونکتی ہیں، دروازہ کھلتا ہے، منشی جی آتے ہیں)

منشی جی ارے بھائی کہاں گئیں، لاحول ولاقوۃ، وہی ہانڈی چولہا، چھوڑو بھی اسے میں پوچھتا ہوں کوئی تار تو نہیں آیا۔

بیوی تار — کیسا تار۔؟

منشی جی یعنی معلوم بھی ہے آج ۲۰ تاریخ ہے آج ہی تو تار آئے گا۔ اس لاٹری کا!!

بیوی تو یہ ہے۔ میں تو سمجھی سچ مچ کسی کا تار آنے والا ہے۔ اور میں تو پوچھتی ہوں۔ اب کے یہ لکڑیاں کہاں سے اٹھا لائے تھے۔؟

منشی جی اجی جہنم میں ڈالو، ان لکڑیوں کو اور چھوڑو اس چولہا ہانڈی کو۔

بیوی کہو! کیا کہتے ہو، سُن تو رہی ہوں۔"[2]

---

[1] شوکت تھانوی "لاٹری کا ٹکٹ" مشمولہ "ہماری زبان" ہماری کتاب نثر مولفہ: خلیل الرب، سری رام مہرہ اینڈ سنز۔ آگرہ، ص ۱۶۰ [2] شوکت تھانوی "لاٹری کا ٹکٹ" مشمولہ "ہماری کتاب نثر" مولفہ۔ خلیل الرب، سری رام مہرہ اینڈ سنز۔ آگرہ، ص ۱۵۶-۱۵۵
[3] ایضاً ۱۶۵ ۱۵۵

اس ڈرامے میں تجسس اور کشش و پیچ کی کیفیت از اول تا آخر برقرار رکھی گئی ہے جس نے ظریفانہ طرزِ اظہار سے مل کر دلچسپی کو دوبالا کر دیا ہے۔
القصہ بچوں کے مزاحیہ ڈراموں میں شوکت تھانوی کی اس تخلیق کو اہم مقام حاصل ہے۔

نئے جوتے (نجمہ یوسف)

مزاحیہ ڈراموں کے سلسلے میں تکمیل گفتگو کے طرز پر "نئے جوتے" (نجمہ یوسف) کا تجزیہ بھی پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ نجمہ یوسف کا یہ ڈراما ۱۹۸۴ء میں منظرِ عام پر آیا اور خود مصنف کا تعلق بھی بالکل نئے لکھنے والوں کی نسل سے ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا "نئے جوتے" بھی ایک مزاحیہ اور تفریحی نوعیت کا ڈرامہ ہے۔

افضل احمد اپنے دوست کے پاس دوسرے شہر جانے والے ہیں۔ ان کے جوتے بہت پُرانے اور خستہ حال ہیں۔ بیگم افضل چاہتی ہیں کہ وہ نئے جوتے پہن کر دوست کے پاس جائیں۔ جوتے خریدنے کی چپقلش، جوتوں کا آنا اور پورے گھر کا اس پُرلطف مُہم میں شامل ہو جانا جیسے واقعات پلاٹ میں شامل ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ افضل احمد بوکھلاہٹ سے پُرانے جوتے پہن کر سفر میں جاتے ہیں۔ واقعات کی پیشکش میں ڈراما نگار نے مہارتِ فن کا ثبوت دیا ہے۔ افضل احمد پر روانگی کا یہ منظر ملاحظہ ہو:۔

افضل (گھڑی کی طرف دیکھ کر) دیر ہوگئی (جلدی جلدی ٹائی باندھتے ہیں اور ادھر مڑتے ہیں جہاں جوتے رکھے ہیں۔ اسی وقت بجلی چلی جاتی ہے وہ بڑبڑاتے ہیں) بجلی بھی جانی تھی، اندھیرا ہی ہوگیا۔"

(وہ تیزی سے بڑھ کر جوتے پہن لیتے ہیں بیگم افضل سلام پھیرتی ہیں۔)

بیگم افضل (یاد دلاتے ہوئے) نئے جوتے پہن لیے۔؟

افضل احمد پہن لیے، اب جاتا ہوں، خدا حافظ۔" [1]

---

[1] نجمہ یوسف "نئے جوتے" مشمولہ ماہنامہ کھلونا" مئی ۱۹۸۴ء ص ۳۷ (مدیر الیاس دہلوی وغیرہ)

ڈراما نگار نے واقعہ کی کتنی پُرلطف مصوری کی ہے "نئے جوتے" کا انجام بھی انتہائی دلچسپ اور ڈرامائی ہے۔

بیگم افضل (روہانسی ہوکر) مجھے معلوم ہوتا ہے کہ "نئے جوتے" کم بخت رہ ہی جائیں گے تو میں ساری رات انھیں لیے کھڑی رہتی۔

(بیگم افضل دونوں ہاتھ میں جوتے اٹھا کر انھیں حسرت سے دیکھتی ہیں، نئے جوتے جگمگا رہے ہیں اور ان دونوں کے چہرے پھیکے پڑے ہوئے ہیں[1]

ڈراما پانچ مختلف منظروں پر مشتمل ہے، ہر منظر میں جزئیات نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً دوسرا منظر ملاحظہ ہو۔

"جوتوں کی دُکان پر افضل احمد اور بیگم افضل احمد گدے دار بنچ پر بیٹھے ہیں افضل احمد کی گود میں ٹربے چینی سے دکان میں رکھے ہوئے جوتوں کے ڈبوں کی طرف لپک رہی ہے۔ وہ اسے بہ مشکل سنبھال رہے ہیں۔ ان کے سامنے مختلف رنگوں کے نئے چمچماتے جوتوں کا ڈھیر لگا ہے، دُکان دار سر پکڑے بیٹھا ہے۔"[2]

کردار نگاری کے ضمن میں ڈراما نگار نے نفسیات پر اپنی قدرت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ بیگم افضل کا کردار متوسط طبقے کی فطری ترجمانی کرتا ہے وہ افضل احمد پر حاوی ہیں، عقل مند اور سمجھ دار ہیں۔ افضل کے مزاج میں بوکھلاہٹ، بے چینی اور لاپرواہی شامل ہے درج ذیل اقتباس سے بیگم افضل اور افضل احمد کے مزاج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بیگم افضل: ابھی چلیے — جوتے خرید لاتے ہیں۔

افضل احمد: پہلے کھانا کھالوں۔

بیگم افضل: نہیں پہلے جوتے خریدیں گے تاکہ مجھے اطمینان ہوجائے۔

افضل احمد: کھانے کے بعد بھی جوتے خریدے جاسکتے ہیں۔

---

[1] نجمہ یوسف "نئے جوتے" مشمولہ ماہنامہ کھلونا" مئی ۱۹۸۴ء ص ۳۷ (مدیر الیاس دہلوی وغیرہ)

[2] نجمہ یوسف "نئے جوتے" مشمولہ ماہنامہ کھلونا، مئی ۱۹۸۴ء ص ۳۶ (مدیر الیاس دہلوی وغیرہ)

بیگم افضل (ذرا غصّے سے) مجھے معلوم ہے آپ یہ پھٹے پرانے جوتے ہی پہن کر جائیں گے
اور بے عزتی کرائیں گے۔
کچھ بھی ہو، میں اپنے سڑے ہوئے جوتوں کے ساتھ آپ کو نہیں جانے
دوں گی۔[۱]

باہمی تکرار، برجستہ مکالموں اور زبان کی شگفتگی نے اس اقتباس کو خاصا پُرلطف بنادیا ہے،
بحیثیت مجموعی ڈراما "نئے جوتے" بچوں کی تفریح کا خاصا سامان فراہم کرتا ہے اور پڑھنے
والا واقعات کی دلچسپ اور فطری پیشکش پر ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(۵)

قدیم داستانوں، حکایتوں اور تاریخی واقعات کی مدد سے تخلیق کردہ ڈراموں کی
کثیر تعداد اُردو کے ادب اطفال میں موجود ہے۔ ان میں "مہابلی" (محمد عمر نورالہی)
"بغداد کا حجام" (سعدی مجلی شہری)، اور "ایک تھا قاسم ایک تھا علی بابا" (اظہر افسر) وغیرہ خاص طور
پر قابلِ ذکر ہیں۔

محمد عمر نورالہی اردو ڈرامے کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں "مہابلی" ان کا ایک باب
پر مشتمل تاریخی ڈراما ہے جس میں شہنشاہ اکبر کے عہد کی دو راجپوت عورتوں مہارانی "پدمنی"
اور "ویرا" کی بہادری اور جانبازی کا واقعہ ڈرامائی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈرامے میں جہاں
راجپوتوں کی روایتی شجاعت کو اجاگر کیا گیا ہے وہیں اکبر اعظم کی مذہبی رواداری پر بھی روشنی
ڈالی گئی ہے نیز قومی یک جہتی اور حب الوطنی کو بھی اس ڈرامے سے تقویت ملتی ہے۔

ڈراما "مہابلی" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ واقعات نہایت تیز رفتاری کے ساتھ
رونما ہوتے ہیں اور ڈرامے کا ٹیمپو کہیں بھی سست گامی کا شکار نہیں ہوتا۔ مکالموں کے وسیلے
سے بھی نوع بنوع واقعات کو پلاٹ کا جزو بنایا گیا ہے۔ اکبر راجپوتوں پر فتح حاصل کر لیتا ہے۔
لیکن اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس جنگ میں راجپوتوں کی تعداد بہت کم

---

[۱] نجمہ یوسف "نئے جوتے" مشمولہ کھلونا ماہنامہ مدیر: الیاس دہلوی۔ مئی ۱۹۸۲ء ص ۲۲

تھی اور ان کے مقابلہ پر مغلوں کی فوج کافی بڑی تھی۔ اکبر کے اس احساس کی ترجمانی درج ذیل اقتباس میں نہایت پُرتاثیر انداز میں کی گئی ہے۔

"سچ تو یہ ہے کہ راجپوتوں کی اس شکست پر ہزار فتح قربان ہے۔ ٹڈی دل لشکر اور مٹھی بھر سپاہیوں کا کیا مقابلہ۔

مُلّا جی! یہ شجاعت کی فتح نہ تھی، یہ فن سپہ گری کی کامیابی نہ تھی فقط تعداد کا سیلاب تھا جو راجپوتوں کو بہالے گا۔

آہ! ان کا نوعمر سپہ سالار جس کی شکل آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی معرکہ جنگ میں اس طرح جھوم رہا تھا گویا کسی کھیل میں مشغول ہے۔ . . .

... سبحان اللہ راجپوت کیسی شان سے لڑے۔ [1]

مہارانی پدمنی اور ویرا کا فقیر بن کر دربار میں آنا، بادشاہ اکبر کو قتل کرنے کی سازش لیکن اس کی شخصیت سے خود مغلوب ہو جانا، اکبر کی وسیع النظری اس کی بے مثال انصاف پسندی اور راجپوتوں کو ان کا راج واپس کر دینا جیسے واقعات نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ڈرامے میں شامل کیے گئے ہیں۔

مرکزی کرداروں میں اکبر، ابوالفضل، ویرا اور پدمنی، قارئین کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کرداروں کی پیشکش میں محمد عمر نور الہٰی نے مہارت فن کا ثبوت دیا ہے۔ ڈرامے کی زبان عام فہم اور بچّوں کی استعداد سے مناسبت رکھتی ہے۔ کہیں کہیں ہندی الفاظ کا برمحل استعمال کیا گیا ہے۔ فقیر اور اکبر اعظم کی گفتگو سے متعلق یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

اکبر: سائیں جی! کس ملک سے آنا ہوا۔

فقیر: بابا جی، دیس تھا، تھا اب دیس پردیس ایک ہو رہا ہے نہ ہمارا کوئی دیس نہ ہم کسی دیس کے۔ بھیا بھارت ماتا نے گود سے اچھال کر پھینک دیا ہے اب پڑے بھٹکتے ہیں۔

---

[1] محمد عمر نور الہٰی "مشمولہ" دبستان حصہ سوم) پریمیر پبلشنگ ہاؤس بنارس ۱۹۷۱ء ص ۱۷۲ (مرتبہ رفیق حسن)

اکبر   کوئی بیوی بچہ۔

فقیر   آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا۔

اکبر   مجھ سے ملنے کا کس طرح دھیان آیا۔

فقیر   کہتے تھے کہ مہابلی، سادھو اور گائوں کی پالنا کرتے ہیں۔ اس لیے پرکشا کے لیے چلے آئے۔

دوسرا فقیر   پرجا کو راجا کے گن گاتے سُنا تو پرن کیا کہ مرنے سے پہلے ایسے مہابلی کے درشن کریں گے۔[1]

ڈرامے کی زبان کہیں کہیں خطیبانہ اور شعریت آمیز ہو گئی ہے جس سے اس کا حسن اور بھی بڑھ گیا ہے۔ ایک مثال:۔

اکبر   عالی شان مہارانیو! قابلِ پرستش دیویو! تمہاری صداقت، شجاعت، عصمت شعاری اور خودداری کا اعتراف کرنے کے لیے زبان اور قلم درکار ہے۔[2]

راجپوتوں کے وطن سے والہانہ محبت اور اکبر کی رواداری کی نمائندگی کرنے والا یہ پُر تاثر ڈراما بچوں کو وسیع المشربی اور حب الوطنی کی تعلیم دیتا ہے۔ مختلف مذاہب کے درمیان خلیج کو پاٹنے کی کوشش کتنی خوش اسلوبی سے کی گئی ہے۔ اکبر اور ابوالفضل کے مندرجہ ذیل مکالموں سے بخوبی واضح ہو جائے گا۔

اکبر راجپوت رانیوں سے کہتا ہے:

"آپ مجھ سے کیوں خائف ہیں، اس لیے کہ میرا اور آپ کا مذہب مختلف ہے۔ یہ تو منافرت کی بات نہیں، کسی کو میٹھا پسند کسی کو نمک۔ ایک کو سبز رنگ بھاتا ہے دوسرے کو زرد، یہ باتیں تو جھگڑے کی نہیں۔ میرا مرنا جینا ہندوستان کے ساتھ ہے۔ ان سے لوں گا، تو انہیں کو دوں گا۔

---

[1] محمد عمر نور الہٰی "مہابلی" مشمولہ "دبستان" (حصہ سوم) پریمیر پبلشنگ ہاؤس بنارس ۱۹۷۱ء ص (مرتبہ ڈاکٹر رفیق حسین)

[2] محمد عمر نور الہٰی "مہابلی" مشمولہ دبستان (حصہ سوم)، پریمیر پبلشنگ ہاؤس بنارس ۱۹۷۱ء (ص ۷۳، (مرتبہ ڈاکٹر رفیق حسین)

ابوالفضل: ہر مذہب کا تیز رنگ و بو تو یہی چند روزہ بات ہے جب ایک دوسرے
کو سمجھ جائیں گے تو شوالہ و مسجد پہلو بہ پہلو بنائیں گے۔ [1]

ڈراما "ہمایوں" ایک منفرد تاریخی ڈراما ہے جس میں بچوں کو مغل شہنشاہ کی انصاف پسندی، طرزِ حکومت اور مذہبی رواداری کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اور بالواسطہ طور پر ان میں وطن پرستی اور قومی یکجہتی کا جذبہ بھی بیدار کیا ہے۔

سعدی مچھلی شہری کے ڈراموں کا مجموعہ "بچے کا دل" [illegible] میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ جس میں "بچے کا دل"، "خودداری کی حفاظت"، "رانا پرتاپ سنگھ"، "ثریا"، "ظفر"، "قاضی جہانا بدھ" اور "بغداد کا حجام" ڈرامے شامل ہیں۔ سعدی مچھلی شہری بحیثیت ڈراما نگار اس لیے بھی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں کہ اس مجموعے کی اشاعت کے وقت ان کی عمر محض پندرہ سولہ برس کی تھی اور اس وقت بھی موصوف کے یہ ڈرامے اس لائق تصور کیے گئے تھے۔ خواجہ حسن [2] نظامی اور شوکت [3] تھانوی جیسے مشاہیر نے انہیں دادِ تحسین سے نوازا تھا۔ غالباً اطہر افسر اور عبدالغفار مدھولی کے بعد بچوں کے لیے سب سے زیادہ ڈرامے سعدی مچھلی شہری کے ہی ملتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں فنی پختگی اور دلچسپی کے اعتبار سے "بغداد کا حجام" کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

"بغداد کا حجام" سعدی مچھلی شہری کا ایک روایتی داستان پر مشتمل ڈرامہ ہے۔ جس میں مصنف نے داستان "الف لیلیٰ" میں بیان کردہ خلیفہ ہارون رشید کے دربار کا ایک سبق آموز قصہ ڈرامائی شکل میں پیش کیا ہے اور بھولے بھالے انداز میں ایسا ڈراما پیش کیا ہے، جسے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ گویا کوئی بچہ اپنے ہم عمر بچوں کو کوئی کہانی سنا رہا ہے۔ اس ڈرامے میں ایک چالاک حجام نے غریب لکڑہارے کو دھوکہ دے کر اس

---

[1] محمد عمر نور الہیٰ "ہمایوں" مسودہ "دبستان" (حصہ سوم) پریمیئر پبلشنگ ہاؤس بنارس [illegible] ص ١٧٠ (مرتبہ: ڈاکٹر رفیق حسین) [2] خواجہ حسن نظامی، مقدمہ "بچے کا دل اور دوسرے ڈرامے" بچوں کا کتب خانہ دہلی [illegible] ص ٨۔ [3] شوکت تھانوی۔ دیباچہ "بچے کا دل اور دوسرے ڈرامے" بچوں کا کتب خانہ دہلی [illegible] ص ١١

سب لکڑیاں چھین لیں اور پیسے نہیں دیئے۔ لکڑھارا خلیفہ کے پاس پہنچا اور اپنی روئیداد اس طرح سنائی:۔

"۔۔۔۔۔اس نے مجھے پانچ دینار دیئے اور کہا کہ لکڑیاں دکان کے دوسرے برآمدے میں رکھ دو، جب میں سب لکڑیاں رکھ چکا تو۔۔۔۔ اس نے کہا تم نے ابھی سب لکڑیاں کیوں نہیں رکھیں۔۔۔ تم نے کاٹھی کیوں نہ رکھی، میں نے تو سب لکڑیاں پانچ دینار میں لے لیں۔ میں نے کہا کاٹھی ان لکڑیوں میں شامل نہیں ہے۔ اس پر اس نے مجھے پیٹا اور دکان سے دھکے مار کر نکال دیا۔" [1]

لکڑہارے حسن کو خلیفہ ہارون رشید ایک مشورہ دیتا ہے۔ جس پر وہ عمل کرتا ہے۔ اس بار حجام علی اپنی شکایت لے کر خلیفہ کے پاس آتا ہے۔ اس موقعہ کا یہ اقتباس دیکھئے۔

"حضور سنیئے! جب میں اس کی حجامت بنا چکا۔ میں نے اس سے کہا کہ اب تم اپنے دوست کو بلاؤ۔ یہ شخص اپنے گدھے کو لے آیا اور کہا یہ میرا دوست ہے حضور یہ ٹھیک ہے ایسے بے وقوفوں کے ساتھ لڑنے میں گدھا اس کا دوست ہو سکتا ہے۔ میں نے اس سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں تمھارے گدھے کے بال بھی بنا دوں گا۔ میں نے یہ بات کبھی نہیں سنی کہ گدھے کی بھی حجامت بنتی ہے۔" [2]

محولہ بالا اقتباس میں بچّوں کی دلچسپی کا جملہ سامان موجود ہے جسے پڑھ کر محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تفریح کے پردے میں کسی کو دھوکا نہ دینے کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ درج ذیل سطور سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

" اتنا خیال رہے کہ آئندہ کسی کو دھوکا نہ دینا اور کسی کے ساتھ بُرا

---

[1] سعدی بھیلی شہری "بغداد کا حجام" مشمولہ "بچّہ کا دل اور دوسرے ڈرامے" بچّوں کا کتب خانہ نئی دہلی۔ ۱۹۳۶ء ص ۱۵۱

[2] سعدی بھیلی شہری "بغداد کا حجام" مشمولہ "بچہ کا دل اور دوسرے ڈرامے" بچّوں کا کتب خانہ نئی دہلی۔ ص ۱۵۶

سلوک نہ کرنا خواہ تمہارا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔" [1]

ڈرامے میں کردار صرف تین ہیں، حسن (لکڑ ھارا)، علی (حجام) اور خلیفہ ہارون رشید۔ لکڑ ہارا ایک غریب اور سیدھا سادہ انسان ہے جبکہ علی ایک چالاک، مکار اور دھوکہ باز شخص ہے۔ خلیفہ ہارون رشید کی شخصیت ایک انصاف پسند بادشاہ کی ہے۔ ڈراما ان تینوں کرداروں کی بنیادی خصوصیات کو پر تاثیر انداز میں اجاگر کرنے میں کامیاب ہے۔ مکالمات میں دقیق اور مشکل الفاظ کا استعمال قطعی نہیں کیا گیا۔ درج ذیل اقتباس اسکی اچھی مثال ہے:۔

علی :۔ میں خیال کرتا ہوں کہ شاید تم اپنی کاٹھی واپس مانگنے کے لیے آئے ہو۔

حسن :۔ بھائی مجھے اس کا خیال تک نہیں ہے۔ میں تو اپنے دوست کے بال کٹوانے کے لیے آیا ہوں۔ کیا آپ ہماری حجامت بنا دیں گے۔؟

علی :۔ ہاں، ہاں ضرور

حسن :۔ تو آخر اجرت کیا لوگے؟

علی :۔ بس دونوں کی حجامت کا ایک دینار دے دینا۔

حسن :۔ اچھا پہلے میری حجامت بنا دو۔ (حسن کی حجامت بنانے کے بعد)

علی :۔ تمہارا دوست کہاں ہے؟ اسے بلاؤ۔

حسن :۔ وہ باہر کھڑا ہے، ذرا ٹھہرو میں اسے ابھی لاتا ہوں۔" [2]

اس ڈرامے میں چار منظر ہیں پہلے منظر میں حجام کی دکان کا نقشہ پیش کیا ہے۔ اور دوسرے منظر میں خلیفہ ہارون رشید کا دربار دکھایا ہے، تیسرا منظر پھر علی کی دکان سے متعلق ہے۔ چوتھے منظر میں حسن دوبارہ ہارون رشید کے دربار میں پیش ہوتا ہے۔ پیشکش کے لحاظ سے چاروں منظر اتنے سادے ہیں کہ انہیں بچے سہولت کے ساتھ

---

[1] سعدی پھلی شہری "بچہ کا دل اور دوسرے ڈرامے" بچوں کا کتب خانہ نئی دہلی ۱۹۳۶ء ص ۱۰۷

[2] سعدی پھلی شہری "مشمولہ بچہ کا دل اور دوسرے ڈرامے" بچوں کا کتب خانہ نئی دہلی ۱۹۳۶ء ص ۱۰۴

اسٹیج پر پیش کر سکتے ہیں۔

سعدی کی پہلی شہری کے بقیہ ڈراموں میں بھی دلچسپی کی تفصیل پہلے دی جا چکی ہے)
موضوع اور طرز اظہار کی یہی سادگی کار فرما ہے۔ افسوس کہ سعدی کا نے غالباً اپنے تخلیقی سفر کو ابتدائی عمر میں ہی ختم کر دیا ورنہ ان کے قلم سے بچوں کے لیے بہت سے اچھے ڈراموں کے وجود میں آنے کی توقع تھی۔

ایک تھا قاسم ایک تھا علی بابا (اظہر افسر)

ایک تھا قاسم ایک تھا علی بابا۔ اظہر افسر کا قلمبند کردہ دلچسپ ڈراما ہے۔ اس ڈراما کا پلاٹ بھی شہرۂ آفاق داستان "الف لیلیٰ" سے ماخوذ ہے لیکن اس واقعے کی پیشکش نے اس ڈرامے کو بچوں کے ڈراموں میں ایک منفرد مقام عطا کیا ہے

ڈرامے کے مرکزی کردار علی بابا، اس کا بھائی قاسم، قاسم کی عیار و چالاک بیوی فتنہ، علی بابا کی تیز و طرار کنیز مرجینا اور ڈاکوؤں کا سردار ہیں۔ علی بابا ایک غریب لکڑہارا ہے۔ جس کو ڈاکوؤں کا ایک خزانہ ملتا ہے، وہ بہت نیک دل اور رحم دل ہے۔ علی بابا کی سخاوت محبت، ہمدردی اور مہمان نوازی بہت مشہور ہے۔ علی بابا کے برعکس اس کا بھائی قاسم لالچی اور خود غرض ہے۔ علی بابا کی بہ نسبت بہت مال دار ہے لیکن اپنے بھائی کی مدد بھی نہیں کر سکتا۔ جب علی بابا کے اچانک مال دار بن جانے کا علم ہوتا ہے تو وہ اپنے بھائی کے پاس جانا چاہتا ہے فتنہ قاسم کو اس کے سابقہ نامناسب سلوک اور رویّہ کو یاد دلاتی ہے۔ اس کے اس مکالمے سے قاسم کے کردار کی بنیادی خوبیاں اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ چند سطریں دیکھئے:-

"کل تک وہ تمہاری دولت میں، تمہارے عیش و آرام میں آدھے حصے کا حق دار نہیں تھا۔! آج تم اس کی دولت میں حصہ دار ہو گئے کل اس کی کنیز مرجینا سیر بھر جَو کا آٹا مانگنے آئی تھی تو تم نے اسے دُتکار دیا تھا" [1]

---

[1] اظہر افسر: ایک تھا قاسم ایک تھا بابا، مشمولہ ماہنامہ کھلونا نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۵۹ء ص ۳۰ (مدیر: الیاس دہلوی)

نسوانی کرداروں میں مرجینا اور فتنہ ایک دوسرے سے متضاد خصوصیات کی حامل ہیں۔ مرجینا نہایت ذہین، وفادار، نیک خو اور اپنے مالک کی جاں نثار ہے۔ وہ اپنی دانشمندی سے علی بابا کی جان بچاتی ہے۔ علی بابا اس کی بہادری سے خوش ہو کر کہتا ہے

"...... تم نے ہماری جان بچائی ہے۔ وہ کام کیا ہے جو بہادر سے بہادر مرد اور عقلمند سے عقلمند آدمی نہیں کر سکتا۔ تم تو انعام و اکرام کی حقدار ہو" [1]

مرجینا کے برعکس فتنہ اسم با مسمیٰ ہے وہ نہایت چالاک، عیار اور مکار ہے۔ اسے صرف دولت سے محبت ہے۔ اپنے شوہر قاسم کو وہ قدم قدم پر ٹوکتی ہے۔ علی بابا جب اشرفیاں تولنے کے لیے ترازو منگاتا ہے اس وقت فتنہ کا فریب کارانہ رویہ ملاحظہ ہو:

"فتنہ ـــ بات یہ ہے کہ کل مرجینا جو علی بابا کی کنیز ہے، ترازو مانگنے آئی تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ اتنی رات کو یہ ترازو سے کیا تولے گی۔ میں نے ترازو دینے سے پہلے ترازو کے ایک پلڑے کے نیچے موم چپکا دیا تاکہ جو کچھ وہ تولے، اس کی خبر ہمیں مل جائے۔ میرا خیال تھا۔ اسے کہیں سے اناج ادھار مل گیا ہے اور یہ تول کر اندازہ کرنا چاہتی ہے کہ کتنا ہے۔ لیکن جب ترازو آ گئی تو میں دنگ رہ گئی۔ پلڑے کے موم کے ساتھ اشرفی چپکی ہوئی تھی" [2]

اظہر افسر نے ڈرامے میں کردار سازی کے ساتھ واقعات کی پیشکش میں مہارت فن کا ثبوت دیا ہے۔ جو واقعہ پیش کیا گیا ہے اس کی ہو بہو تصویر پڑھنے والے کے ذہن تک منتقل ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس اس کی بہترین مثال ہے۔

"کھل جا سم سم، کھل جا سم سم کہنے سے غار کا دروازہ تو کھل گیا

---

[1] اظہر افسر، ایک تھا قاسم ایک تھا علی بابا، مشمولہ ماہنامہ کھلونا نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۸۵ء ص ۲۹ زیر ایڈیٹر الیاس دہلوی

[2] اظہر افسر، ایک تھا قاسم ایک تھا علی بابا، مشمولہ ماہنامہ کھلونا نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۸۵ء ص ۳۵ زیر ایڈیٹر الیاس دہلوی

علی بابا صحیح کہتا تھا، یہاں تو قارون کا خزانہ گڑا ہے، زیورات، موتیوں کے ہار، جواہرات، اشرفیاں، سونا، چاندی نقد روپیہ ۔۔۔ اب باہر کیسے نکلوں گا؟ کھولنے کا ایک اسم اعظم ہے (پکارتا ہے) کھل جا جم جم۔ کھل جا جم جم۔ نہیں کھلتا۔

(باہر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی ہے)"[1]

ڈراما "ایک تھا قاسم ایک تھا علی بابا" کی زبان شگفتہ، سلیس اور رواں ہے۔ یہ مثال اس امر کے ثبوت میں پیش خدمت ہے۔

"ٹھیک ہے مجھے محبت سے عاجزی سے، منت سے، خوشامد سے، چاپلوسی سے، ظلم سے، جبر سے، حکمت عملی سے، دغابازی سے، حیلہ سازی سے، کسی بھی طرح وہ ذریعہ، وہ مقام، وہ پتہ دریافت کرنا ہے، جہاں سے یہ سونے کا ڈھیر اور اشرفیاں علی بابا اٹھا لایا تھا۔"[2]

ڈرامے کے مکالمے برجستہ اور برمحل ہیں نیز ان کی ادائیگی میں حفظ مراتب کا پورا لحاظ برتا گیا ہے۔ مکالموں میں طوالت سے گریز کیا گیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"علی بابا: مرجینا۔

مرجینا: آقا

علی بابا: آج ہمیں یمن کے ایک بہت بڑے سوداگر کی مہمان نوازی کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

کیا ہمارے مہمان کے سارے پیپے احتیاط سے رکھوا دیئے گئے؟

مرجینا: جی ہاں آقا۔ گاڑیوں میں بھر کر ہمارا مہمان جتنے پیپے لایا تھا سب احتیاط سے رکھ دیئے گئے۔

---

[1] اظہر افسر۔ ایک تھا قاسم ایک تھا علی بابا۔ مشمولہ کھلونا نئی دہلی اکتوبر ۱۹۸۵ء ص ۳۹، مدیر: الیاس دہلوی

[2] اظہر افسر۔ ایک تھا قاسم ایک تھا علی بابا۔ مشمولہ کھلونا نئی دہلی اکتوبر ۱۹۸۵ء ص ۳۹، مدیر: الیاس دہلوی

علی بابا آج رات کھانے کے بعد تمہارا ناچ رہے تو کیسا ہو۔ یمن کے تاجر خاص طور پر ناچ گانے کو بہت پسند کرتے ہیں۔ [1]

"ایک تھا قاسم ایک تھا علی بابا" ایک ریڈیائی ڈراما ہے لیکن مصنف نے جگہ جگہ ڈرامے میں ایسی ہدایات بھی شامل کر دی ہیں کہ اسے آسانی سے اسٹیج کیا جا سکتا ہے۔ اظہر افسر نے اس ڈرامے کے علاوہ بھی بچوں کے لیے متعدد ڈرامے تصنیف کیے ہیں جن میں "اداکار رہتا دوست ہو تو ایسا" "بڑے دنوں کے بعد" "دانت کا درد" "ایک تھا مریض ایک تھا ڈاکٹر" "ہنستا ہوا جبشی" اور "آئینے کانپ اٹھے" وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور "ایک تھا قاسم ایک تھا علی بابا" کے تجزیے میں بیان کردہ خصوصیات ان کے کم و بیش ہر ڈرامے میں موجود ہیں معیار اور تعداد ہر اعتبار سے اظہر افسر کو اردو میں بچوں کا سب سے اہم ڈراما نگار تسلیم کرنا چاہیئے۔

گیند (کرشن چندر)

ہنسنے ہنسانے والے موضوعات پر مشتمل ڈرامے اور قدیم داستانوں اور حکایتوں سے ماخوذ ڈراموں کے ساتھ بچے مہماتی ڈراموں میں بھی بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ ایسے ڈراموں سے ان کا ذوق تجسس اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ تسکین پاتا ہے نیز مہمات سے متعلق بہادری اور شجاعت کے کارنامے اسٹیج پر دیکھ کر بچے بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ کرشن چندر کا "گیند" ایک ایسا ہی یک بابی ڈرامہ ہے۔ اس میں کرشن چندر نے بڑے دلچسپ اور دلکش انداز میں تین کمسن، باہمت اور نڈر بچوں کے کارنامے پیش کیے ہیں۔ ان بچوں کی بہادری کے نتیجے میں کئی خطرناک مجرم گرفتار کر لیے جاتے ہیں۔ اس ڈرامے کے اہم کردار موہن، بھوشن، اسلم، پولیس کا حوالدار اور تین بدمعاش ہیں۔ ڈرامے میں پیش کردہ مقام بڑے شہر کا غیر آباد اور ویران مکان ہے۔ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس میں بھوت رہتے ہیں۔

---

[1] اظہر افسر "ایک تھا قاسم ایک تھا علی بابا" مشمولہ ماہنامہ کھلونا۔ نئی دہلی۔ اکتوبر ۱۹۹۵ء ص ۳۴ (مدیر الیاس دہلوی)

ہے اس آدمی کے ہاتھ میں ایک تلوار ہے، تلوار لے کر وہ سر کٹا آدمی الماری سے نکال کر ہولے ہولے آگے بڑھتا ہے۔[1]

مصنف نے بچوں کی کردار سازی کے دوران اپنے نفسیاتی درک سے بھوت فراہم کیے ہیں۔ خوف، حیرت اور استعجاب کے جذبات کو ابھارنے والے کئی اچھے نمونے اس ڈرامے میں موجود ہیں۔ ایک موقع پر تینوں بچے گیند کی تلاش میں ہیں۔ اندھیرے میں بھوتوں کے خوف اور اپنی گیند کے حاصل کرنے کی لالچ جیسے ملے جلے احساسات کی عکاسی درج ذیل اقتباس میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کی گئی ہے۔

"موہن، اسلم، اور بھوشن مختلف کونوں میں جاکر دو زانو ہو کر فرنیچر کے نیچے اور فرش ٹٹولتے ہوئے گیند کی تلاش کرتے ہیں، گیند تلاش کرتے کرتے موہن اور اسلم ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں، اندھیرے میں دونوں گھبرا کر ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں اور چیختے ہیں،
دونوں بھوت بھوت ۔۔۔۔۔
(دونوں ایک دوسرے کا گلا دبانے کی کوشش کرتے ہیں)[2]

بچوں کی بہادری کا یہ منظر بھی ملاحظہ ہو:۔

"پہلا کالا بھوت دونوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر دونوں اس سے لڑتے ہیں۔ دوسرا بھوت جلدی جلدی بند دروازے کا تالا کھولنے کی کوشش کرتا ہے، مگر اسلم اس کی ٹانگ پر کاٹ کھاتا ہے۔ آخر دوسرا بھوت بڑی مشکل سے دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دونوں بھوت مل کر لڑکوں کو دروازے کے اندر گھسیٹنے لگتے ہیں کہ عین اسی وقت کھڑکی سے دھما دھم بہت سے لڑکے اندر کود پڑتے ہیں[3]

---

[1] کرشن چندر "گیند" مشمولہ "ہماری زبان" حصہ سوم، سررشتہ تعلیم اتر پردیش، لکھنؤ، ص ۱۱۴-۱۱۵

[2] کرشن چندر "گیند" مشمولہ "ہماری زبان" حصہ سوم، سررشتہ تعلیم اتر پردیش، لکھنؤ، ص ۱۱۳، ۱۱۴

[3] کرشن چندر "گیند" مشمولہ "ہماری زبان" حصہ سوم، سررشتہ تعلیم اتر پردیش، لکھنؤ، ص ۱۱۸

ان بچوں کی مدد سے تین خطرناک ڈاکوؤں کو پولیس گرفتار کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ان کی گیند بھی مل جاتی ہے۔ سنتری خوش ہو کر بچوں کو بتاتا ہے کہ انہیں سرکار کی طرف سے انعام دیا جائے گا۔ اس موقع پر بچوں کی طفلانہ باتوں سے ان کی نفسیات کا ایک خوبصورت پہلو سامنے آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"اسلم: نئی گیند ملے گی؟

تیسرا سنتری: ہاں

بھوشن۔ نیا بلا بھی؟

دوسرا سنتری: ہاں نیا بلا بھی!

موہن: اور نئی وکٹیں بھی؟

پہلا سنتری: ہاں نئی وکٹیں بھی اور بہت سارا روپیہ بھی

بھوشن: ارے تب تو ہم ہر وقت بھوت پکڑا کریں گے اور ہر روز نئے نئے گراؤنڈ پر کرکٹ کھیلا کریں گے۔" [1]

بچوں کی بنیادی دلچسپی اور خوشی مال و دولت سے زیادہ کھیل اور کھیل کے سامان میں ہے۔ مجموعی طور پر بچوں کا ایک نہایت دلچسپ ڈراما ہے جس کا پلاٹ، کردار، واقعات، زبان، مکالمے اور انداز پیشکش سب فنی اعتبار سے اعلیٰ معیار کو چھوتے ہیں۔

مہماتی واقعات کو ڈرامائی صورت میں پیش کرنا انتہائی دشوار عمل ہے کیونکہ اسٹیج پر خطرناک قسم کی مہمات کا پیش کرنا ایک پیچیدہ عمل ہے لیکن کرشن چندر نے اس دشوار گذار منزل کو اپنی خلاقی کے سہارے سلیقے کے ساتھ طے کیا ہے۔ اس نوع کے بچوں کے ڈرامے اردو میں بہت کم لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ گیند اپنے موضوع کی ندرت کے اعتبار سے بھی ادب اطفال میں ایک گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

---

[1] کرشن چندر "گیند" مشمولہ ہماری زبان حصہ سوم سررشتہ تعلیم اترپردیش، لکھنؤ، ص ۱۱۹

گیلی گیلیو (اطہر پرویز)

اردو ادب اطفال میں اطہر پرویز کا نام خاصا جانا پہچانا ہے۔ کہانیاں اور معلوماتی مضامین کے ساتھ انھوں نے کئی ڈرامے بھی بچوں کے لیے لکھے ہیں۔ جن میں "شرابی" "چراغ سے چراغ جلتا ہے" اور "گیلی گیلیو" اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص طور پر "گیلی گیلیو" میں توہم پرستی اور فرسودہ عقیدوں پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔

"گیلی گیلیو" ایک سائنس داں تھا جس نے پرانے نظریے کو رد کرتے ہوئے دنیا کو بتایا کہ سورج زمین کے گرد نہیں زمین سورج کے چاروں طرف گردش کرتی ہے۔ قدامت پسندوں کے لیے یہ عقیدہ شکنی خاصی پریشان کن ثابت ہوئی اور گیلیو کو اس بات سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ لیکن یہ حق پسند سائنس داں اس بات کے اعلان سے باز نہ آیا اور نتیجتاً عتاب کا شکار ہوا۔

یہ ایک ایکٹ کا ڈراما ہے اگرچہ اس میں دو منظر ہیں لیکن ڈرامے کو ایک ہی منظر میں لانے کے لیے اطہر پرویز نے پرانی تکنیک کا سہارا لیا ہے اور سنسکرت کے ڈراموں کی مانند نٹی اور سوتر دھار کے کرداروں سے کام لیا ہے جو راوی کی طرح بہت سی ایسی باتیں جنھیں اسٹیج پر پیش کرنا دشوار ہوتا ہے، گفتگو میں بیان کر دیتے ہیں۔ مثلاً

نٹی:- تو کیا ہر منظر دکھانے کے لیے تمھارے واسطے الگ الگ اسٹیج لانا پڑے گا!
لو میں ابھی ٹھیک کیے دیتی ہوں (اسٹیج سیٹ کرنے لگتی ہے) لو یہ بازار ہو گیا۔ جب عدالت کا منظر آئے گا تو بڑھئی کی دکان سے یہ میز کرسی اٹھالیں گے۔ اور یہ سامنے والی دکان کا تخت عدالت کے لیے بچھا دیں گے۔

سوتر:- ...... اور یہ بازار!

نٹی:- تو پھر کیا ان کے لیے بازار سے بازار لانا پڑے گا۔ ارے بھئی ہم ڈراما ہی تو کر رہے ہیں، نقل ہے اصل تھوڑا ہی ہے۔ تم سارا بازار اٹھا کر

ے آؤ تو بھی وہ بانتا را اسٹیج کا بانتا رہے گا[1]

نٹ اور سوتر دھار کے کرداروں سے نوٹنکیوں میں یہی کام لیا جاتا ہے۔ ڈرامے کی ابتدا میں ان دونوں کرداروں کی باہمی نوک جھونک بڑے دلچسپ انداز میں پیش کی گئی ہے۔ ڈرامے میں زمان و مکان کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ واقعہ سولہویں صدی عیسوی کے آخر میں روم میں رونما ہوا تھا۔ جب پوپ کی مذہبی بالادستی عروج پر تھی اور توہم پرستی کا بول بالا تھا۔ ڈرامے کی ابتدا ایک ڈھنڈورچی کے اعلان سے یوں ہوتی ہے

ڈھنڈورچی:- (بھاری آواز میں)

جنت کا ٹکٹ خرید لو جنت کے شہریو، جنت کا ٹکٹ لو، پرجا راجا کی عرش
خدا کا، فرش پوپ پادری کا اور پوپ عرش سے ادھر خدا کا نائب اور اس
قادر مطلق کا قائم مقام فرش زمین کا مالک عرش پر خدا کا قانون چلتا
ہے، فرش پر پوپ پادری کا۔ جنت کا ٹکٹ لو جنت کا۔ ہر درجے کا ٹکٹ
پوپ کے دفتر سے ملتا ہے۔[2]

پوپ کی مطلق العنانی کے خلاف کوئی سر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسی دور میں گیلی لیو گیلیلیو اپنے سائنسی تجربات کر رہا تھا۔ اس ڈرامے کے وسیلے سے بچوں کو گیلی لیو گیلیلیو کی ایجاد کردہ دوربین کے بارے میں سیر حاصل معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس دوربین سے بہت دور کی چیز نزدیک نظر آتی ہے اور اس کی مدد سے چاند کی مختلف شکلیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بچوں کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اس وقت روم میں رجعت پسندی کا یہ عالم تھا کہ آرٹسٹ اور پروفیسر جب اس سائنسی معلومات کے بارے میں ایک عام شاہراہ پر آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو سپاہی انھیں مجرم قرار دیتے ہوئے کہتا ہے :-

---

[1] اطہر پرویز: "گیلی لیو گیلیلیو" اردو گھر، علی گڑھ ۱۹۸۵ء ص ۱۶-۱۹

[2] اطہر پرویز: "گیلی لیو گیلیلیو" اردو گھر، علی گڑھ ۱۹۸۵ء ص ۲۲-۲۳

سپاہی: آپ سب مجرم ہیں اور قانون کے مطابق آپ سب گرفتار کیے جاتے ہیں۔
اس لیے کہ آپ لوگوں نے بھرے بازار میں یہ کہا کہ زمین گھومتی ہے اور
آپ جانتے ہیں کہ کلیسا کے خلاف اگر کان میں آواز پڑے تو اس کے
کان میں سیسہ پگھلانا چاہیے اور آپ لوگوں نے ان گنت انسانوں کو
گنہگار اور مجرم بنایا۔" [۱]

ڈرامے کی زبان بہت سہل، سُبک اور عام فہم ہے۔ جملوں میں ربط اور بیساختگی ہے
مثلاً جب پروفیسر کو سپاہی اس جرم میں پکڑ لیتا ہے کہ وہ زمین کے گھومنے کی بات کر رہا
ہے۔ تو پروفیسر سٹپٹا جاتا ہے۔ اس کی گھبراہٹ سے مملو یہ فطری لب و لہجہ ملاحظہ ہو۔

پروفیسر: (گھبرا جاتا ہے۔ گھبراہٹ میں اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا،
ہکلانے لگتا ہے)
جہ جہ جہ نہ نہ نہ نہیں، میں نے نہ نہیں کہ کہا

سپاہی:- تم نے نہیں کہا!

پروفیسر:- میں نے نہیں کہا۔ (کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کرتا ہے) ___ میں تو یہ کہتا
ہوں کہ سورج گھومتا ہے، زمین اپنی جگہ پر قائم ہے۔ میں بھلا ایسی باتیں
کیوں کہنے لگا۔ آخر مجھے تو خدا کو منہ دکھانا ہے۔ بائبل میں لکھا ہے کہ
سورج گھومتا ہے بس یہی سچ ہوگا۔ زمین کے گھومنے کے بارے میں تو
گلیلی گلیلیو کہتا ہے۔" [۲]

اردو میں دستیاب بچوں کے عام ڈراموں کی بہ نسبت گلیلی گلیلیو ایک طویل ڈراما
ہے اور کہیں کہیں احساس ہوتا ہے کہ مکالمے ضرورت سے زیادہ لمبے ہو گئے ہیں۔ بایں
ہمہ موضوع اور پیشکش کے اعتبار سے اسے بچوں کے اہم ڈراموں میں شمار کرنا ہوگا۔

---

[۱] اطہر پرویز۔ "گلیلی گلیلیو" اردو گھر علی گڑھ ۱۹۵۸ء ص ۴۷

تاج کی دُرگت (مظفر حنفی)

"تاج کی دُرگت" مظفر حنفی کا ایک رومانی ڈراما ہے۔ یہ ڈراما بھی سعدی کی پہلی نثری کاوش کی طرح مصنف نے اس وقت قلم بند کیا تھا جب ان کی عمر پندرہ سولہ برس کی تھی۔ اس ڈرامے میں بادشاہ بہت نیک اور شریف ہے۔ رعایا اس سے بہت خوش ہے لیکن وہ توہم پرستی کے سبب شاہی "تاج کی دُرگت" کا سبب بنتا ہے۔ ڈرامے کا آغاز بچوں کے معمولی کھیل سے ہوتا ہے جس میں پہیہ چلاتے ہوئے وہ شاہی قلعے کے پھاٹک تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ معصوم اور بھولے بھالے بچے کھیل کھیل میں ایک گیت سونے کی انگوٹھی سے پھاٹک پر لکھ دیتے ہیں۔ اس طرح مصنف نے نہایت چابکدستی کے ساتھ ایک معمولی سے واقعہ کو ڈرامے کا موضوع بنایا ہے۔ بچوں کا لکھا ہوا یہ گیت تقریباً لایعنی ہے اور بادشاہ اور اس کے مصاحب آکر اسے پڑھتے ہیں اس موقعہ کی ایک جھلک دیکھئے:۔

بادشاہ: (پھاٹک کی طرف دیکھ) اس پر سنہری حروف میں کیا لکھا ہے؟

ایک مصاحب: (قریب جاکر پڑھتے ہوئے) میں نے دیکھی اودی چڑیا،
پنجڑے سے اڑکر گئی۔ اڑتے اڑتے بڑی دُور تک اوپر ہی اوپر
گئی پھر وہاں سے گر کر مر گئی۔"

بادشاہ: (چونک کر) ارے یہ تو دھمکی معلوم ہوتی ہے۔ سنتری سے، کیوں
یہاں کون آیا تھا۔؟

سنتری: صرف ایک اجنبی آیا تھا۔

بادشاہ۔ کیا اس نے پھاٹک کو چھوا تھا؟

سنتری جی نہیں عالم پناہ۔"[1]

"تاج کی دُرگت" چونکہ بچوں کے لیے ہے اس لیے ڈرامہ نگار نے بچوں کی دلچسپی

---

[1] مظفر حنفی "تاج کی دُرگت" مشمولہ "نیلا ہیرا" مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی ۱۹۸۲ء، ص ۲۱-۲۲

کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ بچے ستاج کے مقابلے کھیل کے پہیے سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں مظفر حنفی نے زبان کی لطافت کے ساتھ سادگی اور روانی کو برقرار رکھا ہے۔ نیز کرداروں کے حسب مرتبہ الفاظ اور جملے استعمال کیے ہیں۔ درج ذیل سطور مصنف کی مرقع کشی پر مہارت ہونے کا ثبوت ہیں :۔

لڑکا :۔ شاہی پھاٹک ! کل تو میں تم سے پہیہ لینا بھول ہی گیا تھا۔ لاؤ جلدی سے مجھے پہیہ دے دو۔ صبح کا اسکول ہے مجھے دیر ہو رہی ہے۔ (کچھ ٹھہر کر) کہیں تم اس لیے ناراض تو نہیں کہ میں نے اس لڑکی کے بہلانے کو تمہارے اوپر واہیات سا گیت لکھ دیا تھا (مسکرا کر) لو اب تو گیت بھی مٹا دیا۔ لاؤ اب پہیہ دے دو۔ (تاج کو دیکھ کر) واہ رے میرے اچھے پھاٹک تم نے تو پہلے ہی کتنا اچھا پہیہ رکھ چھوڑا ہے۔ شکریہ۔[1]

" کچھ ٹھہر کر " " مسکرا کر " اور " تاج کو دیکھ کر " جیسے بے ساختہ جملے استعمال کرکے مکالموں میں جان ڈال دی گئی ہے۔ یہ ڈراما تین منظروں پر پھیلایا گیا ہے۔ پہلے منظر میں شام کا وقت ہے، شاہی محل کے پھاٹک پر دو سنتری پہرہ دے رہے ہیں دوسرے منظر میں دونوں سنتری شاہی پھاٹک پر پہرہ دیتے ہوئے باتوں میں مشغول ہیں اور بادشاہ سلامت کی سواری آتی ہے۔ تیسرا منظر سورج نکلنے سے پہلے کا ہے۔ لڑکا ہاتھ میں پہیہ لڑھکانے والا دستہ لیے پھاٹک کے سامنے آتا ہے۔

بادشاہ، مصاحب، نجومی، سنتری، ایک بھولی بھالی بچّی اور ایک کمسن لڑکا اس ڈرامے کے کردار ہیں۔ بادشاہ، مصاحب اور نجومی کی حرکات و سکنات اور مکالمات کی پیشکش میں ان کے مرتبہ کا لحاظ رکھا گیا ہے اور بادشاہ کے آنے پر وہی استقبالیہ جملے استعمال کیے گئے ہیں جو اس کے شایانِ شان تھے۔ مثلاً بادشاہ کی آمد کا اعلان۔

" آواز (پھاٹک کے اندر سے) " باادب باملاحظہ ہوشیار، شہنشاہ اعظم،

---

[1] مظفر حنفی " تاج کی ٹھوکر " مشمولہ نیلا ہیرا مکتبہ پیام تعلیم نئی دہلی ۱۹۷۸ء ص ۴۴

خلق اللہ، جہاں پناہ، عالی جاہ سلطان صاحب قرآن برائے تفریح باہر تشریف لاتے ہیں۔ نگاہ رو برو، ہوشیار، خبردار؟ [1]

بحیثیت مجموعی "تاج کی درگت" بچوں کا ایک دلچسپ روایتی انداز میں لکھا گیا ڈراما ہے جس کی نمایاں خوبی واقعات کی پیشکش ہے اور بالواسطہ طور پر یہ ڈراما بچوں کو توہم پرستی سے دُور رہنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔

مظفر حنفی کا بچوں کے لئے ایک اور ڈراما "مچھلی کا شکار" بھی لائق ذکر ہے۔ جس میں اختصار کے ساتھ بچوں کو نمائش پسندی سے بچنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

ہندوستان ہمارا (جگن ناتھ آزاد)

ایک ادبی ڈراما ہے جس میں ہندوستان کے عظیم شاعر علامہ اقبال اور ان کی شاعری سے بچوں کو نہایت خوش اُسلوبی کے ساتھ متعارف کرایا گیا ہے۔ اقبال کی تخلیق کردہ بچوں کی نظموں کی معنویت اور افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ بچوں کے لیے ڈرامے کا موضوع بہت خشک ہے۔ لیکن جگن ناتھ آزاد نے سادہ اسلوب اور نفسیاتی طریقۂ کار سے کام لے کر اقبال کی سیرت دلچسپ انداز میں پیش کی ہے۔ ڈرامے کی ابتدا ملاحظہ ہو

"(اسکول کا کمرہ بچوں کا شور و غل استانی جی کے قدموں کی چاپ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی خاموشی چھا جاتی ہے)

استانی: پیارے بچو! میں نے کل کے سبق میں تمھیں اردو کے دو مشہور شاعروں کے نام بتائے تھے۔ کیا تمھیں وہ نام یاد ہیں۔

دو تین آوازیں: جی ہاں۔ جی ہاں

استانی: اچھا موہن کمار تم بتاؤ۔

موہن کمار: غالب اور اقبال

---

[1] مظفر حنفی "تاج کی درگت" مشمولہ "نیلا ہیرا" مکتبہ پیام تعلیم نئی دہلی ۱۹۷۸ء ص ۲۱

استانی   شاباش! اچھا بتاؤ کہ میں نے کل اقبال کی جو دو نظمیں یاد کرنے کے لیے کہا تھا، وہ کس کس نے یاد کی ہیں؟"[1]

اس ڈرامے میں جگہ جگہ اقبال کی نظموں کی شمولیت نے اس کی دلچسپی کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ نظموں کے ساتھ ساتھ اقبال کی زندگی کے چند ہلکے پھلکے واقعات دلچسپ پیرائے میں پیش کئے گئے ہیں مثلاً ایک بچہ خادم مسیح، اقبال کی زندگی کا یہ دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہے:-

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اقبال جب اسکول میں پڑھتے تھے تو کلاس میں دیر سے پہنچے۔ استاد نے خفا ہو کر پوچھا — اقبال آج تم دیر سے کیوں آئے؟"

"اقبال نے فوراً جواب دیا — اقبال دیر ہی سے آیا کرتا ہے"

(بچوں کی طرف سے واہ واہ کی آوازیں اور تالیوں کی گونج)"[2]

اس ڈرامے کی زبان نہایت سادہ لیکن دل نشین ہے جس میں دریا کی سی روانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی نظموں کے وسیلے سے جو پند و نصیحت بچوں کو کی گئی ہے اس میں خشکی یا بے کیفی کا احساس نہیں ہوتا۔ مثلاً استانی بچوں سے کہتی ہیں۔

"دیکھا بچو! علامہ اقبال نے تم ایسے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے بھی علم و حکمت کے کیسے کیسے خزانے لٹائے ہیں۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم ان نصیحتوں کو گرہ میں باندھو اور انہیں اپنے لیے راستے کی مشعل بناؤ تاکہ تمہاری زندگی ہمیشہ نورانی اور روشن رہے۔"[3]

جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی نظموں کے وسیلے سے صرف پند و نصیحت ہی نہیں کی بلکہ

---

[1] جگن ناتھ آزاد "ہندوستان ہمارا" ریڈیو فیچر، مکتبہ پیام تعلیم نئی دہلی ص ۱۳

[2] جگن ناتھ آزاد "ہندوستان ہمارا" ریڈیو فیچر، مکتبہ پیام تعلیم نئی دہلی ص ۱۸

[3] جگن ناتھ آزاد "ہندوستان ہمارا" ریڈیو فیچر، مکتبہ پیام تعلیم نئی دہلی ص ۲۴

ان کی نظموں کے توسط سے حب الوطنی اور قومی یکجہتی کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔ علامہ اقبال سے متعلق یہ ڈراما "ہندوستان ہمارا" اس اعتبار سے بھی بہت اہم ہے کہ یہ جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے۔ اور موہن کمار اور سنتوش (ہندو)، ستیندر (سکھ)، خادم مسیح (عیسائی) اور رفیق (مسلمان) بچے ہیں، جن کو اقبال اور اقبال کے کلام میں دلچسپی ہے جو ہندوستان گیر پیمانے پر ادب اطفال میں قومی یکجہتی کی بہترین مثال ہے۔ یہ ڈراما اس اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے ذریعے بچوں کو ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ "اقبال اور اردو" پر ہندوستان کے ہر بچے کا حق ہے نیز یہ دو علامتیں ہیں جو ہندوستان میں یکجہتی کے فروغ اور ارتقا میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔

"ہندوستان ہمارا" ڈراما ایک ریڈیو فیچر ہے اس لیے بسا اوقات اس میں واقعات کے تسلسل میں رکاوٹ محسوس ہوتی ہے لیکن ریڈیو فیچر میں واقعات کے تسلسل سے زیادہ تاریخی واقفیت اور مقصدیت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اس لیے اس ڈرامے کو بھی اس زاویے سے دیکھنا ہوگا۔ "بچوں کا اقبال" اور ہمارے تہوار بھی جگن ناتھ آزاد کے قابل ذکر ریڈیو فیچر ہیں۔

نظیر اکبرآبادی (محمد حسن)

"ہندوستان ہمارا" کی قبیل کا ایک ڈراما ڈاکٹر محمد حسن نے بھی لکھا ہے جیسا کہ اس کے عنوان سے بھی ظاہر ہے۔ یہ نظیر اکبرآبادی سے متعلق ہے۔ اس ڈرامے میں نظیر اکبرآبادی کی شخصیت کے اہم پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ حب الوطنی اور قومی یگانگت اس ڈرامے کا مرکزی خیال ہے اور یہ دونوں اوصاف نظیر اکبرآبادی کے کلام کی اساس ہیں

نظیر آگرہ کے رہنے والے تھے، قادر الکلام شاعر تھے۔ نواب واجد علی شاہ نے ان کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی لیکن موصوف اپنا آبائی وطن چھوڑنے کو تیار نہیں ہوئے۔

ڈرامے کی ابتدا نظیر کے اس شعر سے ہوتی ہے جسے ایک فقیر چمٹا بجا کر گاتا ہوا اسٹیج پر آتا ہے :-

"تن سوکھا، کبڑی پیٹھ ہوئی، گھوڑے پر زین دھرو بابا، اب کوچ نقارہ باج چکا، چلنے کی فکر کرو بابا۔"[1]

اس شعر کے ساتھ ہی فقیر کہتا ہے:۔

"نظیر کی دنیا میں چلو گے؟ نظیر اکبر آبادی کی دنیا میں چلتے ہو تو میرے پیچھے پیچھے آؤ، میں تخیل کا درویش ہوں۔ تمہارے بے نظیر کی روح کو پھر بلالوں گا۔ اس کی البیلی دنیا کو پھر سے زندہ کر دوں گا۔ روحوں سے ملاقات میرے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ، وہ دیکھو اس دنیا کا دروازہ ...."[2]

ڈرامے کو محمد حسن کے اسلوب نے نہایت پرکشش اور رنگین بنادیا ہے۔ ابتدا ہی سے ڈراما قاری کی دلچسپی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ روحوں سے ملاقات کے ذکر پر ڈراما پڑھنے والے کا جذبۂ تجسس بیدار ہو جاتا ہے۔

ڈرامے میں نظیر اکبر آبادی کی عوامی شاعری کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس میں قومی یگانگت کی لہر جاری و ساری ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے شاگرد دنسی دھر، شنکر داس اور مول چند ہیں جو نظیر اکبر آبادی سے ہولی اور بسنت وغیرہ کے مواقع پر نظموں کی فرمائش کرتے ہیں۔ ڈرامے کی زبان نہایت سادہ دل نشین اور شعریت آمیز ہے۔ سلاست اور روانی بھی ڈرامے کے اندازِ نگارش کو منفرد بنادیتی ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:۔

نظیر:۔ واجد علی شاہ کے دربار سے آیا ہے کوئی؟ اچھا اسے بٹھاؤ۔ اس کی تواضع کرو۔ میں تو ہولی کے جشن سے نبٹ کے ہی آؤں گا۔

قطب الدین:۔ اسے بہت ضروری کام ہے۔

---

[1] ڈاکٹر محمد حسن "نظیر اکبر آبادی" مشمولہ اردو کی دسویں کتاب شائع کردہ حکومت آندھرا پردیش ۱۹۹۴ء مرتبہ نجمہ سلطان ڈاکٹر رفیعہ سلطان ص ۲۵۳ [2] ڈاکٹر محمد حسن "نظیر اکبر آبادی" مشمولہ اردو کی دسویں کتاب شائع کردہ حکومت آندھرا پردیش مرتبہ نجمہ سلطان ڈاکٹر رفیعہ سلطان ص ۲۵۲

نظیر ارے جشن اور مستی سے بھی ضروری ہوتا ہے کوئی کام؟ یہی تو ایک ہے
جو انسان کے اختیار میں ہے باقی تو سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد
چلے گا بنجارہ[1]

اسی ڈرامے کا مرکزی کردار نظیر اکبرآبادی کا ہے۔ سارا ڈراما اسی کردار کے گرد گھومتا ہے۔ نظیر کی تاج محل، آگرہ اور آگرہ کی گلیوں سے بے پناہ محبت، حب الوطنی کے جذبے کو بیدار کرتی ہے۔ بسنت، ہولی جیسے تہوار، مول چند اور شنکر داس جیسے غیر مسلم کردار اور ان کی اپنے استاد سے بے پناہ عقیدت و محبت، قومی یگانگت کی عمدہ مثالیں ہیں۔ نواب واجد علی شاہ نظیر کو لکھنؤ بلانے کی دعوت دیتے ہیں۔ نظیر قطب الدین کے اکسانے پر وہاں جانے کے لیے آمادہ بھی ہو جاتے ہیں لیکن آگرہ کی سرحد پار کرتے ہی آگرہ کی جدائی کا خیال انہیں مضطرب کر دیتا ہے۔ درج ذیل سطور نظیر کے جذبات اور وطن پرستی کی عمدہ عکاسی کرتی ہیں۔

"نظیر کچھ بھی ہو گھوڑی واپس پھیرو، ہم تاج محل کی طرف چلتے ہیں، ہم کہتے تھے یہاں میرا ہے کون؟ میں تاج سے کیسے رخصت ہوں گا۔؟ میں آگرے کے ان بازاروں سے ان محبت کرنے والے لوگوں سے کیسے رُخصت ہوں گا جو ہر گلی کوچے میں میرے گیت گاتے ہیں"[2]

ڈرامے کا اختتام فقیر کے چمٹے اور نظیر کے اسی شعر سے ہوتا ہے:۔

"تن سوکھا، کبڑی پیٹھ ہوئی، گھوڑے پر زین دھرو بابا۔ اب کوچ نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا"

معاشرے میں شاعر کی حیثیت اقتصادی اعتبار سے بہت پسماندہ تصور کی جاتی رہی ہے۔ نظیر کو بھی اس بات کا احساس ہے۔ جب راجہ بلاس رائے کا بیٹا مول چند شاعر

---

[1] ڈاکٹر محمد حسن "نظیر اکبرآبادی" مشمولہ اردو کی دسویں کتاب شائع کردہ حکومت آندھرا پردیش ۱۹۶۸ء مرتبہ کمیٹی سلطان، ڈاکٹر رفیعہ سلطان ص ۲۵۹ [2] ڈاکٹر محمد حسن "نظیر اکبرآبادی" مشمولہ اردو کی دسویں کتاب شائع کردہ حکومت آندھرا پردیش ص ۲۵۶ ۱۹۶۸ء مرتبہ کمیٹی سلطان، ڈاکٹر رفیعہ سلطان)

بننے کی خواہش ظاہر کرتا ہے تو نظیر ہنستے ہوئے کہتے ہیں :۔

"راجا پلاس رائے سن لیں گے تو بہت پریشان ہوں گے۔ شاعر بنے گا تو فاقوں مرجائے گا۔ ایسے ہی لڑکے پڑھا پڑھا کر گذر بسر کرنی پڑے گی۔" [1]

اس اقتباس میں طنز کے نشتر کی چبھن کو ہر قاری محسوس کرسکتا ہے۔

"فنی اعتبار سے "نظیر اکبر آبادی" بچوں کا ایک عمدہ ادبی ڈراما ہے جسے اسٹیج پر پیش کرنے کے لیے زیادہ ساز وسامان اور زبان وافراد کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن فن ڈراما نگاری کے رموز سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے اس ڈرامے کو لکھتے ہوئے انھوں نے اسٹیج کے تقاضوں کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ مکالمے ضرورت کے مطابق طویل بھی ہیں لیکن ثانوی درجات کے طلبا انہیں بآسانی ادا کرسکتے ہیں۔

استانی جی (میرزا ادیب)

میرزا ادیب بحیثیت افسانہ نگار اور ڈراما نویس بہت بلند مرتبہ پر فائز ہیں انھوں نے بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لکھا ہے جس میں ڈرامے بھی شامل ہیں۔ میرزا ادیب کا ڈراما "استانی جی" بچوں کی شوخ وشنگ فطرت کا عملی ترجمان ہے۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا بچوں کی فطرت میں شامل ہے۔ بچے اپنے بڑوں کی نقل اتارنے کے شائق بھی ہوتے ہیں "آستانی جی" ایک ایسا ہی ڈراما ہے۔ جس میں ایک بچی "نجمہ" استانی بنتی ہے اور ڈرامے کے دیگر کردار راشد، حمید، ضیار اور اقبال اس کے شاگردوں کا رول ادا کرتے ہیں۔ میرزا ادیب نے نفسیاتی پیچیدگیوں کی عکاسی بڑی چابکدستی سے کی ہے۔

ڈرامے کا پلاٹ سادہ اور ہلکا پھلکا ہے یہ ڈراما ایک ہی سین پر مشتمل ہے۔ اور اس کے آغاز میں چھوٹی چھوٹی جزئیات اور ہدایات کے ذریعے منظر اور جاندار بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً

---

[1] ڈاکٹر محمد حسن۔ نظیر اکبر آبادی مشمولہ ۱۹۸۰ء کی دسویں کتاب شائع کردہ حکومت آندھرا پردیش ص ۲۵۶ ۱۹۸۲ء (مرتبہ نجمہ سلطانہ، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ)

"ایک عام کمرہ ۔ آنے جانے کے لیے دروازہ مشرقی دیوار میں، کمرے کے وسط میں ایک بڑی میز، میز کے اوپر کتابیں، کاپیاں، کاغذ اور قلم بکھرے پڑے ہیں۔ میز کے اردگرد کرسیاں پڑی ہیں، وقت دن کے بارہ بجے ہیں۔
جس وقت پردہ اٹھتا ہے۔ نجمہ، ضیاء، حمید، اقبال اور ارشد دروازے سے داخل ہو کر کمرے میں آتے ہیں۔ نجمہ کے ہاتھ میں چھوٹا سا سیب ہے اور باقی تمام بچوں کے پاس امرود، سنترے اور سیب ہیں" [1]

اس ڈرامے کا مرکزی کردار نجمہ ہے۔ اس کے حصّے میں سب سے چھوٹا سیب آیا ہے۔ جب کہ دوسرے بچّوں کو بڑے بڑے سیب اور سنترے دیئے گئے ہیں۔ ذہانت سے کام لیتے ہوئے نجمہ ان بچّوں کو ڈرامہ کھیلنے کے لیے آمادہ کرتی ہے اور خود استانی کا رول ادا کرتے ہوئے بچّوں کو سوالات میں الجھا کر ان کو پھسلا کر غائب ہو جاتی ہے۔ ڈرامے کا یہ دلچسپ اختتام ملاحظہ ہو:۔

"راشد : کیا ہوا؟
حمید : وہاں چھلکے پڑے ہیں اور وہ غائب ہے ۔ سب کچھ کھا گئی ہے استانی کی بچی میں پہلے ہی کہتا تھا ۔ اوں اوں اوں ۔
راشد، ضیاء، اقبال (ایک ساتھ) کیا !!
حمید (روتے ہوئے) ہمارے پھل کھا گئی ہے ۔
راشد (اونچی آواز میں) ماں
(سب بچّے دروازے سے نکل جاتے ہیں۔ نجمہ مسکراتی ہوئی پردے سے نکلتی ہے اور کرسی پر بیٹھ کر کتاب کھول کر اس طرح پڑھنے لگتی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ پردہ گرتا ہے)" [2]

---

[1] میرزا ادیب "استانی جی" مطبوعہ ماہنامہ کھلونا نئی دہلی اکتوبر ۱۹۵۹ء ص ۲۰ مدیران یونس دہلوی وغیرہ
[2] میرزا ادیب "استانی جی" مطبوعہ ماہنامہ کھلونا نئی دہلی اکتوبر ۱۹۵۹ء ص ۲۳ مدیران یونس دہلوی وغیرہ

اس ڈرامے میں بچوں کی شرارتوں کا بیان اور کلاس روم کی منظر کشی قابلِ داد ہے
نجمہ استانی بنی ہوئی ہے، بچے اس سے مختلف سوالات کرتے ہیں۔

راشد: (پڑھتے ہوئے) سورج نکل آیا۔ استانی جی! سورج جب غروب ہو جاتا
ہے تو کہاں جاتا ہے!

نجمہ: سورج غروب ہو کر آسمان کے پیچھے غائب ہو جاتا ہے

راشد: آسمان کے پیچھے کیا ہے!

نجمہ: تم آگے پڑھو

راشد: (آہستہ سے) استانی جی کو خود بھی پتہ نہیں۔

نجمہ: بکو نہیں۔

ضیاء: میں پڑھوں استانی جی!

نجمہ: پڑھو

ضیاء: (کتاب کھولتا ہے) سورج نکل آیا ہے — میرا امرود

نجمہ: یہ بار بار کیا ہو رہا ہے۔ میرا سیب۔ میرا امرود
گھر سے پڑھنے آئے ہیں ماؤں کے لاڈلے۔" [1]

محولہ بالا اقتباس میں مکالمات کی برجستگی اور اختصار مصنف کے مہارتِ فن کا
ثبوت ہے۔ کردار سازی کے میدان میں بھی میرزا ادیب نے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔
نجمہ بحیثیت استانی خوش اسلوبی سے کلاس کو کنٹرول میں رکھتی ہے اور ذہانت کے ساتھ
دوسرے بچوں کے پھل بھی ہتیا لیتی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس دیکھئے۔

راشد: میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ کام کرتے ہوئے بار بار بول اٹھتے ہو، تمہاری
چیزیں الگ رکھ دیتی ہوں۔ فارغ ہو جاؤ گے تو لے لینا۔

ضیاء: میرے پھل بھی رکھ لیں۔

---

[1] میرزا ادیب "استانی جی" مشمولہ ماہنامہ کھلونا نئی دہلی اکتوبر ۱۹۵۸ء ص ۲۳ (مدیران یونس دہلوی وغیرہ)

بچہ: ابھی تو وہ مزے دار کھیل شروع بھی نہیں ہوا۔[1]

فنی اعتبار سے ایک دلچسپ اور مکمل ڈراما ہے جسے بچے اپنے گھر اور اسکول میں بآسانی اسٹیج کر سکتے ہیں۔ اس میں نہ تو کسی خاص پوشاک اور ساز و سامان کی ضرورت ہے اور نہ ہی میک اپ کی۔

میرزا ادیب کا ڈراما بچوں کی دلچسپی کا وافر سامان فراہم کرتا ہے۔ بچوں کے لیے میرزا ادیب نے اور بھی کئی ڈرامے تخلیق کیے ہیں جن میں "ایک دفعہ کا ذکر ہے" اور "ایک مسافر" اپنی اہمیت کا بطور خاص احساس دلاتے ہیں۔

شیطانی گھنٹی

بچوں کے تفریحی ڈراموں میں کرشن گوپال عابد کا "شیطانی گھنٹی" بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس ڈرامے میں مصنف نے بچوں کی کلاس روم کی شرارتیں بہت ہی دلچسپ اور انوکھے انداز میں پیش کی ہیں۔ "شیطانی گھنٹی" استاد کے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔ کلاس میں پڑھاتے وقت ہر کونے سے گھنٹی کی آواز آتی ہے لیکن ماسٹر صاحب گھنٹی بجانے والے کو پکڑنے میں ناکام رہتے ہیں اور بچوں کی یہ حرکت آسیب کی حرکت سے تعبیر کی جانے لگتی ہے۔

یہ ڈراما بچوں کی شرارتوں اور شوخیوں سے مملو ہیں جس کی پیشکش میں مصنف نے نفسیاتی طریقۂ کار اختیار کیا ہے۔ ڈرامے میں از اوّل تا آخر سسپنس قائم رکھا گیا ہے اور آخر میں ہیڈ ماسٹر آکر کلاس ٹیچر کے شش و پنج اور گھبراہٹ کو دور کرتے ہیں۔ ڈرامے کا یہ دلچسپ اختتام ملاحظہ ہو:-

ہیڈ ماسٹر (ہنس کر) وہ شیطانی گھنٹی۔ . . . آپ ابھی تک حیران ہیں کہ وہ کیسے بج اٹھتی ہے۔؟ محبوب میاں یہاں آؤ۔ دکھاؤ، ماسٹر صاحب کو وہ

---

[1] میرزا ادیب "استانی جی" مشمولہ ماہنامہ کھلونا نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۵۹ء ص ۲۳ (مدیران: یونس دہلوی وغیرہ)

شیطانی گھنٹی ۔۔۔ لیجئے ماسٹر صاحب یہ رہا وہ شیطان ۔۔۔ یہ اس ٹوپی میں، وہ آسیب ۔ ہاتھوں میں گھنٹی رکھنے سے تو۔ آپ خود آ چھد پکڑ لیتے۔ لیکن ان چاروں نے اپنے شیطانوں کو اپنی ٹوپیوں کے اندر چھپا رکھا تھا۔ ذرا اپنی نگاہ ہٹی اور انھوں نے گردن ہلائی۔ جوں ہی مڑ کر دیکھا اور گردن ساکت۔" [1]

اس طرح ماسٹر صاحب کا آسیب کے خوف اور توہم پرستی کے مرض سے نجات حاصل کرتے ہیں۔ ڈراموں کے مرکزی کردار اصغر، محبوب اور ماسٹر ہیں۔ اصغر اور محبوب نہایت شریر لڑکے ہیں۔ ان کی شوخ و شنگ فطرت کی عکاسی مصنف نے بڑی چابکدستی کے ساتھ کی ہے۔ ماسٹر صاحب کی بوکھلاہٹ اور جھنجھلاہٹ کی تصویر کشی میں بھی کمال فن کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ بار بار گھنٹی بجنے اور گھنٹی بجانے والے کا پتہ نہ چلنے پر وہ جھنجلاتے ہیں۔ لیجئے، ماسٹر صاحب کی زبانی ان کی جھنجلاہٹ ملاحظہ ہو:۔

"ماسٹر ۔ (سٹپٹا کر) تم مجھے بیوقوف بنانا چاہتے ہو مجھے (زور زور سے بینت ہلاتے ہوئے) بتا دو کون ہے؟ ورنہ۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔ (غصہ سے کانپنے لگتا ہے) تم بتاؤ؟ تم سب لوگ جانتے ہو مجھے ان کا نام بتاؤ میں ان کی کھال ادھیڑ دوں گا، بڑوں کے ساتھ مذاق۔۔۔ ایک لڑکے کو مارنے لگتا ہے) تم بتاؤ جلدی ۔۔ بتاؤ۔

(مارتا ہے، لڑکا رونے لگتا ہے۔ زور زور سے رونے لگتا ہے)" [2]

مندرج بالا سطور میں زبان کی شگفتگی، روانی اور مکالموں میں برجستگی قابل داد ہے۔ واقعات کی پیشکش میں بھی کرشن گوپال عابد نے کمال فن کا ثبوت دیا ہے۔ ماسٹر صاحب کلاس میں

---

[1] کرشن گوپال عابد "شیطانی گھنٹی" مشمولہ ماہنامہ کھلونا۔ نئی دہلی جنوری ۱۹۵۷ء ص ۱۰ مدیران یونس دہلوی وغیرہ
[2] کرشن گوپال عابد "شیطانی گھنٹی" مشمولہ ماہنامہ کھلونا نئی دہلی جنوری ۱۹۵۷ء۔ ص ۱۳ (مدیران: یونس دہلوی وغیرہ)

تاریخ پڑھا رہے ہیں۔ اس وقت کا یہ منظر دیکھئے :۔

"ماسٹر (زور زور سے) بولتے ہوئے لکھنے لگتا ہے)

یوں تو مغلیہ سلطنت کے تمام حکمراں انصاف پسند اور رعایا پرور تھے مگر۔ دناگاہ کمرے کے ایک کونے میں گھنٹی بج اٹھتی ہے، ماسٹر صاحب تیزی سے پلٹتے ہیں۔ اس کونے کی جانب تیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ تمام لڑکے سنجیدہ اور خاموش ہیں، محسوس ہوتا ہے جیسے کسی دوسرے نے گھنٹی کی آواز کو سُنا تک نہیں۔ ماسٹر صاحب پھر بلیک بورڈ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، رعایا پرور تھے۔ مگر جہانگیر تو۔۔ ناگاہ کمرے کے دوسرے کونے سے گھنٹی بجتی ہے)"[1]

بحیثیت مجموعی ڈراما "شیطانی گھنٹی" بچّوں کے لیے ایک بہترین تفریحی ڈراما ہے۔

ننھی سی لڑکی (برج کیتال)

برج کیتال کا "ننھی سی لڑکی" اپنے نوع کا منفرد اور بے مثال ڈراما ہے جسے ہم تمثیلی ڈراما بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس کے کردار عام انسان نہیں بلکہ قحط، جنگ، بیماری، جہالت، لالچ، طوفان اور سیلاب جیسی آفتیں ہیں جو ابتدائے آفرینش سے لے کر موجودہ دور تک بنی نوع انسان کو پریشان کرتی رہتی ہیں۔

بظاہر ڈراما "ننھی لڑکی" بچّوں کی دلچسپی اور فہم سے بالاتر نظر آتا ہے، لیکن ڈراما نگار نے اسے اتنی خوش اسلوبی اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے کہ ڈرامے میں بچّوں کی دلچسپی از اول تا آخر برقرار رہتی ہے نیز بچّے ان تمثیلی کرداروں اور ڈرامے کے موضوع کو بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔ اس ڈرامے کے کردار مختلف ادوار میں پوری دنیا اور بطور خاص ہندوستان کو برباد کرنے کے درپے رہے ہیں مگر ایک ننھی سی معصوم لڑکی "میو جنا"

---

[1] کرشن گوپال عابد "شیطانی گھنٹی" مشمولہ ماہنامہ کھلونا، نئی دہلی جنوری ۱۹۵۸ء ص ۱۴
دو دیوان: [illegible]

کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کردار بھی تمثیلی ہے۔ ڈرامے کے وسیلے سے بچّوں کو بتایا گیا ہے کہ ہمارے منصوبے اگر دیانت داری اور تندہی سے بروئے کار لائے جائیں تو ہم ان آفتوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈرامے کی ابتدا دل کش اور پُراسرار انداز میں ہے۔

"پردہ کھلتے ہی اسٹیج پر ایک اجاڑ بیابان کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ رات کا وقت ہے اور ایک سوکھے ہوئے پیڑ کے نیچے آگ جلائے ہوئے عجیب ڈراؤنی شکلوں والے چند مرد اور عورتیں بیٹھی ہیں۔ وہ قحط، بیماری، جہالت، لالچ، طوفان، باڑھ، سیلاب وغیرہ ہیں۔ اس جلسے کی صدر جنگ بی بی ذرا اونچی جگہ پر بیٹھی ہے۔ یہ سب لوگ بہت شور مچا رہے ہیں۔"[۱]

اس ڈرامے میں منظر کشی اور کردار نگاری کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مصنف نے ایک ننھی سی لڑکی کا کتنا اچھا پُرتاثیر مُرقع پیش کیا ہے۔ قحط کی زبانی سنیئے۔

"ہاں، ایک ننھی سی لڑکی جس کے گالوں پر پکے ہوئے سیبوں کی لالیاں ہیں، ہونٹوں کی مسکراہٹ میں شہد کی مٹھاس ہے۔ دانت یوں چمکتے ہیں جیسے موتی، وہ چلتی ہے تو دھان کے کھیتوں پر تیز ہوا کے چلنے کا گمان ہوتا ہے۔"[۲]

ڈرامے میں بچّوں کو قحط، جنگ، بیماری، جہالت، اور سیلاب وغیرہ کے بارے میں بتایا گیا ہے نیز یہ بھی سمجھایا گیا ہے کہ ان سے کبھی تباہ کاریاں آتی ہیں مثلاً قحط کی زبانی سے اس کا تعارف:۔

"جیسا کہ میرے نام سے ظاہر ہے، میرا کام دنیا میں بھوک پھیلانا ہے۔

۱؎ برج کیتال "ننھی سی لڑکی" مشمولہ ماہنامہ کھلونا، نئی دہلی نومبر ۱۹۵۸ء ص ۲۹ مدیران ادریس دہلوی وغیرہ

۲؎ برج کیتال "ننھی سی لڑکی" مشمولہ ماہنامہ کھلونا، نئی دہلی نومبر ۱۹۵۸ء ص ۳۰ مدیران ادریس دہلوی وغیرہ

انسان اور اس کے کام آنے والے جانوروں کو بھوک سے تڑپاتا ہے،
اور تڑپا تڑپا کر مارتا ہے... اس لیے کبھی مجھ باڑھ، کبھی طوفان، کبھی
سوکھے اور کبھی زلزلے سے مدد لینی پڑتی ہے۔ ان سب کی مدد سے میں
دنیا میں اپنا سکہ جمائے ہوئے ہوں "[1]

ننھی سی لڑکی دریوجا، قحط، بیماری، جہالت اور طوفان کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس
لڑکی کے ہاتھ میں کتابیں، دوائیاں، دھان کی بالیاں قحط کا مقابلہ کرتی ہیں۔

ڈرامے کے مکالمے برجستہ اور برمحل ہیں۔ ان میں نسائی لہجے اور عورتوں کی نوک
جھونک کے پُرلطف پہلو ملتے ہیں۔ درج ذیل اقتباس میں یہ بخوبی واضح ہے۔

"جہالت: بکتی ہو، کتابوں اور کاپیوں کو دوائیاں اور پھل کہتی ہو۔
طوفان: اری جہالت، وہ کتابیں، کاپیاں نہیں مچھلیاں پکڑنے کا جال ہے۔
جہالت: گویا کہ بیماری کی طرح تم بھی اندھی ہوں۔
طوفان اور بیماری: اندھا کسے کہا۔؟
جہالت: تم دونوں کو۔!
بیماری: ذرا ٹھہر تو۔!
(اتنا کہتی ہوئی آگے بڑھتی ہے مگر جہالت کے ایک ہی دھکے سے
گر جاتی ہے، پھر طوفان اور جہالت لڑتے ہیں)
جنگ: خاموش رہو! بے وقوفو۔ تم سب اندھے ہو۔
سب: (حیرانی سے) ہم سب اندھے ہیں!"[2]

جنگ، بیماری، جہالت، قحط اور طوفان جیسے تخریب کار صحت، کام، خوشی
اور تعلیم جیسے نیک تمثیلی کرداروں کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔ یہ تمام تو جبا کے ساتھی ہیں۔

---

[1] برج کیتال "ننھی سی لڑکی" مشمولہ ماہنامہ کھلونا، نئی دہلی، نومبر ۱۹۵۰ء ص ۳۰ (مدیران ادریس دہلوی)

[2] برج کیتال "ننھی سی لڑکی" مشمولہ ماہنامہ کھلونا نئی دہلی، نومبر ۱۹۵۰ء ص ۳۳
(مدیران ادریس دہلوی)

مجموعی حیثیت سے برج کیتال کا ڈراما "ننھی سی لڑکی" بچوں کا شاہکار ڈراما ہے جس کے ذریعے بچوں کو مؤثر پیرایہ میں عمل کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ ڈراما بہر طور فنی خصوصیت مقصدیت اور معنویت کے اعتبار سے اردو ادب اطفال میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔

لڑائی لڑائی معاف کرو (عمر عادل مارہروی)

لڑائی لڑائی معاف کرو" عمر عادل مارہروی کا بہت مختصر مگر دلچسپ یک بابی ڈراما ہے۔ دو ننھے منے کردار منی اور گڈو ہیں جن کی عمریں بالترتیب پانچ اور سات سال کی ہیں. گڈو نے منی کی گڑیا چھپادی ہے اور گڈو کی گیند منی نے کہیں رکھ دی ہے۔ اس بات پر دونوں میں تکرار ہو رہی ہے۔ یہ دونوں بھائی لڑتے لڑتے رونے لگتے ہیں عمر عادل مارہروی نے نہایت چابکدستی کے ساتھ بہت کم عمر بچوں کی نفسیات کا خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ بچے آپس میں بہت محبت کرتے ہیں لیکن بات بات پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔ اس ڈرامے میں مصنف نے اپنی جانب سے پیش کش کے بارے میں کوئی ہدایات شامل نہیں کی ہیں نہ ہی اسے سمجھانے کے لیے بحیثیت راوی خود درمیان میں آیا ہے بلکہ بچوں کی آپسی گفتگو کے ذریعے ان کے کرداروں کی نفسیات کو ابھارا ہے۔

معصوم بچوں کی لڑائی کا منظر ملاحظہ ہو:۔

"منی : تم نے میری فراک پر روشنائی کیوں پھینکی تھی!

گڈو : پہلے تم نے میری کاپی پر تصویر بنائی تھی

منی : پہلے تم نے سوتے میں میری داڑھی بنائی تھی!

گڈو : تم نے میرے اوپر پانی کیوں پھینکا تھا!

منی : تم نے مجھے چڑیل کیوں کہا تھا۔

گڈو : پہلے تم نے مجھے بدو کہا تھا!

منی : تو تم نے مجھے منہ کیوں چڑایا تھا!

۱؎ عمر عادل مارہروی "لڑائی لڑائی معاف کرو" مشمولہ ماہنامہ کھلونا نئی دہلی اکتوبر ۱۹۶۸ء ص ۴۲ (مدیران یونس دہلوی وغیرہ)

آگے چل کر ڈرامے میں بچوں کی یہ تکرار شدت اختیار کرتی ہے بچوں کی اس لڑائی ان کے جذبات اور احساسات کی عکاسی کرنے میں مصنف نے اپنی فنی ادراک کا ثبوت دیا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور اس امر کی منہ بولتی تصویر ہے۔

"گڈو: نہیں بتاؤں گا۔ وہ تو جب پھانسی چڑھ کر میری لاش آئے گی تب پتہ چلے گا۔!

منی: کیا مر جاتے ہیں پھانسی چڑھ کر۔

گڈو: اور کیا کوئی زندہ رہتے ہیں!

منی: تو تم بھی مر جاؤ گے

گڈو: ہاں مر جاؤں گا۔

منی: تم مر جاؤ گے تو میں بھی کنویں میں گر جاؤں گی۔ ہاں واہ! تمہاری آنکھوں میں تو ابھی سے آنسو آ گئے۔ تم کیا خاک ڈوبو گی۔

منی: تو تم مرنے کی بات کیوں کر رہے ہو۔

گڈو: تم بھی تو کہہ رہی ہو کہ میں کنویں میں گر کر مر جاؤں گی!

منی: ارے تم بھی رونے لگے۔

گڈو: تم بھی تو رو رہی ہو۔[1]

محولہ بالا سطور میں جذبات نگاری کے ساتھ زبان کی برجستگی اور روانی بھی لائق توجہ ہے۔ یہ ڈراما ایک بابی ہے جس کے لیے نہ تو کسی اسٹیج کی ضرورت ہے نہ ہی کاسٹیوم کی۔ ایسے معصوم بچے ہر جگہ اور ہر گھر میں موجود ہیں۔ عمر عادل مارہروی کا یہ سیدھا سادہ ڈراما معصوم بچوں کی شوخیوں، فطری رجحانات اور شرارتوں کا ایک اچھا مرقع ہے۔

---

[1] عمر عادل مارہروی "لڑائی، لڑائی، معاف کرو" مشمولہ ماہنامہ کھلونا۔ نئی دہلی اکتوبر ۱۹۵۸ء ص ۴۲، (مدیران: یونس دہلوی وغیرہ)

حلوے کی چوری (خالد عرفان)

بچوں کے خالصاً تفریحی ڈراموں میں جدید ترین نسل کے ادیب خالد عرفان کا "حلوے کی چوری" بھی قابل ذکر ہے۔ جیسا کہ عنوان ہی سے ظاہر ہے حلوہ چوری ہوا ہے اور حلوہ صرف بچے ہی چرا سکتے ہیں، لیکن اس دلچسپ ڈرامے میں حلوہ چور کوئی بچہ نہیں ہے بلکہ ابّا جان ہیں۔ اور شبہ بے گناہ بچوں پر کیا جاتا ہے۔

اس ڈرامے میں مصنف نے نہایت چابکدستی کے ساتھ کرداروں کی فطرت کو اجاگر کیا ہے۔ افراد ڈراما کے تعارف سے ہی قاری کا ذوق انجام جاننے کے لیے مضطرب ہو جاتا ہے۔ کرداروں کا دلچسپ تعارف اس طرح ہے۔

"ابا : عام اباؤں کی طرح امی سے سہمے ہوئے،
امی : سب ہی امیّوں کی طرح تیز مزاج
بھیا : ابا کے بیٹے لیکن امی کے نہیں۔
ننھا : ابا اور امی کے لاڈلے۔
ماجد : کام سے زیادہ جی حضوری کرنے والا،
رحیمن آپا : جس کے ذمے بکوان بھی ہے۔"[1]

یہ ڈراما تین منظروں پر مشتمل ہے، پہلے منظر میں امی باورچی خانے میں داخل ہوتی ہیں اور دوسرے منظر میں امی کو ڈرائینگ روم میں فریج کھولتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور تیسرے منظر میں امی اور ابا دونوں ہال میں داخل ہوتے ہیں، جہاں ننھا کھیل رہا ہے۔

مصنف نے منظروں کی پیشکش اور ان کی تفصیلات سے کردار نگاری پر توجہ صرف کی ہے۔ درج ذیل اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے کردار میں کون کون

---

[1] خالد عرفان "حلوے کی چوری" مشمولہ ماہنامہ کھلونا، نئی دہلی دسمبر ۱۹۵۸ء ص ۱۹
(مدیران: یونس دہلوی وغیرہ)

سے نمایاں اوصاف ہیں۔

امّی : (اپنے آپ سے) اگر رحیمن اور ماجد نے چوری کی ہوتی تو پوری پلیٹ
نہ صاف کر پاتے ۔ ضرور کسی اور نے اڑایا ہے۔ . . ہاں ہاں سمجھ گئی!
(ابّا اور بھیّا داخل ہوتے ہیں، امّی کے چہرے پر تیوریاں دیکھ کر دونوں
سہم جاتے ہیں۔)

ابّا : (ہمت کر کے) کیوں کیا بات ہوئی بیگم!

امّی : ہوتی کیا۔ دیکھو تمہارے لاڈلے کے کرتوت۔ تمہارے لاڈ نے ہی
تو بگاڑ رکھا ہے ۔ آج سے" [1]

اس ڈرامے کی زبان روزمرہ کی بول چال کی ہے، مکالموں میں بے ساختگی اور برجستگی نظر آتی ہے۔ مصنف کو بیگماتی زبان کے استعمال اور نسائی لب و لہجہ پر قدرت حاصل ہے۔ ایک مثال دیکھئے،

"رحیمن : کیا ہوا بیگم صاحبہ!

ماجد : جی بیگم صاحبہ۔

امی : یہ کیا جی جی لگا رکھی ہے! بتاؤ کیا ہوا یہاں سے حلوہ! کس نے غائب
کیا ہے! سچ سچ بتاؤ ـــ ورنہ . . . "

ماجد : (سہم کر) جی میں نے نہیں دیکھا بیگم صاحبہ۔

امی : اور تو نے چکھا نہیں، ہے نا!

رحیمن : (دبی آواز سے) جی بیگم صاحبہ۔

امی : جی کی بچی، میں سمجھتی ہوں، تمہیں لوگوں نے غائب کیا ہے" [2]

"حلوے کی چوری" کا نمایاں ترین وصف اس کا کلائمکس ہے۔ ڈرامے میں

---

[1] خالد عرفان "حلوے کی چوری" مشمولہ ماہنامہ کھلونا نئی دہلی دسمبر ۱۹۵۸ء ص ۱۴ مدیران یونس دہلوی وغیرہ

[2] خالد عرفان "حلوے کی چوری" مشمولہ ماہنامہ کھلونا نئی دہلی دسمبر ۱۹۵۸ء ص ۱۵ (مدیران یونس دہلوی وغیرہ)

سسپنس کی فضا آخیر تک برقرار رہتی ہے۔ اور پڑھنے والے آخیر سطر تک یہ بھنے قاصر رہتے ہیں کہ دراصل حلوہ کس نے چرایا ہے۔؟

"حلوے کی چوری" کا یہ دلچسپ اور ڈرامائی اختتام ملاحظہ ہو:۔

امی : ارے بابا مجھے سننے تو دو بھیا نے نہیں تو پھر کس نے؟

ننھا : (ابا کی طرف دیکھتے ہوئے) ممی ابا نے اور میں نے کل رات حلوہ . . .

امی : (چونک کر) اوئی یہ کیا . . . .

(امی تعجب اور غصے سے ابا کی طرف دیکھ کر)

ابا، غصیلی نظروں سے ننھے کو! اور ننھے میاں تعجب سے ابا اور امی کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔" [1]

الغرض "حلوے کی چوری" بچوں کا ایک نہایت دلچسپ اور تفریحی ڈرامہ ہے۔ جن ڈراموں کے تجزیے اس باب میں پیش کیے گئے ہیں یہ اپنے موضوع اور پیشکش کے اعتبار سے نمائندہ تخلیقات میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بچوں کے لیے بہت سے ڈرامے ملتے ہیں جن میں "شریر لڑکا" (سید عابد حسین) "ولیم ٹیل" (نصیر احمد) "آنکھ مچولی" (شجاع احمد قائد) "تنا روں روں" (ابو طاہر داؤد) "اونٹوں کی کھیتی" (غوث انصاری) "اندھیر نگری" (رجیب تنویر) "نیا کھیل" (احمد جمال پاشا) "کھوٹا سکہ" (مناظر عاشق ہرگانوی) "بلاک نمبر" (فرحت قمر) "کرشن کنہیا" (غلام حیدر) "گونگا جاسوس" (ذکی انور) "مرالکھی کی قیمت" (کالیکا پرشاد) "انگر کھا" (سیف الرحمن عباد) "بکری کا دُکھ گئی" (ایم ندیم) "جان پہچان" (سراج انور) "روبینہ" (عشرت رحمانی) "مٹھائی کا چور" (شاہد اعجاز) کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح تعداد اور معیار بہر اعتبار اُردو ادب اطفال کا یہ گوشہ خاصا تابناک ہے۔

---

[1] خالد عرفان "حلوے کی چوری" مشمولہ ماہنامہ کھلونا نئی دہلی، دسمبر ۱۹۸۵ء ص ۱۷
(مدیران یونس دہلوی وغیرہ)

بارہواں باب

ناول

قصر صحرا (عظیم بیگ چغتائی)

بیشتر ناقدین اس امر پر متفق الرائے ہیں کہ اردو میں باقاعدہ ناول نگاری کا آغاز پچھلے سو برس کے درمیان ہی ہوا ہے۔ اور دوسری اصناف ادب کے مقابلے میں بڑے اور اچھے ناولوں کی تعداد ہماری زبان میں نسبتاً بہت کم ہے۔ جب یہ صورت حال بڑوں کے ناولوں کی تعداد کی ہے تو بطور خاص بچوں کے لیے لکھے جانے والے ناول ظاہر ہے تعداد میں بہت زیادہ نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اردو ادب اطفال میں دستیاب ناولوں کا تعداد اور معیار کے اعتبار سے دیگر ترقی یافتہ عالمی زبانوں سے موازنہ زیادہ مناسب نہ ہوگا۔ البتہ ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں کو پیش نظر رکھا جائے یا خود اردو میں بالغوں کے لیے لکھے جانے والے ناولوں سے مقابلہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زبان میں بچوں کے لیے بھی تقریباً ہر اہم موضوع پر خاصی تعداد میں ناول لکھے گئے ہیں۔ ایسے ناولوں میں انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا سے متعلق تصانیف بھی شامل ہیں، انوکھی مہمات کے بارے میں دلچسپ تخلیقات بھی موجود ہیں۔ سراغ رسانی کے واقعات کو بھی بچوں کے ناولوں کا محور بنایا گیا ہے اخلاقی اور سماجی موضوعات پر بھی اس میدان میں خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ تمثیلیہ ناول بھی لکھے گئے اور مافوق الفطرت واقعات پر مشتمل ناول بھی تصنیف کیے گئے۔ سائنسی ناولوں کی بھی کمی نہیں ہے اور ہلکے پھلکے واقعات پر مشتمل مزاحیہ ناول بھی اردو ادب اطفال کے سرمایہ میں شامل ہیں۔

پھول گروپ کی ادب اطفال کے سلسلے میں مختلف الجہات خدمات کا ذکر مقالے

کے حصہ دوم میں تفصیل کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔[1] بچوں کے ناولوں کی تخلیق و اشاعت کے معاملات میں بھی اس گروپ کی پیش قدمی کا اعتراف کرنا ہوگا۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دو تین دہائیوں میں پھول گروپ کے مصنفین نے کئی ایسی کتابیں تصنیف کیں جن میں بچوں کے ناول کے ابتدائی نقوش دیکھے جا سکتے ہیں اور یہ کتابیں پنجاب کے مختلف اشاعت گھروں نے شائع بھی کیں۔ مثال کے طور پر پھول کے ایک مدیر امتیاز علی تاج کی تصانیف "محنت کا رنگ" "بچوں کی بہادری" اور "سندری شہزادی" وغیرہ اپنی طوالت کے اعتبار سے ناول کا لطف دیتی ہیں۔ لیکن باعتبار تکنیک انھیں باقاعدہ ناول کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح پھول کے ایڈیٹر حفیظ جالندھری "داستان امیر حمزہ" اور "طلسم ہوشربا" کے نہایت دلچسپ انوکھے کردار "عمرو عیار" کے کارنامے دو جلدوں میں آسان اور عام فہم لیکن پرلطف زبان میں بچوں کے لیے تالیف کیے۔ لیکن خاصی ضخامت کے باوجود ان کی یہ تالیف بھی باقاعدہ ناول کے ذیل میں نہیں رکھی جا سکتی کیونکہ اول تو یہ مختلف داستانوں سے بکھرے ہوئے اجزا کو یکجا کر کے مرتب کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ نہ تو اس میں پلاٹ کی تنظیم ہے نہ ناول کی تکنیک برتی گئی ہے۔

ادب اطفال میں تا حال دستیاب ناولوں کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کی تصنیف "قصر صحرا" اردو میں بچوں کا پہلا باقاعدہ اور طبع زاد ناول ہے حالانکہ ناقدین نے اس کی اہمیت کا خاطر خواہ تو کجا معمولی سا اعتراف بھی نہیں کیا۔ اردو ادب اطفال سے نقاد اور محقق عام طور پر بے اعتنائی برتتے ہیں۔ اکا دکا چند لوگوں نے اس طرف توجہ منعطف بھی کی تو زیادہ تر شاعری اور کہانیوں کو اپنی فکر کا محور بنایا اور عام طور پر یہ تصور کیا جاتا رہا کہ اردو ادب اطفال میں ناول نام کی چیز عنقا ہے خصوصاً آزادی ہند کے بعد بچوں کے ادب پر شائع ہونے والے مضامین میں مجھے کہیں بھی "قصر صحرا" کا حوالہ دیکھنے کو نہیں ملا۔ لے دے کر مظفر حنفی نے اپنے مضمون "اردو میں ادب اطفال" میں اس ناول کا تذکرہ کیا ہے لیکن وہاں سہواً مصنف کا نام مرزا عظیم بیگ کی جگہ میرزا ادیب درج کیا گیا ہے۔[2]

---

[2] مظفر حنفی "جہات و جستجو" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۲ء ص ۸۷

عظیم بیگ چغتائی کا یہ ناول تین حصوں میں علاحدہ علاحدہ کتابی صورت میں
دارالاشاعت پنجاب (لاہور) نے سنہ ۱۹۲۴ء، سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع کیا لیکن کتاب
کے حصہ سوم میں "معذرت" کے عنوان سے عظیم بیگ چغتائی نے جو باتیں لکھی ہیں وہ
۳۰ر اگست سنہ ۱۹۲۶ء کی تحریر کردہ ہیں۔ جب موصوف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بی،
اے کے طالب علم تھے۔ مذکورہ بالا معذرت میں انھوں نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ
"قصر صحرا" کا تیسرا حصہ تحریر کرنے میں ناقابل معافی دیر ہو گئی ہے۔ اس اعتبار سے
کتاب کے حصہ اول و حصہ دوم سنہ ۱۹۲۰ء کے آس پاس قلمبند کیے جا چکے ہوں گے۔
چونکہ اس سے قبل اردو میں بچوں کا کوئی باقاعدہ ناول تا حال تلاش نہیں کیا جا سکا۔
اس لیے "قصر صحرا" ہی کو شرف اولیت کا حامل قرار دینا ہوگا۔

تین حصوں پر پھیلے ہوئے اس ناول میں ایک ترک خاندان کی پرلطف اور حیرت انگیز
داستان پیش کی گئی ہے جسے مختلف مہمات کا سامنا کرنا پڑا اور کئی سال تک ایک ویران
جزیرے میں زندگی بسر کرنی پڑی۔ حصہ اول بصیغہ واحد متکلم میں بیان کیا گیا ہے کہ قسطنطنیہ
کا رہنے والا شخص سلطانی فوج میں ملازمت کرتا تھا۔ بعض وجوہ سے جلاوطنی کی سزا
دی گئی اور حکم ملا کہ وہ ترکی ممالک میں قدم نہ رکھے۔ چنانچہ وہ اپنے بیوی بچوں اور برادر
نسبتی کے ساتھ بحری جہاز پر سفر کا آغاز کرتا ہے راستے میں یہ سمندری ڈاکوؤں کے نرغے
میں آجاتا ہے جس سے کسی طرح نجات حاصل کر کے یہ لوگ جبل القطار تک پہنچتے ہیں
اور وہاں سے آگے بڑھتے ہیں لیکن بیکراں سمندر کے درمیان ابھری ہوئی ایک چٹان سے
ٹکرا کر ان کا جہاز غرق ہو جاتا ہے اور صرف ہیرو کا خاندان بمشکل ایک حفاظتی کشتی کے
سہارے ویران جزیرے تک پہنچ پاتا ہے۔ بہت تھوڑے سے سامان کے ساتھ یہ لوگ
اس گمنام اور ویران جزیرے پر زندگی کے دن بسر کرتے ہیں۔ ابتدائی دور کے وحشی
انسانوں کی طرح انھیں جزیرے پر از سر نو ارتقائی منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ لوگ
رہنے کے لیے جھونپڑیاں بناتے ہیں، جانور پالتے ہیں، مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں، چقماق
پتھر کی مدد سے آگ تیار کرتے ہیں۔ کھانے کے لائق پھل تلاش کرتے ہیں پینے کا
پانی کا بندوبست کرتے ہیں۔ مٹی کے برتن بناتے ہیں اور رفتہ رفتہ جزیرے پر غلے
کی چھوٹی موٹی کاشت بھی کرنے لگتے ہیں۔ چند ماہ بعد انھیں گرم کپڑوں کی ضرورت پیش

آتی ہے تو بھیڑوں کی اون کتر کر کپڑا بنایا جاتا ہے۔ الغرض اس قسم کی چھوٹی بڑی متعدد مہمات کا ایسا دلچسپ سلسلہ ناول کے حصۂ اول میں خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ تمام باتیں فطری، حقیقت آمیز اور دلچسپ محسوس ہوتی ہیں۔ اس جزیرے پر انوکھے انداز میں مہم جوئی کی زندگی بسر کرتے ہوئے اس خاندان کو چار برس گزرنے کے بعد سونے کا ذخیرہ بھی ہاتھ آجاتا ہے۔ ابتدائی کچھ مدت تک تکلیفیں اٹھانے کے بعد یہ لوگ جزیرے میں پرسکون زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ چند برسوں بعد اچانک بحری قزاقوں کا ایک جہاز جزیرے پر آنکلتا ہے۔ جلاوطن خاندان حتی الامکان ان سے جانبازی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے لیکن شکست یاب ہوتا ہے۔ عین اس موقعے پر ایک انگریزی جہاز وہاں پہنچتا ہے اور انھیں قزاقوں سے نجات دلاتا ہے۔ قزاق گرفتار کر لیے جاتے ہیں اور انگریزی جہاز انھیں لے کر جزیرے سے روانہ ہو جاتا ہے۔ ناول کا پہلا حصہ اس واقعہ پر ختم ہو جاتا ہے۔

"قصرِ صحرا" کا حصۂ دوم، اول میں بیان کردہ جزیرے پر جلاوطن خاندان کی مزید مہمات کے بیان پر مشتمل ہے۔ عظیم بیگ چغتائی کی جنگلیوں اور آدم خوروں کے حالات قلمبند کرنے سے خاصی دلچسپی رہی ہے۔ ان کی ایک مستقل تصنیف "آدم خور" اس موضوع پر دستیاب ہے جس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ناول کے دوسرے حصے میں بھی آدم خوروں کے ساتھ جلاوطن خاندان کی مڈبھیڑ اور دیگر سنسنی خیز واقعات بڑی چابک دستی اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں۔ کتاب کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ لرزہ خیز مہمات کو آخر تک پڑھے بغیر کتاب کو ہاتھ سے رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔

"قصرِ صحرا" حصۂ سوم میں اس جلاوطن خاندان کے ایک اور سفر کی پرلطف داستان پیش کی گئی ہے۔ جزیرے میں رہتے ہوئے ان لوگوں کو آٹھ برس گزر چکے تھے اور یہ لوگ ترقی کر کے ایک عالی شان محل میں آرام دہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے ذاتی ملازمین کی تعداد دو ہزار کے قریب پہنچ چکی تھی اور چھوٹے بڑے سات جہازوں کے ذریعے یہ لوگ بڑے پیمانے پر بیرونی دنیا کے ساتھ تجارت بھی کرنے لگے تھے لیکن اچانک ایک دن کوہ آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے اور جزیرے کا بڑا حصہ

سمندر میں غرق ہو جاتا ہے۔ لے دے کر کل تین سو آدمی اور ایک دو مہینے کی خوراک بچ رہتی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ ایک بار پھر سمندری سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ ان کا ارادہ یورپ پہنچنے کا تھا۔ راستے میں ایک بحری قزاق سردار گن کو اس کے کیفر کردار تک پہنچاتے ہیں۔ اور وہیل مچھلی کا شکار کھیلنے کے لیے جانے والے چند جہازوں کے ساتھ بحر منجمد کے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ ناول کے اس حصہ میں برف کے پہاڑوں کو عبور کرنے سے لے کر خوفناک والرس اور وہیل مچھلیوں کے شکار تک متعدد مہمات تک تذکرے نہایت دلچسپ پیرائے میں قلمبند کیے گئے ہیں، کہیں جلاوطن خاندان کے افراد کو برفانی ریچھ کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ تو کہیں اسکیمو، قبائلیوں کے شب خون سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان قبائلیوں کی تہذیب و تمدن، رسم و رواج۔ برف کے مکانات کی تعمیر اور ان میں رہائش وغیرہ متعدد باتیں ناول میں زیب داستان کے طور پر پیش کی گئی ہے۔

الغرض قطب شمالی اور بحر منجمد کے پس منظر میں جلاوطن خاندان کی سرفروشی، جانبازی، جرأت اور حوصلہ مندی نیز مہم جوئی کے لاتعداد واقعات بچوں کی دلچسپی کا وافر سامان مہیا کرتے ہیں۔ حصہ سوم کے سولہویں باب میں اس خاندان کو اپنے وطن کی یاد ستاتی ہے اور یہ لوگ مختلف دشواریوں کا سامنا کرنے کے بعد قسطنطنیہ واپس پہنچ جاتے ہیں لیکن وہاں اب ان کی طبیعت نہیں لگتی۔ اس لیے یہ لوگ دریائے بحر الغزال کی وادی میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور وہیں اپنے مستقل قیام کا بندوبست کر لیتے ہیں۔

حصہ سوم کے آخر میں مصنف نے بطور نوٹ درج کیا ہے کہ افریقہ کے خوفناک جنگلوں میں ہاتھی: اژدہوں اور بن مانسوں وغیرہ کا حال ایک اور کتاب 'قصر الغزال" میں قلمبند کیا جائے گا۔ افسوس کہ یہ کتاب لکھی نہیں جا سکی یا لکھی بھی گئی تو زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی کیوں کہ نہ تو عظیم بیگ چغتائی کی فہرست تصانیف میں اس کا اشتہار کہیں دیکھنے میں آتا ہے نہ اس کا کوئی نسخہ کسی لائبریری میں دستیاب ہے۔

جیسا کہ مندرجہ بالا سطور سے واضح ہے "قصر صحرا" کا پلاٹ بے حد انوکھا مہم جوئی کے واقعات سے لبریز اور ایک باحوصلہ زندہ دل نیز جری خاندان کے

سرفروشی کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ جس میں سمندر، جنگلات، برفانی علاقے اور ایسے ہی پرخطر مقامات کے نہایت جیتے جاگتے واضح اور روشن مرقعے پیش کیے گئے ہیں۔ زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے مصنف کی سحرانگیز تحریر کا محض اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں قطب شمالی پر عجیب و غریب پراسرار روشنی کا منظر مصوّر کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"مغرب سے لے کر مشرق تک اور اوپر سے لے کر نیچے تک سارے آسمان میں ایک نہایت خوش رنگ، خوشنما سنہری رنگ کی ہزاروں میل تک آگ لگی ہوئی معلوم ہو رہی تھی سنہری رنگ میں جگہ جگہ قوس و قزح کے رنگوں کی آمیزش تھی اور یہ سب رنگ سیکڑوں میل لمبے چوڑے گویا رنگ برنگ کے نہایت ہی شوخ چشمے تھے اور جو اس قدر تیزی سے عجیب عجیب رنگ بدلتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ رنگ رنگ کی بجلیاں کوندرہی ہیں۔ دائیں بائیں اور اوپر نیچے گویا سیکڑوں میل کی مسافت اور رنگ برنگی تلواریں تھیں جو بجلی کی طرح تڑپ تڑپ کر گر رہی تھیں اور ایک ایک لمحہ دس رنگ بدلتی تھیں۔ اور ہر رنگ ایسا خوشنما اور ایسا دل فریب ہوتا تھا کہ دیکھنے والا حیرت میں آجاتا تھا۔"[۱]

عظیم بیگ چغتائی کا ذہن نئے نئے واقعات گھڑنے اور ترکیبیں اختراع کرنے میں بے حد زرخیز ہے۔ ویران جزیرے پر جنگلی بکریوں کو زندہ پکڑنے کا یہ انوکھا طریقہ وہی ایجاد کرسکتے ہیں۔

"ہم نے گڑھا کھودنے کے واسطے وہی جگہ پسند کی اور کھودنا شروع کردیا۔ غرض تین روز متواتر ہم یہاں آتے اور گڑھا کھودتے رہتے۔ چوتھے روز گڑھا ٹھیک ہوگیا۔ چونکہ ہم کو بکریاں زندہ پکڑنی تھیں۔ اس لیے اس کے اندر ہم نے برچھا نصب نہیں کیا بلکہ نرم گھاس اس کی تہ میں بچھادی اور پھر اس کو بڑی احتیاط سے پاٹا۔ پتلی پتلی لکڑیاں اس کے منہ پر رکھی

۱۔ عظیم بیگ چغتائی "قصر صحرا" حصہ سوم، دارالاشاعت پنجاب (لاہور) سنہ ۱۹۳۲ء، ص ۶۰ - ۵۹

گئیں اور پھر اس کے اوپر گھاس پھوس رکھ کر مٹی پھیلادی، جب مٹی اچھی
طرح پھیلادی گئی تو اس پر کچھ جو ڈال کر پانی ڈال دیا۔ یہ کام کرکے ہم
واپس چلے آئے۔"[۱]

لازمی تھا کہ بکریاں اس خطۂ زمین کی طرف مائل ہوں اور پکڑی جائیں چنانچہ ایسا
ہی ہوا اور بعد میں انھیں پالتو بنادیا گیا۔

بحیثیت مزاح نگار عظیم بیگ چغتائی نے آگے چل کر جو شہرت حاصل کی وہ محتاج
بیان نہیں ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں قلمبند کردہ بچوں کے اس ناول میں بھی موصوف
کی ظرافت نگاری کے نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔

یوں تو "قصر صحرا" کے تینوں حصوں میں سینکڑوں کردار ہمارے سامنے آتے ہیں
لیکن صیغۂ واحد متکلم کا میں، احمد، بختیار، عائشہ، انور مصطفےٰ، جمال، رابرٹ، مرجان، ریگی،
فلورا، تارا اور میم صاحب وغیرہ کے کردار مرکزی اہمیت کے حامل ہیں اور مختلف واقعات
کے پس منظر میں نیز ان کی باہمی گفتگو کے ذریعے ان کرداروں کی سیرت اور شخصیت کے واضح
نقوش پیش کیے گئے ہیں نیز ان کی انفرادیت کو اجاگر کرنے میں مصنف کو خاطر خواہ
کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ کرداروں کو مختلف مواقع پر مختلف کیفیتوں کا بیان بھی اتنی
مہارت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ عظیم بیگ چغتائی کی جذبات نگاری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔
چھوٹے بڑے متعدد کرداروں کے خوشی، دہشت، غم، غصے، جوش، مایوسی، شجاعت،
رحمدلی اور باہمی محبت و نفرت کے لاتعداد پرتاثیر مرقعے ناول کے صفحات پر بکھرے
ہوئے ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی کو جذبات نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔ کسی معاملے یا واقعہ
کا بیان کرتے ہوئے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ان کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہتی تھی اور
معمولی معمولی چیزوں کے بیان سے وہ واقعہ کو نہایت جاندار اور حقیقی بناکر پیش کرنے میں

---

[۱] عظیم بیگ چغتائی "قصر صحرا" حصہ اوّل۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور ۱۹۳۲ء ص: ۹-۹۰

ملکہ رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک موقع کی تصویر کشی کرتے ہوئے ان حقیر اور بے حد معمولی اشیاء تک بھی ان کی نگاہ پہنچتی ہے۔

"اب ان سب چیزوں کو لے جانے کی تیاری کی گئی، میں نے لکڑی کے کئی بڑے بڑے پہیے لیے، بھیڑوں کی گردنوں میں رسی باندھی اور اس کو گدھوں کے گلے میں باندھا۔ اور جو کچھ سامان ہو سکا کشتی پر بار کیا اور ناؤ کو اسی میں باندھا۔ اور یوں ناؤ کو میں نے بڑی کوشش سے کھینا شروع کیا۔ مرغیاں میں نے ڈلیوں میں بند کر کے لکڑی کے پہیوں پر رکھ دی تھیں، بطوں کو یوں ہی کھول دیا تھا۔ ایک پہیے پر احمد بیٹھا تھا اور دوسرے پہیے پر بختیار بیٹھا تھا۔"[1]

الغرض پلاٹ کی ندرت، جزئیات نگاری کے کامل جذبات اور احساسات کی پُر تاثیر عکاسی، کردار سازی کی عمدگی اور پُر لطف اندازِ نگارش نے مل کر "قصرِ صحرا" کو ایک شاہکار ناول کا درجہ عطا کیا ہے۔ مقامِ حیرت ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں لکھا گیا۔ بچوں کا یہ پہلا ناول معیار کے اعتبار سے آج بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ یہاں اس امر کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہے کہ طبع زاد اور آزاد تخلیق ہونے کے باوصف ناول "قصرِ صحرا" میں ڈینیل ڈیفو کے شہرۂ آفاق "رابنس کروسو" کے واضح اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ "قصرِ صحرا" میں ایک جلاوطن ترک خاندان ویران جزیرے پر پہنچ کر از سرِ نو انسانی و تمدنی کی ارتقائی منزلوں سے گذرتا ہے اور مختلف مہمات سے نبرد آزما ہوتا ہے "رابنسن کروسو" میں یہ تجربات ایک فرد کو پیش آتے ہیں اور وہ بھی تقریباً نئے سرے سے انسانی ارتقا کے مختلف مدارج کو ایک ویران جزیرے پر رہ کر طے کرتا ہے۔ البتہ دونوں ناولوں میں مقامی معاشرت اور جغرافیائی حالات کے اختلاف نے علیحدہ علیحدہ صورتِ حال کو جنم دیا ہے۔

---

[1] عظیم بیگ چغتائی "قصرِ صحرا" حصہ اول۔ دارالاشاعت پنجاب (لاہور) ۱۹۳۶ء ص ۱۴

"قصرِ صحرا" کے علاوہ بھی عظیم بیگ چغتائی نے بچوں کے لیے ایک اور بھائی ناول "بحرِ جنوبی کا سفر" بھی قلمبند کیا ہے۔ ان کے "قصر الغزل" کے بارے میں پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔ بحیثیت مجموعی چغتائی بچوں کے پہلے ناول نگار بھی۔

رابنسن کروسو (ڈینیل ڈیفو)

ڈینیل ڈیفو کی شہرۂ آفاق تصنیف "رابنسن کروسو" کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اسے عالمی ادبِ اطفال میں بے حد ممتاز مقام حاصل ہے۔ ناول رابنسن کروسو کو صیغۂ واحد متکلم میں بیان کردہ داستان پر مشتمل ہے۔

رابنسن کروسو سترھویں صدی عیسوی میں ایک یورپی شہر یارک میں پیدا ہوا۔ اسے بچپن سے ہی سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ نوجوان ہونے پر اپنے والدین کی مرضی کے خلاف ایک کپتان کی مدد سے سمندری سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس سفر میں اسے بہت سی پریشانیوں اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ راستے میں بحری قزاقوں نے ان کا جہاز اور ساز و سامان چھین لیا۔ رابنسن ایک عرصہ تک لیٹروں کے سردار کا غلام رہا۔ ایک دن موقع پا کر رابنسن، سردار کی ایک کشتی پر فرار ہو گیا اور ایک بحری جہاز کی مدد سے برازیل پہنچا۔ دولت مند بننے کا اسے خبط تھا۔ اس نے دوسرے ممالک سے غلام خرید کر برازیل میں بیچنے کا منصوبہ بنایا اور بحری سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس کے پاس ایک بڑا جہاز، چودہ غلام، چھ توپیں، گولہ بارود اور کافری باشندوں کے لیے چاقو، چھری، گلاس اور کھلونے وغیرہ تھے۔ بدقسمتی سے یہ جہاز طوفان کی نذر ہو گیا۔ رابنسن بہ ہزار دشواری جان بچا کر ایک بالکل سنسان ویران جزیرے پر پہنچ گیا۔ ناول کی اصل داستان حقیقتاً اسی مرحلے سے شروع ہوتی ہے۔ اس جزیرے پر کہیں کہیں آدم خور وحشی بھی آس پاس کے جزیروں سے آ کر اپنی خوراک اور شکار حاصل کرتے تھے۔ رابنسن کروسو اس جزیرے پر انسانی تہذیب کی ارتقائی منزلوں سے تقریباً اسی انداز میں دوچار ہوا، جیسے کہ ابتدائی انسان ان مرحلوں سے گذرتے تھے۔ کافی جانفشانی اور دشواریوں نیز

طویل مدت کی جد وجہد کے بعد اس نے جزیرے پر اپنے لیے رہنے کا مستقل انتظام کیا رفتہ رفتہ اسے بڑھا کر ایک آرام اور محفوظ رہائش گاہ کی شکل دی۔ آگے چل کر رابنسن نے غلہ کی کاشت شروع کر دی اور کچھ دنوں بعد آس پاس کے ساحلی علاقے گھومنے کے لیے ایک کشتی تیار کر لی۔ اس نے بکریاں بھی پالیں۔ جن سے اسے گوشت، دودھ، مکھن وافر مقدار میں ملنے لگا۔ اس طرح رونبسن نے اس ویران جزیرے پر جو وحشیوں کی آماجگاہ بھی تھی۔ اپنی زندگی کے ۲۳ سال گذارے۔ اس دوران اس نے اپنی ضروریات زندگی کا جملہ سامان مسلسل کاوش، جدوجہد اور دانش مندی سے مہیا کر لیا تھا۔ ایک اور جہاز طوفان کی زد میں آکر اسی جگہ تباہ ہوتا ہے۔ جہاں رابنسن کا جہاز طوفان کا شکار ہوا تھا۔ اس جہاز سے بھی رابنسن اپنی ضروریات کا بہت سا سامان حاصل کرتا ہے۔ اسی دوران میں وہ جزیرے پر آدم خور وحشیوں کو دیکھ چکا تھا۔ ایک بار رابنسن نے آدم خوروں کے چنگل سے ایک شخص کی جان بچائی، جس کا نام فرائیڈے تھا۔ بالآخر رابنسن اور جمعہ مل کر آدم خوروں کا مقابلہ کرتے ہیں اور انھیں ختم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کچھ دن بعد ایک اور اسپینی جہاز اسی جگہ آلگتا ہے۔ جس میں ایک بوڑھا انگریز ملتا ہے۔ اٹھائیس برس تک ایسی ہی مصیبتیں جھیلتے اور مہمات کا سامنا کرتے ہوئے رابنسن اس ویران جزیرے پر زندگی بسر کرتا ہے۔ ناول کے اختتام پر جزیرے کے قریب سے ایک جہاز گذرتا ہے۔ رابنسن اور اس کے ساتھی اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ نیز کپتان کی مدد سے رابنسن اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ واپس اپنے وطن لوٹ آتا ہے۔

مندرجہ بالا واقعات سے واضح ہو جاتا ہے کہ دراصل ڈینیل ڈیفو نے رابنسن کروسو کی مہم جوئی کا یہ واقعہ بچوں کو انسانی تہذیب و تمدن کی ارتقا کی صورت حال سے روشناس کرنے کے لیے قلمبند کیا تھا جیسا کہ قصر صحرا، کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے نشاندہی کی جا چکی ہے۔ اُردو میں اس ناول کے براہ راست ترجمے سے قبل ایسی تخلیقات وجود میں آچکی تھیں۔ جن کا محرک غالباً ڈینیل ڈیفو کا رابنسن کروسو تھا۔ کیونکہ قصر صحرا پر اس ناول کے

گہرے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۹۶۸ء میں ترقی اردو بورڈ نے ڈیفو کے اس شاہکار کی تلخیص "رابنسن کروسو" کے نام سے شائع کی جو کل ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جہاں تک اصل ناول کا پلاٹ، کردار سازی، جذبات نگاری اور منظر کشی وغیرہ کا تعلق ہے۔ ڈینیل ڈیفو نے ان تمام امور پر اپنی مکمل قدرت اور مہارت کا ثبوت دیا ہے لیکن ندیم کے تراجم کردہ تلخیص میں یہ تمام پہلو دھندلے دھندلے نظر آتے ہیں۔ غالباً اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ایک طویل داستان کو محدود صفحات میں سمیٹنے کی شعوری کوشش نے واقعات کو بڑی حد تک غیر مربوط کر دیا ہے۔ بایں ہمہ اپنی افادیت اور عالمی ادب میں امتیازی حیثیت رکھنے کی وجہ سے ضروری تھا کہ اردو جاننے والے بچوں کو بھی اس تصنیف سے متعارف کرایا جائے اور ندیم نے یہ خدمت بخوبی انجام دی ہے۔ ضرورت ہے کہ ڈینیل ڈیفو کا یہ ناول اپنی مکمل صورت میں بھی اردو میں منتقل کیا جائے۔

غار سے جھونپڑی تک (غلام حیدر)

"غار سے جھونپڑی تک" غلام حیدر کا ناول بچوں کے لیے ایسا ناول ہے جس میں ابتدائی انسان کی زندگی اور اس کی معاشرت کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ اور پُرلطف واقعات کے ذریعے بچوں کو اس تہذیب کے ارتقائی سفر سے آشنا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو غار سے جھونپڑی تک منتقل ہونے کی جد و جہد میں انسان کو پیش آئے۔ اور پھر بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح الگ الگ غاروں میں وحشیانہ زندگی بسر کرنے والا آدمی قبائلی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوا۔ اس ناول میں ابتدائی زندگی کے جو نقوش پیش کیے گئے ہیں ان کی جھلک مدھیہ پردیش، آسام، ناگالینڈ اور بہار وغیرہ کور دہ علاقوں میں بسنے والے قبیلوں کی زندگی میں آج بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ زمانی اعتبار سے اس ناول کا موضوع اب سے کم و بیش دس بارہ ہزار سال پیشتر کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ البتہ ناول یہ واضح نہیں کرتا کہ یہ داستان دنیا کے کس علاقے سے متعلق ہے۔ اس وقت انسان غاروں میں رہتا تھا اور اس کی زندگی کا دار و مدار زیادہ تر شکار پر تھا۔ کچھ آگے چل کر جنگل کے خودرو پودوں

اور درختوں سے بھی وحشی انسان اپنی خوراک اور دیگر ضروریات حاصل کرنے لگا۔

ناول "غار سے جھونپڑی تک" کا پلاٹ دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے میں ناول کا ہیرو کینوڈ کے بچپن سے لے کر جوانی تک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں، وہ کس طرح شکار پر جاتا ہے؛ اس کا خاندان کس طرح زندگی بسر کرتا ہے؛ پتھر کے ہتھیار کیسے وجود میں آئے ہیں؛ تیر و کمان کے استعمال کا آغاز کیسے ہوا؛ ان لوگوں کی گذر بسر جنگلی پھلوں اور جانوروں کے شکار سے ہوتی ہے۔ یہ جانور صرف ان کا پیٹ بھرنے کے لیے گوشت ہی فراہم نہیں کرتے بلکہ ان کی کھالوں سے وحشی اپنا تن بھی ڈھکتے ہیں۔ بعض اوقات شکار وحشی درندے (بھیڑیا وغیرہ) بھی ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ایسے ایک موقع کا بیان مصنف کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

> "انھوں نے پوری طاقت سے کمان کی تانت کو کھینچا، دوڑتے ہوئے گیدڑ کا نشانہ لیا اور ایک ساتھ دو تیر کمان سے سنسناتے ہوئے نکلے۔ ایک تیر نشانے سے بہت دُور نکل گیا لیکن دوسرا گیدڑ کی ران میں گھس گیا۔ گیدڑ زمین سے کچھ اُچھلا لڑکھڑایا اور اپنی جان بچانے کے لیے ایک بار پھر بھاگا۔ تیر کی پتھر کی اَنی اب بھی اس کی ٹانگ میں گھسی ہوئی تھی اور اس کا دوسرا سرا زمین میں رگڑ رہا تھا۔ ابھی وہ زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ ایک بھالا اس کے بائیں طرف لگا اب وہ زمین سے نہ اٹھ سکا . . .
> ان کا دوسرا شکار جو کافی دیر بعد ہاتھ لگا وہ ایک لومڑی تھی۔"[1]

اسی طرح یہ شکاری بچے اپنے شکار کو حفاظت کے خیال سے غار میں رکھ دیتے ہیں۔ اور قریبی ندی میں نہانے چلے جاتے ہیں لیکن جب واپس آتے ہیں، اپنے شکار پر بھیڑیئے کو قابو میں کر پاتے ہیں۔ اس موقعہ پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

> "دراڑ میں جھانکتے ہی سب کے چہروں کی رنگت بدل گئی دو بھیڑیئے

---

[1] غلام حیدر "غار سے جھونپڑی تک" اردو اکیڈمی اترپردیش لکھنؤ ۱۹۸۱ء ص ۱۴

ان کے شکار کے گوشت کو ہڈیوں سے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ ہتھیار
بھی بھیڑیوں کے پاس ہی پڑے تھے۔ انھیں اپنی ریڑھ کی ہڈیوں
میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔" [1]

ناول میں جگہ جگہ اس قسم کے دلچسپ واقعات اور دل نشین مناظر کی پیشکش سے مصنف قاری کی دلچسپی کو گرفت میں رکھتا ہے اور بیان ایسے جزئیات نگاری کا حامل ہے کہ سارا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس ناول کے پلاٹ کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ مصنف نے مانڈو قبیلے کے معمر ترین بوڑھے شامی بابا سے بچوں کو کہانیاں سنوائی ہیں۔ شامی بابا بہت بوڑھے ہیں وہ اپنے اور اپنے بزرگوں کے حیرت ناک کارنامے بچوں کو سناتے ہیں۔ اس طرح مصنف نہایت چابکدستی سے بچوں کو ایک اور قدیم تر تہذیب کی جھلک بھی دکھا دی ہے اور اس تہذیب کے ایسے گوشے روشنی میں لائے گئے ہیں جو مہم جوئی، حیرت و استعجاب سے مملو ہیں۔

ایک روز شامی بابا نے بچوں کو خوفناک ہاتھیوں کی کہانی سنائی اور وہ پُرلطف واقعہ بیان کیا۔ جب پہلی بار اس وحشی انسان نے ہاتھی کا شکار کیا تھا۔ ان وحشیوں نے دانشمندی سے کام لیا اور جگہ جگہ بڑے بڑے گڈھے کھودے نیز ان پر ہری ہری ٹہنیاں اور پتے بچھا دیئے۔ پھر ان لوگوں نے ہاتھیوں کو گھیر لیا۔ ہاتھیوں کے شکار کا یہ منظر دیکھیے:

"ہاتھیوں کی ہولناک چنگھاڑوں، درختوں میں چھپے آدمیوں کے نعروں کا
شور، پرندوں کے پر کے پھڑپھڑانے کی آوازوں نے پورے جنگل میں
ایک کہرام سا مچا دیا۔ ہاتھیوں کا سردار گھبرا کر راستے کے سیدھی
طرف بھاگا، پیڑوں پر سے اٹھنے والا شور کچھ اور تیز ہوا اور پورا غول
بھڑکتے ہوئے راستے سے بچ کر اپنے سردار کے پیچھے دوڑ پڑا۔ ایک
ایک کر کے دھماکوں کے ساتھ شکاری بھی درختوں سے کود پڑے۔

---

[1] غلام حیدر "غار سے جھونپڑی تک" اردو اکیڈمی اتر پردیش لکھنؤ ۱۹۸۱ء ص ۱۳

شور مچاتے، ہتھیار ہلاتے، پتھر برساتے یہ سب گھبرائے ہوئے ہاتھیوں
کے پیچھے دوڑ پڑے اور پھر دھماکہ ہوا۔ لکڑی کے چٹخنے کی آوازیں اور
ایک ہاتھی کی زوردار چنگھاڑ جنگل میں گونجی، ایک ہاتھی گڈھے میں گر گیا تھا۔[1]

شامی بابا کی باتوں پر بچوں کو یقین نہیں آتا تھا اور وہ بمشکل باور کرا پاتے کہ سب کچھ انھوں نے یا ان کے دادا یا پردادا نے اس کو دیکھا تھا۔ شامی بابا اس طرح قدیم ترین زمانے کے انسان کی زندگی، رہن سہن اور ان کے ہتھیاروں نیز شکار کے بارے میں وہ بچوں سے کہتے ہیں۔

"نہیں وہ بہت دور ہے۔ اس غار تک پہنچنے کے لیے بہت دن چلنا
پڑتا ہے اور جانتے ہو ان لوگوں نے اس کہانی کو غار کی دیواروں پر کھود
بھی دیا تھا۔ میں نے خود ان تصویروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جب
میں تمہاری طرح بچہ تھا۔"[2]

کینٹو کا باپ قبیلے کا سردار اپنے بیٹے کو بھی اپنا جیسا بہادر بنانا چاہتا ہے۔ وہ اسے ہتھیار بنانے کا فن سکھانے کی کوشش کرتا ہے مگر کینٹو بہادر ضرور تھا اس کی دلچسپی ہتھیار بنانے میں نہ تھی جس کا احساس اسے بعد میں ہوا۔ اس کے باوجود کینٹو بہت اچھا شکاری تھا۔ ملیٹی کینٹو کی چھوٹی بہن ہے۔

غلام حیدر نے ناول میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ جنگلی جانوروں، موسموں اور جنگلوں کا ذکر کیا ہے۔ برسات میں ان وحشیوں کا برا حال ہوتا ہے اور کئی کئی دن تک یہ لوگ درختوں پر بھوکے پیاسے رہتے ہیں۔

ناول کا پہلا حصہ کینٹو کے لڑکپن کے واقعات پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں کینٹو جوانی کی حدود میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کے ماں باپ مر چکے ہیں اور جوان بہن ملیٹی کی ذمہ داری

---

[1] غلام حیدر "غار سے جھونپڑی تک" اردو اکیڈمی اترپردیش (لکھنؤ)، ۱۹۸۱ء ص ۳۲

[2] غلام حیدر "غار سے جھونپڑی تک" اردو اکیڈمی اترپردیش (لکھنؤ)، ۱۹۸۱ء ص ۳۳

کینٹو کے شانوں پر آپڑی ہے۔ کینٹو وحشی ہے۔ شکار کا شوقین ہے۔ زندہ دل اور سیر
سیاحت کا شائق ہے لیکن اسے بہن سے متعلق اپنے فرائض کا بھرپور احساس بھی
بلیٹی جوان ہے اور بدلی نامی ایک نوجوان اس سے محبت کرتا ہے۔ نیز بلیٹی کو اپنی محبو بہ
میں رکھنا چاہتا ہے۔ کینٹو بدلی کو قطعی پسند نہیں کرتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کے مابین
خاندانی رقابت چلی آرہی ہے۔ ناول کے اس حصے میں محبت حسد رشک اور دیگر جذبات
کی شمولیت سے مصنف نے کہانی کو رنگین بنایا ہے۔ بلیٹی کو ایک دوسرا نوجوان گوبٹی
پسند کرتا ہے۔ اس طرح پلاٹ فطری انداز میں ان تینوں کے بیچ گھومتا ہے اور
مقامات پر مصنف کردار نگاری کے نازک مرحلوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ بر
ہوا ہے۔

مانڈو قبیلہ پہلے کی بہ نسبت ترقی پذیر ہے۔ کینٹو اور دوسرے نوجوان بڑی ند
پار کر کے پہاڑوں کے پرے جانا چاہتے ہیں۔ ناول میں جگہ بہ جگہ مناظر کی جلوہ گر
نظر آتی ہے۔

اب تک جانوروں کی کھالیں بدن ڈھانکنے کے لیے ہی استعمال ہوتی تھیں
مصنف نے بڑے انوکھے لیکن فطری انداز میں کھال سے ڈھول بنانے کے واقعہ کا ذ
کیا ہے۔ ایک کھال سکھانے کی غرض سے اتفاقاً اس طرح پھیلا دی گئی تھی کہ اس
نیچے ہوا کا گذر ممکن نہ تھا۔ پاس ہی بچے کھیل رہے تھے اچانک لکڑی کا ایک ٹکڑا سو کھ
ہوئی کھال پر جا پڑتا ہے۔ اور اس سے شیر کی گرج جیسی آواز نکلتی ہے۔ خوفزدہ وحشی
اسے بھوت سے تعبیر کرتے ہیں۔

وحشی انسان اب مچھلی کا شکار بھی کرنے لگے ہیں۔ یہ لوگ ندی پار کر کے پہاڑ
کے پیچھے ایک ایسی بستی میں بھی جانے لگے ہیں۔ جہاں کانو قبیلہ رہتا ہے۔ جو مانڈو قبیلے
سے کچھ زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ کانو قبیلے کے لوگ پتھر کے پیالے استعمال کرتے ہیں
گوشت میں پتھر کا سفوف (نمک) بھی ڈالتے ہیں۔ پھلوں کا استعمال بھی ان کے یہا
نسبتاً زیادہ ہے

ناول کا پلاٹ خاصی تیزی سے آگے بڑھتا ہے اور کنٹو اپنی مہم جوئی، شجاعت اور ہمت کے سبب مانڈو قبیلے کا سردار بنا دیا جاتا ہے۔ کنٹو کو مانڈو قبیلے کا سردار بنانے میں شامی بابا کی حمایت بھی شامل ہے۔

ناول "غار سے جھونپڑی تک" کینٹو کے سردار بننے پر ختم ہو جاتا ہے۔ کہانی کا موضوع خشک ہے۔ غلام حیدر نے جس سلیقے سے پلاٹ کا تانا بانا تیار کیا ہے اور واقعات کو فطری انداز میں شگفتہ بیان نیز دلکش اسلوب میں پیش کیا ہے اس کی وجہ سے بچے کہیں بھی بے کیفی محسوس نہیں کرتے۔

غلام حیدر کو زبان و بیان کے برتاؤ کا ہنر آتا ہے۔ کینٹو، شامی بابا، پلیٹ وغیرہ کے کردار ایسی جہات کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں کہ ہر ایک کی انفرادیت اور شخصیت واضح نظر آتی ہے۔ جذبات نگاری کا سلیقہ بھی غلام حیدر کو حاصل ہے خصوصاً بعض مقامات پر متضاد اور پیچیدہ واقعات کی بیک وقت پیشکش نے کرداروں کی باطنی کیفیات کو بڑی خوبی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ قدرتی مرقعے بھی صاف اور جیتے جاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ واقعات ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ پلاٹ میں کہیں ڈھیلا پن محسوس نہیں ہوتا۔ غلام حیدر جانتے ہیں کہ کس بات کو کہاں تفصیل سے اور اختصار سے بیان کرنا ہے۔ حسنِ توازن اس ناول کی بڑی خوبی ہے۔ سادہ لوح وحشی انسان کی نفسیات اور ابتدائی انسان کی بول چال میں بھی کہیں ناہمواری نظر نہیں آتی۔ البتہ میری نظر میں ناول کا بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں پلیٹ سے بدلی اور گولش کے عشق کی داستان بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے جب کہ یہ ناول بچوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ لازم تھا کہ ان مقامات پر اختصار اور اشاروں کنایوں سے کام لیا جاتا۔

بحیثیت مجموعی "غار سے جھونپڑی تک" بھی بچوں کا ایک اہم ناول ہے اور اسے عظیم بیگ چغتائی کے "قعر صحرا" اور رابن سن کروسو کے سلسلے کی ایک ارتقائی کڑی سمجھنا چاہیے۔ "غار سے جھونپڑی تک" ایک طبع زاد ناول ہے۔ اسے شائع کرنے

میں بھی اتر پردیش اردو اکیڈمی نے خاصا اہتمام برتا ہے۔ کتابت جلی اور طباعت روشن ہے۔ نیز درمیان میں مناسب مواقع پر تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں جو بچوں کی دلچسپ کو بڑھانے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔ البتہ ناول کی قیمت اتنی رکھی گئی ہے کہ عام بچے کی دسترس اس تک لائبریری کے وسیلے سے ہی ممکن ہے کم از کم سرکاری اداروں سے بچوں کے لیے شائع ہونے والے ناول کو تجارتی مفاد سے بے نیاز ہونا چاہئے تھا۔

ستاروں کی سیر (کرشن چندر)

ہمارا دور سائنس کا دور ہے۔ آج کا بچہ اب مافوق الفطرت واقعات اور عجیب و غریب کرداروں کی بہ نسبت نئی نئی ایجادات اور خلائی معلومات میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ دور جدید کا بچہ بے بنیاد باتوں پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔ یہی سبب ہے کہ عصر حاضر میں سائنس فکشن نے بچوں کے ادب میں منفرد مقام حاصل کر لیا ہے۔ سائنس فکشن جہاں بچوں کو جدید سائنسی معلومات فراہم کرتا ہے وہیں انہیں خلائی مہمات فضائی سیر و سیاحت اور اسی نوع کے دلچسپ موضوعات پر تازہ بہ تازہ معلومات فراہم کرتا ہے۔ تخیلاتی اڑن کھٹولہ اب پرانی چیز ہو گئی۔ بچے خود ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آسمان کی سیر کرتے ہیں۔ اور انسان خلا میں جا کر اپنی ہی دنیا کو چھوٹے سے ستارے کی شکل میں دیکھتا ہے۔

کرشن چندر کے ناول "ستاروں کی سیر" بچوں کو نئے نئے جہانوں کی گھر بیٹھے سیر کراتا ہے۔ جس میں تحیّر و استعجاب سے تخیلات و حادثات کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا ہے اور تفریح کے پردے میں بچوں کو جدید سائنسی ایجادات اور کائنات کے اسرار سے روشناس کرایا ہے۔ اس ناول میں ایک عجیب و غریب روبوٹ سائنس داں کے احکامات کا پابند ہے اور اس کے سارے کام انجام دیتا ہے۔

ناول ستاروں کی سیر آج سے پچاس برس آگے کی داستان ہے۔ ایٹم بموں اور راکٹوں کی جنگ دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی یکسر ختم کر چکی ہے۔ زمین کا محور بدل گیا ہے۔ اس کی سطح نیچی اور سمندر کی سطح نسبتاً اوپر

ہوگئی ہے۔ اس طرح دنیا کا تین چوتھائی حصہ سمندر میں غرق ہوگیا ہے اور انسان پہاڑوں پر پناہ گزین ہے۔
اونچے اونچے پہاڑوں پر اینٹی قلعہ بندیاں کی جاچکی ہیں، دنیا دو گروہوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک سائنس دانوں کی دنیا دوسری عام آدمیوں کی دنیا۔ سائنسداں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ ان سائنس دانوں میں ایک بوڑھا سائنسداں بھی ہے۔ جو تین بچوں عرفی، ناز اور موہنی کے ساتھ پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر رہتا ہے۔ اس کا چوتھا سائنسی بیٹا جمی روبوٹ ہے۔ سائنس داں اپنے تجرباتی کاموں میں اس کی معاونت حاصل کرتا ہے۔ جمی کے ہاتھ پاؤں، ناک، کان حتیٰ کہ بال تک ہیں لیکن یہ تمام اعضا سب لوہے کے ہیں۔ اس کا ایک دل اور دو دماغ ہیں۔ اسے دل سے زیادہ دماغ کی ضرورت ہے تاکہ ایک دماغ کام کرنا چھوڑ دے تو دوسرا برسرِ کار رہے۔ یہ روبوٹ خود کار بیٹری سے چلتا ہے۔ ایک بار حالات ایسے پیش آئے ہیں کہ بچے روبوٹ کے ساتھ پروفیسر کے تیار کردہ انتہائی ترقی یافتہ راکٹ میں بیٹھ جاتے ہیں اور عرفی اسے جمی کی مدد سے اسٹارٹ کر دیتا ہے۔ اس طرح تینوں بچے اور جمی روبوٹ زمین کی کشش ثقیل سے آزاد ہو کر خلا میں پہنچ جاتے ہیں، ستاروں کی دنیا میں پہنچ کر عجیب و غریب کائنات دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ کائنات مافوق الفطرت واقعات، پریوں اور دیوؤں کی دنیا اور پرستان جیسی قدیمی داستانی دنیاؤں سے قطعی مختلف ہے۔ لیکن تخیلی اور سائنسی انکشافات کی آمیزش سے مصنف نے ایسی پر اسرار اور عجیب و غریب فضا تخلیق کی ہے کہ اس کے سامنے طلسمی دنیا ہیچ نظر آتی ہے۔

بچوں کا جہاز ماہتاب ائر پورٹ پر پہنچتا ہے جہاں چاندنی کی کارفرمائی ہے۔ یہ جہاز موتی ستیارے کی طرف پرواز کرتا ہے اور جہاں تانبے کی مخلوق بستی ہے۔ نیز موتیوں کا لباس پہنتی ہے۔ وہاں سے بچوں کا جہاز چاند کے دوسرے حصے میں واپس آتا ہے جہاں جھوٹوں کا شہر واقع ہے، بچے بادشاہ دروغ گو کے دربار میں پہنچتے ہیں اور درباریوں کے حیرت انگیز بیانات سے محظوظ ہوتے ہیں۔

بعد ازاں ایک فولادی شاہین بچوں کو عقاب کی وادی میں لے جاتا ہے، عقاب

لی دادی بھی عجیب وغریب ہے، یہاں بوڑھا بالشتیہ بچوں کو اپنی قوم کی دل گداز داستان سناتا ہے۔ یہ بالشتیے بھی انسانوں کی طرح چاند پر حکومت کرتے ہیں۔ آگے چل کر جادوگرنی کے ہیبت ناک کارنامے، کاغذی جنّات وغیرہ اسی نوع کے متعدد دلچسپ واقعات اس ناول میں بیان کیے گئے ہیں۔ آخرکار یہ بچے روبوٹ کی مدد سے اپنی دنیا میں بخیر و عافیت واپس آجاتے ہیں۔

یہ ناول بیس ابواب پر مشتمل ہے[1] ناول کا آغاز روبوٹ جی کے تعارف سے ہوتا ہے جس کو سائنسداں نے آٹھ برس کی محنت سے تیار کیا ہے۔ سائنسداں چاند پر حکومت کرنے کا خواہش مند ہے۔ اس مقصد کے تحت روبوٹ کو تربیت دی گئی ہے لیکن سائنسداں سے پہلے ہی بچے روبوٹ کی مدد سے راکٹ جہاز سے اڑتے ہیں۔ پورا پلاٹ نہایت عمدگی اور خوش سلیقگی سے مرتب کیا گیا ہے۔ ہرچند کہ یہ ایک سائنسی ناول ہے اور مصنف بچوں کو جدید سائنسی ترقیات سے روشناس کرانا چاہتا ہے۔ لیکن اس خشک موضوع کے لیے جو پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی مثال اُردو کے کسی دوسرے ناول میں نہیں ملتی۔ ماہرِ فن ناول نگار نے باتوں باتوں میں بچوں کو چاند کی دنیا کی سیر کرائی ہے۔ ان کی دلچسپی کے لیے وہاں کی دنیا کو مافوق الفطرت عناصر اور جن، پری، دیو جیسے بعید از قیاس کرداروں کے برعکس بالکل نئی قسم کی مخلوق اور نئے جہان سے متعارف کرایا ہے اور ایسے عجائبات کی سیر کرائی ہے جس کی مثال طلسمی داستانوں میں بھی نہیں ملتی۔ بچوں کا راکٹ مہتاب ایئرپورٹ پر پہنچا۔ اور وہاں بچے مختلف عجائبات سے محظوظ ہوئے

ایک ایسے ہی انوکھے واقعہ سے متعلق اقتباس مثال کے طور پر درج کیا

---

[1] ستاروں کی سیر، ماہنامہ کھلونا، نئی دہلی میں اکتوبر ۱۹۵۷ء سے اپریل ۱۹۵۹ء ختم تک قسط وار شائع ہوا۔ بیچ میں چند ماہ اس کی قسطیں شائع نہیں ہوئی تھیں۔ چونکہ ہر قسط میں ایک نیا اور دلچسپ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے اقساط کو بابوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعد ازاں یہ ناول مکتبہ پیام تعلیم نے ۱۹۶۶ء میں کتابی شکل میں شائع کیا۔

جاتا ہے:۔

"یہاں ہر چیز چاندنی کی طرح شفاف تھی۔ گلاب جامن اور امرتی، موتی چور اور حلوہ سوہن ہر شے کا رنگ سفید تھا۔ چاندی کے گلاسوں میں بھی اب شفاف پانی بھرا ہوا تھا لیکن جو ہی وہ لوگ پانی پیتے ہیں انہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انھوں نے کچھ پیا ہی نہیں، گلاس خالی ہو جاتا ہے مگر ان کے پیٹ میں کچھ نہیں پہنچتا۔ لڈو اٹھا کر وہ لوگ منہ میں رکھتے اور منہ میں رکھتے ہی جبڑے چلنے لگتے مگر منہ میں لڈو محسوس نہ ہوتا۔"[1]

مصنف کے اندازِ بیان کی خوبی دیکھئے کہ چاند کی دنیا میں پہنچ کر انھوں نے بچوں کی دلچسپی کی چیزوں ہی کا ذکر کیا ہے۔ جن میں گلاب جامن، موتی چور اور حلوہ سوہن جیسی مٹھائیاں شامل ہیں۔ آگے چل کر مصنف نے اس راز کا انکشاف کر کے بچوں کے جذبۂ تجسس کو آسودہ بھی کر دیا ہے کہ خاکی انسان چاند کی غذا سے اپنا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ کیوں کہ وہاں کی مخلوق نورانی ہے اور اس کی غذا بھی چاندنی کی چیزوں سے تیار ہوتی ہے۔ بچے سیارے پر ایک شہر "موتی نگر" میں داخل ہوئے تو وہاں کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ کرشن چندر کے شاہکار تخیل نے اس شہر کی تخلیق میں بڑی گل کاریاں کی ہیں ایک منظر

"یہاں جو عمارت بھی نظر آتی تھی، موتیوں کو جوڑ جوڑ کر بنائی گئی معلوم ہوتی تھی، دودھیا رنگ کی چھ چھ سات سات منزلہ عمارتیں، بے حد خوبصورت اور دلکش، ہر عمارت تاج محل کی طرح خوبصورت نظر آتی تھی۔ دیواریں موتیوں کی تھیں۔ نشست موتیوں کی تھی۔ کمرے کے اندر ٹیلی فون موتیوں کا لباس موتیوں کا تھا۔"[2]

---

[1] کرشن چندر "ستاروں کی سیر" مشمولہ کھلونا، نئی دہلی جنوری ۱۹۵۸ء ص ۲۵ (مدیر ادریس دہلوی وغیرہ)

[2] کرشن چندر "ستاروں کی سیر" مشمولہ کھلونا، نئی دہلی جنوری ۱۹۵۸ء ص ۴۴، مدیر ادریس دہلوی وغیرہ۔

ناول میں جگہ جگہ لطیف طنز کی کارفرمائی بھی موجود ہے۔ مثلاً موتی نگر کا میئر بچوں کو بتاتا ہے کہ وہ لوگ تانبے کے ہیں، بجلی سے چلتے ہیں لیکن انسانوں سے کئی اعتبار سے بہتر ہیں۔

کرشن چندر نے ناول کے توسط سے بچوں کی تفریح کا سامان فراہم کرنے کے ساتھ انھیں جدید سائنسی معلومات کے بارے میں بھی واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ آج کا عام انسان جانتا ہے کہ چاند ویران اور اجاڑ ہے۔ جہاں ہوا اور پانی بھی دستیاب نہیں چاند کی زمین پر رات و دن ریت کے بگولے اٹھتے رہتے ہیں اور یہ سرزمین سرد آتش فشاں پہاڑوں سے اَٹی ہوئی ہے

"ہماری دُوربینوں سے زمین کے رہنے والے کو چاند کا صرف ایک حصہ نظر آتا ہے اور زمین اور چاند کی گردش کا یہ حساب ہے کہ ہمیشہ وہی حصہ نظر آتا ہے جو ویران اور بنجر ہے۔ جہاں نہ ہوا ہے نہ پانی، نہ درخت ہیں۔ نہ جانور لیکن چاند کا وہ حصہ جو ہماری دُوربین کی آنکھ سے اوجھل ہے۔ اس میں کیا ہے یہ آج تک کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔"

ناول "ستاروں کی سیر" میں جگہ جگہ دلکش مناظر بھی پیش کیے گئے ہیں ادبی دنیا میں منظر کشی کے میدان میں کرشن چندر کے سحر کار قلم اور نادر کار تخیل کی پیش کش کو ہمیشہ بے مثال سمجھا گیا ہے۔ نادیدہ حصہ کا ایک خوبصورت منظر ملاحظہ فرمائیں۔

"تمام سطح زمین پر نیلے رنگ کی گھاس پھیلی ہوئی تھی اور کہیں پر بھوری مٹی نظر نہ آتی تھی۔ تمام پتوں کا رنگ سنہری تھا اور تمام پھول سفید تھے اور بادل آسمان میں بہت اونچے نہیں اُڑتے تھے۔ بلکہ درختوں کی چوٹیوں کو چھو کر نکلتے تھے۔ تو ان میں سے پانی کی بارش کے بجائے موسیقی کی بارش ہوتی تھی اور دھیمے دھیمے سروں میں خوبصورت راگ ہر وقت برستے رہتے تھے۔" [1]

---

[1] کرشن چندر "ستاروں کی سیر" مشمولہ کھلونا نئی دہلی ۱۹۵۸ء ص ۲۸

اس شعریت آمیز نثر کے طلسم میں قاری کو ایسی خوابناک فضا میں پہنچا دیتا ہے جو ہماری اس دکھوں بھری دنیا سے قطعی مختلف ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ کرشن چندر کو محض خوبصورت مناظر کے مرقعے پیش کرنے میں ہی درک حاصل ہے، وہ حسب ضرورت ہولناک منظروں کی بھیانک تصویریں بھی کھینچتے ہیں۔ اس ناول میں بھی خوف و دہشت کے مناظر ایسے فطری انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ پڑھنے والے خود کو اس کا جزو سمجھنے لگتے ہیں۔

کردار سازی میں کرشن چندر کی خوبی یہ ہے کہ وہ کرداروں کے بارے میں تعارفی نوعیت کے سپاٹ بیانات سے گریز کرتے ہیں اور افعال نیز حرکات و سکنات کے وسیلے سے ان کے انفرادی نقوش کو اس طرح اُبھارتے ہیں کہ ان کی جیتی جاگتی شخصیت سامنے آجاتی ہے جمی روبوٹ ہے۔ اس ناول کے مرکزی کرداروں میں ہے اگرچہ وہ لوہے کا بنا ہے اور بجلی کے ایک چھوٹے ڈائینمو سے چلتا ہے لیکن کرشن چندر کا کمال یہ ہے کہ اس فولادی انسان کی حرکات و سکنات اور طور طریقوں میں نمایاں انفرادیت پیدا کردی ہے۔

جمی چونکہ فولاد کا بنا ہوا تھا اس لیے اس پر کسی موسم کا اثر نہیں ہوتا تھا لیکن بقول کرشن چندر۔

> "اس قدر نیک دل تھا کہ ہر ایک سے پیار کرتا تھا۔ پروفیسر نے جمی کا دل اس قدر خوبصورت اور اس قدر اچھا بنایا تھا کہ اس میں نیک خیالوں کے سوا اور کوئی خیال سماتا ہی نہ تھا۔ جمی ایک بہت ہی اچھا لوہے کا لڑکا تھا۔"[1]

جمی کے دونوں دماغوں میں سائنس، ریاضی، ادب اور شعور فلسفہ سماج اور معاشرے کا علم بھر دیا گیا تھا۔ اور یہ دماغ بہت تیزی سے کام کرتا تھا۔ ایک موقعہ پر بچے سائنسداں سے جہاز کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو جمی خود نما بچوں کی طرح

---

[1] کرشن چندر ستاروں کی سیر، مشمولہ کھلونا، نئی دہلی اکتوبر ۱۹۵۷ء ص ۲۲

بول پڑتا ہے۔

"ابھی اس میں دس دن کا کام باقی ہے اور جب یہ جہاز تیار ہو جائے گا تو اس کی لمبائی ساٹھ میٹر ہوگی۔ چوڑائی چھ میٹر، وزن ایک ہزار ٹن اس میں چار راکٹ پمپ ہوں گے جو پارے کی بھاپ سے چلیں گے۔" [1]

اس اقتباس سے اس فولادی روبوٹ میں بچّے کی سی فطرت کا اظہار ہوتا ہے۔ مزید برآں وہ انسانوں کی طرح محسوس بھی کرتا ہے۔ اچھے بُرے کی اس کو تمیز ہے۔ انسانی کرداروں کے جذبات واحساسات اور نفسیات کی عکاسی تو سب ہی کر لیتے ہیں۔ کرشن چندر نے اس روبوٹ کو بھی ان صفات سے متصف کر کے مہارت فن کا ثبوت دیا ہے سائنسداں کی بیٹی موہنی، جمی سے بچوں کی طرح چھیڑ خانیاں کرتی رہتی ہے اور وہ اپنے ردِ عمل کا اظہار بھی کرتا ہے۔

تانبے کے انسان اپنا سارا کام مشینوں سے لیتے ہیں۔ مشینوں کے اندر انھوں نے ایسی عقل، یادداشت اور تجربہ بھر دیا تھا کہ ہر مشین خود اپنی جگہ پر ایک شخص کا کام کرتی تھی۔ "سوتی نگر" کا میئر بھی تانبے کا ہے۔ وہ زمین سے آنے والے ان بچّوں کو شہر کی سیر کراتا ہے۔ تانبے کے یہ لوگ دل بھی رکھتے ہیں جس میں جذبات واحساسات بھی ہیں لیکن وہ لوگ اپنے حالات سے غیر مطمئن ہیں۔

عرفی، ناز اور موہنی کے کردار بھی منفرد خصوصیت کے حامل ہیں۔ عرفی سب سے بڑا اور سمجھدار ہے وہ ہر جگہ جمی کی معاونت کرتا ہے۔ دس سالہ موہنی بہت نٹ کھٹ اور شوخ بچّی ہے۔ اس کے برعکس چودہ سالہ ناز دور اندیش اور بہت سوجھ بوجھ والی ہے۔ پورے ناول میں یہ تینوں کردار مخصوص صفات اور امتیازی خصوصیات کی وجہ سے انفرادیت کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کرداروں کے علاوہ سائنس داں، بادشاہ دمغ گو اور پتلی کے کردار بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

---

[1] کرشن چندر: ستاروں کی سیر، مشمولہ کھلونا، نئی دہلی اکتوبر ۱۹۵۸ء ص ۲۲ مدیران ادریس دہلوی وغیرہ،

کرشن چندر نے جس کردار کو جہاں پیش کیا ہے وہ اس فطری انداز میں پیش کیا ہے کہ کردار کی جیتی جاگتی متحرک حیثیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ شوخ و شنگ عرفی کے کردار کی ایک جھلک دیکھئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک امن پسند بچہ ہے لیکن مستقل مزاجی حوصلہ اور جرأت کے اوصاف بھی اس کے کردار میں موجود ہیں۔

ناول "ستاروں کی سیر" کی زبان انتہائی دلکش ہونے کے باوجود عام فہم ہے اور اگر بعض مقامات پر ایسے مشکل الفاظ کا استعمال ناگزیر ہو گیا ہے تو کرشن چندر نے ایسے سیاق و سباق میں پیش کیا ہے کہ بچے بآسانی اس کا مفہوم سمجھ لیں۔ اور ان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہو۔

مکالموں میں دریا کی سی روانی ہے۔ زبان میں شعریت پیدا کرنا تو کرشن چندر کا بنیادی وصف ہے جس کے نمونے پورے ناول میں قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔

جب یہ بچے بادشاہ دروغ گو کے ملک میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں عجیب و غریب استقبال سے گھبرا جاتے ہیں۔ اس سرزمین پر سچ بولنا گناہ ہے۔ وہاں ہر بات کا مطلب الٹا ہی تصور کیا جاتا ہے۔

جادوگروں کے دیس میں پہنچ کر کسٹم آفیسران بچوں سے جادو دکھانے کو کہتا ہے۔ عرفی جو بہت ذہین ہے اپنے پاندان سے ایک پان نکال کر کہا۔

"یہ پتہ دیکھئے اس کا رنگ کون سا ہے!" ——— "سبز ہے" عرفی نے پان منہ میں ڈالا اور کہا۔ اب آپ کہیے ایک دو تین چار"

کسٹم آفیسر کہنے لگا۔ "ایک — دو — تین — چار"۔

چار کے بعد عرفی نے جو ابھی تک ٹھیک سے پان نہیں چبایا تھا، پھر کہا ایک بار پھر کہو"

ایک — دو — تین — چار!

"وہ رہی پان کی دھار" عرفی نے پان کی سرخ پیک زور سے ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا — دیکھا میرا جادو، منہ میں ڈالا تھا سبز پتہ نکلا سرخ پانی"[1]

---

[1] کرشن چندر "ستاروں کی سیر" مشمولہ کھلونا۔ نئی دہلی نومبر ۱۹۶۸ء ص ۲۰ (مدیران ادریس دہلوی وغیرہ)

چھوٹے چھوٹے فقروں، نامکمل جملوں اور ڈرامائی انداز نے ان مکالموں میں جو دل کشی پیدا کی ہے اہل نظر اس کی داد دیں گے۔

الغرض ناول "ستاروں کی سیر" بچوں کے سائنس فکشن میں شاہ کا درجہ رکھتا ہے۔ دکھ اور درد کی ماری ہوئی اس دنیا میں ہولناک اور تباہ کن ایٹمی ہتھیاروں نے خوف و دہشت کی جو فضا پیدا کر دی ہے، اس ناول کے ذریعے بچوں میں اس سے نجات پانے کی خواہش بیدار کرنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے اور سائنس کی ایسی ترقی سے جو امن کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرے نئی نسل کو محتاط رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ "ستاروں کی سیر" کے دوران اس مکروہ دنیا سے دوری پر رہ کر بھی بچوں کو ایک ایسے ناول سے روشناس کرایا گیا ہے۔ جہاں ظلم، جبر، خود غرضی، عناد پرستی، دروغ گوئی جیسے مکروہات میں الجھے ہوئے لوگ امن و سکون کے متلاشی نظر آتے ہیں طنز کی لطیف کاٹ کرشن چندر کی شعریت آمیز نثر میں تحلیل ہو کر ایک ایسے دل پذیر اور پُر تاثیر اسلوب کو جنم دیتی ہے جو ننھے قاریوں کے دل و دماغ کو فی الفور اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ کرشن چندر کا تخیل انتہائی بلند اور نگاہ بے حد عمیق ہے۔ تخیل کی مدد سے وہ بیحد پُر اسرار، دل نشین اور خواب ناک فضا تخلیق کرتے ہیں اور ان کی باریک بینی اس جہانِ نو میں مفید مطلب گوشوں کو بآسانی تلاش کر لیتی ہے۔ ناول کے ہر باب میں خیر و شر کی کشمکش اور بدی پر نیکی کی فتح اتنے دل آویز طریقے سے دکھائی گئی ہے کہ نوخیز ذہن اس سے صحت مند تاثیر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زبان کا جادو، پڑھنے والے کو از اول تا آخر اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ خوبصورت نرالے اور نو بہ نو مناظر مختلف النوع کردار، عجیب و غریب پرندے، انوکھی مخلوق اور سائنسی انکشافات کے تانے بانے سے تخلیق کردہ یہ شاہکار داستان اُردو ادبِ اطفال میں کرشن چندر کو اہم ترین ناول نگار کا درجہ دلانے میں کامیاب ہے۔

ستاروں کے قیدی (ظفر پیامی)

"ستاروں کے قیدی" ظفر پیامی کا ویسا ہی سائنسی ناول ہے جیسا کہ کرشن چندر

کا "ستاروں کی سیر" بلکہ اسے نقشِ ثانی کی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ کرشن چندر نے اپنے ناول میں تخیلات کی طلسمی دنیا تخلیق کی اور سیاروں میں بھی جادوگروں اور مافوق الفطرت پرندوں سے دنیاوی کرداروں کی مڈبھیڑ دکھائی ہے۔ اس کے برعکس ظفر پیامی کا زیرِ بحث ناول حقیقت سے نسبتاً قریب تر ہے اور اس میں جدید ترین سائنسی انکشافات سے مطابقت اور موافقت برقرار رکھنے کی شعوری کوشش کارفرما نظر آتی ہے۔

اس ناول میں دو کم عمر بچے عطیہ اور جاوید ایک سائنس داں کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں جو مریخ اور دوسرے سیاروں کی دنیاؤں پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ وہاں جاکر مریخ کے باشندوں کی مدد سے پورے کرۂ ارض پر قابض ہونے کا منصوبہ رکھتا ہے۔ یہ سائنس داں ۱۵۰ سال سے ہمالیہ کی پہاڑیوں میں چھپ کر سائنسی تجربات کر رہا تھا۔ اس نے ایسی جڑی بوٹیاں بھی تلاش کرلی تھیں جن کے استعمال سے تین سو برس سے زیادہ مدت تک زندہ رہ سکتا تھا اور ایک ایسا انجکشن تیار کیا تھا جس کے لگانے سے عمر میں کم سے کم سو سال کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس سائنس داں نے خفیہ طور پر ایک راکٹ بھی تیار کیا تھا۔ سائنسداں کی تجربہ گاہ اور راکٹ سے کوئی واقف نہیں تھا۔ وہ پہاڑوں سے راہ گیروں کو اغوا کرکے ان سے اپنی لیبوریٹری میں کام لیتا تھا۔ وہ اپنے تیار کردہ کراماتی انجکشن کا استعمال ان لوگوں پر کرتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ مدت تک ان سے کام لے سکے۔

عطیہ اور جاوید بھی اس سائنسداں کے قیدی بن جاتے ہیں۔ ایک نرس جو سائنسداں کی قیدی ہے، بچوں کی ہمدرد اور مونس ہوجاتی ہے۔ بچے اس نرس کی مدد سے سائنسداں کے بہت سے راز معلوم کرلیتے ہیں۔ اگرچہ بچوں کے بھی انجکشن لگائے گئے ہیں مگر ان کے جذبات، احساسات، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور جسم کا کوئی عضو خراب نہیں ہوتا لیکن ان بچوں کا فرار ممکن نہ تھا کیونکہ سائنسداں نے جسم میں کچھ ایسی پُراسرار ریڈیائی لہریں پیدا کرلی تھیں کہ اس کا قیدی ایک میل کے فاصلے سے اس کے پیچھے چلا آتا تھا۔

بچے ایک دن نرس کی مدد سے راکٹ تک پہنچ جاتے ہیں اور اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے راکٹ اسٹارٹ کر دیتے ہیں۔ راکٹ خلا میں پہنچ جاتا ہے۔ پہلے یہ بچے

موتی سیارے پر پہنچتے ہیں۔ اس سیارے پر باشندے رہتے ہیں جن کی مریخ کے باشندوں سے عداوت چلی آرہی ہے۔ موتی سیارے پر بچے مختلف عجائبات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مثلاً وہاں کے لوگ مچھلیوں کو گائے، بھینسوں کی طرح دودھ حاصل کرنے کے لیے پال لیتے ہیں۔ یہ مچھلیاں بھی عجیب و غریب ہیں جو نصف دھڑ سے مچھلیاں ہیں اور نصف دھڑ سے چوپائے، یہ باشندے سمندر ہی سے ہر طرح کے پھل اور سبزیاں حاصل کرتے ہیں۔ اس سیارے کی مخلوق بھوک محسوس نہیں کرتی پھر بھی باشندے جتنا چاہے کھا سکتے ہیں۔

عطیہ اور جاوید اپنی ذہانت اور بلند ہمتی سے کام لے کر سیارے سے فرار ہو جاتے ہیں اور وہاں کے سردار کو بھی اپنے ساتھ قید کر لاتے ہیں۔ اب ان کا راکٹ مریخ سیارے پر پہنچتا ہے۔ جہاں دیو ہیکل مشینی مخلوق بستی ہے۔ مریخ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں جگہ اور اشخاص کے نام نہیں ہوتے بلکہ نمبر ہوتے ہیں یہ سیارے دوسری دنیاؤں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ یہاں موٹروں کی جگہ ہیلی کوپٹر کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔

مریخ میں کھانے کی جگہ "گولیاں" استعمال ہوتی ہیں۔ کرۂ ارض کے کھانے کا تصور ان کے نزدیک سو سال پرانا ہے۔ مختلف عجائبات کی سیر کرتے ہوئے ان بچوں کے سو سال گذر جاتے ہیں اور ان کا راکٹ مریخ والوں کی معاونت سے اپنی دنیا میں واپس آجاتا ہے۔

سو سال بعد بچوں کو یہاں کی دنیا بالکل بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس اثنا میں دنیا کی آبادی بیس گنا بڑھ چکی ہے اور جدید سائنسی ترقیات میں یہ دنیا انھیں مریخ اور موتی سیاروں سے بھی کہیں آگے محسوس ہوتی ہے۔ ہوائی جہاز، ہیلی کوپٹر، موٹریں، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، ایٹمی ری ایکٹر، آبدوز کشتیاں وغیرہ ان گنت سائنسی ایجادات سے بنی نوع انسان مستفید ہو رہی ہے۔ اب بچوں کو اسکول کا سبق رٹنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ ان کے لیے "یاد مشین" ایجاد ہو چکی ہے۔ جس کو بچے کان سے لگا لیتے ہیں اور ٹیلی ویژن کے پڑھایا گیا سبق چند منٹوں میں ان کو یاد ہو جاتا ہے۔

عطیہ اور جاوید کے صلاح مشورہ سے زمین کے سائنسداں مریخ پر جا پہنچتے ہیں اور اس کے آس پاس کے سیاروں پر بھی انسان قابض ہونے کی تیاریاں کرنے لگتا ہے۔

ناول "ستاروں کے قیدی" کا پلاٹ نہایت عمدگی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس پلاٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ظفر پیامی نے مافوق الفطرت واقعات بھی اس انداز میں پیش کیے ہیں کہ وہ مافوق الفطرت نہ رہ کر سائنسی کرشمے معلوم ہوتے ہیں اور جدید سائنسی ایجادات اور انکشافات کو نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

بچوں کی گرفتاری کا واقعہ بڑے فطری انداز میں بیان کیا ہے۔ عطیہ اور جاوید باغ میں کھیل رہے تھے۔ سائنسداں کے خوبصورت مقناطیسی خرگوش کا پیچھا کرتے ہوئے وہ مگرمچھ جیسے غار میں گھس جاتے ہیں اور سائنس داں کے قیدی بن جاتے ہیں

اس طرح ناول نے آغاز داستان سے ہی قاری کی دلچسپی اور اس کے ذہن کو اپنی جانب مرکوز کر لیا ہے۔ اس ناول کا سائنس داں کرشن چندر کے سائنسداں کی طرح روبوٹ یا مشینی انسان سے کام نہیں لیتا بلکہ ایسا انجکشن ایجاد کیا ہے جس سے انسان کی عمر سو سال بڑھ جاتی ہے اور وہ سائنسداں کا کام انجام دیتا ہے۔

سائنس داں کی قیدی نرس بچوں کی مونس و ہمدرد ہے وہ ان کو سائنسداں کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرتی ہے نیز اس راکٹ کے بارے میں سب کچھ بتاتی ہے۔ سائنسداں بھی ان بچوں کو اپنے حصول مقصد کے لیے تربیت دیتا ہے۔ ظفر پیامی کو بچوں کی نفسیات پر بھی عبور حاصل ہے اور وہ بچوں کے شوق اور ان کی دلچسپیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ مہربان نرس بچوں کا دل بہلانے کے لیے کہتی ہے۔

> "ہم یہاں تمھیں طرح طرح کے کھلونے دیں گے۔ ہمارے پاس ایک بولنے والی گڑیا بھی ہے اور بیٹے تمھارے لیے ہمارے پاس ایک دوربین بھی ہے۔ جس سے آدمی چاند ستاروں کی دنیا دیکھ سکتا ہے۔ کہو تم رہو گے ہمارے پاس۔ بس دو ہی تین دن۔ پھر تمھیں ہم تمھاری امی کے پاس بھیج دیں گے۔"[1]

---

[1] ظفر پیامی "ستاروں کے قیدی" کھلونا بکڈپو۔ نئی دہلی ۱۹۶۴ء ص ۱۳

اس طرح مہربان نرس بچّوں کی دل جوئی کرتی رہتی ہے۔ ایک دن نیچے سائنسداں کا راکٹ لے اڑتے ہیں۔ چونکہ بچّوں کی ذہنی استعداد محدود ہے اس لیے سائنسداں ریڈیائی لہروں اور دوسرے راکٹ کے ذریعے ان مفرور بچّوں کو دوبارہ قید کرنے کے لیے سعی کرتا ہے، نرس اسے اس حرکت سے باز رکھنا چاہتی ہے۔ سائنسداں نرس کو ختم کرنے کے لیے اور اپنی اسکیم میں ناکامی کے باعث جھلاہٹ میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کی نفسیاتی کیفیت کا یہ مرقع دیکھیے :۔

"بٹن دباتے ہی آگ کے شعلے بلند ہونا شروع ہوئے جنھوں نے ہر ایک چیز کو اس طرح نگلنا شروع کر دیا جیسے بڑے بڑے دیو چھوٹے چھوٹے انسانوں کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ سائنسداں غصّے سے پاگل ہوا جا رہا تھا اور اسی غصّے میں آکر نرس کو آگ میں پھینک دیا۔ لیکن نرس قہقہے لگاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اس لیے کہ سائنسداں ہی کے کمال کی وجہ سے آگ اس پر اثر نہیں کر سکتی تھی۔

جلتے ہوئے شعلوں میں ریڈیو کی لہروں کو کنٹرول کرنے والا ہینڈل گھمانے کے لیے سائنسداں نرس کو پیروں میں روندتے ہوئے ہینڈل کی طرف بڑھا لیکن ڈائل پر سوئی کا رُخ دیکھ کر اس نے اپنا سر پیٹ لیا اور بڑھتے ہوئے شعلوں میں بے ہوش ہو کر گر پڑا ۔

اب لیبارٹری سے راکٹ کی رفتار یا راستے کو کنٹرول نہیں کیا جا سکتا۔"[1]

پہلے یہ راکٹ موتی ستارے پر پہنچتا ہے جہاں بالشتیے رہتے تھے۔ ان کی اور مریخ ستارے کے باشندوں کی آپس میں دشمنی تھی۔ چنانچہ بالشتیے نووارد خلا بازوں کو بھی مریخ کا باشندہ ہی سمجھتے ہیں۔ اس غلط فہمی کے تحت بالشتیوں نے بچّوں کے راکٹ پر حملہ کر دیا لیکن سائنسداں نے مدافعت کا سارا بندوبست پہلے ہی کر رکھا تھا۔

ظفر پیامی کو جذبات نگاری کا ہنر بھی خوب آتا ہے۔ خوشی، رنج، غصّہ، خوف،

---

[1] ظفر پیامی۔ ستاروں کے قیدی۔ کھلونا بکڈپو۔ نئی دہلی ۱۹۶۳ء ص ۲۵-۲۶

دہشت وغیرہ تقریباً تمام جذبات مختلف کرداروں کے وسیلے سے اس فطری انداز میں اجاگر کیے گئے ہیں کہ کردار ہمارے آس پاس کے جیتے جاگتے مانوس انسان معلوم ہوتے ہیں اور اس میں اجنبیت اور غیریت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ایک دہشت ناک منظر دیکھیے۔ یہ سائنسداں کا حلیہ ہے:۔

"جاوید نے لیٹے ہی لیٹے دیکھا کہ ایسا کہتے ہوئے جب اسی نے اپنا منہ کھولا تھا تو اس کے دانت عجیب قسم کے نوکیلے تھے جیسے کُتّے یا بھیڑئے کے دانت ہوں۔ اور اس کی آنکھوں میں بڑے بڑے گڑھے تھے جن میں صرف دیکھنے کی پُتلیاں ہی تیر رہی تھیں اور ابرو یا بھویں بالکل نہیں تھیں۔ عطیہ اب تک سہمی پڑی تھی پھر اس نے عطیہ کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے لیے چغے کے اندر سے ہاتھ نکالا۔ جسے دیکھ کر دونوں نے سہم کر ایک چیخ ماری کیوں کہ اس کا ہاتھ اتنا لمبا تھا کہ کھڑے کھڑے وہ اس کے پیروں تک پہنچا تھا اور گوشت پوست کے بجائے وہ محض ایک لمبی سی سیاہ ہڈّی معلوم ہو رہا تھا۔" [1]

حیرت کے جذبات کو اُبھارنے میں بھی ظفر پیامی کو ملکہ حاصل ہے۔ مریخی انسان کی اس حیرت کدائی سے نوعمر قارئین کتنے متعجب ہوں گے اس کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

"اب تک تو وہ یہ سوچ رہے تھے کہ ان لوگوں کی ٹانگیں نہیں ہیں لیکن جوں ہی وہ مریخی آدمی راکٹ سے باہر نکلا۔ اس نے اُچک کر اپنی ٹانگیں اپنے دھڑ سے باہر نکال لیں اور وہ سب سرکس کے کھلاڑیوں کی طرح لمبی لمبی لیکن پتلی پتلی لکڑیوں جیسی ٹانگوں پر چلتے ہوئے جا رہے تھے۔ اتنے میں ان میں سے کسی کی نگاہ عطیہ اور جاوید پر جا پڑی اور اس نے اپنا بازو پکڑ کر انھیں بھی پھول کی طرح اٹھا لیا اور پھر اپنا

---

[1] ظفر پیامی "ستاروں کے قیدی" کھلونا بکڈپو۔ نئی دہلی ۱۹۶۹ء ص ۱۵

دوسرا بازو نکال کر جو بغیر ہڈیوں کے بنا ہوا تھا۔ ان کے گرد لپیٹ لیا اور ٹانگیں نکال کر گھسٹ گھسٹ چلنا شروع کردیا۔"[1]

ناول میں کردار نگاری کی شان بھی نظر آتی ہے۔ نرس کی پُر شفقت شخصیت سائنسداں کا ہولناک کردار، عطیہ اور جاوید کی ذہانت اور جرأت مندی سے مُرتّب معصوم کردار مریخی مخلوق میں سے نمبر ۱۱۳ کا وفاداری کے جذبے سے سرشار کردار اپنی انفرادیت کا احساس دلاتے ہیں۔ یہ کردار محض مصنّف کے بیان کردہ اوصاف سے آراستہ ساکت وجامد کردار نہیں ہیں بلکہ اپنے طور طریقے عادات واطوار بول چال اور اعمال سے بھی اپنی زندگی اور اصلیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں نیز ہر کردار کی امتیازی خصوصیات واوصاف کو مختلف مقامات پر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ بالکل ان کے حسب حال ہے۔ مثلاً جاوید کے کردار کو لیجئے، جس کی حیثیت ناول میں مرکزیت کی حامل ہے۔ ایک آدھ مقام پر چند فقروں کے علاوہ مصنف نے اس کی جملہ صفات اپنے طور پر کہیں بیان نہیں کیں لیکن ناول میں بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے واقعات اور مکالموں سے بخوبی صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ جاوید ایک نیک لڑکا ہے جس کی عمر تقریباً نو دس سال ہے۔ جاوید کو جانوروں سے محبت کرتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے۔ اور انسانوں سے ہمدردی کا جذبہ بھی اس کے دل میں موجود ہے۔ نوعمری کے باوصف کئی مواقع پر وہ خاص دلیری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور صداقت شعاری، خدا ترسی، عالی ہمتی کے جوہر اس کی ذات میں موجود ہیں۔ لیکن ان تمام اوصاف حمیدہ سے متصف ہونے کے باوجود اس میں بچوں کی سی شوخی، تیزی، طراری اور بے ضرر شرارتوں کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس طرح یہ کردار بہت جیتا جاگتا اور مانوس سا محسوس ہوتا ہے اور پڑھنے والے ناول کے چند صفحات کے مطالعہ کے بعد ہی اس کردار سے اس حد تک واقف ہوجاتے ہیں کہ اگلے صفحات پر پیش کیے جانے والے مکالمات سے اگر نام بھی ہٹادیئے جائیں تو جاوید کے ادا کردہ مکالمات صاف پہچانے جاسکتے ہیں۔ یہی صورت عطیہ کے کردار کی ہے جس کی فطرت میں بھول پن، معصومیت اور اپنے بھائی نیز ماں سے بے پناہ محبت کا جذبہ نظر آتا ہے۔ اس

---

[1] ظفر پیامی: ستاروں کے قیدی، کھلونا بکڈپو، نئی دہلی ۱۹۶۶ء ص ۹۱۔۹۲

طرح ظفر پیامی کی کردار نگاری کا ہیں جہارت کے شواہد ناول میں کثرت سے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

ناول "ستاروں کے قیدی" کی نمایاں خوبی اس کی زبان ہے۔ مصنف نے ناول میں بچوں کی نفسیات اور ان کی ذہنی استعداد کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو بھی جملے ان بچوں نے ادا کیے ہیں وہ فطری ہیں اور بچوں کی ذہنیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ نہ تو زبان کو رنگین بنانے کی بے جا کوشش کی گئی ہے اور نہ ایسے مشکل الفاظ استعمال کیے گئے ہیں کہ بچوں کے ذہن پر بار گزریں۔ اس کے باوجود ناول میں چھوٹے چھوٹے مکالمے اور سادے جملوں سے کام لیا گیا ہے۔ جو بچوں کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں۔

جاوید ابھی کچھ بولنے ہی والا تھا کہ سپاہیوں کے سردار نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"مشین"۔

تمھارا نام کیا ہے؟ جاوید نے پوچھا۔

"تمھیں نام سے مطلب" سپاہیوں کے سردار نے جواب دیا۔

"پھر بھی۔ جاوید بولا۔

"نمبر ۱۷/۹۰۰ ۱۵" سردار نے جواب دیا۔

"میں تمھارا نام معلوم کر رہا ہوں، گھر کا نمبر نہیں"[1]

ایسی مثالیں "ستاروں کے قیدی" میں بکثرت ملتی ہیں۔ ظفر پیامی کے اسلوب میں بھرپور ڈرامائیت اور تحیر و استعجاب کو ابھارنے کی خصوصیت قابل ذکر ہے۔

مندرجہ بالا خوبیوں کی بنا پر ناول "ستاروں کے قیدی" کو بھی بچوں کے سائنس فکشن میں قابل قدر اضافہ سمجھنا چاہیے۔

جن حسن عبدالرحمٰن (قرۃ العین حیدر)

ناول "جن حسن عبدالرحمٰن" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (نئی دہلی) نے دو حصوں میں شائع کیا ہے۔

---

[1] ظفر پیامی "ستاروں کے قیدی" کھلونا بک ڈپو نئی دہلی ۱۹۷۳ء ص ۲۲

جس کی اصل مصنفہ روس کی ایل لاگن ہیں۔ دونوں جلدوں پر اردو ترجمہ کرنے والے کا نام شائع نہیں کیا گیا ہے نہ ہی یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ کتاب براہِ راست روسی زبان سے اردو میں منتقل کی گئی ہے یا انگریزی کے وسیلے سے ترجمہ ہوئی ہے۔ لیکن مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی فہرست مطبوعات اور اس ادارے سے شائع ہونے والے ماہنامہ پیام تعلیم (نئی دہلی) میں متعلقہ کتاب کے اشتہارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ترجمہ قرۃ العین حیدر نے کیا ہے۔

ناول جن حسن عبدالرحمن ایک نہایت دلچسپ سائنسی ناول ہے۔ اس ناول میں نہ بچوں کو سیاروں کی فرضی سیر کرائی گئی ہے نہ محض مافوق الفطرت نیز طلسمی نوعیت کے واقعات اور کردار پیش کیے گئے ہیں بلکہ اس ناول کے ذریعے بچوں میں حیرت و استعجاب کا جذبہ ابھارنے کی کوشش سائنٹفک انداز میں کی گئی ہے۔ اور انہیں جدید عہد کی سائنسی ترقیات نیز اس کی برکتوں سے بخوبی آشنا کرایا گیا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ بچے اب پریوں دیوؤں اور جنوں کی کہانیوں میں کم دلچسپی لیتے ہیں۔ انہیں علی بابا چالیس چور اور الہ دین کے چراغ کی کہانیاں پرانی اور دور از کار محسوس ہوتی ہیں۔ اب تو جن حطابچ جیسے کرداروں سے منسوب واقعات بچوں میں زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ جو دراصل قدیم داستانوں اور مافوق الفطرت کرداروں کی پیروڈی ہے۔ ناول کا یہ جن ہمارے دور کی ترقیاں اور سائنس کی روز افزوں ایجادات دیکھ کر ہکا بکا رہ جاتا ہے۔

"جن حسن عبدالرحمن" ایک ہونہار روسی طالب علم کی داستان ہے۔ اس کا نام وولکا کوسٹل ہے۔ وولکا اتفاقاً ایک بوڑھے جن حطابچ کی نجات کا سبب بنتا ہے۔ جن کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی حرکت سے ناراض ہو کر ہزاروں سال پہلے ایک صراحی میں قید کر دیا تھا۔

جن صراحی کی قید سے آزاد ہو کر وولکا کا غلام بن جاتا ہے اور اپنے آقا وولکا کے سامنے اپنی عظیم صلاحیتوں اور طلسماتی قوتوں کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے نیز وولکا کی ہر خواہش پوری کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ذہین اور تیز طرار وولکا جدید سائنسی دور کے ایک ترقی یافتہ اشتراکی ملک کا بچہ ہے اور اسے یہ غیر فطری اور غیر ضروری مراعات قبول کرنا پسند نہیں۔

جن حطابچ، وولکا کی تعلیم میں ہر طرح سے مدد کرنا چاہتا ہے اور اس کی خاطر امتحانات کے پرچے بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن حطابچ کی سائنس، جغرافیہ، حساب اور دیگر مضامین کی معلومات، جدید سائنٹیفک نصاب کے مقابلے میں بہت پرانی اور تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس طرح جن معاون اور مددگار ہونے کے بجائے، وولکا کے لیے دردِ سر بن جاتا ہے اور استانیاں جن خطابچ کی حرکتوں کے باعث وولکا سے ناراض ہو جاتی ہیں۔

سینما، سرکس اور پکنک کے موقعہ وغیرہ پر جن خود بہت سی چیزیں دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے، وولکا کے اداس ہونے پر، حطابچ اپنی طلسمی قوتوں کا مظاہرہ کرتا ہے، لیکن وولکا کی معصوم اور حقیقت پر مبنی باتوں سے خود متاثر ہو جاتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے بوڑھے حطابچ کے ساتھ اس کے دوسرے بھائی عمر ابن آصف کو بھی تانبے کی صراحی میں قید کر کے سمندر میں پھینک دیا تھا۔ حطابچ اپنے بھائی کو تلاش کرتا ہے اور بالآخر ناول کے دوسرے حصے میں اسے بھی صراحی کی قید سے آزاد کر لیتا ہے۔

وولکا، حطابچ کو اپنے کردار، ذہانت اور معلومات سے مسلسل متاثر کرتا ہے، انہیں اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ طلسمی قوتوں کی جگہ حقیقی علم زیادہ باا ثر اور کارآمد ہے۔ چنانچہ دونوں اسکول میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور تعلیم مکمل کر کے ریڈیو انجینیئر بن جاتے ہیں۔

ناول "جن حسن عبد الرحمن" کا پلاٹ بہت عمدگی سے تشکیل دیا گیا ہے اور واقعات کے تانے بانے سے ایک ایسی پُر لطف نیم فنطاسی داستان تخلیق کی گئی ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بچوں کے عام سائنسی ناولوں کے مقابلے میں بالکل منفرد ہے۔

جن حطابچ کا تعارف کراتے ہوئے مصنف نے ننھے قارئین کی دلچسپی کو شروع سے ہی اپنی جانب متوجہ کر لیا ہے۔ یہ ناول دو حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول میں ناول کا ہیرو تیرہ[۱۳] برس کا لڑکا وولکا جن حطابچ کو صراحی کی قید سے نجات دلانے کا سبب بنتا ہے اور حطابچ اس کا غلام بن جاتا ہے۔ وہ حتی الامکان وولکا کی ہر خوشی اور ہر ضرورت پوری کرنا چاہتا ہے لیکن وولکا

کو فائدہ پہنچانے کی اس کی ہر کوشش ناکام ہوتی ہے کیونکہ ایک ترقی یافتہ ملک کے ذہین بچے کی نگاہ میں ایسا ہر طلسمی شعبدہ بے حقیقت ہے۔ ناول کے حصہ دوم میں حطابچ اپنے بھائی عمر ابن آصف کو رہائی دلاتا ہے اور عہد جدید کی سائنسی ترقیوں اور برکتوں سے مستفیذ ہونے کے لیے روس میں ہی مستقل قیام کرنا پسند کرتا ہے۔

ناول کے واقعات کی پیش کش میں فنکارانہ چابکدستی سے کام لیا ہے۔ وولکا ندی میں رہا ہے اس کا ہاتھ کسی سخت چیز پر پڑتا ہے۔

"اس چیز کو اٹھا کر وہ ساحل کے قریب سطح پر نکلا اور اس نے دیکھا کہ ایک عجیب چکنا، کائی آلود، مٹی کا برتن اس کے ہاتھ میں ہے۔ پرانے زمانے کی یونانی صراحی سے ملتی جلتی اس کی شکل تھی۔ اس کے منہ پر ہرے رنگ کے مسالے کی ڈاٹ لگی تھی اور اس پر مہر کی سی چھاپ پڑی تھی۔"[1]

وولکا اس صراحی کو خوشی اور گھبراہٹ میں گھر لے جاتا ہے اور چاقو سے صراحی کی مہر کھرچ ڈالتا ہے۔

"یکایک کمرہ سیاہ دھوئیں سے بھر گیا، اتنا دھواں کہ دم گھٹنے لگا اور ایک بے آواز دھماکہ زور سے وولکا چھت سے جا لگا۔ فانوس کے کنڈے میں اس کی پتلون اٹک گئی اور وہ چھت سے الٹا لٹک گیا۔"[2]

اس طرح ابتدا سے ہی حیرت و استعجاب اور طلسمات کی آمیزش نیز مصنفہ کی رنگین بیانی نے ناول کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔

حطابچ وولکا کا غلام ہو کر اس کی ہر طرح مدد کرنا چاہتا ہے لیکن وولکا ایک دیانتدار با اصول روسی بچہ ہے جو بہت ذہین ہے۔ سائنسی معلومات اور تعلیم و تربیت نے اسے توہمات اور محیر العقول باتوں سے گریز کرنا سکھایا ہے۔ وولکا کا جغرافیہ کا امتحان ہے۔

---

[1] قرۃ العین حیدر: حسن عبد الرحمن، (حصہ اول)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۶۲ء ص ۱۰

[2] قرۃ العین حیدر: حسن عبد الرحمن (حصہ اول)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۶۲ء ص ۱۳

حطابچ وولکا سے کہتا ہے۔

"میں تم کو سارے جواب لکھواتا جاؤں گا، کوئی مجھے دیکھ نہ سکے گا اور تم اپنے کو خوبصورت شہر کے سب سے زیادہ مشہور طالب علم بن جاؤ گے۔ اگر تمہارے کسی استاد نے تم کو سب سے زیادہ نمبر نہ دیئے تو اسے پانی کی مشکیں اٹھانے والے خچر میں تبدیل کر دوں گا۔ گلی کا کتا اور انتہائی بدصورت مینڈک بنا دوں گا۔" [1]

لیکن وولکا پر جن کی ان باتوں کا اثر نہیں ہوتا۔ اسے اپنی ذہانت پر پکا اعتماد ہے۔ وہ جن حطابچ کو جواب دیتا ہے۔

"جواب لکھنے میں میری مدد کی ضرورت نہیں ہم نوجوان پانیر اس چیز کے سخت خلاف ہیں کہ کسی دوسرے سے چوری چوری کام کرائیں یہ ہمارا اصول نہیں ہے" [2]

اس طرح پورے ناول میں جگہ جگہ وولکا، بوڑھے جن حطابچ کو مافوق الفطرت حرکتوں سے باز رکھتا ہے۔

سینما، سرکس، ہوٹل، بازار اور مختلف پبلک مقامات پر وولکا حطابچ کو ساتھ لے جاتا ہے جہاں بہت سے دلچسپ واقعات رونما ہوتے ہیں۔ یہ سائنسی کرشمات حطابچ کو متعجب کرتے رہتے ہیں۔ حطابچ ریل کے انجن اور موٹروں سے خائف ہے اور انہیں وہ عجیب چیز سمجھتا ہے۔

ناول کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مصنف کو بچوں کی نفسیات پر بھی قدرت حاصل ہے۔ وولکا میں بھی اپنی عمر کے بچوں کی طرح حسد اور رشک کا مادہ ہے۔ وہ گوگا سے رشک کرتا ہے کیونکہ گوگا کو امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل ہوئی ہے اور اس کی

---

[1] قرۃ العین حیدر: جن حسن عبدالرحمٰن (حصہ اول) مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۲ء ص ۱۹، ۲۰

[2] قرۃ العین حیدر: جن حسن عبدالرحمٰن (حصہ اول) مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۲ء ص ۲۰

ماں بطور انعام اسے ایک ایشیشن پکتا دینے والی ہے جبکہ دو لکا کا جغرافیہ کا پرچہ حطانچ کی وجہ سے خراب ہو چکا ہے۔

حطانچ دو لکا کا فرماں بردار، غم گسار ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ اس کا مالک کسی بھی اعتبار سے دوسرے بچوں سے کم تر ہو۔ وہ نہ صرف دو لکا کے لیے کتاب بن جاتا ہے بلکہ گوگا نے جب جغرافیہ کے پرچے کے بارے میں اپنی ماں کو بتانے کی کوشش کی تو گوگا کے منہ سے نکلا۔

"جب دو لکا نے بھوں ۔ بھوں ۔ بھوں تو استانی جی نے بھوں ۔ بھوں ۔"

گوگا کو حیرت و ڈر کے مارے سکتہ ہو گیا۔ دو منٹ بعد اس نے پھر بات شروع کرنی چاہی مگر وہی بھو کنا بھونکنے لگا۔

"امی ۔ امی جان ۔ اس نے فریاد کی۔

کیا ہوا میرے بچے ۔ خیر تو ہے ۔!

"میں کہہ رہا تھا کہ بھوں ۔ بھوں ۔ امی یہ کیا ہو گیا؟"

گوگا ڈر کے مارے سفید پڑ گیا۔" [1]

ناول میں جگہ جگہ حیرت ناک مناظر پائے جاتے ہیں مثلاً:

" یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ بڑے میاں پلک جھپکتے ہی ہوا میں غائب ہو گئے۔ تھر تھر کانپتے ہوئے بے چارہ دربان نے وہ پیالی جو بڑے میاں کے لیے بنائی تھی۔ غٹ غٹ چڑھا لی، پھر دوسری بنائی، پھر تیسری، یہاں تک کہ چائے دانی خالی ہو گئی، پھر اپنی کرسی پر گر کر اخبار سے پنکھا جھلنے میں مصروف ہو گیا۔" [2]

یہ فطری انداز بیان اور ڈرامائی کیفیت مصنفہ کی ناول کے فن پر مہارت کا ثبوت

۱۔ قرۃ العین حیدر، جن حسن عبدالرحمٰن (حصہ اوّل) مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۹۳ء ص ۸۱

۲۔ قرۃ العین حیدر، جن حسن عبدالرحمٰن، حصہ اول، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۹۳ء ص ۲۲

ہے ناول میں جن حطایچ کے اس طرح کے طلسماتی کرشمے بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً دولہا کے پاس گھڑی نہیں ہے۔ جن چٹکی بجاتے ہی گھڑی اس کے لیے مہیا کر دیتا ہے۔ اسے جادو سے قالین پر بٹھا کر خلا کی سیر کراتا ہے، اس کے لیے کتاب بن جاتا ہے۔ لیکن سینما دیکھ کر جن خود متحیر ہو جاتا ہے فلم کا ہیرو اور ہیروئن بھی سینما ہال میں موجود ہیں۔ ان دونوں کو پردے پر دیکھتا ہے تو بیساختہ کہتا ہے۔

"یہ بات ٹھیک نہیں۔ مجھے انسان کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا پسند نہیں
یہ تو میں بھی نہیں کر سکتا کہ اس کرسی پر بیٹھا رہوں۔ اور سر پٹ گھوڑے
پر بھی اڑ جاؤں۔ حضرت سلیمان بھی یہ نہیں کر سکتے تھے۔"[۱]

اس طرح مصنفہ نے جن سے یہ اعتراف کرایا ہے کہ انسان اپنی فہم و فراست کی وجہ سے جنات، دیو اور پریوں سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ جن حطایچ اپنے بھائی عمر ابن آصف کی جستجو میں ہے۔ جسے حضرت سلیمان نے حطایچ کی مانند صراحی میں بند کر کے سمندر میں پھکوا دیا تھا۔ ایک بار حطایچ کو سمندر میں صراحی نما لوہے کا گولہ ملتا ہے اور وہ اسے سمندر سے نکال لاتا ہے۔

ڈرامائیت اور بیساختگی نیز متضاد جذبات کی بیک وقت پیشکش نے اس واقعہ کو جتنا فطری اور جاندار بنا دیا ہے اہلِ نظر اس کی داد دیں گے۔

اس ناول میں جہاں فطری منظر ملتے ہیں ان کے حسن اور دلکشی کا قاری کو بھرپور احساس ہوتا ہے۔ ناول میں کردار نگاری کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔ ناول کا ہیرو دولہا ایک ذہین طالب علم ہے، وہ توہم پرستی سے پاک ہے۔ سعادت مندی، حب الوطنی، انسان دوستی، فرمانبرداری، روشن خیالی، بلند ہمتی، صدق شعاری، اس کردار کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ اس کی راست گوئی کا عالم یہ ہے کہ جغرافیہ کا پرچہ خراب ہونے پر وہ اپنی دادی سے پوری حقیقت بیان کر دیتا ہے۔

۱؎ قرۃ العین حیدر، جن حسن عبدالرحمٰن (حصہ اول)، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۲ء، ص ۵۵

وولکا کو مختلف مضامین خصوصاً سائنس پر عبور حاصل ہے اور وہ ان معلومات کے ذریعے حطابچ کو متاثر کرتا ہے۔ وولکا بہت ایماندار اور وطن پرست لڑکا ہے اور اپنے ملک کی کسی بھی چیز کو نقصان پہنچانا اس کے نزدیک ناقابل معافی جرم ہے۔ ایک بار حطابچ ناراض ہوکر ریستوران کا سارا فرنیچر توڑ دینا چاہتا ہے۔

بوڑھے جن حطابچ کی عمر تین ہزار سات سو تیس سال ہے۔ اسے اپنی بزرگی کا بھی احساس ہے اور اس لڑکے کا غلام ہونے کا بھی، وہ اپنی صلاحیتوں پر نازاں ہے۔ اور وولکا ان پر یقین نہیں کرتا تو اسے غصہ آجاتا ہے لیکن احسان مندی کا جذبہ اسے معتدل کر دیتا ہے۔

جن وولکا کا انتہائی وفادار فرمانبردار اور اس کے لیے جان پر بازی لگانے پر تیار رہنے والا غلام ہے۔ مالک کی ناراضی اسے کسی طرح گوارا نہیں۔ اسی طرح ناول میں زنیا، دادی ماں، گوگا اور دارا استانی اور دارا اسٹینیا کے ضمنی کردار بھی انفرادی خوبیوں کے مالک ہیں۔

جن حسن عبدالرحمن، ایل لاگن کے ناول کا اردو ترجمہ ہے لیکن منفرد طرز نگارش اور رواں دواں زبان کی دلکشی کے سبب اس کو کسی بھی عمدہ اور طبع زاد ناول سے کم درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ اسلوب بیان کی ندرت اور زبان کی لطافت نے ناول کو بچوں کے لیے بیحد دلچسپ بنا دیا ہے۔

جگہ جگہ مصنفہ نے بچوں کی آپسی نوک جھونک سے ڈرامائی ماحول پیدا کر دیا ہے۔ دادی اماں اور وولکا کے درمیان ایک مکالمہ دیکھئے:۔

"میں آپ کو ابھی یہ بتا دینا چاہتا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ دوبارہ امتحان دینے کے بعد ساری بات بتاؤں گا لیکن مجھے اتنی شرم آرہی ہے": شرم کی کیا بات ہے؟ انسان کا ضمیر بہت بڑی چیز ہے۔ اپنے ضمیر کے خلاف کبھی کوئی کام نہ کرنا۔ اچھا اب سو جاؤ ۔ میاں نجومی: آپ فی الحال یہ کتاب واپس لے جائیے۔" وولکا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بکو مت ۔ میں اسے

رکھوں گا کہاں۔؟ یہ فرض کرلو کہ اسے میں نے تمھیں امانت کے طور پر دیا
ہے۔ اچھا اب پڑ کر سو جاؤ۔"[1]

ناول کے کردار اور زمان و مکان کا تعلق سرزمین روس سے ہے اور اس میں مقصدیت کو ہر جگہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس ناول کے ذریعے بچوں میں حب الوطنی، فرض شناسی، بڑوں کا احترام اور فرمانبرداری وغیرہ کی تلقین کی گئی ہے نیز اشتراکی نظریات کو عام کرنے کی کامیاب سعی نظر آتی ہے۔ البتہ کہیں کہیں احساس ہوتا ہے کہ پروپیگنڈے کی نے ضرورت سے زیادہ شدید ہو گئی ہے، ناول میں بجا طور پر روس سے محبت پر زور دیا گیا ہے، لیکن ایک دوسرے ملک سے نفرت اور تذلیل کی تعلیم بھی دی گئی ہے جو میرے نزدیک کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

اس ناول پر مترجم کی حیثیت سے قرۃ العین حیدر کا نام بھی شائع ہونا چاہیے تھا بلاشبہ وہ ایک معتبر اور مستند افسانہ نگار، ناول نویس ہیں لیکن ترجمے کا فن بھی ایسا کمتر نہیں ہے کہ اس میدان میں قدم رکھتے ہوئے سبکی محسوس کریں بلکہ چند دوسری کتابوں پر ترجمہ نگار کی حیثیت سے ان کا نام شائع بھی ہوتا ہے، اس لیے بچوں کے اس ناول پر اپنے نام کی اشاعت سے گریز کرنے کا ان کے پاس کوئی جواز بھی نہیں۔

پہاڑ کی چوٹی پر (میرزا ادیب)

"پہاڑ کی چوٹی پر" میرزا ادیب کا بچوں کے لیے ایک دلچسپ مہماتی ناول ہے۔ جس کے کم سن کردار پہاڑ کی بلند چوٹی پر پہنچنے کی مہم سر کرتے ہیں۔ یہ ناول تحیر و استعجاب مہم جوئی، سراغ رسانی، سسپنس اور سنسنی خیز واقعات سے لبریز ہے اور ان واقعات کی پیشکش میں مصنف نے بچوں کی نفسیات اور تفریحات کا لحاظ رکھا ہے۔ اچھی کتاب کا نمایاں وصف یہ بھی ہے کہ تحریر سے انسانوں سے محبت اور ان کے دکھ درد کا سچا اظہار ہو، اپنی

---

[1] قرۃ العین حیدر، "چن حسن عبدالرحمٰن" (حصہ اول)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۶۲ء، ص ۵۔

تہذیب و تمدن کی انسیت کے ساتھ ساتھ زندگی کو سنوارنے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کا جذبہ اور شعور بھی ہو۔ یہ تمام خوبیاں میرزا ادیب کے ناول میں موجود ہیں۔
ناول "پہاڑ کی چوٹی پر" میں پلاٹ اور اسلوب کو اس فنکاری کے ساتھ آمیز کیا گیا ہے کہ مقصدیت اور اصلاح پسندی کا احساس پڑھنے والوں کو نہیں ہونے پاتا۔
ناول کی ابتدا اجمال شاہ اور نصیر شاہ کے آباد کردہ قصبات جمال پورہ اکبر اور جمال پور اصغر سے ہوتی ہے جن کے درمیان بچوں کے لیے ایک بہت بڑا اور خوبصورت پارک بنایا گیا ہے لیکن شرط یہ عائد کی گئی ہے کہ پارک میں بچوں کا داخلہ اس وقت ہو سکے گا جب کوئی بچہ پہاڑ کی بلند چوٹی پر پہنچ کر محمود شاہ (پارک کے بانی) کے سوال کا جواب معلوم کرے گا سوال یہ تھا کہ پہاڑ کی ایک چوٹی پر بعض اوقات ایک شخص آتا ہے کچھ دیر تک روتا رہتا ہے بعد ازاں وہ کہیں چلا جاتا ہے کسی کو معلوم نہیں کہ وہ پُراسرار شخص کون ہے! کہاں سے آتا ہے! اور وہاں آ کر کیوں روتا ہے! بچوں کو اس شخص کے بارے میں پہاڑ کی اس بلند چوٹی پر پہنچ کر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔
دونوں قصبوں کے چار لڑکے فیاض، فیروز، منور اور انور پوری تیاریوں کے ساتھ اس مہم پر روانہ ہوتے ہیں۔ خوفناک بڑے بڑے جنگلوں، بڑی بڑی ندیوں اور بلند و بالا پہاڑوں سے گزرتے ہیں۔ انہیں ہولناک طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ناول کے ہیرو فیاض کے علاوہ بقیہ تینوں ساتھی ہمت کا دامن چھوڑ دیتے ہیں۔ مہم سر ہونے سے پہلے ہی واپس آ جاتے ہیں۔ فیاض نہایت بہادر نڈر، باہمت اور باحوصلہ لڑکا ہے۔ وہ مایوس نہیں ہوتا اور مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ اس مہم میں ایک شخص عاصم اس کی مدد کرتا ہے۔ جس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے فیاض اس مہم پر نکلا تھا وہ صرف ہفتہ میں ایک بار پہاڑ کی چوٹی پر آتا ہے۔ فیاض مہم سر کرنے سے قبل بیمار پڑ جاتا ہے مگر اس کا حوصلہ کم زور نہیں ہوتا۔ آخر فیاض اپنی مہم میں کامیاب ہوتا ہے اور اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ وہ شخص کوئی دوسرا نہیں بلکہ محمود شاہ ہی ہیں۔
بچوں کے لیے پارک کھول دیا جاتا ہے اور اس کا نام "فیاض پارک" رکھا

جاتا ہے۔ بچوں کے استفسار پر محمود چچا بتاتے ہیں کہ وہ اپنے ایک گناہ کی تلافی کے لیے ہر
حضرات کو خدا سے معافی مانگنے پہاڑ کی چوٹی پر جاتے ہیں۔
ناول "پہاڑ کی چوٹی پر" کا پلاٹ نہایت خوش سلیقگی سے ترتیب دیا گیا ہے اور
اسے مناسب ابواب میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت پھیلایا گیا ہے۔ ابواب کے
عنوانات ہیں۔ "مہم جو لڑکوں کا انتخاب" "مہم کی تیاری" "مصلاح و مشورے" "سفر کا آغاز"
"پہلی منزل" "منزل کی طرف تنہا سفر" "نئی زندگی" "وہ مل گیا" "واپسی" "انکشاف
راز" اور ہر باب میں ایک آدھ ایسا پُر لطف اور حیرت انگیز واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ بچوں
کی دلچسپی آئندہ واقعات معلوم کرنے میں برقرار رہتی ہے۔ اس ناول کے ذریعے بچوں
میں "مہم جوئی" کا جذبہ ابھارنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ناول کا ایک اہم کردار
محمود پاشا اس ضمن میں کہتا ہے

"میری ساری زندگی مہمات میں بسی ہوئی ہے۔ مہم جوئی ایک زندہ
قوم کی نشانی ہوتی ہے۔ اگر انسان کے اندر خالق کائنات مہم جوئی کا
جذبہ پیدا نہ کرتا تو آج ہمیں معلوم نہ ہوتا کہ سمندروں کی گہرائیوں میں
کیا ہے؟ پہاڑوں کی چوٹیوں پر کیا کچھ ہوتا ہے؟ قطب شمالی کیا ہے؟
میں چاہتا ہوں کہ میری قوم کے بچوں میں مشکلیں برداشت کرنے،
خطرات کا مقابلہ کرنے اور جان جوکھوں میں ڈالنے کی اسپرٹ پیدا ہو،
بہادری کا جذبہ ابھرے، مہم جوئی کا احساس ظہور پذیر ہو۔" [1]

آپ نے دیکھا مصنف نے کتنی فنکارانہ چابکدستی سے بچوں میں مہم جوئی کا جذبہ
ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ "بچوں کا پارک" اس مہم کا نقطۂ آغاز ہے اور اس کا نقشہ
میرزا ادیب نے ایسی مہارت کے ساتھ کھینچا ہے کہ ان کی منظر نگاری کا قائل ہونا
پڑتا ہے۔

---

[1] میرزا ادیب "پہاڑ کی چوٹی" مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی ۱۹۸۴ء ص ۱۹

رنگا رنگ پھول، لہلہاتے پودے، رنگین مچھلیاں، خوبصورت فوارے، ریل گاڑی، جھولے وغیرہ ان کے اشتیاق کو انگیخت کرنے والی ایسی اشیاء ہیں جن کی خاطر بچے کسی بھی دشواری سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں۔ ان سطور سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ منظر کشی پر قدرت ہونے کے ساتھ میرزا ادیب کو بچوں کی نفسیات پر بھی عبور حاصل ہے۔

محمود پاشا نے بچوں کو پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر معلومات حاصل کرنے کے لیے اکسایا تو قصبے کے بڑے لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ ایسی دشوار گذار مہم پر بچوں کو روانہ کرنا قرین عقل نہیں۔ ان کے خیال میں یہ دور حاتم کی طرح مشکلات سے گذر کر عجیب وغریب سوال کا جواب حاصل کرنے کا نہیں ہے۔ ایک شخص کی زبانی ان خیالات کی ترجمانی اس طرح کی گئی ہے۔

"آپ خوب جانتے ہیں یہ حاتم طائی کا زمانہ تو ہے نہیں کہ ایسے سوالات کیے جائیں اور حاتم بیچارہ جنگلوں اور پہاڑوں میں مارا مارا پھرے" [1]

ناول کے پلاٹ میں حیرت واستعجاب اور تجسس کا عنصر از اول تا آخر موجود ہے۔ فیاض اس ناول کا ہیرو ہے جو اپنے ساتھیوں فیروز، منور اور انور کے ساتھ مہم پر جاتا ہے۔ ناول مختصر ہے۔ میرزا ادیب کو جزئیات نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔ ان کی نگاہ سے معمولی سے معمولی نکتہ اوجھل نہیں ہوتا۔ مثلاً فیاض کا باپ پنشن یافتہ ڈرائنگ ماسٹر ہے۔ فیروز کا باپ زمیندار کا ڈرائیور ہے، نیز منور اور انور قصبے کے دکاندار کے بیٹے ہیں۔ ناول میں جزئیات نگاری اور منظر کشی نے جان ڈال دی ہے۔

مصنف نے جو منظر پیش کیا اس میں جزئیات کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے جزئیات کی پیشکش اس ہنرمندی کے ساتھ کی ہے کہ قاری کی نگاہ کے سامنے سارا منظر جیتا جاگتا گھوم جاتا ہے۔ اسی طرح فطری عناصر کی منظر کشی میں میرزا ادیب نے کمال دکھایا ہے:

---

[1] میرزا ادیب "پہاڑی کی چوٹی پر" مکتبہ پیام تعلیم نئی دہلی ۱۹۸۳ء ص ۱۱

ناول میں واقعات بڑی سرعت رفتار کے ساتھ پے در پے پیش آتے ہیں اور ہیرو فیاض بہت ہمت اور حوصلہ مندی سے اکیلا اس مہم کو سر کرتا ہے۔ ناول کا اختتام کئی پراسرار باتوں سے پردہ ہٹاتا ہے۔

کردار سازی میں بھی میرزا ادیب نے فطری انداز اختیار کیا ہے۔ ناول کا ہیرو فیاض ایک بہادر، نڈر، نیک، غریبوں کا ہمدرد، فرض شناس اور احسان کو یاد رکھنے والا عالی ہمت لڑکا ہے اس میں رحم دلی اور تحمل کی صفات بھی موجود ہیں۔ مصنف نے صرف تعارفاً یہ اوصاف فیاض کی شخصیت میں بیان نہیں کر دیئے ہیں بلکہ عملی واقعات کی صورت میں ان کے ثبوت بھی فراہم کیے ہیں۔ اس طرح ناول میں کہیں قول وفعل کا تضاد نہیں پایا جاتا۔

فیاض جنگل میں ایک زخمی چڑیا کی تیمار داری کرتا ہے جب کہ اس کے ساتھی اسے کار فضول سمجھ کر اپنا رستہ کھوٹا نہیں کرتے۔

منور، انور، فیروز، عاصم چچا، سہیل، بابا خاں اور ایک خدا رسیدہ بزرگ کے ضمنی کردار بھی اپنی انفرادیت کا نقش جماتے ہیں۔

اس ناول میں جذبات نگاری کے عمدہ نمونے قدم قدم پر ملتے ہیں۔ مثلاً فیاض بیمار ہے، منزل پر جلد جانا چاہتا، اس جسمانی بیچارگی اور باطنی اشتیاق میں جو متضاد جذبات ہیں ان کی تصویر مصنف کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:۔

> "فیاض آہستہ آہستہ صحت یاب ہونے لگا۔ عاصم، اس کی بیوی اور عزیزوں نے اسے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی کوشش کی مگر اس کی خواہش تھی کہ وہ دن بھی نہ لیٹے۔ اسے اپنی مہم کا بار بار خیال آتا تھا اور اس خیال کے آتے ہی بے اختیار بستر سے اٹھ بیٹھتا تھا لیکن عاصم یا اس کے گھر والے اسے لٹا دیتے تھے۔ ہر دن کے بیت جانے پر اسے افسوس ہوتا تھا کہ بے کار بیت گیا ہے۔" [1]

---

[1] میرزا ادیب۔ "پہاڑ کی چوٹی پر"۔ مکتبہ پیام تعلیم۔ نئی دہلی ۱۹۵۸ء ص ۵۸

میرزا ادیب بڑوں کے لیے لکھنے والوں میں بھی نہایت چابکدست افسانہ نگار اور صاحب طرز مصنف تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انہیں زبان و بیان پر مکمل قدرت حاصل ہے اور ان کے ہر فقرے میں ادبی چاشنی اور فنی محاسن پیوست ہوتے ہیں۔ بچوں کے لیے قلم بند کردہ ان کے اس ناول میں بھی وہی ہنرمندی اور ادبیت کارفرما ہے۔

اس ناول کی زبان روزمرّہ اور بول چال کی زبان ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے لیکن سداں رواں ہیں۔ طویل مکالموں اور مشکل الفاظ سے گریز کیا گیا ہے۔ کردار کی گفتگو حسب مراتب اور برجستہ و بیساختہ ہے۔ خصوصاً ہم عمر دوستوں کی بات چیت میں بے تکلفی کا انداز ہے۔

اس ناول کے مطالعے کے دوران یہ دیکھ کر بھی اطمینان ہوا کہ جہاں مصنف نے کم سن پڑھنے والوں کی ذہنی استعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ثقیل الفاظ، پیچیدہ جملوں اور ژولیدہ بیانی سے اجتناب کیا ہے، وہیں ناشر نے اس کی کتابت پر خصوصی توجہ صرف کی ہے اور اکثر ایسے الفاظ پر جس کا تلفظ بچے غلط طور پر ادا کرتے میں اعراب لگائے ہیں۔ کتاب تصاویر سے بھی مزین ہے۔ البتہ کاتب نے قلم جلی استعمال نہیں کیا۔ اس کی وجہ سے کتابت باریک رہ گئی ہے اور خاص طور چھوٹے بچوں کو اسے پڑھنے میں قدرے دشواری کا احساس ہو سکتا ہے۔

مجموعی طور پر اس ناول کو بچوں کے ناولوں میں ایک قیمتی اضافہ تصور کرتا ہوں اور اسے بچوں کا بہترین مہماتی ناول تصور کرتا ہوں۔

مونگے کے جزیرے (سیدی اعجاز)

مہماتی ناولوں کے ضمن میں سیدی اعجاز کی تصانیف کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ جنھوں نے کچھ انگریزی ناولوں کی تلخیص اُردو داں بچوں کے لیے کی ہے۔ ناولوں میں "مونگے کے جزیرے" نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دراصل آر۔ ایم بلنٹائن کے ایک ضخیم ناول سے ماخوذ ہے۔ مصنف نے اپنے کم عمر قارئین کو مخاطب کرتے ہوئے دیباچے میں تحریر کیا ہے

"کتاب کو تمہاری سہولت اور پسند کی خاطر ایسا بنا دیا ہے کہ تم
لوگ یہ سمجھو کہ جیسے یہ کارنامہ تم ہی لوگوں نے انجام دیا ہے۔ کرداروں
کے نام اور دوسری بہت سی چیزیں ہم نے اپنے ملک کے رسم ورواج
کے مطابق بدل دی ہیں۔ اس کتاب میں ہم نے کچھ چیزیں اپنی طرف سے
بڑھائی ہیں۔ اصل میں انگریزی میں یہ کتاب بہت موٹی تھی لیکن ہم نے
اسے مختصر کر دیا۔"[1]

مندرجہ بالا دعوے کے باوجود اکثر مقامات پر سیدی اعجاز اس التزام پر کاربند نہیں رہ سکے اور کرداروں کے افعال واقوال سے لے کر جغرافیائی پس منظر تک کئی باتیں ہندوستانی بچوں کو نامانوس اور اجنبی سی محسوس ہوتی ہیں۔ ناول کا پلاٹ حسب ذیل ہے۔

عظیم، عزیز اور خالد گہرے دوست ہیں یہ لڑکے نئی نئی باتوں کی تلاش میں رہتے اور فطرت سے بہت رغبت رکھتے ہیں۔ اپنے اسی شوق کو تسکین دینے کے لیے وہ ایک بندرگاہ سے سمندری جہاز پر سوار ہو جاتے ہیں اور بحرالکاہل میں واقع مونگے کے جزیروں کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ مونگے کے جزیرے سمندر میں ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں اور بعض مقامات پر سطح آب سے نیچے اس طرح واقع ہیں کہ جہاز راں انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ اسی وجہ سے اکثر جہاز راں ان سے ٹکرا کر غرقاب ہو جاتے ہیں لیکن ان تینوں دوستوں کا جہاز کسی طرح ان تہ آب جزیروں سے بچتا ہوا اپنے سفر کو جاری رکھتا ہے۔ آغاز سفر کے چند دن بعد یہ جہاز جزیروں کے قریب پہنچ کر طوفان کی زد میں آجاتا ہے۔ یہ طوفان بہت خوفناک ہے۔ اس کے تھپیڑوں سے مقابلہ کرتا ہوا بچوں کا جہاز بالآخر ایک چٹان سے ٹکرا جاتا ہے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

عظیم، خالد اور عزیز جہاز سے سمندر میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ سر پر پتوار کی چوٹ لگنے کی وجہ سے خالد پانی میں گر کر غش کھا جاتا ہے لیکن عظیم اور عزیز اس کی حفاظت کرتے

---

[1] سیدی اعجاز "مونگے کے جزیرے" نسیم بکڈپو لکھنؤ، ص ۲

ہیں اور بدقت تمام اس کو کھینچ کر ساحل پر لے آتے ہیں۔ یہ ساحل لڑکوں کی خوش قسمتی سے مونگے کے جزیرے کا ہے۔ اس جزیرے پر بچّے مختلف النوع مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں اور کئی بار مہمات سر کرتے ہیں ابتدا میں انھیں تقریباً ویسے ہی تجربات اور دقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جیسی کہ ڈینیئل ڈیفو کے "رابنسن کروسو" کو اپنی مہم کے دوران پیش آئی تھیں۔ کبھی وہ دشوار گذار جنگلوں میں ناریل کے درختوں سے خوراک حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی بمشکل تمام جھیل سے مچھلی پکڑنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایک بڑے درخت کو کاٹ کر ان تینوں نے اس کے لٹھے کو کشتی کی طرح استعمال کرنا شروع کیا اور اس کی مدد سے سمندر میں تھوڑے تھوڑے فاصلے کا سفر بھی کرنے لگے۔ اپنی ان چھوٹی چھوٹی مہمات میں کبھی انھیں شارپ جیسی خونخوار مچھلی سے مقابلہ کرنا پڑا تو کبھی پانی کے باغ کے پُرلطف مشاہدے سے محظوظ ہوئے۔

جزیرے پر اپنے قیام کے دوران پتھروں اور لکڑی کی شاخوں سے چھوٹے چھوٹے ہتھیار بنائے اور جانوروں کا شکار بھی کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے جان توڑ محنت، ذہانت اور باہمی اشتراک سے ایک چھوٹی سی کشتی بھی تیار کر لی۔ اور اس کشتی کے سہارے سمندر میں سفر کرتے ہوئے وہ پینگوئن پرندوں کے جزیروں کی پُرلطف سیر بھی کر آئے۔

ناول کے اختتام پر سمندر میں جنگلی وحشیوں کی خوفناک جنگ ہوتی ہے جسے عزیز، عظیم اور خالد اپنے جزیرے سے دیکھتے ہیں اور جب یہ لوگ ان کے جزیرے پر آجاتے ہیں تو تینوں دوست مظلوم اور کمزور جماعت کی مدد کرتے ہیں، بالآخر اس جماعت کی فتح ہوتی ہے اور فاتح وحشی انسان ان کے دوست بن جاتے ہیں۔

ناول کے بالکل آخری صفحہ پر بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن بچّوں کے جزیرے کے قریب ایک جہاز گزرتا ہوا دکھائی دیا جسے اپنی طرف متوجہ کر کے لڑکوں نے مدد حاصل کی اور اسی جہاز کے ذریعے اپنی واپسی کا سفر مکمل کر لیا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس ناول کو بھی اردو میں مہماتی ناولوں کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے، جس کا آغاز "رابنسن کروسو" کی طرز پر ناول "قصرِ صحرا" کی صورت

میں میرزا عظیم بیگ چغتائیؒ نے کم و بیش نصف صدی قبل کیا تھا۔ بلاشبہ ناول کا پلاٹ انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز ہے۔ از اول تا آخر حیرت انگیز واقعات تیزی کے ساتھ رونما ہوتے رہتے ہے اور کہانی کے تینوں ہیرو ان سے بہت پامردی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے۔ نو عمر لڑکوں کا ایسی ہولناک آفتوں سے مقابلہ کرنا بظاہر غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مصنف نے نہایت چابکدستی کے ساتھ انہیں فطری انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ تمام باتیں پڑھنے والوں کو ممکن محسوس ہونے لگتی ہیں۔ کردار نگاری، منظر کشی اور جزیات کی عکاسی بھی خاصی عمدگی کے ساتھ کی گئی ہے۔ لیکن ناول کی ان خوبیوں کا سہرا اصل مصنف آر، ایم بلنٹائن کے سر جاتا ہے۔ سیدی اعجاز کو محض اس بات کے لیے سراہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے چابکدستی کے ساتھ ایک ضخیم ناول کو کم صفحات میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس مرحلے پر انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور انھوں نے کتاب کی ابتدا میں ناول کے خاصے بڑے حصے کی تلخیص ایک ہی صفحہ پر پیش کر کے داستان کا آدھا لطف زائل کر دیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ناول بیحد ناہموار اور عدم توازن کا شکار ہو گیا ہے۔ کرداروں کی اجنبیت کم کرنے کی غرض سے سیدی اعجاز نے ان کے نام ہندوستانی رکھ دیئے ہیں لیکن طریق، عادات و اطوار اور طرز گفتگو سے ان تینوں لڑکوں کے ہندوستانی ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔ ناول کی زبان خاصی اکھڑی اکھڑی سی ہے

تین اناڑی (عصمت چغتائیؒ)

"تین اناڑی" بچّوں کا ایک دلچسپ ناول ہے۔ جس کی مصنفہ مشہور ترقی پسند، افسانہ نگار عصمت چغتائیؒ ہیں۔ جنھوں نے بڑوں کے لیے بھی متعدد معیاری ناول لکھے۔ "تین اناڑی" میں نہ تو بچّوں میں حیرت و استعجاب ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے اور نہ ہی مافوق الفطرت واقعات میں الجھایا گیا ہے۔ بلکہ یہ ناول شوخ و شنگ بچّوں بیلو اور ٹیٹو کی معصوم شرارتوں کا پُر لطف بیان ہے جو موسم گرما کی چھٹیاں تفریح میں

بسر کرنے کے خواہش مند ہیں۔ بچوں کی فطرت میں شوخی، ظرافت، کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا اضطراب، ہر بات کے بارے میں جاننے کا جذبہ، خود نمائی کی عادت، اپنی چیزوں کو جمع کرنا اور ان کی حفاظت کرنا، بڑوں اور اپنے ہمعصر ساتھیوں کے ساتھ رہ کر کچھ نہ کچھ سیکھنا، ایک دوسرے سے مقابلہ اور باہمی ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے۔

ناول کے مرکزی کردار تین اناڑی اور معصوم بچے ان تمام فطری خوبیوں کے حامل ہیں۔ عصمت نے جس فطری انداز میں ان کے کردار پیش کیے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کی نفسیات پر ان کی گہری نگاہ رکھی ہے۔ اور وسیع مشاہدے نیز قوت متخیلہ کے حسین امتزاج سے اپنی تحریروں میں جان پیدا کر دیتی ہیں۔ انھوں نے بچوں کی فطری نشوونما پر زور دیا ہے۔ انہیں خشک وعظ، پند و نصیحت، ہر وقت بچوں کو ڈانٹنا، ٹوکنا پسند نہیں۔ اور اپنے ناول میں بھی انھوں نے ان باتوں سے گریز کیا ہے۔ ناول کے پیش لفظ میں موصوفہ نے بچوں سے براہ راست خطاب کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

> "اگر میں یہ نصیحت کروں کہ جھوٹ نہ بولو، بڑوں کا ادب کرو اور جی لگا کر پڑھو تاکہ ایک دن لائق فائق بن کر اپنے ملک اور قوم کا نام روشن کرو ۔۔ تو میری لمبی چوڑی نصیحت بے کار ہو گئی۔ مجھے یقین ہے کہ تم جھوٹ نہیں بولتے۔ بڑوں کا ادب بھی کرتے ہو اور پڑھنے میں بھی جی لگاتے ہو۔ لہذا ضرور ایک دن کسی قابل بنو گے اور ملک کی خدمت کرو گے تم مستقبل کے معمار ہو۔
>
> پھر بھلا تمہیں نصیحتوں کی کیا ضرورت ہے!"[۱]

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عصمت نے بچوں کو سچ بولنے، بڑوں کا ادب کرنے، جی لگا کر پڑھنے، ملک و قوم کا نام روشن کرنے اور مستقبل کا معمار بننے کی نصیحت کس فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ کی ہے اور ساتھ ہی بچوں کو یہ بھی باور کرا دیا ہے کہ وہ

---

[۱] عصمت چغتائی "تین اناڑی" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء ص ۵

نصیحت کرنے کے خلاف ہیں۔ پورے ناول میں یہی نفسیاتی طریقۂ کار استعمال کیا ہے۔ بیجا پابندیاں بچوں کی نشوونما میں حارج ہوتی ہیں، بچوں کو کھلی آزادی چاہیے ناول کے ابتدائی صفحات میں " دو باتیں " کے تحت عصمت چغتائی نے بڑوں کو بھی یہ نصیحت کی ہے۔

"انسان کی زندگی ایک درخت جیسی ہے، اکلّہ پھوٹتا ہے۔ پودا پروان چڑھتا ہے۔ اس وقت وہ بالکل اناڑیوں جیسی حرکتیں کرتا ہے، کبھی ایک طرف ٹیڑھا ہونے لگتا ہے کبھی دوسری طرف ضرورت سے زیادہ جھکتا ہے۔ کبھی کسی دیوار سے اڑکر بڑھنے لگتا ہے۔ دیوار بھی چٹختی ہے اور اس کا جسم بھی کبڑا ہو جاتا ہے اگر مالی ہوشیار ہو تو وہ تم لوگوں کی طرح سینہ تان کر آسمان کی طرف اٹھتا چلا جاتا ہے اور ایک دن پھول اور پھل سے بارآور ہو کر دنیا کو فیض پہنچاتا ہے۔" [1]

اس تجزیاتی بحث کو طول دینے سے پہلے آیئے اس ناول کے پلاٹ پر ایک نظر ڈالی جائے۔

عصمت چغتائی بچوں کو شرارتیں کرنے اور قہقہے لگانے کی دعوت دیتی ہیں۔ ناول کے تینوں کردار ککو، بیلو، اور ٹیڈو مختلف خوبیوں اور فطری صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ ککو بہت شریر ہے۔ بیلو ذرا سیدھا ہے مگر فطرتاً بہت ذہین ہے۔ ٹیڈو سب سے چھوٹا ہے اور نٹ کھٹ ہے۔

"تاج اکبر" اس عمارت کا نام ہے جہاں تینوں بچے رہتے ہیں۔ ناول کا آغاز اس نکتے سے ہوتا ہے کہ یہ بچے تعطیلاتِ گرما پرلطف انداز میں کیسے گزاریں تینوں مختلف تجاویز پیش کرتے ہیں کوئی دو کوئی تین پانچ کھیلنے پر زور دے رہا ہے کوئی ڈرامہ کمپنی بنانے پر مصر ہے۔ آخر تینوں نے متفقہ رائے ہو کر ایک ڈرامہ کمپنی بنانا طے کیا اور

---

[1] عصمت چغتائی "تین اناڑی" مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، [illegible]، ص،

پہلے ایک ایسا ڈرامہ تیار کیا جس میں کالا دیو، بہادر سپاہی، بادشاہ، شہزادی اور شہزادہ تھے۔ شہزادی کو انگور کھانے تھے اس لیے تینوں بچے شہزادہ بننے پر مُصر تھے۔ بادشاہ، کالا دیو، بہادر سپاہی، چوبدار، جامنتری کے کردار بھی ان ہی تینوں کو ادا کرنے تھے۔

حسن آرا ایک معمر خاتون ہے اور ان بچوں کو ان کی ہمدردی حاصل ہے۔ وہ بچوں کو ڈرامہ کرنے کے لیے ساز و سامان فراہم کرنے میں مدد کرتی ہے۔ ڈرامے کے ٹکٹ بھی بیچے جاتے ہیں، چبوترے پر تخت بچھا کر اسٹیج بنایا گیا، گھر بھر کی تمام کرسیاں اور مونڈھے جمع کر کے بیٹھنے کا انتظام ہوا، گھر والے اور پاس پڑوس کے لوگ ڈرامہ دیکھنے آئے۔ ڈرامہ شروع ہوا۔ تینوں بچوں کی نیت انگوروں پر بھی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تینوں اسٹیج پر ہی تکرار کرنے لگے۔ تو تو میں میں سے بات ہاتھا پائی تک پہنچی۔ ایک نے دوسرے کو دھکا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈرامہ ناکام ہوا۔

ڈرامہ کمپنی کی دل شکنی، ناکامی کے بعد تینوں بجھے بجھے سے رہے۔ ان کی چھٹیاں ضائع ہو رہی تھیں آخر ان ہی چھٹیوں کے دوران اپنے طور پر کچھ کمانے کی دھن سوار ہوئی۔ اس سلسلے میں طے ہوا کہ گُڑ چنے کی ٹافی بنائی جائے۔ پھر یہ لوگ گُڑ جمع کرنے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ گُڑ کسی نہ کسی طرح جمع کر لیا۔ وہ پک بھی گیا مگر وا رے قسمت! گُڑ جل گیا ساتھ ہی بیلو کی جیب میں کانڈ کباڑ ہونے کے سبب ساری اسکیم پر پانی پھر گیا۔

اس واقعہ کے بعد یہ تینوں بچے خود کو "اناڑی" محسوس کرنے لگے، وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتے اس میں ناکامی ہو رہی تھی۔ تینوں تاج اکبر کی سیڑھیوں پر بیٹھے نئی نئی اسکیمیں سوچتے رہتے۔ دل بہلانے کے لیے انہیں صرف آموں کا سہارا تھا۔ ایک دن تینوں آم کھا رہے تھے کہ وسیم بھائی گھبرائے ہوئے آئے، بچوں نے ان کی گھبراہٹ کا سبب معلوم کیا، پتہ چلا کہ وسیم بھائی انکم ٹیکس کی وجہ سے پریشان ہیں۔

بچے انکم ٹیکس کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ وہ ہر ایک سے انکم ٹیکس کے بارے میں پوچھتے لیکن ان کی تسلی نہیں ہوتی۔ بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ انکم ٹیکس ایک قسم کا جرمانہ ہوتا ہے، پھر تینوں اپنی معصوم عقل کا استعمال کرتے ہیں اور اس جرمانے کے بارے میں مختلف رائے پر یہ آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے

ہیں۔ آخر صوفی آلہ انہیں انکم ٹیکس کے بارے میں بہت ہی نفسیاتی طریقے سے مفصل معلومات فراہم کرتی ہیں۔ اس ضمن میں ان کو ابتدائی وحشی انسان کی زندگی، اس کی گزر اوقات، اس کی ضروریات اور اس کے وسائل سے لے کر دورِ جدید کی آسائشوں اور سہولیات کے بارے میں بتایا جاتا ہے نیز انہیں احساس دلایا جاتا ہے کہ اسکول، اسپتال، کورٹ کچہری اور دیگر ضروری محکموں کے اخراجات انکم ٹیکس سے پورے کیے جاتے ہیں۔ اس طرح ناول میں پُرلطف واقعات کے تانے بانے میں مفید معلومات ایسے فنکارانہ انداز میں پرو دی گئی ہیں کہ تفریح کے ساتھ ساتھ بچے ضروری اور کارآمد باتیں بھی ذہن نشین کر لیں۔

ناول کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے ان تین اناڑیوں کی حماقتوں اور دُشمن بھیا کی شرارتوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ آم رس کو چمڑا کہہ کر بچوں کو بیوقوف بنایا جاتا ہے۔ بیلو کی گپ بازی کا تذکرہ بھی دلچسپ ہے۔ سرکس سے بھاگے ہوئے شیر کا واقعہ داستان کو کسی قدر تحیر و استعجاب کا حامل بھی بناتا ہے۔ ٹیٹو نے ماسٹر بننے کی خواہش کی اور خواب میں ماسٹر بن بھی گئے، خود ماسٹر بننے پر ان کو استاد کی ذمہ داریوں، پریشانیوں اور بچوں کی شرارتوں سے تنگ آجانے کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس پیشے سے توبہ کر لیتے ہیں۔ آنکھ کھلنے پر وہ بچہ بن کر طالب علم ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔

ناول کا خاتمہ انکم ٹیکس کے بیان پر ہی ہوتا ہے، بچوں کی چھٹیاں ختم ہو جاتی ہیں وہ نئے بستوں، نئی کتابوں اور نئے کپڑوں کے تصور میں مگن ہو جاتے ہیں۔

ناول میں "تین اناڑی" کا پلاٹ آٹھ مختصر ابواب میں پھیلایا گیا ہے۔ ہر باب میں ایک آدھ واقعہ بیان کیا گیا ہے جس کا محور ٹیٹو، بیلو اور گلو ہیں۔ ڈراما کمپنی، اس میں ناکامیابی گڑ چنے کی ٹافی بنانا اور وہاں بھی ناکامی، وسیم بھائی کا انکم ٹیکس سے گھبرانا، آم رس اور چمڑے کے دلچسپ واقعات، سرکس کے مغرور شیر کا گھر میں گھس آنا۔ گلو کا خواب میں ماسٹر بننا اور صوفی آلہ (خالہ) کا بچوں کو انکم ٹیکس کی اہمیت افادیت سے آگاہ کرنا، جیسے واقعات بڑی خوش اسلوبی سے مربوط کیے گئے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ عصمت نے

ناول میں مناسب واقعات پر اسالیب اور واقعات سے مزاح پیدا کیا ہے اور بچوں کی معصوم فطرت اور شوخیوں کی جھلک دکھائی ہے۔

ماں کا لسانی لہجہ اور بیگماتی زبان محاوروں کا برجستہ استعمال، بچوں کی بوکھلاہٹ اور واقعات سے مزاح کا پہلو اُبھارنا، عصمت کے فن سے منسوب ایسی خصوصیات ہیں جو ان کے دیگر (بڑوں کے لیے لکھے گئے) ناولوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ البتہ یہاں الفاظ کے استعمال میں خصوصی احتیاط برتی گئی ہے کہ زبان بچوں کے لیے مشکل اور ثقیل نہ ہونے پائے۔"

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ اس ناول میں عصمت نے باتوں باتوں میں ننھے قارئین کو انکم ٹیکس جیسے انتہائی خشک موضوع کے بارے میں بہت سی کارآمد باتیں ذہن نشین کرادی ہیں لیکن ان کا بیان ایسی شکل میں کیا گیا کہ یہ بچوں کے ذہن پر گراں نہیں گزرتیں۔

عصمت چغتائی کو نہ بچوں کی نفسیات سے بخوبی آگاہی ہے اور انھوں نے بچوں کی شرارتوں پر مشتمل واقعات اور ان کے جذبات کی عکاسی نہایت خوش اسلوبی سے کی ہے ٹیمٹو، اور ببلو اور لکو تینوں معصوم مگر شوخ و شنگ بچے ہیں کہ کہیں بھی ان کے کردار کے فرضی ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ عام بچوں کی طرح وہ آپس میں بے انتہا محبت کرتے ہیں لیکن بات بات پر لڑتے جھگڑتے بھی ہیں۔ عصمت کے یہ کردار بھی خوبیوں اور خامیوں کا امتزاج ہیں۔ ان میں خود نمائی کا وہ فطری جذبہ بھی موجود ہے جو ہر نارمل بچے میں پایا جاتا ہے۔ انکم ٹیکس کے بارے میں تینوں میں سے کوئی نہیں جانتا لیکن ہر ایک اس بارے میں قابلیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

بچوں کی معصوم چالاکیوں اور بے لوث عیاریوں کا ایسا خوبصورت بیان عصمت ہی کا حصہ ہے۔ عصمت چغتائی نے بزرگوں کے جذبات اور ان کی محبت کی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں۔ صوفی آپا بچوں کی شرارتوں سے محظوظ ہوتی ہیں۔ ان کو ٹافیاں چاکلیٹ بانٹتی ہیں ان کی ہر خواہش اور غم میں شریک ہیں۔ ناول کا یہ منظر دیکھئے۔

"ہائے... لوگو میرا ببلو۔ اماں جو کرے سے سب کچھ سُن رہی تھیں پچھاڑ کھا کر

ڈنلپ کے نئے گدّے پر گریں پھر اٹھ کر وہ دوڑیں۔ بلو کے کمرے کی طرف اگر اباّ نے
کولیا بھر کر انہیں پکڑ نہ لیا ہوتا تو وہ سیدھی شیر کے جبڑوں میں گھس جاتیں۔
ہائے میرا بچہ۔ ہائے! مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ تم لوگوں پر
بھاری ہے بچہ ۔ ۔ ۔ اسے اس کی جان لے کر ہی چین آیا۔ حسب
دستور دادی اماں نے گھبرائے ہوئے اماں اور ابا کی ٹانگ لی۔
"اب تو کلیجے میں ٹھنڈک پڑی"[1]

پیچیدہ جذبات کی ترجمانی اور مکالموں کی روانی، بیساختگی عصمت کے انداز نگارش
کی بنیادی خوبیاں ہیں جو اس ناول کے ہر صفحہ پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ طنز کی بے پناہ
کاٹ ان کی تحریر کا امتیاز ہے لیکن چونکہ پیش نظر ناول بچوں کے لیے تصنیف کیا گیا ہے۔
اس لیے یہاں عصمت نے اپنے طنز کو ممکنہ حد تک لطیف بنانے کی کوشش کی ہے۔
بچوں کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ اپنی چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ نئی نئی چیزیں
جمع کرتے ہیں۔ بظاہر یہ چیزیں بڑوں کے لیے بیکار ہوتی ہیں اور بڑے انہیں دیکھ کر
تعجب کرتے ہیں کہ بچے کو یہ چیزیں کیوں جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔ ناول کا یہ
اقتباس بچوں کی اس فطرت کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔

"بلو نے جس جیب میں گڑ رکھا تھا اس میں اتفاق سے پہلے سے کباڑ
خانہ موجود تھا، کچھ زنگیائی ہوئی ٹیڑھی کیلیں، خالی کارتوس مختلف
رنگ اور وزن کے پتھر، چند کینچوے اور نیم مُردہ مینڈک کے بچے جو
انھوں نے مچھلی کے شکار کے خیال سے جمع کیے تھے، کچھ خوش رنگ پر"[2]

ناول تین اناڑی" کی زبان نہایت سادہ، عام فہم اور روزمرہ بول چال کی
ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے لیکن شگفتہ الفاظ سے مُزیّن ہیں جن میں محاوروں کی برمحل

---

[1] عصمت چغتائی "تین اناڑی" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۸ء ص ۳، ۴۔
[2] عصمت چغتائی "تین اناڑی" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۸ء ص ۲۹

شمولیت اور مناسب لہجوں کے استعمال نے جان ڈال دی ہے۔

الغرض پلاٹ کردار، واقعات نگاری، منظر کشی اور طرز ادا بہر اعتبار "تین اناڑی" بچوں کے ناولوں میں ممتاز حیثیت کا حامل قرار پاتا ہے۔ معمولی سے معمولی واقعات کی تال میل سے عصمت نے بچوں کے لیے جو فن پارہ تخلیق کیا ہے اس میں حقیقت نگاری کے باوجود ایسی دلکشی اور مقناطیسی قوت ہے کہ پڑھنے والے بچے اسے ختم کیے بغیر ہاتھ سے نہیں رکھ سکتے۔ انتہائی پُر اسرار اور عجیب و غریب پلاٹ نیز مافوق الفطرت واقعات پر مشتمل ناول بھی ان اوصاف میں "تین اناڑی" کے مرتبہ تک نہیں پہنچے۔ بلاشبہ اس ناول کو ہم ایک سنگِ میل کی حیثیت دے سکتے ہیں۔

الٹا درخت (کرشن چندر)

ناول "الٹا درخت" کرشن چندر کا شاہکار فنطاسیہ ہے۔ جس میں مختلف النوع موضوعات کی شمولیت نے بڑی پہلوداری پیدا کردی ہے۔ ناول میں سائنسی معلومات اور انوکھی مہمات کا تانا بانا نہایت خوبصورتی کے ساتھ بنا گیا ہے۔ اس داستان میں دیو بھی ہیں، جادوگر بھی ہیں، غضرنا رحم دل بوڑھا بھی ہے۔ سلیمانی ٹوپی اور اڑنے والی چھڑی بھی ہے اور ساتھ ہی دورِ جدید کے پیچیدہ سیاسی اور سماجی مسائل کو بھی طنزیہ اسلوب اور تمثیلی پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ "الٹا درخت" میں جادوگر ایلیکشن بھی لڑتے ہیں اور ظلم ڈائرکٹر اس طلسمی کارخانے میں الو بنا دیئے جاتے ہیں نیز مشینوں کے تمدن کا بھی نقشہ آتا ہے۔ اس عجیب و غریب داستان میں بچوں کی دلچسپی کے جملہ سامان موجود ہیں۔ ناول سرتاسر تخیلاتی ہے لیکن کرشن چندر کے بالغ سیاسی اور سماجی شعور نے اس فنطاسیہ کو بلند پایہ طنزیہ تمثیلی بنا دیا ہے اور "الٹا درخت" کا ہر تخیلی پیکر ایک عمیق رمزیت اور ہر واقعہ گہری معنویت کا حامل بن گیا ہے۔

ناول "الٹا درخت" کا پلاٹ اس طرح ہے۔ ناول کا ہیرو یوسف ایک موچی کا سادہ لوح بیٹا ہے۔ جس کی عمر بارہ تیرہ برس ہے۔ اس کی زمین اور کنواں غاصب

بادشاہ نے ضبط کر لیا ہے کیونکہ یوسف اس کی فوج میں بھرتی ہو کر انسانوں پر ظلم ڈھانے
سے انکار کر چکا ہے۔ یوسف اپنی گائے کے بدلے ایک شخص سے جادو کے تین دانے
حاصل کرتا ہے۔ اور انہیں زمین میں بو دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک اُلٹا درخت
اُگ آتا ہے۔ اس کی جڑیں زمین سے اوپر ہیں اور باقی حصہ زمین کے اندر ہے۔ اصل
ناول کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے اور یوسف اس درخت کے سہارے تحت الثریٰ میں
پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اسے متعدد عجائبات کا مشاہدہ کرنے کے مواقع ہاتھ آتے ہیں۔
سب سے پہلے اس کا سابقہ آوازوں کے قبرستان سے پڑتا ہے۔ جہاں ان شاعروں
ادیبوں اور سیاست دانوں کی آوازیں ہیں جنہیں ظالم بادشاہ نے قتل کرا دیا تھا یا قید
کر رکھا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بادشاہ کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ بعد ازاں یوسف کا
گزر کالے دیو کے شہر سے ہوتا ہے۔ یوسف کالے دیو کو مساوات کا قائل کرتا ہے
اور اپنی ذہانت سے ثابت کرتا ہے کہ کالے اور گورے دونوں طرح کے انسانوں میں ایک
ہی رنگ کا خون دوڑتا ہے۔ اس شہر سے نکل کر وہ ایک طلسمی جنگل سے ہوتا ہوا مشینی
شہر میں پہنچتا ہے۔ یہاں ایک درخت پر کئی فلم ڈائرکٹر الو بنا کر بٹھا دیئے گئے ہیں۔
انہیں مشینی شہر کے حکمراں لڑکے نے اس لیے الو کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔ کیونکہ
انھوں نے بچوں کے لیے ایک فلم نہیں بنائی تھی۔ یہاں یوسف مشینی شہر کے مناظر
دیکھتا ہے۔ اس حیرت انگیز بستی میں انسان کا نام و نشان تک نہیں لیکن آرام و
آسائش اور سہولیات کا وافر سامان موجود ہے۔ ہر مشین کام کرتی ہے۔ اس شہر کا مالک ایک
لڑکا ہے جس کی ہاتھوں میں انگلیاں نہیں صرف ایک ایک انگوٹھا ہے۔ اس کے باپ نے
اسکی انگلیاں اس لیے کٹوا دی تھیں کہ مشین کا بٹن دبانے کے لیے انگوٹھا ہی کافی تھا۔

یوسف سمجھا بجھا کر اس لڑکے کو مشینوں کے شہر سے نکال لاتا ہے اور اس کا نام
موہن رکھتا ہے۔ واپسی میں انہیں ایک دیو ملتا ہے جو انسانی خون سے سونے کی دیوار
تعمیر کر رہا ہے۔ دیوار بڑھتی جا رہی ہے اور انسان کم ہوتے جا رہے ہیں۔ آگے جا کر
یہ دونوں ایک خوبصورت لڑکی کو نیلام چڑھتے دیکھتے ہیں جس کے آنسو زمین پر گرتے

بنا سچے موتی بن جاتے ہیں۔ یوسف بڑی عقلمندی سے اسے نیلام ہونے سے بچا لیتا ہے۔ وہ شہزادی نہیں ہے۔ ایک ڈبل روٹی بنانے والے کی لڑکی ہے اس لیے اس کا نام مس ڈبل روٹی رکھا جاتا ہے۔ تینوں بچے جادونگری میں داخل ہوتے ہیں۔ جہاں جادوگروں کے الیکشن دیکھتے ہیں۔ اس الیکشن میں الہ دین، جادوئی چراغ کے ساتھ انتخاب کی سرگرمیوں میں معروف تھے۔ دوسرا امیدوار جادو کی ٹوپی کے کرشمے دکھا کر عوام کو بیوقوف بنا رہا ہے نیز تیسرا جادوگر امیدوار کا غذوں کے استعمال سے عوام الناس کو سبز باغ دکھاتا ہے۔

بعد ازاں مس ڈبل روٹی، موہن اور یوسف جادونگری سے نکل کر سانپوں کے شہر میں پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں سانپوں کی دہشت پھیلی ہوئی ہے۔ اس شہر کی ساری سڑکیں مکانات، کوچے، بازار، سب پختہ ہیں۔ سانپوں کے ڈر سے ہر چیز پر لوہے کی باریک جالی لگی ہے۔ حتیٰ کے تمام نالیاں بھی زمین دوز ہیں اور ان کے دہانوں پر لوہے کی جالیاں لگی ہوئی ہیں حکومت نے اس آفت سے بچنے کے لیے طرح طرح کے حفاظتی اقدامات اٹھائے ہیں۔ پھر بھی روزانہ دس آدمی سانپ کے کاٹنے سے مرجاتے ہیں۔ بچے وہاں کے وحشت زدہ باشندوں کو دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں اور اس دہشت گردی کے خلاف تمام لوگوں کو احتجاج کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ لیکن سانپ جی مہاراج سے کوئی بھی دشمنی مول لینا نہیں چاہتا۔ آخر اس راز سے پردہ اٹھانے کی کوشش میں یوسف کو ڈس لیتا ہے۔ لڑکی اور موہن اس ناگہانی اُفتاد سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور ایک صاحبِ کرامات بزرگ بچوں کی مدد کے لیے سامنے آتے ہیں۔ بزرگ بچوں کو بتاتے ہیں کہ انہیں سوتوں کے شہر کے پادری سے ایک لعل لانا ہوگا جسے یوسف کے مار گزیدہ عضو پر لگانے سے وہ دوبارہ زندہ ہو جائے گا۔

لڑکی کو بزرگ کے پاس چھوڑ کر موہن سوتوں کے شہر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ راستے میں مختلف صعوبتوں کا سامنا کرتے ہوئے موہن کو اپنی انگلیاں نذر

کا شدید احساس ہوتا ہے۔ قدرت کی کرم فرمائی سے اس کے ہاتھوں میں دوبارہ انگلیاں نکل آتی ہیں۔ بالآخر وہ سوتوں کے شہر میں پہنچتا ہے جہاں تمام جاندار خوابِ غفلت کے شکار ہیں۔ موہن پادری کے پاس پہنچتا ہے لیکن لعل اسے نہیں ملتا۔ اس کے لیے موہن کو موتیوں والا شنکھ لاتا ہے، یہ شنکھ سات دیوؤں کے قبضے میں ہے۔ اس شنکھ کے بجانے سے اس شہر کے تمام لوگ بیدار ہو جائیں گے، ان دیوؤں کا ظلم بھی ختم ہو جائے گا۔

موہن اپنے دوست کی خاطر اس شنکھ کو حاصل کرنے جاتا ہے اور دیو اسے پنجرے میں قید کر دیتا ہے۔ وہ شنکھ بہت بھاری ہے۔ اس کے لیے گلاب کے ایک ایسے طلسماتی پھول کی ضرورت ہے جس کے لمس سے یہ شنکھ ہلکا ہو سکتا ہے، یہ پھول ایک کوے کی چونچ میں ہے۔ یہ کوا ایسے شہر میں ہے جہاں پر ہر چیز سونے کی ہے۔ لڑکی کو خدا رسیدہ بزرگ کے عطا کردہ آئینے کی مدد سے معلوم ہو جاتا ہے کہ موہن دیو کی قید میں ہے۔ وہ عصا کی مدد سے پھول حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوتی ہے۔ اس شہر میں پہنچتی ہے جہاں ہر چیز سونے کی ہے وہاں لڑکی کو وہی جوہری سونے کا بنا ملتا ہے جو لالچ میں اندھا ہو کر اس لڑکی کو نیلام کر رہا تھا۔ جوہری کی انگلی میں جو انگوٹھی ہے اس میں پارس پتھر تھا جس کے لمس سے ہر چیز سونے کی بن جاتی تھی۔ جوہری نے غلطی سے اپنی بیٹی کو بھی پارس پتھر سے چھو لیا تھا اور اس کی بیٹی سونے کی ہو چکی ہے۔ لڑکی عصا کے مدد سے ان سب کو اپنی اصلی حالت میں واپس لاتی ہے۔ جوہری خوش ہو کر پہاڑی کوے کا پنجرا شہزادی کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کوے میں تمام دیوؤں کی جان ہے۔ لڑکی وہ کوا لے کر موہن کے پاس آتی ہے اور پہلے اس کوے کو جان سے مار دیتی ہے جس کے نتیجے میں تمام دیو بھی مر جاتے ہیں اور شنکھ بچوں کے ہاتھ آجاتا ہے۔ جسے لے کر پادری کے پاس پہنچتے ہیں۔ شنکھ بجانے سے سارا شہر بیدار ہو جاتا ہے۔ اور پادری انعام کے طور پر طلسمی لعل بچوں کو بخش دیتا ہے اور اس کے اثر سے یوسف سانپ کے زہر سے آزاد ہو جاتا ہے اور نئی زندگی حاصل کرتا ہے اور شہر بھی سانپوں کے طلسم سے نجات پاتا ہے۔ بعد ازاں بزرگ کے دیئے ہوئے جادوئی آئینہ میں یوسف اپنی ماں پر بلاؤں اور اس کے کارندوں کے ظلم و ستم کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ان ہی بزرگ کے ساتھ تینوں بچے

یوسف کی ماں کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور وہ خدا رسیدہ بزرگ لالچی بادشاہ کو زندہ دفن کر دیتے ہیں اور اس کے بعد موہن، لڑکی اور یوسف ماں کے ساتھ اپنے جھونپڑے میں ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔ یوسف بابا سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اُلٹے درخت کے آخری سرے پر جانا چاہتا ہے وہ اس پر اس راز کا انکشاف کرتے ہیں کہ وہ کوئی عام درخت نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی ترقیوں کا علامتی شجر ہے اور اس کی آخری چوٹی کو اب تک کسی نے نہیں دیکھا۔ اس لیے یوسف کو اتنے ہی تجربات پر اکتفا کرنا چاہیے۔

کرشن چندر کا یہ ناول اردو ادب اطفال میں شاہکار طبع زاد ناول کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک فنطاسیہ ناول ہے جسے طنزیہ تمثیل بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کا بڑا وصف یہ ہے کہ علامتی پیرایہ کی بنا پر بچے اور بوڑھے اس سے بیک وقت اپنی اپنی استعداد کے مطابق لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس کا ہیرو یوسف ایک بے خوف اور دلیر بچہ ہے جسے خطرات سے مقابلہ کرنے اور الجھنوں کو سلجھانے میں لطف آتا ہے۔ وہ آوازوں کے قبرستان سانپوں کے شہر میں اور دیوؤں کے شہر میں انتہائی ہولناک حادثات سے دوچار ہوتا ہے لیکن ہر جگہ اپنی فہم و فراست اور جرأت مندی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یوسف اور اس کے ساتھی موہن رحم دلی کے جذبہ سے بھی متصف ہیں۔ چنانچہ ایک روتی ہوئی بچی کو ہنسنے کی تلقین کرتے ہیں اور اسے ظلم و ستم کا مقابلہ کرنے کے لیے اُکساتے ہیں ان بچوں میں انسانیت اور حمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ یہ مساوات کے حامی اور سرمایہ داروں کے مخالف ہیں۔ جگہ جگہ ان کرداروں کی مدد سے کرشن چندر ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر دیتے ہیں اور انسان کی مادّہ پرستی نیز مفاد پسندی جیسے سفلی جذبات سے بالاتر ہو کر انسان دوستی کا سبق دیتے ہیں۔ بچوں کے اس ناول میں بھی کرشن چندر نے ترقی پسند نظریات اور حقیقت نگاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ مشینوں کا شہر ہو یا سانپوں کی بستی، ہر جگہ اپنی شہرت آمیز نثر کے وسیلے سے وہ ہماری دنیا کے حسین و قبیح مرقعے اجاگر کرتے ہیں۔

اپنے اس ناول میں کرشن چندر نے عہد رواں کی بے شمار معاشرتی خامیوں کے

چہرے سے نقاب اٹھائی ہے جو سماج کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔ اور اپنے کمسن قارئین کو بالواسطہ طور پر ان خرابیوں سے اجتناب کرنے اور انہیں دور کرنے کی تلقین کی ہے۔ مساوات، حق شناسی، باہمی اخوت سرمایہ دارانہ استحصال سے نفرت کے جذبات ابھارنے میں کرشن چندر کامیاب ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک چھوٹے سے واقعے کے ذریعے انہوں نے بچوں کو تمام انسانوں کی برابری کا سبق دیا ہے۔

سانپوں کا شہر اور سوتوں کی بستی کے بیان میں کرشن چندر نے حکمراں طبقے کی چال بازیوں اور شاطرانہ حکمت عملیوں کے نہایت پُرلطف لیکن حقیقت سے قریب مرقعے پیش کیے ہیں۔ ان کے وسیلے سے عوام الناس کو کبھی خواب غفلت میں مبتلا کر کے مٹھی بھر چالاک اور فریبی لوگ اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ سانپوں کے ڈر سے عوام کو بے حوصلہ اور پست ہمت بنا دینا بھی ویسا ہی عمل ہے۔ جیسا کہ سبز باغ دکھا کر اور حقائق سے لاعلم رکھ کر طاقتور حکومتیں اپنے مفاد کی راہیں ہموار کرتی ہیں۔

سوتوں کے شہر کی رعایا کو دیو بعینہٖ اسی طرح سوتے جاگتے کے چکر میں الجھائے ہوئے ہیں جیسے کہ خود ہمارے ملک میں عوام کو امید و بیم کے مابین معلق رکھ کر سیاسی مفادات کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور اسی خیال کی تائید کرتے ہیں۔

> "موہن آگے بڑھا تو اسے دس جلاہے کھڈیوں پر کام کرتے نظر آئے یہاں بھی یہی حالت تھی۔ تانا بانا چل رہا تھا مگر خواب کی حالت میں جلاہوں کے ہاتھ پاؤں کام کرتے تھے، کپڑا بھی بنا جا رہا تھا مگر نیند کی حالت میں . . . . ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے جلاہوں نے افیون پی رکھی ہے۔" [1]

مفاد پرستی کی بڑھتی ہوئی لے اور دنیاوی آسائشوں کے پیچھے بھاگتے رہنے کا رویہ آج اس قدر عام ہو چکا ہے کہ بچوں کو اس کے مضر اثرات سے آگاہ کرنا ہر روشن ضمیر فنکار کا فریضہ ہو جاتا ہے۔ کرشن چندر اپنے اس فرض سے نہایت فنکارانہ انداز

---

[1] کرشن چندر "الٹا درخت" ایشیا پبلشرز، دہلی ص ۱۱۴-۱۱۵

میں سبکدوش ہوتے ہیں۔ سونے کی بستی میں انہوں نے نوخیز ذہنوں کو اس نکتے سے بے حد
پر تاثیر انداز میں روشناس کرایا ہے کہ دراصل ساری ترقی اور سرمایہ کاری کا بنیادی مقصد
انسان کی فلاح و بہبود نیز سہولت اور آسائش ہے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا تو ہماری ترقی
اور دنیا کی ساری دولت بے سود ہے۔

اپنی عام تحریروں میں تخیل کی بلندی اور اشاریاتی اسلوب کے وسیلے سے کرشن چندر
پہلو داری اور معنویت میں اضافہ کرنے کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ ان کا یہ وصف ناول
"الٹا درخت" میں معراج پر نظر آتا ہے۔ جادوگروں نے الیکشن میں سفید ٹوپی کا نشان،
فلم سازوں کا الو بن کر درختوں پر معلق ہونا، مشینوں کے شہر میں ہاتھ کی تمام انگلیوں
کا غیر ضروری سمجھ کر تراش دیا جانا، کالے لوگوں کا گوروں کو محکوم بنائے رکھنا، انسانی خون
سے طلائی دیوار کی تعمیر جیسے ہزاروں رمزیت آمیز واقعات ناول میں بچوں کو بہت کچھ
سوچنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

اپنی تمام رمزیت، اشاریت اور تخیل پسندی کے باوصف کرشن چندر نے اس کے
ذریعے محض بچوں کی دل بستگی کا سامان ہی فراہم نہیں کیا ہے بلکہ ہر مناسب موقعہ پر
ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کامیاب سعی بھی کی۔ ناول پڑھ کر بچوں کو غیر محسوس طریقے
پر پارس پتھر کی ماہیت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور انہیں پتہ چلتا ہے کہ کس طرح
حکمراں اپنی رعایا کو قابو میں رکھنے کے لیے مخبری کا جال بچھائے رکھتے ہیں۔ وقت ہمیشہ
رواں دواں رہتا ہے۔ انسان کی ترقیوں کا اختتام کہیں نہیں ہوتا۔ لاش برف خانوں
میں مدتوں محفوظ رکھی جا سکتی ہے اور ایسی مفید معلومات کے ساتھ ساتھ کرشن چندر بچوں
کے دامن پر مسلمہ اخلاقی اصولوں کے نقوش بھی مرتسم کرتے چلے ہیں مثلاً نیکی کبھی ضائع
نہیں کی جاتی، ہمدردی انسانیت کا قومی جوہر ہے، لالچ بری بلا ہے، سستی اور کاہلی
افلاس کا سرچشمہ ہیں۔ محنت میں برکت ہے، ایمان داری اور صداقت کو کسی بھی قیمت پر
ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے اور دنیا کی سب سے قیمتی شے انسان ہے۔

ناول میں چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں تفصیلات اس دلچسپ پیرایہ میں بیان

کی گئی ہے کہ بچے اسے شوق سے پڑھنے پر مجبور ہوتے ہیں اور غیر محسوس طریقے پر ایسی جزئیات سے واقف ہو جاتے ہیں، جنہیں کسی طرح براہ راست طریقے سے ان کے ذہن نشین کرایا جا سکتا۔

ایک پُر لطف لیکن عجیب و غریب منظر دیکھئے :۔

"آگے جا کے انھوں نے دیکھا کہ درخت کی ایک اونچی ڈال پر ایک پنجرا لٹکا ہوا ہے اور اس میں چاند بند ہے۔

اس پنجرے کے پاس ایک عجیب شکل کا دیو بیٹھا ہے، جس کی رنگت چاندی کی سی ہے۔ اس دیو کی آنکھیں چاندی کی سی تھیں اور اس کے بازو چاندی کے تھے اور اس کی زبان چاندی کی تھی اور جب وہ بات کرتا تھا تو اس کے منہ سے لفظوں کے بجائے روپے نکلتے تھے اور یہ روپے کھنکھناتے ہوئے عجیب سی آواز پیدا کرتے ہوئے نیچے ایک بڑی سی چاندی کی طشتری میں گرتے جاتے تھے۔ ایک طشتری کے بیچ میں بڑا سوراخ تھا جس میں ایک نلی لگی ہوئی تھی جس کا ایک سرا طشتری میں اور دوسرا سرا اس دیو کی ناف میں لگا ہوا تھا۔ چنانچہ روپے دیو کے ہونٹوں سے گرتے آواز پیدا ہوتے ہوئے طشتری میں کھنکھناتے اور سوراخ سے غائب ہو کر نلی میں ہوتے ہوئے دیو کی ناف کے اندر چلے جاتے ہیں"[1]

لطیف طنز کی برمحل کارفرمائی نے اس ناول کی اصل میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے یہ جو ہر دراصل ناول کے خمیر میں اس طرح پیوست ہے کہ محض چند مثالوں سے اس کی مکمل وضاحت نہیں ہو سکتی پھر بھی کچھ مختصر مختصر اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

کرشن چندر نے تحیر، تجسس اور سسپنس کی فضا اپنے اس ماحول میں از اول تا آخر ایسی کامیابی کے ساتھ برقرار رکھی ہے کہ کوئی بھی ذہین بچہ اسے ختم کیے بغیر ہاتھ

---

[1] کرشن چندر "الٹا درخت" ایشیا پبلشرز، دہلی ص ۵۶-۵۷

سے چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ بیج کے تین دانوں کے عوض گائے کو بیچ دینا، دو بیجوں ۷ کو ٹوں کی نذر ہو جانا، ایک بیج سے الٹے درخت کا اگنا، ایسے سنسنی خیز اور تحیر انگیز نکات ہیں کہ بچے ان کا سبب اور انجام جاننے کے لیے بیقرار ہو جاتے ہیں۔ سانپوں کے شہر میں داخلے کی عجیب شرط کہ جب تک دروازہ نہ کھل جائے پلکیں نہ جھپکنے پائیں اور مارگزیدہ لوگوں کی لاشوں کا انتہائی پُراسرار طریقے سے غائب ہو جانا، یوسف کی موت کے بعد اسے زندہ کرنے کی ترکیب، سونے کے آدمیوں پر سادہ پانی چھڑک کر انہیں دوبارہ انسان کی ہیئت میں لانا وغیرہ متعدد واقعات سے ناول مزّین ہے اور کرشن چندر نے پوری داستان میں سسپنس کو برقرار رکھنے میں بھرپور کامیابی حاصل کی ہے۔

کرشن چندر نے اپنی اس فنطاسیہ میں بے جان اشیاء کو جاندار بنا کر انہیں تجسیم PERSONIFICATION عطا کی ہے اور ستار اور شنکھ جیسی بے جان چیزوں سے گفتگو کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ درخت کا بلندی کے بجائے پستی کی طرف بڑھنا، خود ایک انتہائی حیرت ناک لیکن معنی خیز بات ہے۔ یہ درخت انسان کی ترقی معکوس کی انتہائی پُرتاثیر علامت ہے جو انسان کے لیے ایٹم بم اور مزائلوں کی شکل میں بلائے ناگہانی بن گئے ہیں۔ ظفر احمد نظامی کی اس رائے سے بھی اتفاق ہے کہ:۔

> "الٹا درخت" کی زبان بہت سادہ ہے، اس کے جملوں میں ربط ہے۔ اسلوب بیان میں سادگی اور وقار ہے۔ واقعات خوبصورتی سے بیان کیے گئے ہیں۔ برائیوں کو نیچا اور اچھائیوں کو بلند اور فتحیاب دکھایا گیا ہے۔ کرشن چندر کا طرز تحریر انوکھا ہے اور انہیں زبان پر قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے موضوع خیال اور اسلوب میں ربط رکھا ہے جس سے دلچسپی کہیں بھی کم ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ اس میں تخیل بھی ہے اور معلومات کا خزینہ بھی، شعریت بھی ہے اور معنویت بھی، اشاریت بھی ہے اور طنز بھی اور تصور بھی ہے اور رمزیت بھی۔ ان کے قلم سے نثر بھی شعریت میں ڈھل کر نکلتی ہے۔"

الفعتہ کردار سازی، منظر نگاری، مرقع کشی، نفسیات، جذبات کی عکاسی تخیل کی ندرت، حقیقت پسندی، پُر کشش اسلوب سادہ لیکن رواں دواں زبان ہر اعتبار کرشن چندر کا یہ ناول اردو ادب اطفال میں بیحد اہمیت کا حامل ہے۔ اسے یہ شرف بھی حاصل ہے کہ یہ بچوں کا پہلا طبع زاد ناول ہے۔

خوفناک جزیرہ" "کالی دنیا" "نیلی دنیا" (سراج انور)

دورِ جدید میں سائنس، سراغ رسانی اور مُہمات پر ناول بچوں میں بہت مقبول ہوئے ہیں لیکن جن ناولوں میں ان موضوعات کے ساتھ ساتھ تخیلات کی کارفرمائی اور مافوق الفطرت واقعات اور کرداروں کی آمیزش بھی ہوا انہیں بچوں میں اور زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ سراج انور کے سلسلے وار ناول خوفناک جزیرہ، کالی دنیا اور نیلی دنیا کی نوعیت بھی یہی ہے۔ ان ناولوں میں محیر العقول واقعات، سائنسی کرشمے، سراغ رسانی کے کارنامے اور مہمات کی رودادوں نے مل جل کر ایسی پُرکشش اور دلچسپ صورت اختیار کر لی ہے کہ بچے ہی کیا بڑے بھی انہیں از اول تا آخر ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور حسب استعداد محظوظ ہوتے ہیں۔ تینوں ناول مل کر ایک مثلث کی تکمیل کرتے ہیں۔ "خوفناک جزیرہ" میں ہماری دنیا کے دور دراز علاقوں کی مہمات کی حکایات لذیذ پیش کی گئی ہیں۔ "کالی دنیا" میں اس سلسلے کو طول دے کر ناول کے ہیرو تحت الثریٰ کی عجیب و غریب اور اس کے عجائبات نبرد آزما ہوتے دکھایا گیا ہے اور اس سلسلے کی تیسری کڑی "نیلی دنیا" وہی ہیرو خلا میں مختلف ستاروں کی سیر کرتا نظر آتا ہے۔ ناولوں کا مرکزی کردار اور ہیرو فیروز جو تینوں ناولوں میں صیغہ واحد متکلم میں قارئین سے ہم کلام ہو کر تین آپ بیتیاں بیان کرتا ہے جسے سن کر قدیم داستان "الف لیلیٰ" کا کردار "سند باد جہازی" اور اس کے سات سفر بیساختہ یاد آتے ہیں۔

"خوفناک جزیرہ" کے واقعات سے گزرتے وقت فیروز کی عمر چودہ برس کی ہے وہ دہلی کے ایک ہوٹل میں معمولی بیرا ہے۔ اس کو سیر و سیاحت اور مہم جوئی سے

اوائل عمر ہی سے رغبت ہے۔ ایک دن اسے ہوٹل میں تین غیر ملکی سیاح آکر مقیم ہوتے ہیں ان کی گفتگو سے اس کو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تینوں کسی مہم پر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ جان عبدل اور جیک ہیں۔ جان امریکہ کا بہترین سائنسداں ہے وہ دنیا کی بیشتر زبانیں جانتا ہے افریقی جیک جسمانی اعتبار سے بہت طاقتور ہے اور تیسرا ساتھی عبدل مصری ہے جو چاقو زنی کا ماہر ہے۔

فیروز کی خواہش پر جان نے اپنا ملازم بنا لیا ہے اور اس سفر میں فیروز کو اپنے ساتھ لے جانے پر آمادگی ظاہر کرتا ہے۔ یہ لوگ ایک خوفناک جزیرے پر پہنچ کر وہاں سے مافوق الفطرت مکھی کی طلسمی آنکھیں حاصل کر کے ان آنکھوں کی مدد سے خزانہ حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ خوفناک جزیرے تک رسائی بیحد دشوار ہے اور جان لیوا بھی۔ لیکن فیروز اور اس کے ساتھی نہایت جانبازی کے ساتھ متعدد ہولناک واقعات سے گزر کر اس جزیرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس عجیب و غریب دیوزاد مکھی کو تلاش کر لیتے ہیں اور بہ ہزار دقت اسے شکار کرتے ہیں نیز اس کی آنکھیں حاصل کر لیتے ہیں۔ ان آنکھوں پر قبضہ کرنے سے انہیں مطلوبہ دفینے تک رسائی ہو جاتی ہے۔ اس مہم میں انہیں ایک بڑے جادوگر کو شکست دینی پڑتی ہے۔ عبدل اس مہم میں مارا جاتا ہے خزانے پر قابو پا لینے کے بعد جان اور جیک اسے فیروز کو بخش دیتے ہیں۔ کیونکہ اس کی جانبازی اور دیانتداری نے انہیں بیحد متاثر کیا ہے۔ مکھی کی طلسمی آنکھیں جان امریکہ لے کر چلا جاتا ہے۔

وطن آنے پر فیروز کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نواب کا پوتا ہے۔ "خوف ناک جزیرہ" کے اختتام پر فیروز کو شادی شدہ خوش حال زندگی بسر کرتے دکھایا گیا ہے۔

"خوفناک جزیرہ" کے سلسلے کی دوسری کڑی ناول "کالی دنیا" ہے جس میں ہیرو نواب زادہ فیروز دو بچوں کا باپ ہے اور ان کے ساتھ تحت الثریٰ میں پہنچ کر ایک مہم سر کرتا ہے۔ اختر اور نجمہ کی عمر بالترتیب چودہ پندرہ برس کی ہے۔ یہ بچے بھی باپ کی طرح نڈر بہادر اور مہم جوئی کے دل دادہ ہیں۔ ان کی پرورش اور تربیت میں فیروز کے ملازم بلونت کا نمایاں حصہ رہا ہے۔

ایک دن فیروز کو اچانک اپنے محسن جان کا ایک پُراسرار خط موصول ہوتا ہے۔

جس میں تحریر ہے کہ جان اپنے ساتھی جیک کے ساتھ ایک ویران اور خوفناک جزیرے میں مصائب سے دوچار ہے اور اسے فیروز کی مدد درکار ہے۔ فیروز، بلونت اور کرشنا سوامی کے ساتھ اپنے محسن کی مدد کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ فیروز کے علم میں لائے بغیر اس کے بچے نجمہ اور اختر بھی اسٹیمر کے نچلے حصے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ جس کا علم ہزاروں میل کا سمندری سفر کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ فیروز اور اس کے ساتھی بھٹکتے اور مصیبتیں جھیلتے ہوئے ایک بار پھر خوفناک جزیرے میں پہنچتے ہیں جس کا ذکر اس سیریز کے پہلے ناول میں آچکا ہے جزیرے کے قریب پہنچتے پہنچتے ان کا اسٹیمر طوفان میں تباہ ہو جاتا ہے اور ان کا ساتھی بلونت بھی ان سے بچھڑ جاتا ہے۔

اس بار اس خوفناک جزیرے پر انہیں عجیب الخلقت مخلوق زدک سے سابقہ پڑتا ہے۔ جان اور جیک زدک لوگوں کے ہی قیدی ہیں۔ زہرہ ستیارے کے دو سائنسداں شاگو اور جیگا آپس میں ٹکرا گئے ہیں۔ شاگو امن پسند ہے جب کہ جیگا بہت ظالم اور تخریب کار ہے اور اس جزیرے کو کرۂ ارض سے زہرہ پر لے جانا چاہتا ہے۔ اس جزیرے پر سوبیا دھات کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ زہرہ باشندوں کے لیے یہ دھات بہت کارآمد ہے۔ وہاں کارخانے، موٹریں اور راکٹ وغیرہ اسی دھات سے چلتے ہیں۔ جیگا اس دھات کا استعمال تخریبی کاموں کے لیے کرنا چاہتا ہے۔ جیگا نے اس جزیرے پر ایک زمین دوز بستی بنا رکھی ہے اور اس بستی کا نام "کالی دنیا" ہے۔ اس "کالی دنیا" میں جیگا کے تخلیق کردہ روبوٹ سارا کام انجام دیتے ہیں۔

جان، جیک، فیروز، کرشنا سوامی، نجمہ اور اختر انتہائی دشوار مراحل سے گزرتے ہیں، جیگا ان کو مسلسل اذیتیں پہنچاتا ہے۔ نجمہ اور اختر اس مہم میں بڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اور بالآخر ان ہی کی دانشمندی اور دلیری سے جیگا کو شکست ہوتی ہے اس کی زمین دوز سائنسی "کالی دنیا" برباد ہو جاتی ہے اور یہ راز بھی آخر میں منکشف ہوتا ہے کہ جیگا کوئی اور نہیں بلونت تھا جو سائنس کی مدد سے اپنی شکل تبدیل کر کے انسانی ہیئت میں ان کے ساتھ تھا۔

ستارہ زہرہ کا سائنس داں شاگو ان بچوں کا بہت شکر گذار ہوتا ہے اور انہیں زہرہ سیارے پر آنے کی دعوت دیتا ہے نیز ان کو بہت سا زروجواہر دے کر اپنے سیارے پر واپس چلا جاتا ہے۔

"خوفناک جزیرے" کی تیسری ناول ٹیلی دنیا ہے اس سیریز کے دوسرے ناول "کالی دنیا" کے فیروز اور اس کے ساتھی، اس ناول میں خلائی مہمات سر کرتے نظر آتے ہیں "کالی دنیا" میں زہرہ کے سائنس داں جیگا کی عبرتناک شکست ہوئی تھی۔ اب اس کے ہمنوا اور پیروکار فیروز اور اس کے بچوں سے جیگا کی تباہی کا انتقام لینا چاہتے ہیں جیک اور جان امریکہ میں ہیں۔ نجمہ کی شادی امجد سے ہو چکی ہے جو "کالی دنیا" کا مہم میں ان لوگوں کا شریک کار تھا۔ ایک دن اچانک امجد اور نجمہ کی کار اغوا کر لی جاتی ہے اور خلا میں پہنچادی جاتی ہے ۔ بعد ازاں فیروز کو ٹیلی ویژن میں ایک اشارہ ملتا ہے اور اس کے ساتھ ہی زہرہ سیارے کے باشندے زوک اور جکاری اس کے کمرے میں آکر اسے متنبہ کرتے ہیں کہ نجمہ اور امجد کو زہرہ پر اغوا کر لیا گیا ہے اور جیگا کی موت کا بدلہ اس سے ضرور لیا جائے گا۔

جیگا کی منتقمانہ کارروائی کے نتیجے میں فیروز کے ملک میں کیڑے مکوڑے اور زہریلے جانور اچانک اپنی اصلی جسامت سے بدرجہا بڑے ہو جاتے ہیں اور انسانوں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ اس اچانک آفت ناگہانی سے پورے ملک میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ادھر امریکہ میں مقیم جان اور جیک کو زہرہ سیارے کا امن پسند سائنس داں خطرے سے آگاہ کرتا ہے۔ شاگو کو زہرہ کی نئی حکومت نے قید کر دیا تھا۔ جان اور جیک ہندوستان آکر اپنی سائنسی ایجادات کی مدد سے ملک کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلاتے ہیں، شاگو کی فراہم کردہ ہدایات کے مطابق ایک خلائی راکٹ تیار کیا جاتا ہے جس کی مدد سے فیروز، جان، جیک، اختر اور کرشن سواتی زہرہ سیارے پر پہنچتے ہیں۔

جیگا ایک ساتھی شاکا زہرہ کا نیا حکمراں ہے۔ شاکا کرۂ ارض ہی نہیں اپنے سیارے زہرہ کے باشندوں کے لیے بھی مضر ثابت ہو رہا ہے۔ فیروز اور اس کے ساتھی

اپنی فہم و فراست اور شجاعت سے زہرہ کے باشندوں کو اس ظالم حکمراں سے نجات دلاتے ہیں اور نجمہ کو رہائی نصیب ہوتی ہے۔

سراج انور کے ان سیریز ناولوں (خوفناک جزیرہ، کالی دنیا، نیلی دنیا) کا پلاٹ مختلف النوع مہمات پر مشتمل ہے۔ "خوفناک جزیرے" میں ایک چودہ سال کے فیروز کے سمندری سفر اور بحری مہمات کی حیرت انگیز داستان بیان کی گئی ہے۔ فیروز نے قدم قدم پر ہزاروں مصیبتیں جھیلیں۔ طوفانوں سے لڑا، خطروں کا مقابلہ کیا اور نہایت عجیب و غریب واقعات سے گزرنے کے بعد اپنی دلیری اور سوجھ بوجھ نیز دیگر اوصاف حمیدہ کی بنا پر ایک معمولی بیرے سے ترقی کر کے ایک بڑی جہاز راں کمپنی کا مالک بن گیا۔ یہ ناول سائنسی فکشن اور فنطاسیے کا پُرلطف امتزاج ہے۔ اس ناول میں پتھر کے دیو ہیں جو سو بیا دھات کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ پتھر کے دیو چٹانوں میں اس طرح سما جاتے ہیں جیسے پانی کا قطرہ مٹی میں جذب ہو جاتا ہے۔ ناول میں عجیب و غریب سرزمین حیرت انگیز پہاڑ اور مافوق الفطرت پرندے اور جانور ہیں۔ قدم قدم پر دلچسپ اور حیرت ناک اور دل دہلا دینے والے بے شمار واقعات سے سراج انور نے ناول کو پُرلطف بنا دیا ہے۔

ناول "کالی دنیا" بھی فنطاسیے اور سائنسی مہمات کا دلچسپ آمیزہ ہے اور اس میں "خوفناک جزیرے" سے ایک منزل آگے جا کر تحت الثریٰ کی مہمات اور واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ اس میں دنیا کے حیرت انگیز سائنسی کرشموں کا بیان فنکاری کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس دنیا میں تین فٹ کی ایک عجیب مخلوق، دیو ہیکل گرگٹ اور ہیبت ناک آدم خور نظر آتے ہیں۔ البتہ فیروز کے ساتھیوں میں اس کے بچوں (نجمہ اور اختر) کا اضافہ ہو چکا ہے۔ یہ لوگ "سیارہ زہرہ" کے ظالم سائنسداں جیگا کے تعاقب میں سمندر کے نیچے پاتال میں پہنچتے ہیں۔ جہاں انہیں کبھی برفانی مخلوق سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ کبھی یہ آدم خوروں کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں کہیں یہ لوگ بونوں کے شہر میں صعوبتوں سے گزرتے ہیں تو کہیں چلتے پھرتے درختوں اور خوفناک

گرگٹوں سے مقابل ہوتے ہیں اور یہ سب مصیبتیں وہ لوگ نہایت حوصلہ مندی کے ساتھ محض اپنی پیاری دنیا کی سلامتی کے لیے برداشت کرتے ہیں۔

اس استعجاب انگیز داستان کی آخری کڑی ناول "نیلی دنیا" میں سراج انور کا زرخیز ذہن خلا میں قارئین کو نئے جہانوں کی سیر کراتا ہے۔ فیروز اور اس کے ساتھیوں اور بچوں کو زہرہ سیارے کے نئے حکمراں شاکا کی انتقامی کارروائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس ناول میں بھی سائنس اور فنطاسیہ کی ملی جلی کارفرمائی ہے۔ شاکا کرۂ ارض کو تباہ کرنے کے درپے ہے۔ اپنی دنیا کو بچانے کے لئے فیروز اپنی ٹیم کے ساتھ زمین سے بہت دور خلا میں جاکر زہرہ سیارے پر دشمن کا مقابلہ کرتا ہے، جہاں اسے خوفناک بلائیں عجیب و غریب مخلوق اور ہولناک درندوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اس مہم میں فیروز اور اس کے ساتھی دوسرے سیارے کی سیر کرتے ہیں۔ انجام کار جابر حکمراں شاکا کو ختم کر کے زہرہ سیارے کے باشندوں کو ظلم و ستم سے نجات دلاتے ہیں اور بخیر و عافیت کرۂ ارض پر لوٹ آتے ہیں۔

تینوں سیریز ناولوں کا پلاٹ خوفناک مناظر بھیانک واقعات اور جہاتی کارناموں سے لبریز ہے۔ جن میں بچوں کی دلچسپی کے ہمراہ انہیں زمین، خلا، تحت الثریٰ اور مختلف سیاروں کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ نیز جدید سائنسی انکشافات اور ایجادات سے فنکارانہ انداز میں روشناس کرایا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر ان ناولوں میں فنطاسیہ کی شان بھی پائی جاتی ہے۔ جو کرشن چندر کے ناول "الٹا درخت" کی یاد تازہ رکھتی ہے۔ واقعہ نگاری میں سراج انور نے مہارتِ فن کا ثبوت دیا ہے انہیں بیانیہ پر قدرت حاصل ہے۔ پیچیدہ واقعات اور محیر العقول واقعات بیان کرتے ہوئے بھی ان کا قلم کہیں لغزش کرتا نظر نہیں آتا۔

مریخ کے لوگوں کی انتقامی کارروائی سے متاثر انسان کس طرح سراسیمہ و سرگرداں ہیں، اس کی مثال ملاحظہ ہو:۔

"شہر میں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ معمولی سے معمولی اور حقیر

سے حقیر جانور بھی بیحد خطرناک ہو چکے تھے۔ مچھر اور چیونٹیاں بڑھ کر مرغی کے برابر ہو گئی تھیں اور ان چیونٹیوں نے دکانوں اور مکانوں پر حملہ بول دیا تھا۔ شکر کے گودام منٹوں اور سیکنڈوں میں صاف ہو گئے تھے۔ مچھروں کی سونڈ ایک لمبے سے خنجر کی طرح ہر ایک کو صاف نظر آتی تھی۔ مچھروں کے ڈسنے سے بہت سے آدمی مر گئے اور چیونٹیوں کے کاٹنے سے لوگوں کے جسم سوج کر سُرخ ہو گئے۔ سانپ بڑھتے بڑھتے اژدھے بن گئے۔۔۔۔ کُتّے بالکل شیر نظر آتے تھے۔ انھوں نے راہ چلتے آدمیوں کو مار ڈالا۔"[1]

سراج انور نے استعجاب انگیز جانوروں اور مافوق الفطرت مخلوق، عظیم الجثہ کیڑے مکوڑوں کی تصویر کشی میں کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے اور ان ناولوں میں ایک اچھے فنطاسیہ کی خوبی بھی پیدا کر دی ہے۔ مثال کے طور پر ایک دیو پیکر مکھی کا ہیبت ناک حلیہ دیکھئے:۔

"عجیب دیوزاد مکھی ہے جس کا قد اونٹ سے بھی اونچا ہے لمبائی میں وہ گینڈے سے بھی لمبی ہے۔ اس کی ناک سے شعلے نکلتے ہیں، وہ بے حد خطرناک ہے اور سمندر میں رہتی ہے۔ صرف چاندرات کو جبکہ جزیرہ سمندر کی سطح پر نمودار ہوتا ہے وہ شکار کی غرض سے ہوا میں اڑتی ہے۔۔۔۔ اس کی آنکھیں اگر احتیاط سے نکال لی جائیں تو چھپے ہوئے دفینوں کو خود بخود زمین میں سے کھینچ کر باہر نکال لیتی ہیں۔"[1]

مندرجہ بالا اقتباس میں مصنف نے ایک عام مکھی کو بڑھا کر دیو قامت بنا دیا ہے اور اس ضمن میں جزئیات نگاری کا کمال بھی دکھایا ہے۔ اب ایک عجیب الخلقت

---

[1] سراج انور: نیلی دنیا، کھلونا بکڈپو، نئی دہلی ص ۵۰

مخلوق کا نقشہ ملاحظہ ہو۔ یہ زہرہ کے باشندے زوک ہیں جن کا حلیہ پیش کرتے ہوئے سراج انور نے تخیل کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔

سراج انور نے ان سلسلے وار ناولوں میں کردار نگاری پر مہارتِ فن کا ثبوت دیا ہے۔ ان ناولوں کا ہیرو نواب زاد فیروز ہے جو بچپن سے ہی نہایت نڈر بہادر، ایماندار مہم جو اور حصول مقصد کے لیے مصیبتوں کے جھیلنے کا خوگر ہے۔ فیروز کی ان خصوصیات کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے چودہ سال کی عمر میں ہی "خوفناک جزیرے" کی مہم سر کر لی تھی اور اپنی محنت اور شرافت وفاداری اور شجاعت کے صلے میں ایک معمولی بیرے سے ایک بڑے جہاز راں کمپنی کا مالک بن گیا تھا۔

فیروز نہایت بے خوف اور باہمت انسان ہے۔ بڑی سے بڑی مشکل کا سامنا ہمیشہ خندہ پیشانی سے کرتا ہے۔ "کالی دنیا" کی مہم کے دوران فیروز اور اس کے ساتھیوں کا جہاز غرق آب ہو چکا ہے اور سمندروں کی لہروں نے ان کو ایک ویران لق و دق جزیرے پر لا پھینکا ہے، جہاں انسان کا نام و نشان نہیں اور گدھ زندہ انسانوں کا گوشت کھاتے ہیں۔ اس جزیرے پر اس نے حوصلہ مندی بے خوفی کا مظاہرہ کیا وہ بھی سراج انور کی کردار نگاری پر قدرت کا ثبوت ہے۔

> "شاید وہ کسی تکلیف کا ہی احساس تھا جس کی وجہ سے مجھے ہوش آ گیا اور ہوش میں آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ایک گدھ میرے سینے پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کی نوکیلی چونچ میں شاید میرے ہی سینے کی بوٹی ہے۔ اس خیال نے کہ گدھ ہم زندہ انسانوں کو نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں، مجھے پھر زندہ کر دیا۔ نہ جانے میرے جسم میں اچانک کہاں سے طاقت آ گئی۔ . . . میں تھوڑا سا کسمسایا مجھے ہلتے دیکھ کر وہ گدھ ایک چیخ مار کر اڑ گیا۔" [۱]

---

[۱] سراج انور "کالی دنیا" کھلونا بکڈپو، نئی دہلی۔ ص ۹۵

یہاں اس امر کا اعتراف بھی کرنا چاہیے کہ خوف و دہشت کے جذبات کی ترجمانی کا فن بھی مصنف کو خوب آتا ہے۔

فیروز کی زندگی کا بیشتر حصہ مختلف النوع مہمات سر کرنے میں گزرا۔ اس کی زندگی کا بڑا حصہ سمندروں، پہاڑوں، جنگلوں اور جزیروں پر گزرتا ہے۔ اس نے اپنی محنت، شرافت، وفاداری اور ایمانداری سے بے پناہ دولت حاصل کی لیکن اپنے فرض سے بھی غافل نہیں رہا۔ فیروز نے اپنی زندگی میں مختلف دور دیکھے لیکن ہر حیثیت سے اس کا کردار مثالی رہا۔ مالک کی حیثیت سے وہ اپنے ملازمین کا ہمدرد اور غمگسار رہے، باپ کی حیثیت سے اس نے کسی بھی موقعہ پر اپنے بچوں کے جذبات، خیالات اور ان کی خوشیوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ بحیثیت شوہر اس نے زرینہ کے دامن میں دنیا بھر کی خوشیاں بھر دیں۔ زندگی بھر وہ اپنے محسن جان کا احسان مند رہا۔ اپنے محسن کی جان بچانے کے لیے خود اپنی زندگی خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ جان کا پیغام ملتے ہی اس کے دل و دماغ کی جو کیفیت ہوئی اس کا بیان سراج انور نے بڑی چابکدستی سے کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے کرداروں کی نفسیات اور جذبات کی عکاسی پر پوری قدرت حاصل ہے۔

نجمہ اور اختر بھی بچپن سے ہی بے خوف، باہمت اور بہادر ہیں۔ نیز مہمات سر کرنے کے خواہش مند۔ فیروز جب جان اور جیک کو بچانے انجانے جزیرے کی طرف روانہ ہوتا ہے تو یہ بچے چھپ کر جہاز میں بیٹھ جاتے ہیں۔ نجمہ بھولی بھالی کمسن لڑکی ہے لیکن اس مہم کو سر کرنے میں نمایاں رول ادا کرتی ہے۔ جزیرے پر جب یہ لوگ راہ سے بھٹک جاتے ہیں اور جان و جیک تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو نجمہ کی دانشمندی ان لوگوں کی رہنمائی کرتی ہے۔

جان سیریز ناولوں کا دوسرا اہم کردار ہے جو امریکہ کا ایک سائنسداں ہے اور دنیا بھر میں امن و آشتی کی فضا عام کرنا چاہتا ہے۔ جان انتہائی بے لوث اور قناعت پسند ہے۔ وہ ساری مصیبتیں اور پریشانیاں محض بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کی خاطر

برداشت کرتا ہے۔

جان بہت بڑا سائنسداں ہے اور خلا کے بہت سے رازہائے سربستہ اس پر عیاں ہو چکے ہیں۔ اس کی سائنسی معلومات کے وسیلے سے سراج انور نے بچوں کو بہت سے سائنسی نکات اور جدید معلومات اس طرح آمیز کر دی گئی ہے کہ کمسن قارئین موضوع کی خشکی کا احساس نہیں کرتے۔

ناول "خوفناک جزیرے" کے دو اہم ضمنی کردار عبدل اور کبڑا جادوگر چین خودغرض اور لالچی ہیں اور اس مہم کے دوران اپنے کیفرکردار کو پہنچتے ہیں۔ زہرہ سیارے کے باشندے شاگو جیگا، والٹر اور شاکا کے کردار بھی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ زہرہ کے ان باشندوں کا کردار واضح کرنے میں سراج انور نے مہارت فن کا ثبوت دیا ہے۔ سائنسداں جیگا تخریب کار ہے اور کرۂ ارض کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ جیگا کا تعارف شاگو کی زبانی۔

> "جیگا میں کئی خوبیاں ہیں، وہ سائنس کے بل بوتے پر اپنی شکل بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ چاہے تو ہوا میں مل سکتا ہے اور چاہے تو پانی بن سکتا ہے۔" [1]

ان ناولوں میں جگہ جگہ جذبات نگاری کے بھی اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔ بہن بھائی کی باہمی کیفیت، والدین کی بچوں کے لیے قربانیاں، فیروز کا اپنے محسن جان کے لیے جذبۂ ایثار، حُبّ الوطنی اور انسان دوستی کے احساسات و جذبات سے متعلق خوبصورت مرقعے ان تینوں سیریز ناولوں میں جابجا نظر آتے ہیں۔ نجمہ کی کار زہرہ والوں نے اغوا کر لی ہے۔

فیروز اور اس کے ساتھی دنیا میں امن وسکون کی فضا عام کرنا چاہتے ہیں اور خودغرضی اور فریب کاری، اونچ نیچ کی تفریق کو مٹا کر مساوات کا علم بلند کرنے کے

---

[1] سراج انور "کالی دنیا" کھلونا بکڈپو۔ نئی دہلی۔ ص ۱۱۰

خواہش مند ہیں۔ یہ لوگ کرۂ ارض پر ہی نہیں بلکہ سیاروں کی فرضی دنیاؤں میں بھی ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح ہماری دنیا کو خلائی جنگوں سے جو خدشات لاحق ہیں ان سے نئی نسل کو غیر شعوری طور پر متنبہ کرنے کی کوشش میں سراج انور نے خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔

ان تینوں سلسلہ وار ناولوں میں موجودہ معاشرہ کی خامیوں اور نظام حکومت کی خام کاریوں پر جگہ جگہ لطیف طنز بھی کئے گئے ہیں تاکہ پڑھنے والے بچے ان سے اجتناب کریں اور اپنے کرداروں میں وہ خوبیاں پیدا کریں جنہیں سراج انور عزیز رکھتے ہیں۔ بقول مصنف بعض معاملات میں جانور، انسان سے کہیں بہتر ہیں۔ ایک جگہ بندر کی معاونت سے مستفیض ہونے کے بعد فیروز کہتا ہے۔

"حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک ہم انسان ہیں کہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اور ایک یہ جانور ہیں جو کسی انسان کا ذرا سا احسان بھی اٹھانا گوارہ نہیں کرتے اور فوراً اس احسان کا بدلہ چکا دیتے ہیں۔"[1]

"نیلی دنیا" میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مفاد پرست دنیا کی افراتفری دیکھ کر ہی دوسرے سیاروں کی مخلوق کرۂ ارض کو تباہ کرنا چاہتی ہے۔

سراج انور کی ان سیریز ناولوں کی زبان سادہ، عام فہم ہے۔ نیز مصنف نے روزمرہ کی بول چال سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مصنف نے اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا ہے کہ الفاظ کا استعمال بچوں کی ذہنی استعداد اور فہم و ذکا کے مطابق ہو۔ دقیق، ثقیل اور مشکل الفاظ کم برتے گئے ہیں۔ یہ تینوں ناول بیانیہ (واحد متکلم) کے صیغے میں بیان کیے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے قارئین خود کو ناولوں کے ہیرو سے ہم کلام تصور کرنے لگتے ہیں۔ اور اس کے لیے انسانیت کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ کہانی

---

[1] سراج انور "کالی دنیا" کھلونا بکڈپو، نئی دہلی ص ۷۰

لکھنے کا فن سراج انور کو خوب آتا ہے۔ مثلاً "نیلی دنیا" کی ابتدا ہی سے آنے والے واقعات کی ہلکی سی جھلک دکھا کر انہوں نے پڑھنے والوں کو ایسے سسپنس میں مبتلا کر دیا ہے کہ مکمل ناول کو پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔

فیروز نے اپنے اوپر بیتی ہوئی ہزاروں آفتوں اور مصیبتوں کا ذکر کر کے قاری کی دلچسپی کو اپنی داستان کی طرف مرکوز کر لیا ہے۔ سراج نے اپنے ان ناولوں میں کرداروں کے حسب حیثیت لہجے اور لفظیات کا استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک معمولی مچھیرے اور جہاز راں کمپنی کے مالک فیروز کی گفتگو ملاحظہ ہو:۔

"میرا باپ بہت غریب اور ان پڑھ ہے۔ سرکار! اپنے خاندان میں صرف میں ہی تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہوں حضور۔ میرے باپ نے مجھے یہ بوتل دے کر آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ کل سمندر میں مچھلیاں پکڑ رہا تھا کہ یہ بوتل اسے سمندر کے اندر بہتی ہوئی نظر آئی۔ لہریں اسے ساحل کی طرف لے جا رہی تھیں۔ اس نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ اور آج میں اسے لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔"

کیوں — ! میں نے تعجب سے دریافت کیا۔"

اس لیے حضور یہ بوتل آپ کے نام ہے۔"

میں نے یکایک چونک کر کہا۔

میرے نام — کیا مطلب! "[1]

مندرجہ بالا اقتباس میں مچھیرے نے اپنے باپ کے لیے واحد غائب اور فیروز کے لیے حضور اور جناب جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

بچوں کے مکالمے چھوٹے چھوٹے اور ان ہی کی زبان میں ہیں۔ مثلاً:

"مجھے دیکھتے ہی وہ ایک زور کی چیخ مار کر میرے سینے پر لیٹ گیا۔

---

[1] سراج انور "کالی دنیا" کھلونا بکڈپو نئی دہلی ص ۱۹

"اباجی — اباجی مجھے بچائیے۔"

کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟ میں نے گھبرا کر کہا۔

اباجی — وہ — وہ غائب ہو گیا — میری نظروں کے سامنے غائب ہو گیا — خوف کے مارے اختر پھر بُری طرح لرزنے لگا۔"

کون غائب ہو گیا۔؟ میں نے حیرت سے کہا۔ اختر کیا کہہ رہے ہو تم نے کیا چیز دیکھی ہے؟"

. . . . وہ — وہ غائب ہو گیا۔" اختر کی آنکھیں اچانک پتھرانے لگیں اور وہ زمین پر گرنے لگا۔"[1]

ان سیریز ناولوں میں کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جنہیں سراج انور کی خامیوں سے تعبیر کرنا ہوگا۔ سب سے بڑی خامی تو میری نگاہ میں یہی ہے کہ ان ناولوں کی مجموعی ضخامت گیارہ سو صفحات ہے۔ جو چودہ پندرہ برس کے موجودہ دور کے بچوں کے لیے بہت زیادہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تجارتی مقاصد کے تحت ناشرین نے مصنف کو طویل ناول لکھنے پر آمادہ کیا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ "کالی دنیا" میں ناول "خوفناک جزیرہ" کی تلخیص بیان کر کے صفحات کی طوالت بڑھائی گئی ہے۔ اور یہی صورت "نیلی دنیا" میں بھی نظر آتی ہے۔ جہاں "خوفناک جزیرے" اور "کالی دنیا" دونوں کی تلخیص موجود ہے۔ اکثر مقامات پر سراج انور حسنِ تناسب کا التزام نہیں کر سکے۔ چنانچہ کہیں تو غیر اہم واقعات کی تفصیل اور غیر ضروری منظر کشی نے صفحات کے صفحات صرف کر دیئے گئے ہیں اور کہیں تفصیل طلب امور کو ایک آدھ پیراگراف میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ بعض اوقات یہ بھی گمان گذرتا ہے کہ مصنف اور ناشر دونوں نے مل کر شعوری کوشش کی ہے کہ یہ ناول بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں میں بھی مقبول ہوں تاکہ حلقۂ اشاعت بڑھایا جا سکے۔ اس وجہ سے فیروز پہلے ناول میں چودہ برس کا لڑکا تھا۔ دوناولوں میں

---

[1] سراج انور "کالی دنیا" کھلونا بکڈپو، نئی دہلی۔ ص ۲۸-۲۹

نہ صرف دو بچّوں کا باپ بن جاتا ہے بلکہ دوسرے ناول کے اختتام تک اس کی بیٹی کی شادی بھی ہو جاتی ہے۔

میرے اس خیال کی تائید یوں بھی ہو جاتی ہے کہ ماہنامہ کھلونا (نئی دہلی) میں تو ان کا اشتہار مسلسل بچّوں کے ناول کی حیثیت سے دیا جاتا رہا ہے لیکن تینوں ناولوں پر کہیں بھی اس امر کی وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ بچّوں کے ناول ہیں۔

ناول کی پیشکش میں بھی حسنِ تناسب اور ہمواری کی نمایاں کمی محسوس ہوتی ہے۔ "خوفناک جزیرے" اور "کالی دنیا" کی کتابت نسبتاً جلی حروف میں ہے جو بچّوں کے لیے مناسب بھی ہے لیکن دونوں ناولوں میں تصاویر شامل نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس سیریز کا تیسرا ناول "نیلی دنیا" دلکش اور مناسب تصاویر سے مزیّن کیا گیا ہے لیکن اس کی کتابت خفی قلم میں ہے۔ تینوں ناولوں کی مجموعی قیمت بھی چالیس روپے ہے۔ ظاہر ہے اتنی قیمتی کتابیں اردو کا ایک عام بچہ خریدنے کی سکت نہیں رکھتا۔

ان خامیوں کے باوجود سراج انور کے یہ ناول اپنی انفرادیت اور اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔

ہکلا طوطا (مظہر الحق علوی)

ناول "ہکلا طوطا" بچّوں کو سراغ رسانی کی نئی تکنیک سے روشناس کراتا ہے۔ اس کے مصنّف مظہر الحق علوی ہیں۔ علوی نے بڑوں کے لیے پچاس سے زائد ہیجانی اور پر اسرار ناول انگریزی سے اُردو میں منتقل کیے اور اس تجربے اور مہارت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بچّوں کے لیے بھی کئی اسی نوعیت کے ناول بھی ترجمہ کیے ہیں اور ماخوذ تخلیقات بھی قلم بند کی ہیں لیکن پیشِ نظر ناول ان کی طبع زاد تخلیق ہے۔

ناول "ہکلا طوطا" شرافت، جہانگیر اور طارق نامی تین جاسوسوں کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ تینوں مختلف اور منفرد صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ سراغرسانی کے اس کارنامے کا پلاٹ مندرجہ ذیل ہے۔

مشہور ناظم استاد عابد کا ایک طوطا ہکلا گم ہو گیا ہے۔ عابد اسے تلاش کرنے کے لیے جہانگیر، شرافت اور طارق کی خدمات حاصل کرتا ہے اور تینوں اس کی کھوج میں دل و جان سے لگ جاتے ہیں۔ ابتدا سے ہی انہیں بہت سے مصائب مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور ناول کے پہلے باب میں ہی ان کا سابقہ مجرموں سے ہے۔ بہرام ان مجرموں کا سرغنہ ہے۔ مجرموں کے جال دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ دراصل سات "ہکلے طوطے" مجرموں کے لیے کوڈ ورڈس میں پیغام رسانی کا کام کرتے ہیں۔ سرفراز بھی ایک مجرم ہے لیکن وہ بہرام کے چنگل سے نکلنا چاہتا ہے اور در پردہ ان تینوں جاسوسوں کی مدد کرتا ہے۔

ناول کا پلاٹ ہندوستانی نوادرات کی چوری کے واقعات سے تشکیل دیا گیا ہے۔ چاند مل اس گروہ کا ایک مجرم ہے اور چھپ کر جاسوسوں کی معاونت کرتا ہے۔ اس کی مدد سے ان جاسوسوں کو حیثیت کا علم ہوتا ہے اور کوڈ ورڈس کا پتہ بھی چاند مل نے بھی ایک مینا کو تربیت دے رکھی ہے۔ اس مینا کو کالے عقاب کا نام دیا گیا ہے۔ طوطوں کے پیغام ٹیلیفون پر بھی دیئے جاتے ہیں۔ ان جاسوسوں کی مڈبھیڑ مجرموں سے کئی بار ہوتی ہے۔ آخر یہ تینوں جاسوس ایک قبرستان میں نوادرات کے پوشیدہ ذخیرہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

ناول "ہکلا طوطا" اُنیس ابواب پر پھیلا ہوا ہے۔ ان ابواب کے عنوانات ہیں "بچاؤ بچاؤ" "ہکلا طوطا" "ننھا چرداہا بھی گم" "لال دروازہ" "بھوت کا رابطہ بھوت سے" "ملاقاتی" "ہوشیار" "پُر اسرار خزانہ" "کالا عقاب" "پھنس گئے" "سات سراغ" "میدان عمل" "مڈبھیڑ" "پراسرار پیغام" "لڑھکتے گھسیٹتے" "معمہ حل ہو گیا" "ہڈیوں کے پیچھے" "آنکھ مچولی" اور "آخری الفاظ"۔

ہر باب میں ایک نیا حادثہ یا واقعہ سنسنی خیز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ابتدا میں اتنی دشواریوں کا اندازہ جاسوسوں کو نہیں ہوتا۔ بظاہر ایک معمولی واقعہ سے شروع ہو کر واقعات پیچیدہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور گتھیاں بُری طرح الجھ جاتی

ہیں۔ منظہر الحق علوی نے نہایت فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ واقعات میں تال میل پیدا کیا ہے۔ ناول میں جگہ جگہ رونگٹے کھڑے کر دینے اور چونکا دینے والے واقعات اور مناظر موجود ہیں۔

جہانگیر کی خوفزدگی کا یہ نقشہ خاصا جاندار ہے اور مصنف کا اثر انگیز بیان قاری کے ذہن پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے پر کامیاب ہے۔ پُرلطف بات یہ ہے کہ جہانگیر کو دبوچنے والے پنجے کسی جانور یا انسان کے پنجے نہیں تھے۔ بلکہ ایک بیل میں الجھ گیا تھا منظہر الحق کی فنکاری کا اس امر میں مضمر ہے کہ اتنی چھوٹی سی بات کو انھوں نے اپنی خلاقی کے وسیلے سے سنسنی خیز بنا کر پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ خوفزدہ انسان کی نفسیات کی عکاسی محولہ بالا اقتباس میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کی گئی ہے اور دہشت کا تاثر ابھارنے کے لیے مصنف نے الفاظ بھی موزوں تلاش کیے ہیں۔ آگے چل کر منظہر الحق علوی نے خوف کے جذبات کا تجزیہ بھی کیا ہے اور اس نقطہ کی وضاحت کی ہے کہ وہم و گمان میں پڑ کر انسان اصل خطرہ سے زیادہ اپنے توہم پرستی سے خائف ہو جاتا ہے۔

"ہکلا طوطا" میں پلاٹ ایسے دلچسپ اور عجیب و غریب اسلوب بیان کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ بچے کہیں بھی بے کیفی محسوس نہیں کرتے۔ ناول میں سراغ رسانی کے نئے نئے داؤ پیچ پیش کیے گئے ہیں۔ مصنف کی نگاہ صرف جاسوسوں کی دانش مندی اور کارکردگی پر ہی نہیں ہے بلکہ اس نے مجرموں کی نفسیات اور ان کے ہتھکنڈوں کی واضح تصویر بھی پیش کی ہے جو تینوں جاسوسوں کو زچ کر دیتے ہیں قدم قدم پر پُراسرار واقعات اور سنسنی خیز انداز نگارش نے ناول میں استعجاب انگیزی کا وصف پیدا کر دیا ہے۔

پیغام رسانی کے لیے مجرموں نے طوطوں کو تربیت دے رکھی تھی جو خفیہ خزانے کے بارے میں مجرموں کے سرغنہ بہرام کا پیغام کوڈ ورڈس میں جماعت کے مختلف کارکنوں تک پہنچاتے ہیں۔ پُراسرار پیغامات ملاحظہ کیجیے۔

"ننھا چرواہا: ننھے چرواہے تیری بھیڑ گم ہوگئی ہے، پتہ نہیں کہاں ہے ــــ
غیبن شاہ سے کہو۔

ولی دکنی: جا ــ دو ــ دو ــ دو میں تیرے نین غزالوں سے کہوں گا۔

کادو مکرانی: میں کادو مکرانی ہوں۔ میں نے آزمائش کے لیے ایک تیر چلایا
اور وہ سو قدم دور مغرب میں گرا۔

غیبن شاہ: ہمت سے دس قدم پیچھے ہو اور منزل قدموں میں ہو گی۔

بوچیہ: الّو کا پٹھا، مجھے جیت نہیں سکتا، بات تیری دم میں نمدہ[1]

ننھا چرواہا، ولی دکنی، کادو مکرانی، غیبن شاہ بوچیہ وغیرہ طوطوں کے نام ہیں۔
ان کی زبانی جو پیغامات بھیجے گئے ہیں ان کے پردے میں بہت اہم ہدایات منتقل کی گئی ہیں۔
اور اس طرح ناول کو خاصا پُراسرار بنا دیا گیا ہے۔

شرافت، طارق اور جہانگیر تینوں جاسوسوں کے کرداروں کو پیش کرنے میں
منظہر الحق علوی نے مہارتِ فن کا ثبوت دیا ہے۔ ان تینوں کی انفرادی خصوصیات ابتدائی
صفحات پر تفصیل کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں اور آگے چل کر ناول میں ان حرکات و سکنات
اقوال و افعال مصنف کی بیان کردہ خصوصیات سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں مجرموں
میں بہرام اور سرفراز کے کرداروں پر خاصی توجہ اور محنت صرف کی گئی ہے۔ بہرام گروہ کا
سرغنہ ہے علوی نے اس کی شخصیت کو انتہائی پراسرار بنا کر پیش کیا ہے جو ان کی کردار
نگاری پر مہارت کی دلیل ہے۔ سرفراز مجرم ہوتے ہوئے جاسوسوں کی مدد کرتا ہے۔ اس کردار
میں نیکی اور بدی کی آویزش پیدا کر کے منظہر الحق علوی نے اسے ایک منفرد حیثیت بخش
دی ہے۔ باقی مجرموں میں چاند ل سکھی کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے جو بے عقاب کے
توسل سے ان جاسوسوں کی مدد کرتا ہے۔

سراغ رسانی کے ناولوں میں مصنف کو جذبات نگاری کا جوہر دکھانے کے

---

[1] منظہر الحق علوی ۔ ہکلا طوطا، نسیم بکڈپو لکھنؤ، ۱۹۷۶ء ص ۱۷۸، ۱۷۹

مواقع کم ہی ملتے ہیں پھر بھی بعض مقامات پر زیر بحث ناول میں مظہرالحق علوی اپنے کردار کے جذبات واحساسات اور نفسیات کی کامیاب عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ناول کے مکالمے برجستہ ہیں اور گفتگو میں بے تکلفی کی چاشنی ہے۔ مکالمات کے دوران کردار کی شخصیت کے اعتبار سے زبان اور لہجے کا استعمال برمحل ہے۔ مکالمے بیاختہ اور برجستہ ہیں، کہیں کہیں شگفتہ الفاظ، محاورے اور کہاوتوں کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً:

"اور یہ کافی ہے، میں جو کچھ معلوم کرنا چاہتی تھی کر چکی" بیگم سرفراز نے کہا۔

"اب یہاں سے سیدھے سبھاؤ باہر نکلو"

"ایس"

"میں نے کہا۔ کارسے اُتر مونڈے۔"

"لیکن" ۔۔۔۔۔۔

"مونڈی کاٹے۔! اب ٹانگیں گھستے پہنچو۔ اپنی اماں کے پاس" بیگم سرفراز بولیں۔ ۔۔۔ "اتر" [1]

مونڈی کاٹے، سیدھے سبھاؤ جیسے الفاظ کا استعمال برمحل بھی ہے اور پرلطف بھی۔ البتہ کئی مقامات پر احساس ہوتا ہے کہ روانی میں مصنف کو یہ لحاظ نہیں رہ گیا کہ یہ ناول بچوں کے لیے لکھا جا رہا ہے۔ چنانچہ "پہنچو اماں پاس" "الو کے پٹھے" "تیری دم میں نمدہ" اور اسی قسم کے بہت سے رکیک اور مبتذل جملے ان کے قلم سے نکل گئے ہیں جنہیں نوعمر لڑکے بآسانی جزو گفتگو بنا سکتے ہیں۔

اکثر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے لاشعوری طور پر انگریزی طرز تحریر کی پیروی کی ہے اور اکثر فقروں کی ساخت انگریزی ناولوں کے جملوں جیسی ہے۔ غالباً

---

[1] مظہرالحق علوی "پہلا طوطا" نسیم بکڈپو لکھنؤ ص ۸۸

درجنوں انگریزی ناولوں کا ترجمہ کرنے کی وجہ سے یہ خامی منظہر الحق علوی کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔

مکمل ناول کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر بھی پہنچا ہوں کہ یہ دراصل بڑوں کا ناول ہے۔ جسے محض آسان زبان کے استعمال سے بچوں کے کام کا بھی بنا دیا ہے واقعات کا الجھاؤ، پلاٹ کی پیچیدگی اور کوڈ ورڈس کے اسرار عام طور پر بچوں کے فہم و فراست سے بالاتر ہیں۔ پھر بھی چونکہ یہ اپنی طرز کا منفرد ناول ہے اور سراغرسانی کے اس نوع کے کارنامے بچوں کے ناولوں میں کم ہی پیش کیے گئے ہیں۔ اس لیے ناول "ہکلا طوطا" کی اہمیت سے یکسر انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ منظہر الحق علوی نے اسی انداز کے کچھ اور ناول بھی قلمبند کیے تھے جن میں "تین جاسوس" "خوفناک آدمی" "طلسمی آئینہ" "دنیا کے دشمن" "تلاش" "موت کی منزل" "صحرا کا شیطان" "خفیہ خزانہ" "سمندری لٹیرے" "سمندری شیطان" اور "فرعون کا خزانہ" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

امید ہے علوی بچوں کے لیے اچھے ناول اور بھی لکھیں گے۔

ا منظہر الحق علوی "ہکلا طوطا" نسیم بکڈپو لکھنؤ ص ۸۸

کتابیات

تنقیدی کتب

نمبر شمار	کتاب	مصنفین / مرتبین	ناشرین	سن اشاعت
۱	ادب کسے کہتے ہیں	اطہر پرویز	ترقی اُردو بورڈ دہلی	۱۹۷۶ء
۲	ادب و آگہی	پروفیسر مجتبیٰ حسین	مکتبہ افکار کراچی الہ آباد	۱۹۶۵ء
۳	ادبی رُجحانات	ڈاکٹر اعجاز حسین	ادارہ انیس اُردو	۱۹۶۳ء
۴	اُردو کی پہلی کتاب	ڈاکٹر اسلم فرخی	ترقی اُردو بورڈ کراچی	۱۹۸۳ء
۵	اسمٰعیل میرٹھی حیات اور کارنامے	ڈاکٹر حسینی بیدی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی	۱۹۷۶ء
۶	اقبال کے نثری افکار	عبدالغفار شکیل	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	۱۹۷۷ء
۷	اقبال کی کہانی	جگن ناتھ آزاد	ترقی اُردو بورڈ دہلی	۱۹۷۶ء
۸	امیر خسرو کی کھڑی بولی کی شاعری	ڈاکٹر گیان چند جین	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۹	امیر خسرو دہلوی	ممتاز حسین	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	۱۹۸۲ء
۱۰	امیر خسرو	شیخ سلیم احمد	نیشنل کونسل آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ، نئی دہلی	— ۱۹۷۵ء
۱۱	انیسویں صدی میں بنگال کا ادب	پروفیسر نہال جاوید	اُردو رائٹرس گلڈ ویس کلکتہ	—
۱۲	بانگ درا	اقبال	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ	۱۹۷۰ء
۱۳	بچوں کا ادب	ڈاکٹر اسد اریب	کاروان ادب ملتان	۱۹۸۲ء
۱۴	بچوں کے اقبال	عبدالقوی دسنوی	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۸ء

۱۵	بچوں کے ادب کی خصوصیات	مُشیر فاطمہ	انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ	۱۹۷۵ء
۱۶	پنجاب میں اُردو	محمود شیرانی	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ لاہور	۱۹۶۷ء
۱۷	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	عشرت پبلشنگ ہاؤس	۱۹۶۴ء
۱۸	جہات وجستجو	مظفر حنفی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۱۹	جائزے	ناظر کاکوری	ادارہ انیس اُردو، الٰہ آباد	۱۹۹۰ء
۲۰	دانش وبینش	کوثر چاند پوری	حلقہ فکر وشعور، دہلی	۱۹۷۵ء
۲۱	محمد حسین آزاد	آغا سلمان باقر	سنگ میل پبلیکیشنز لاہور	۱۹۸۱ء
۲۲	مطالب بانگ درا	غلام رسول مہر	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی	۱۹۷۱ء

اخبارات ورسائل

نمبر شمار	نام رسالہ / اخبار	مدیران / مقام اشاعت	سن اشاعت
۲۳	ماہنامہ اُمنگ	شریف الحسن نقوی، محمود سعیدی، نئی دہلی	نومبر ۱۹۸۸ تا نومبر ۱۹۸۹ء
۲۳۸	ماہنامہ آجکل	شہباز حسین، نئی دہلی	جنوری ۱۹۷۹ء
۲۴	ماہنامہ آجکل	شہباز حسین، نئی دہلی	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء
۲۵	ماہنامہ آجکل	شہباز حسین، نئی دہلی	مارچ ۱۹۸۱ء
۲۶	افکار	صبا لکھنوی، نئی دہلی	نومبر ۱۹۸۵
۲۷	سہ ماہی اُردو	کراچی	جنوری ۱۹۶۶ء
۲۸	ماہنامہ انعام	حیدر آباد	اکتوبر ۱۹۵۰ء
۲۹	ماہنامہ آواز	نئی دہلی	اپریل ۱۹۸۱ء
۳۰	ماہنامہ بازیچہ اطفال	———	مارچ ۱۹۲۸ء

۳۱	ماہنامہ بچوں کا باغ	ایم یوسف، لاہور	اکتوبر	۱۹۴۳ء
۳۲	ماہنامہ بچوں کا باغ	ایم یوسف، لاہور	نومبر	۱۹۴۲ء
۳۳	ماہنامہ بچوں کا باغ	ایم یوسف، لاہور	جنوری	۱۹۴۴ء
۳۴	ماہنامہ بچپن	قدیر جاوید پریمی بریلی	اگست	۱۹۶۷ء
۳۵	ماہنامہ پھول	دہلی	جون	۱۹۵۳ء
۳۶	ماہنامہ پھول	دہلی	اکتوبر	۱۹۵۹ء
۳۷	ماہنامہ پھلواری	ناز انصاری، دہلی	جون	۱۹۵۲ء
۳۸	ماہنامہ پھلواری	ناز انصاری، دہلی	جنوری	۱۹۵۵ء
۳۹	ماہنامہ پھلواری	ناز انصاری، دہلی	جنوری	۱۹۵۹ء
۴۰	ماہنامہ پھلواری	ناز انصاری، دہلی	فروری	۱۹۶۳ء
۴۱	ماہنامہ پیام تعلیم	عابد حسین، نئی دہلی	جنوری ۲۶ء و دسمبر ۱۹۲۷ء	
۴۲	ماہنامہ پیام تعلیم	عابد حسین، نئی دہلی	جنوری ۲۷ء تا دسمبر ۱۹۲۷ء	
۴۳	ماہنامہ پیام تعلیم	عابد حسین، نئی دہلی	جنوری ۳۰ء تا دسمبر ۱۹۳۱ء	
۴۴	ماہنامہ پیام تعلیم	عابد حسین، نئی دہلی	جنوری ۳۳ء تا دسمبر ۱۹۳۴ء	
۴۵	ماہنامہ پیام تعلیم	عابد حسین، نئی دہلی	جنوری ۳۶ء تا دسمبر ۱۹۳۹ء	
۴۶	ماہنامہ پیام تعلیم	عابد حسین، نئی دہلی	جنوری ۴۲ء تا دسمبر ۱۹۴۶ء	
۴۷	ماہنامہ پیام تعلیم	اطہر پرویز، نئی دہلی	جنوری ۴۹ء تا دسمبر ۱۹۵۰ء	
۴۸	ماہنامہ پیام تعلیم	اطہر پرویز، نئی دہلی	جنوری ۵۱ء تا دسمبر ۱۹۵۶ء	
۴۹	ماہنامہ پیام تعلیم	حسین حسان، نئی دہلی	جنوری ۵۷ء تا دسمبر ۱۹۵۸ء	
۵۰	ماہنامہ پیام تعلیم	حسین حسان، نئی دہلی	جنوری ۵۹ء تا دسمبر ۱۹۶۸ء	
۵۱	ماہنامہ پیام تعلیم	حسین حسان، نئی دہلی	جنوری ۷۰ء و دسمبر ۱۹۷۳ء	
۵۲	ماہنامہ پیام تعلیم	ولی شاہجہانپوری، نئی دہلی	جنوری ۷۴ء تا دسمبر ۱۹۷۴ء	
۵۳	ماہنامہ پیام تعلیم	ولی شاہجہاں پوری، نئی دہلی	جنوری ۷۵ء تا دسمبر ۱۹۷۶ء	

۵۴	ماہنامہ پیام تعلیم	ولی شاہجہاں پوری، نئی دہلی	جنوری ۸۳ء تا دسمبر ۱۹۸۵ء
۵۵	ماہنامہ پیام تعلیم	ولی شاہجہاں پوری، نئی دہلی	جنوری ۱۹۸۶ء
۵۶	ماہنامہ تعمیر ہریانہ	چنڈی گڑھ	—— ——
۵۷	ماہنامہ زبان و ادب	پٹنہ	ستمبر ۱۹۸۳ء
۵۸	ماہنامہ جگنو	نعیم کوثر، بھوپال	اپریل ۱۹۶۱ء
۵۹	ماہنامہ دوست	اعظم ذوالفقار، حیدرآباد	جنوری/فروری ۱۹۵۷ء
۶۰	ماہنامہ کھلونا	یونس دہلوی، نئی دہلی الیاس دہلوی، ادریس دہلوی	جنوری ۱۹۵۱ء تا دسمبر ۱۹۵۹ء
۶۱	ماہنامہ کھلونا	یونس دہلوی، نئی دہلی ادریس دہلوی، الیاس دہلوی	جنوری ۱۹۶۱ء تا دسمبر ۱۹۶۱ء
۶۲	ماہنامہ کھلونا	یونس دہلوی، نئی دہلی ادریس دہلوی، الیاس دہلوی	جنوری ۱۹۶۵ء تا دسمبر ۱۹۶۸ء
۶۳	ماہنامہ کھلونا	ادریس دہلوی، نئی دہلی یونس دہلوی، الیاس دہلوی	جنوری ۱۹۷۰ء تا دسمبر ۱۹۷۴ء
۶۴	ماہنامہ کھلونا	الیاس دہلوی، نئی دہلی	جنوری ۷۵ء تا دسمبر ۱۹۷۷ء
۶۵	ماہنامہ کھلونا	الیاس دہلوی، نئی دہلی	جنوری ۸۲ء تا دسمبر ۱۹۸۵ء
۶۶	ماہنامہ کھلونا	الیاس دہلوی، نئی دہلی	جنوری ۱۹۸۶ء
۶۷	ماہنامہ قومی زبان	جمیل الدین عالی، کراچی	اپریل ۱۹۶۹ء
۶۸	ماہنامہ قومی زبان	جمیل الدین عالی، کراچی	مارچ ۱۹۸۵ء
۶۹	ماہنامہ قومی زبان	جمیل الدین عالی، کراچی	ستمبر ۱۹۸۵ء
۷۰	ماہنامہ کتاب	ذوالفقار احمد تابش، لاہور	دسمبر ۱۹۷۹ء
۷۱	ماہنامہ گلشن	حیدرآباد	دسمبر ۱۹۵۸ء
۷۲	ماہنامہ ماہ نو	کشور ناہید، لاہور	نومبر ۱۹۶۹ء

۷۳	ماہنامہ تہذیب	حیدرآباد	مئی	۱۹۵۹ء
۷۴	ماہنامہ نیا دور	خورشید احمد صدیقی، لکھنؤ	نومبر و دسمبر	۱۹۶۹ء
۷۵	ماہنامہ نیرنگ خیال	حکیم یوسف حسین، راولپنڈی	سالنامہ	۱۹۶۲ء
۷۶	ماہنامہ ہدایت	لاہور	جنوری	۱۹۵۸ء
۷۷	ماہنامہ ہمدرد صحت	حکیم عبدالحمید، دہلی	جولائی	۱۹۳۵ء

شاعری

نمبر شمار	شاعر/مرتبین	نام کتاب	ناشر	سن اشاعت ایڈیشن
۷۸	انگر شتاق رحیم آبادی	پیاری نظمیں	ادارۂ فکر و فن، لکھنؤ	۱۹۵۴ء
۷۹	اسمٰعیل میرٹھی	بچوں کی رباعیاں	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۴۹ء
۸۰	اسمٰعیل میرٹھی	بچوں کے اسمٰعیل	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۳۹ء
۸۱	اکبر الٰہ آبادی	کلیات اکبر	مشورہ بک ڈپو، دہلی	پاکٹ ایڈیشن
۸۲	امتیاز علی تاج	پھول باغ	دفتر پھول لاہور	۱۹۳۸ء
۸۳	بدیع الزماں خاور	ننھی کتاب	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی	۱۹۸۳ء
۸۴	بزمی بھارتی	دھنک	مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی	۱۹۷۸ء
۸۵	تلوک چند محروم	بہار طفلی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۶۰ء
۸۶	تلوک چند محروم	بچوں کی دنیا	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۶۵ء
۸۷	جگن ناتھ آزاد	بچوں کی نظمیں	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۲ء
۸۸	چکبست لکھنوی	صبح وطن	———	———
۸۹	حامد اللہ افسر	بچوں کے افسر	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۳۹ء
۹۰	حامد اللہ افسر	گہوارے کے گیت	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	———
۹۱	حفیظ جالندھری	حفیظ کے گیت اور نظمیں	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	———

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	سنہ
٩٣	راج نرائن راز	رنگ برنگے پھول	پبلیکیشنز ڈویژن نئی دہلی	١٩٦٩ء
٩٤	شان الحق حقی	سہانے ترانے	مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی	١٩٨٥ء
٩٥	شاہین ظفر علی	خسرو کی پہیلیاں	ظفر بک ڈپو، لکھنؤ	١٩٥٦ء
٩٦	شفیع الدین نیرّ	اچھی چڑیا	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	١٩٧٢ء
٩٧	شفیع الدین نیرّ	بچوں کا تحفہ (حصہ اول)	نیرّ کتاب گھر، نئی دہلی	١٩٧٢ء
٩٨	شفیع الدین نیرّ	بچوں کا تحفہ (حصہ دوم)	نیرّ کتاب گھر، نئی دہلی	١٩٣٩ء
٩٩	شفیع الدین نیرّ	منّی کے گیت	نیرّ کتاب گھر، نئی دہلی	پہلا ایڈیشن
١٠٠	شفیع الدین نیرّ	گھی شکر	نیرّ کتاب گھر، نئی دہلی	پہلا ایڈیشن
١٠١	شفیع الدین نیرّ	منّی کا تحفہ	نیرّ کتاب گھر، نئی دہلی	پہلا ایڈیشن
١٠٢	شفیع الدین نیرّ	بچوں کا کھلونا	نیرّ کتاب گھر، نئی دہلی	پہلا ایڈیشن
١٠٣	شفیع الدین نیرّ	ہماری نعت	نیرّ کتاب گھر، نئی دہلی	پہلا ایڈیشن
١٠٤	شوکت بنارسی	چوبیس مشعلیں	بال ساہتیہ مندر، الہ آباد	١٩٧٦ء
١٠٥	ظفر گورکھپوری	ناچ ری گڑیا	مصنف، بمبئی	—
١٠٦	علقمہ شبلی	تارے زمیں کے	مصنف، کلکتہ	—
١٠٧	علقمہ شبلی	پھول آنگن کے	مصنف، کلکتہ	—
١٠٨	غلام مصطفےٰ تبسم	جھولنے	دارالاشاعت پنجاب لاہور	—
١٠٩	کیف احمد صدیقی	سدا بہار نظمیں	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	١٩٨٠ء
١١٠	کیف احمد صدیقی	دلچسپ نظمیں	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	—
١١١	کیف احمد صدیقی	دینی نظمیں	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	—
١١٢	کیف احمد صدیقی	سچی نظمیں	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	—
١١٣	محبوب راہی	رنگا رنگ	محبوب راہی باسی ٹاکلی اکولہ	١٩٨٢ء
١١٤	محبوب راہی	گل بوٹے	محبوب راہی اکولہ	١٩٨٢ء
١١٥	محوی صدیقی	بالک باغ	منیر المحوی صدیقی بھوپال	١٩٦٧ء

۱۱۶	مظفر حنفی	کلیات شاد عارفی	نیشنل اکیڈمی اردو دہلی	۱۹۷۵ء
۱۱۷	میرزا ادیب	ڈالیاں	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	――
۱۱۸	ناظم میواتی	تحفہ	ناظم پبلی کیشنز	۱۹۷۶ء
۱۱۹	نظیر اکبرآبادی	کلیات نظیر	رام نرائن بینی مادھو الہ آباد	۱۹۷۶ء
۱۲۰	محمد یاسین	درس اقبال	ہما پبلی کیشنز، احمد آباد	۱۹۸۸ء

کہانی

نمبر شمار	نام مصنف	نام کتاب	ناشر	سن اشاعت
۱۲۰	آفتاب حسین	محنت کی روٹی	زرینہ آفتاب، بمبئی	۱۹۷۶ء
۱۲۱	ابوالحسن نغمی	جان عالم	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۶ء
۱۲۲	ابو تمیم فریدآبادی	الف لیلیٰ	〃 〃 〃	۱۹۷۶ء
۱۲۳	〃	بالوشاہی	کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی	۱۹۴۶ء
۱۲۴	〃	سبزہ پری	〃 〃 〃	۱۹۴۹ء
۱۲۵	〃	لالہ پری	〃 〃 〃	۱۱۴۷ء
۱۲۶	〃	ژالہ پری	〃 〃 〃	۱۹۴۷ء
۱۲۷	〃	لال پری	〃 〃 〃	۱۹۴۶ء
۱۲۸	〃	کالا دیو	〃 〃 〃	۱۹۴۶ء
۱۲۹	〃	چتلا دیو	〃 〃 〃	۱۹۴۶ء
۱۳۰	〃	پیلا دیو	〃 〃 〃	۱۹۴۷ء
۱۳۱	ابرار محسن	انصاف کا تخت	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۶۵ء
۱۳۲	〃	بدنصیب شہزادی	〃 〃 〃	۱۹۶۵ء
۱۳۳	〃	عقل کا سودا	〃 〃 〃	۱۹۶۰ء
۱۳۴	〃	جنگل کا راجہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	

۱۳۵	ابرار محسن	ٹمیس مار خاں	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	——
۱۳۶	احمد جمال پاشا	آسمانی یاقوت	" " "	——
۱۳۷	"	پریوں کی شہزادی	" " "	——
۱۳۸	"	ٹلو میاں	" " "	——
۱۳۹	اسحاق صدیقی	ببر شیر	مکتبہ کلیاں، لکھنؤ	——
۱۴۰	"	آپ کی آنکھیں	" "	——
۱۴۱	اسرار ندوی	ایک کچوری تیل میں	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	——
۱۴۲	اشرف سبحانی	ہیرامن طوطا	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۶ء
۱۴۳	اطہر پرویز	پنچ تنتر کی کہانیاں (اول)	" " "	۱۹۷۶ء
۱۴۴	"	پنچ تنتر کی کہانیاں (دوم)	" " "	۱۹۷۶ء
۱۴۵	"	پنچ تنتر کی کہانیاں (سوم)	" " "	۱۹۷۶ء
۱۴۶	"	دیس دیس کی کہانیاں	" " "	۱۹۷۷ء
۱۴۷	"	مشینی گھوڑا	" " "	۱۹۷۷ء
۱۴۸	"	سندباد جہازی	" " "	۱۹۷۸ء
۱۴۹	"	ایک نائی اور رنگساز	" " "	۱۹۷۸ء
۱۵۰	"	اوڈیسی	" " "	۱۹۷۸ء
۱۵۱	الکا شنکر	تین رانیاں	نہرو بال پستکالیہ نئی دہلی	۱۹۷۶ء
۱۵۲	الیاس احمد مجیبی	چار کی سوئی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	——
۱۵۳	"	ننھی منی کہانیاں	" " "	——
۱۵۴	الیاس سیتاپوری	بگڑا فرشتہ	مکتبہ کلیاں لکھنؤ	۱۹۶۷ء
۱۵۵	"	ظالم بادشاہ	"	۱۹۶۷ء
۱۵۶	"	جن پکڑا گیا	"	۱۹۶۷ء
۱۵۷	"	ہیبت خاں	"	۱۹۶۷ء

۱۵۸	انشاء اللہ خاں انشاء	رانی کیتکی	مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر بمبئی	——
۱۵۹	انور شریف	بصرے کا سوداگر	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۸ء
۱۶۰	انیس مرزا	گمشدہ شہزادہ	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	——
۱۶۱	"	جادو کا محل	" "	——
۱۶۲	"	چارون کا شہزادہ	" "	——
۱۶۳	"	قصہ چہار درویش	ترقی اُردو بورڈ، دہلی	۱۹۸۱ء
۱۶۴	انور کمال حسینی	بہادروں کی کہانیاں	نہرو بال پستکالیہ نئی دہلی	——
۱۶۵	"	شہزادی شیریں	" " "	——
۱۶۶	"	باز بہادر	" " "	——
۱۶۷	"	مورا	" " "	——
۱۶۸	"	سونا کی سیر	" " "	——
۱۶۹	امتیاز علی تاج	موت کا راگ	دفتر "پھول" لاہور	۱۹۳۸ء
۱۷۰	"	بچوں کی بہادری	" "	۱۹۳۸ء
۱۷۱	"	پرستان	" "	۱۹۳۸ء
۱۷۲	"	پھولوں کی کلیاں	" "	۱۹۳۸ء
۱۷۳	"	چڑیا خانہ (حصہ اول، دوم)	" "	۱۹۳۸ء
۱۷۴		گدگدی (حصہ اول، دوم)	" "	۱۹۳۸ء
۱۷۵	"	ابوالحسن	" "	۱۹۳۸ء
۱۷۶	ایم اسلم	باورچی شہزادہ	کھلونا بک ڈپو، نئی دہلی	۱۹۵۶ء
۱۷۷	"	ہنستی پری	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	——
۱۷۸	ایم یوسف انصاری	تین قلندر	" "	——
۱۷۹	"	الہ دین اور طلسمی چراغ	" "	——
۱۸۰	"	بے رحم بادشاہ	" "	——

۱۸۱	ایم یوسف انصاری	مینڈکی شہزادی	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	
۱۸۲	"	زلفی شہزادی	" " "	
۱۸۳	"	فالکن شہزادی	" " "	
۱۸۴	"	چودہ شہزادیاں	" "	
۱۸۵	"	ٹھگوں کی بستی	" "	
۱۸۸	"	ہرکولیس اور جن	" "	
۱۸۹	"	ٹارزن اور بندر کی اولاد	" "	
۱۹۰	"	ٹارزن اور خزانہ	" "	
۱۹۱	"	ٹارزن اور شکاری	" "	
۱۹۲	"	ٹارزن اور آدم خور	" "	
۱۹۳	"	ٹارزن اور چچا بھتیجا	" "	
۱۹۴	"	جادوگر کی بیٹی	" "	
۱۹۵	"	اینڈرسن کے سات سفر	" "	
۱۹۶	اے، آر، خاتون	ساڑھے تین یار	" "	
۱۹۷	"	سیمیں	" "	
۱۹۸	"	بھائی بہن	" "	
۱۹۹	"	سات کھلاڑی	" "	
۲۰۰	"	زمانہ	" "	
۲۰۱	اے، آر، خاتون	شہزادی ماہ رُخ	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	
۲۰۲	"	سلیقہ بیگم اور بربادی بیگم	مکتبہ علم و ادب لکھنؤ	
۲۰۳	جوگیندر پال	پریم چند کی کہانیاں	ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۹ء
۲۰۴	حامد اللہ افسر	جانوروں کی عقل مندی	سنگم کتاب گھر دہلی	۱۹۶۱ء
۲۰۵	"	جانوروں کی کہانی	"	۱۹۶۱ء

۲۰۶	حامد اللہ افسر	مکانوں کی کہانی	سنگم کتاب گھر، دہلی	۱۹۶۰ء
۲۰۷	"	چار چاند	"	۱۹۶۱ء
۲۰۸	حجاب امتیاز علی	الہ دین کا چراغ	دارالاشاعت پنجاب لاہور	——
۲۰۹	حسین حسان	آستین کا سانپ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۶۵ء
۲۱۰	"	چاند	" "	۱۹۶۵ء
۲۱۱	"	بندر والا	سنگم کتاب گھر، نئی دہلی	۱۹۵۸ء
۲۱۲	"	نیا کھلونا	" "	۱۹۵۸ء
۲۱۳	"	پنیر کی دعوت	" "	۱۹۵۹ء
۲۱۴		ہم آزاد ہیں	" "	۱۹۵۹ء
۲۱۵	"	تانبیل خاں	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	——
۲۱۶	"	چنبیلی	" "	——
۲۱۷	"	جیت کس کی	" "	——
۲۱۸	"	دعوت مُلّاجی کی	" "	——
۲۱۹	"	چینی کی گڑیا	" "	——
۲۲۰	"	بہادر سیّاح	" "	——
۲۲۱	خان محبوب طرزی	تریاقی	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	——
۲۲۲	"	دو دیوانے	"	——
۲۲۳	"	سفر طوری	"	——
۲۲۴	"	فولادی پُتلے	"	——
۲۲۵	"	گورکھ دھندا	"	——
۲۲۶	خضر برنی	بندر کا گھر	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	——
۲۲۷	خلیق انجم اشرفی	پھولوں کی دیوی	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	——
۲۲۸	خوشحال زیدی	طلسمی کہانیاں	مشعل راہ، کھنگو سرائے، سنبھل	۱۹۶۰ء

۲۲۸	خوشحال زیدی	پیاسس	مشعل راہ، کنگو سرائے سنبھل۔	۱۹۶۵ء
۲۲۹	ذاکر حسین	مرغی اجیر چلی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۴۷ء
۲۳۰	"	ابو خاں کی بکری اور چودہ کہانیاں	" "	۱۹۴۷ء
۲۳۱	راجہ مہدی علی خاں	جادو کی چکّی	کھلونا بک ڈپو، نئی دہلی	۱۹۵۶ء
۲۳۲	"	لنگڑی کتاب	"	۱۹۵۶ء
۲۳۳	"	موٹر نمبر ۷۸۶	"	۱۹۵۶ء
۲۳۴	"	سونے کی بکری	"	۱۹۵۶ء
۲۳۵	رشید احمد صدیقی	شیخ نیازی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	——
۲۳۶	رضیہ سجاد ظہیر	جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں	نہرو بال پستکالیہ نئی دہلی	۱۹۷۸ء
۲۳۷	"	زین العابدین بڈشاہ	"	۱۹۷۸ء
۲۳۸	سراج انور	سونے کا شیر	طارق پبلی کیشنز، دہلی	۱۹۸۴ء
۲۳۹	"	شیخ چلّی کی شامت	" "	۱۹۸۴ء
۲۴۰	"	گنجا ڈاکو	" "	۱۹۸۴ء
۲۴۱	"	تجوری کا راز	" "	۱۹۸۴ء
۲۴۲	"	بوتل کا قیدی	" "	۱۹۸۴ء
۲۴۳	"	تیس مار خاں	" "	۱۹۸۴ء
۲۴۴	"	بھیانک نقاب	" "	۱۹۸۴ء
۲۴۵	"	جادو کی آنکھیں	" "	۱۹۸۴ء
۲۴۶	"	بھوتوں کا خزانہ	" "	۱۹۸۴ء
۲۴۷	سعادت علی صدیقی	بچّوں کی لوک کہانیاں	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	——
۲۴۸	سید ابوطاہر داؤد	دھوئیں کی پھانسی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	——

٢٤٩	شجاع احمد قائد	چھومنتر کا دھاگہ	عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد	١٩٤٦ء
٢٥٠	"	پٹھان کا بیٹا	"	١٩٤٦ء
٢٥١	"	رابنسن کروسو	"	١٩٤٦ء
٢٥٢	"	کھٹی مٹھی بتیاں	"	١٩٤٥ء
٢٥٣	شفیع الدین نیر	چُنّن مُنّن	نیر کتاب گھر، نئی دہلی	—
٢٥٤	"	گُلگُلے کی دوڑ	"	—
٢٥٥	"	مَیں گھر جاؤں تو کیسے	"	—
٢٥٦	"	مکھن کا ڈبّہ	"	—
٢٥٧	"	ڈھول کے پول	"	—
٢٥٨	"	آٹے کا پتلا	"	—
٢٥٩	"	ہوشیار حسن	"	—
٢٦٠	"	تارا کا ڈنڈا	"	—
٢٦١	"	انار راجہ	"	—
٢٦٢	"	بلخ شہزادی	"	—
٢٦٣	"	ریڈیو کا بھوت	"	—
٢٦٤	"	بونے کا بٹوہ	"	—
٢٦٥	"	ظالم کسان	کتابی دنیا، دہلی	١٩٤٧ء
٢٦٦	"	شیر خاں کے لڑکے	نیر کتاب گھر، نئی دہلی	—
٢٦٧	"	میری چھتری	"	—
٢٦٨	"	پرستان کی سیر	"	—
٢٦٩	"	بونے کا انصاف	"	—
٢٧٠	"	ٹلو میاں	"	—
٢٧١	"	انوکھی چھتری	"	—

۲۷۲	شفیع الدین نیرؔ	میاں مٹھو	نیرؔ کتاب گھر، نئی دہلی	—
۲۷۳	〃	طلسمی مینا	〃	—
۲۷۴	〃	کھلتو میاں	〃	—
۲۷۵	〃	ہماری زندگی	〃	—
۲۷۶	〃	یادگار انگوٹھی	〃	—
۲۷۷	〃	بدھو کی بیوی	〃	—
۲۷۸	〃	جنگو منگو	〃	—
۲۷۹	〃	پیسے کا صابن	〃	—
۲۸۰	〃	گھر کا آئینہ	〃	—
۲۸۱	〃	عید کے کھلونے	〃	—
۲۸۲	〃	باپ کی ناؤ	〃	—
۲۸۳	〃	مزدور کا بیٹا	〃	—
۲۸۴	〃	نئی کہانیاں	〃	—
۲۸۵	شمیم انہونوی	انوکھا تیل	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	—
۲۸۶	〃	جادو کا ہنس	〃	—
۲۸۷	〃	ایک تھا بادشاہ	〃	—
۲۸۸	〃	کہانی میں کہانی	〃	—
۲۸۹	〃	پریوں کی کرامت	〃	—
۲۹۰	〃	شوہر کا روگ	〃	—
۲۹۱	〃	انوکھا پھول	〃	—
۲۹۲	〃	شہزادی زرنگار	〃	—
۲۹۳	〃	شب نور	〃	—
۲۹۴	〃	فاختہ شہزادی	〃	—

۲۹۵	شمیم انہونوی	ننھے میاں نے کھیر کھائی	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	ــــــ
۲۹۶	"	جنت کی سیر	"	ــــــ
۲۹۷	شمیم حنفی	بھوتوں کا جہاز	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	ــــــ
۲۹۸	شمیم احمد	نورتن کہانیاں	ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۸۱ء
۲۹۹	شوکت تھانوی	تیسری آنکھ	کھلونا بک ڈپو، نئی دہلی	۱۹۵۶ء
۳۰۰	"	کالا منہ	"	۱۹۵۶ء
۳۰۱	صالحہ عابد حسین	زعفران پریوں کے دیس میں	جاوید پبلشنگ ہاؤس دہلی	ــــــ
۳۰۲	"	انوہا اور کالا کوا	مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی	ــــــ
۳۰۳	صغرا مہدی	رسیلی کہانیاں	نہرو بال پستکالیہ نئی دہلی	ــــــ
۳۰۴	ظ۔ انصاری	چین کی بہترین کہانیاں	ــــــ	ــــــ
۳۰۵	ظفر گورکھپوری	سچائیاں	ظفر گورکھپوری	ــــــ
۳۰۶	عابد حسین	چنبلا بلا	کتابی دنیا، دہلی	۱۹۴۷ء
۳۰۷	عادل رشید	خونی ڈاکو	کھلونا بک ڈپو، نئی دہلی	۱۹۵۶ء
۳۰۸	"	آخری خواہش	کھلونا بک ڈپو، نئی دہلی	۱۹۵۵ء
۳۰۹	"	جادو کا ہار	"	۱۹۵۵ء
۳۱۰	"	ایران کی شہزادی	"	۱۹۵۵ء
۳۱۱	"	چوہوں کی حکومت	"	۱۹۵۵ء
۳۱۲	عبدالغفور، ایم۔ اے	سونے کی چڑیا	کتابی دنیا، فیض بازار، دہلی	۱۹۴۷ء
۳۱۳	"	انوکھی ملاقات	کتابی دنیا، فیض بازار دہلی	۱۹۴۷ء
۳۱۴	عبدالواحد سندھی	تاک دنادن تاکے سے	مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی	ــــــ
۳۱۵	"	روٹی کس نے پکائی	"	ــــــ
۳۱۶	"	پھر میں چگوں کیا خاک	"	ــــــ
۳۱۷	"	پانچ بونے	"	ــــــ

۳۱۸	عبدالواحد سندھی	چھوٹی رانی	مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی	ـــــ
۳۱۹	"	بچوں کی کہانی	"	ـــــ
۳۲۰	"	پکڑو دم کے ڈکو	"	ـــــ
۳۲۱	"	پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	"	ـــــ
۳۲۲	عطاءاللہ	شہزادی اور گلنار	"	ـــــ
۳۲۳	عفت موہانی	نانی اماں نے شادی کرائی	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	ـــــ
۳۲۴	"	نانی اماں بیمار ہوئیں	"	ـــــ
۳۲۵	"	نانی اماں شادی میں گئیں	"	ـــــ
۳۲۶	"	نانی اماں اور نانا کی جنگ	"	ـــــ
۳۲۷	"	نانی اماں اور بھوت	"	ـــــ
۳۲۸	"	نانی اماں نے بلی پالی	"	ـــــ
۳۲۹	"	نانی اماں نے بہادری دکھائی	"	ـــــ
۳۳۰		نانی اماں نے چغل خوری کی	"	ـــــ
۳۳۱		نانی اماں نے ڈینگ ماری	"	ـــــ
۳۳۲	عطیہ پروین	شب نور	"	ـــــ
۳۳۳	"	فاختہ شہزادی	"	ـــــ
۳۳۴	"	جنت کی تلاش	"	ـــــ
۳۳۵	"	ننھے میاں نے کھیر پکائی	"	ـــــ
۳۳۶	قدسیہ زیدی	کیسا چکما دیا	کتابی دنیا، فیض بازار، دہلی	۱۹۴۷ء
۳۳۷	"	جانباز سپاہی	"	۱۹۴۷ء
۳۳۸	"	بھن بھن بانو	"	۱۹۴۷ء
۳۳۹	"	اَن تھک جان	"	۱۹۴۷ء
۳۴۰	"	گلابو چوہیا اور غبارے		۱۹۴۷ء

۳۴۱	قدسیہ زیدی	گاندھی بابا کی کہانی	کتابی دنیا، فیض بازار، دہلی	۱۹۴۷ء
۳۴۲	قرۃ العین حیدر	لومڑی کے بچے	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۸۳ء
۳۴۳	"	ڈھینچو کے بچے	"	۱۹۸۳ء
۳۴۴	"	ہرن کے بچے	"	۱۹۸۳ء
۳۴۵	"	بھیڑئے کے بچے	"	۱۹۸۳ء
۳۴۶	کرشن چندر	بیوقوفوں کی کہانیاں	کھلونا بک ڈپو، نئی دہلی	۱۹۵۶ء
۳۴۷	"	سونے کی صندوقچی	"	۱۹۵۶ء
۳۴۸	"	سونے کا سیب	"	۱۹۵۷ء
۳۴۹	"	چڑیوں کی الف لیلیٰ	"	۱۹۵۸ء
۳۵۰	"	خرگوش کا سپنا	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۶۵ء
۳۵۱	کوثر چاند پوری	چالاک مرغا	عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد	۱۹۴۶ء
۳۵۲	"	لڑکے کا خواب	"	۱۹۴۶ء
۳۵۳	"	چوہیا بیگم	"	۱۹۴۶ء
۳۵۴	"	گاؤں کا مکھیا	"	۱۹۴۵ء
۳۵۵	"	سمندر کا شہزادہ	"	۱۹۴۵ء
۳۵۶	"	وفادار دوست	"	۱۹۴۵ء
۳۵۷	"	مزدور کا انجام	"	۱۹۴۵ء
۳۵۸	"	کبڑا جادوگر	"	۱۹۴۵ء
۳۵۹	"	چالاک بھیڑیا	"	۱۹۴۵ء
۳۶۰	لیلیٰ خواجہ بانو	بچوں کی کہانیاں	دفتر خواجہ حسن نظامی، دہلی	——
۳۶۱	محمد حسین آزاد	نصیحت کا کرن پھول	آزاد بک ڈپو، دہلی	——
۳۶۲	محمد مجیب	غوطہ خور	کتابی دنیا، نئی دہلی	۱۹۳۶ء
۳۶۳	"	شیدلا	"	۱۹۳۶ء

۳۶۴	مسلم ضیائی	کالا دیو	عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد	۱۹۴۶ء
۳۶۵	"	چٹکنی خاں	"	۱۹۴۶ء
۳۶۶	"	قمقم تماقیل	"	۱۹۴۶ء
۳۶۷	"	سیپی تارہ	"	۱۹۴۶ء
۳۶۸	"	بولتی کیتلی	"	۱۹۴۶ء
۳۶۹	مشتاق احمد اعظمی	تاریخ ہند کی کہانیاں	کتابی دنیا، فیض بازار، دہلی	۱۹۴۷ء
۳۷۰	مظفر حنفی	نیلا ہیرا	مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی	۱۹۸۳ء
۳۷۱	"	بندروں کا مشاعرہ	مکتبہ کلیاں، لکھنؤ	۱۹۵۲ء
۳۷۲	مظہر الحق علوی	طلسمی آئینہ	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	
۳۷۳	"	جل پری	"	
۳۷۴	"	موت کی منزل	"	
۳۷۵	"	جن کا مقابلہ	"	
۳۷۶	"	جادو کی ڈبیا	"	
۳۷۷	"	بلی رانی	"	
۳۷۸	"	چچا مرغی سسرال گئے	"	
۳۷۹	"	نیلا ستون	"	
۳۸۰	"	پھیروں کا خزانہ	"	
۳۸۱	"	شہر سلیمان	"	
۳۸۲	"	چچا مرغی سرکس گئے	"	
۳۸۳	"	چچا مرغی نے سیٹی بجائی	"	
۳۸۴	"	شہزادہ اللہ دیا	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	
۳۸۵	"	شیخ جمن دلی آئے	"	
۳۸۶	"	جمن اور مچھر	"	

۳۸۷	مظہر الحق علوی	چمن سے مقدمہ	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	—
۳۸۸	"	جادوگر سے انتقام	"	—
۳۸۹	"	فقیر شاہ	"	—
۳۹۰	"	تین دن کی کہانی	"	—
۳۹۱	"	آٹھواں تارا	"	—
۳۹۲	مقبول احمد دہلوی	نیلم شہزادی	"	—
۳۹۳	"	بے وقوف شہزادہ	"	—
۳۹۴	"	سنہری چڑیا	"	—
۳۹۵	مناظر عاشق ہرگانوی	اغوا	"	—
۳۹۶	"	تلخ میوہ	"	—
۳۹۷	"	جنگل کا ڈاکو	"	—
۳۹۸	میرزا ادیب	پریوں کا محل	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	—
۳۹۹	"	عرب کی کہانی	کھلونا بکڈپو، نئی دہلی	—
۴۰۰	م۔ ندیم	للی پٹ کا سفر	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	—
۴۰۱	ناوک حمزہ پوری	گل بکاؤلی	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	—
۴۰۲	"	چوہے رام	مکتبہ کلیاں، لکھنؤ	—
۴۰۳	"	گلدستہ	"	—
۴۰۴	"	چڑیا خانہ	"	—
۴۰۵	نریش کمار شاد	چینی طیل	ماہنامہ کھلونا، نئی دہلی	—
۴۰۶	نذیر احمد	منتخب الحکایات	دارالاشاعت پنجاب لاہور	۱۹۳۱ء
۴۰۷	نورالحسن نقوی	چار درویشوں کا قصہ	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۹ء
۴۰۸	ساغر ملک	قاتل سائنسداں	مکتبہ اسلامی بھیونڈی	۱۹۸۸ء
۴۰۸(الف)	تسکین زیدی	امیبی کرن	بزم خضر راہ کانپور	۱۹۸۹ء

ناول:۔

نمبر شمار	نام مصنف	نام کتاب	ناشر	سنہ اشاعت
۴۰۸	افتخار احمد اقبال	پاگل ڈاکٹر	کھلونا بکڈپو، نئی دہلی	۱۹۵۶ء
۴۰۹	"	خونی دروازہ	"	۱۹۵۶ء
۴۱۰	انیس مرزا	مقدس کھوپڑی	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۷ء
۴۱۱	"	کالی گھوڑی کا سوار	"	۱۹۷۷ء
۴۱۲	"	تہہ خانے کا قیدی	"	۱۹۷۸ء
۴۱۳	"	آنسو بنے تارے	"	۱۹۷۸ء
۴۱۴	"	سمندر کا بھیڑیا	"	۱۹۷۸ء
۴۱۵	ایم یوسف انصاری	سند باد کے آٹھ سفر	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۷ء
۴۱۶	ریاض احمد	ہار کی تلاش	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	——
۴۱۷	سراج انور	خوفناک جزیرہ	کھلونا بک ڈپو، نئی دہلی	——
۴۱۸	"	کالی دنیا	"	——
۴۱۹	"	نیلی دنیا	"	——
۴۲۰	سید نبی اعجاز	مونگے کے جزیرے	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	۱۹۸۴ء
۴۲۱	ظفر پیامی	ستاروں کے قیدی	کھلونا بکڈپو، نئی دہلی	۱۹۶۴ء
۴۲۲	عظیم بیگ چغتائی	قصر صحرا (اول، دوم سوم)	دارالاشاعت پنجاب، لاہور	۱۹۳۸ء ۱۹۳۸ء
۴۲۳	عصمت چغتائی	تین اناڑی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۸۰ء
۴۲۴	غلام حیدر	غار سے جھونپڑی تک	اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ	۱۹۸۱ء
۴۲۵	قرۃ العین حیدر	چن حسن عبدالرحمٰن (حصہ اول)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۴۲۶	کرشن چندر	الٹا درخت	ایشیا پبلشرز، دہلی	۱۹۶۴ء

۴۲۷	کرشن چندر	ستاروں کی سیر	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۶۵ء
۴۲۸	محمود نیازی	سلیمان کا خزانہ	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۸ء
۴۲۹	مظہر الحق	ہکلا طوطا	״	۱۹۷۶ء
۴۳۰	״	تین جاسوس	״	۱۹۷۶ء
۴۳۱	״	خوفناک آدمی	״	۱۹۷۷ء
۴۳۲	״	طلسمی آئینہ	״	۱۹۷۶ء
۴۳۳	״	دنیا کے دشمن	״	۱۹۷۷ء
۴۳۴	״	تلاشش	״	۱۹۷۷ء
۴۳۵	״	موت کی منزل	״	۱۹۷۷ء
۴۳۶	״	صحرا کا شیطان	״	۱۹۷۷ء
۴۳۷	״	خفیہ خزانہ	״	۱۹۷۷ء
۴۳۸	״	سمندری لٹیرے	״	۱۹۷۸ء
۴۳۹	״	سمندری شیطان	״	۱۹۷۸ء
۵۰۰	״	فرعون کا خزانہ	״	۱۹۷۸ء
۵۰۱	مناظر عاشق ہرگانوی	گدھے کے بچے	״	۱۹۷۸ء
۵۰۲	میرزا ادیب	پہاڑ کی چوٹی پر	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۸۴ء
۵۰۳	م۔ ندیم	رابنسن کروسو	ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۶ء
۵۰۴	نجم اعجاز	موت کا سفر	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۸ء
۵۰۵	״	اجنبی دنیا	״	۱۹۷۸ء

ڈرامے

۵۰۶	اطہر پرویز	گلیلی گلیلیو	اُردو گھر، علی گڑھ	۱۹۵۸ء
۵۰۷	جگن ناتھ آزاد	ریڈیو فیچر	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	

۵۰۸	حبیب تنویر	آگ کی گیند اور دودھ کا گلاس	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	۱۹۳۷ء
۵۰۹	ذاکر حسین	امانت	"	۱۹۳۹ء
۵۱۰	سعدی پھلی شہری	بچّہ کا دل اور دوسرے ڈرامے	بچّوں کا کتب خانہ، نئی دہلی	۱۹۳۶ء
۵۱۱	شجاع احمد قائد	آنکھ مچولی	عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد	۱۹۴۵ء
۵۱۲	"	اسکول	"	۱۹۴۵ء
۵۱۳	"	عید	"	۱۹۴۶ء
۵۱۴	"	سمندری جہاز	"	۱۹۴۶ء
۵۱۵	شجاعت علی سندیلوی	راکھی	مکتبہ علم و ادب، لکھنؤ	۱۹۵۷ء
۵۱۶	عابد حسین	شریر لڑکا	سنگم کتاب گھر، دہلی	۱۹۳۷ء
۵۱۷	عبدالغفار مدھولی	چور لڑکا بچّوں کی عدالت میں	"	—
۵۱۸	"	قوم پرست طالب علم	"	۱۹۳۸ء
۵۱۹	"	اسکول کی زندگی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	۱۹۳۹ء
۵۲۰	"	محنت	"	۱۹۳۹ء
۵۲۱	"	کایا پلٹ	"	۱۹۳۷ء
۵۲۲	غلام حیدر	کرکٹ کا کپتان	"	پہلا ایڈیشن
۵۲۳	محمد مجیب	آؤ ڈراما کریں	"	۱۹۸۳ء
۵۲۴	میرزا ادیب	ایک مسافر	کھلونا بکڈپو، نئی دہلی	۱۹۵۶ء

معلوماتی کتب

۵۲۵	آمنہ شوکت علی	ہمارے تہوار	آنکل پرکاشن نئی دہلی	۱۹۷۹ء

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	سنہ
۵۲۶	آل احمد سرور	ایورسٹ کی داستان	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۷۹ء
۵۲۷	آصف مجیب	جیب اور اب	" " "	
۵۲۸	اروند ناتھ	سائنس کے کھیل	وگیان پرکاشن، الہ آباد	۱۹۷۶ء
۵۲۹	اطہر پرویز	پودوں اور جانوروں کی دنیا	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۶ء
۵۳۰	اطہر پرویز	محمد شفیع الدین نیر	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	——
۵۳۱	"	جادو کے کھیل	" "	——
۵۳۲	"	دنیا کے جانور	" "	——
۵۳۳	"	چارلس ڈارون	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۸۱ء
۵۳۴	اسلم جیراجپوری	ارکان اسلام	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	——
۵۳۵	"	عقائد اسلام	" "	——
۵۳۶	اندرجیت لال	بیربل کی کہانی	ساوجر پرکاشن دہلی	۱۹۷۶ء
۵۳۷	"	ایٹم کی کہانی	" "	۱۹۷۷ء
۵۳۸	"	سوامی رام تیرتھ	ہری کرانتی انٹرپرائزز دہلی	۱۹۷۶ء
۵۳۹	انور کمال حسینی	ہندوستان نے آزادی کیسے حاصل کی	نہرو بال پستکالیہ، نئی دہلی	
۵۴۰	"	روہنت نندیہ	نہرو بال پستکالیہ نئی دہلی	۱۹۷۸ء
۵۴۱	"	آزادی کی کہانی	" "	۱۹۸۱
۵۴۲	"	پھول اور شہد کی مکھی	" "	۱۹۸۱
۵۴۳	الیاس احمد مجیبی	آنحضرت	مکتبہ جامعہ دہلی	——
۵۴۴	"	چار یار	" "	——
۵۴۵	ایس، پی، چٹرجی	ڈاک ٹکٹوں کی داستان	نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی	۱۹۷۶ء
۵۴۶	بدیع الزماں اعظمی	نظام شمسی کی تشکیلی کانفرنس	" "	۱۹۷۶ء

۵۴۷	بدیع الزماں اعظمی	انوکھے سنسار کی انوکھی باتیں	نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی	۱۹۷۶ء
۵۴۸	〃 〃	عالمی بچے	〃 〃	۱۹۷۸ء
۵۴۹	〃 〃	دیس بدیس کے بچے	〃 〃	۱۹۷۸ء
۵۵۰	جگن ناتھ آزاد	اقبال کی کہانی	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۶ء
۵۵۱	جوناتھن سوئفٹ	للی پٹ کا سفر	〃 〃	۱۹۷۶ء
۵۵۲	حامد اللہ افسر	حکایت گاندھی	سنگم کتاب گھر، دہلی	—
۵۵۳	حسین حسان	دیمک	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۶۵ء
۵۵۴	〃	سرکار دو عالم	〃 〃	۱۹۶۵ء
۵۵۵	〃	میر تقی میر	〃 〃	۱۹۶۵ء
۵۵۶	〃	میر انیس	〃 〃	۱۹۶۵ء
۵۵۷	〃	انوکھا عجائب خانہ	پیام تعلیم، نئی دہلی	—
۵۵۸	〃	دنیا کے بچے	〃 〃	—
۵۵۹	〃	قدرت کے کرشمے	〃 〃	—
۵۶۰	〃	لوٹنے والے	〃 〃	—
۵۶۱	〃	زلزلہ	〃 〃	—
۵۶۲	〃	چچا غالب	〃 〃	—
۵۶۳	〃	چینی کی گڑیا	〃 〃	—
۵۶۴	احمد ندیم	ذرا ہنس دیجیے	مظفری کتب خانہ، بمبئی	۱۹۷۶ء
۵۶۵	ذاکر ندوی	پیار کا دیس	مصنف	۱۹۷۶ء
۵۶۶	راج نرائن راز	فٹبال کی کہانی	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	۱۹۷۹ء
۵۶۷	رسکن بانڈ	چڑیا گھر	نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی	۱۹۷۶ء
۵۶۸	〃	درختوں کی دنیا	〃 〃	۱۹۷۶ء

۵۶۹	رضیہ سجاد ظہیر	ہماری ندیوں کی کہانی	نہرو بال پستکالیہ، نئی دہلی	۱۹۶۹ء
۵۷۰	"	سلطان زین العابدین بڈشاہ	" "	۱۹۶۸ء
۵۷۱	رونذر ناتھ بھارگو	قوم کے معمار	ٹی این بھارگو دہلی	۱۹۶۹ء
۵۷۲	سید احتشام حسین	اردو کی کہانی	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی	—
۵۷۳	سیفی پریمی	کہاوت اور کہانی	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۶۵ء
۵۷۴	شجاع احمد قائدؔ	دسترخوان	عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد	۱۹۴۵ء
۵۷۵	"	جنگ کے بعد کیا ہوگا	" "	۱۹۴۶ء
۵۷۶	"	چھتری فوج	" "	۱۹۴۶ء
۵۷۷	"	پڑوسن	" "	۱۹۴۵ء
۵۷۸	"	پرواز کی آواز	" "	۱۹۴۵ء
۵۷۹		کپڑے	" "	۱۹۴۵ء
۵۸۰	شفیع الدین نیر	پرندوں کی دنیا	نہرو بال پستکالیہ، نئی دہلی	—

ENGLISH

S.No.	Books	Authors/Editors
1.	A Critical History of Children's Literature	Meigs, Carnelia and others.
2.	A Critical Approach to Children's Literature	LILLIAN SMITH
3.	A Critical History of Children's Literature	DR. HENERY STEAL
4.	Books, Children & Men	PAUL HAZARD
5.	Children's Literature in the Elementary School	Charlothe S Huce & Daris Young Kuhu
6.	Childhood in Contemporary Cultures	MARGARET MEAD
7.	Childhood and Adolecence	J.A. HADFIELD
8.	Children's Literature in Indian Languages	Dr. K.A. Jamuna

9.	Criteria for selecting literature, The Middle and Upper Grade.	Edman Marion
10.	Educational Psychology	Charles E. Skinner
11.	Manual of Child Psychology	L. Car Michael
12.	Mental & Physical Growth of Children	PETER SANDIFORD
13.	Principles of Psychology Vol. II.	WILLIAM JAMES
14.	The Mental Development of the Child	KARL BUHLER
15.	The Teaching of Reading and Writing.	WILLIAM S. GREY
16.	The New World of the Children Vol. I	Library Service London 1971.

ENCYCLOPAEDIA:

17.	Britanica Junior Encyclopaedia Vol. 4-C	1964
18.	Britanica Junior (The Boy and Girls) Encyclopaedia Vol IV C.	NEW YORK CHARLES Scrubner's & Sons 1955 & 1980

DICTIONARIES:

19.	SHORTER OXFORD ENGLISH DICTIONARY	WILLIAM LITTLE M.A. Fowler, M.H. and Coulson J.
20.	Standard Dictionary of Fold-Lore	CHARLES FRANCIS POTTER.

PAPERS/REPORTS-

21. Papers Read during the workshop on 'Children's Literature in Indian Languages' organised by N.B.T. India, at Varanasi, 1984, File owned by Dr. Muzaffer Hanfi.

22. Papers presented in the Seminar on children literature, XXI National Prize Competition for Children Literature NCERT, New Delhi, 1980 - File owned by Dr. Muzaffer Hanfi.

23. Papers Read during the workshop organized by NCERT at Hyderabad on population Education and Children's Literature - File owned by Dr. Muzaffer Hanif.